هٰذا بیان للناس وھدًی وموعظۃ للمتقین

تفہیم القرآن

سید ابو الاعلیٰ مودودی

جلد اول

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًی وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ

تفہیم القرآن

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام

جلد اوّل

ادارہ ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ	۵
۲	مقدمہ	۱۳
۳	الفاتحہ	۴۳
۴	البقرہ	۴۶
۵	آل عمران	۲۲۸
۶	النساء	۳۱۶
۷	المائدہ	۴۳۴
۸	الانعام	۵۲۰
۹	فہرست موضوعات	۶۰۹

فہرست نقشہ جات

(تمام نقشہ جات جلد کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت اور ان کے تبلیغی مشن کے مراکز	۱۰۸
۲	نقشہ مقامات حج	۱۵۶
۳	نقشہ جنگ احد	۲۸۴
۴	بنی اسرائیل کی صحرانوردی	۴۶۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

قرآنِ مجید کے ترجمہ وتفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت وسعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مَصرف نہیں ہے۔ اِس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین ومفسّرین کے کام میں رہ گئی ہو، یا طالبینِ قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو پچھلے تراجم وتفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔

اِن صفحات میں ترجمانی وتفہیمِ قرآن کی جو سعی کی گئی ہے، وہ دراصل اسی بُنیاد پر ہے۔ میں ایک مدّت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں رُوحِ قرآن تک پہنچنے اور اس کتابِ پاک کے حقیقی مدّعا سے رُوشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے، وہ مترجمین ومفسّرین کی قابلِ قدر مساعی کے باوجود ہُنوز تِشنہ ہے۔ اس کے ساتھ مَیں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تِشنگی کو بُجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت مَیں بھی کر سکتا ہوں۔ انھی دونوں احساسات نے مجھے اُس کوشش پر مجبور کیا جس کے ثمرات ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لیے فہمِ قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

اِس کام میں میرے پیشِ نظر علما اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں، اور نہ اُن لوگوں کی ضروریات

ہیں جو عَرَبی زبان اور علومِ دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآنِ مجید کا گہرا تحقیقی مُطالَعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بُجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں، جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علومِ قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اُنھی کی ضروریات کو میں نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے اُن تفسیری مَباحِث کو مَیں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علمِ تفسیر میں بڑی اہمیّت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد مَیں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہُوم و مُدّعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے، اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اُس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ نیز دَورانِ مطالعہ میں جہاں جہاں اسے اُلجھنیں پیش آ سکتی ہوں وہ صاف کر دی جائیں اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اُسے بروقت مل جائے۔ یہ میری کوشش ہے۔ اب اس امر کا فیصلہ عام ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ مَیں اس میں کہاں تک کامیاب ہُوا ہوں۔ بہرحال یہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو، یا کسی سوال کا جواب نہ ملے، یا مّدعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو اس سے مجھے مُطّلَع کیا جائے، تاکہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔ علمائے کرام سے بھی مَیں گزارش کرتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں۔

چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلّق بھی:

مَیں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مَیں پابندیِ لفظ کے ساتھ قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ترجمۂ قرآن کا تعلّق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدِّد بزرگ بہترین طریقے پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ، اور اُردُو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدّین صاحب، مولانا محمُود حَسَن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور حافظ فتح محمد صاحب جالندھری کے تراجم اُن اغراض کو بخوبی پورا کر دیتے ہیں جن کے لیے ایک لفظی ترجمہ درکار ہوتا ہے۔

لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمے سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں۔ اُنھی کو مَیں نے ترجمانی کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآنِ مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسُوس ہوتی ہے، وہ روانیِ عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان، اور تاثیرِ کلام کا فُقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی رُوح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسُوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اُترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثُّر رُونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھَلنی صرف دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تُند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصّہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اِس چھَلنی کے اُوپر ہی سے اُڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصّہ ہے، اس کے ادب کا حصّہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔ جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہِلا دی تھی۔ جس کی قوتِ تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادُو اثر کلام جو سُنے گا وہ بالآخر نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اُسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے، تو اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہوسکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔

لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متأثّر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بَینَ السُّطُور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دُوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیونکہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دُوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے، اُس طرح وہ ترجمۂ قرآن کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کرسکتا ہے، کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعے کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائبل کے ترجمے کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور اُوپر نیچے نمبروار لکھ کر اُسے پڑھیے۔ آپ کو خود محسُوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی اِن جدا جدا فقروں کے پڑھنے سے نہیں پڑتا۔

ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثّر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو نقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جُوں کا تُوں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآنِ مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں حسبِ موقع وضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جاتی تھی اور آپؐ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سُناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرتاً بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہے کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے۔ مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ ”لوگ ایسا کہتے ہیں“، بلکہ مقرّر آمدِ سُخَن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شُبہے کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلّق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ ربطِ کلام

ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسُوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلّق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلّق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، اُن کے درمیان کوئی خَلا محسُوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلّم اور مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرّر اپنے زورِ کلام میں موقع ومحل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہِ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلّم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمایندگی کرنے لگتا ہے، اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حُسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسُوس کرتا ہے، اور یہ احساس اُتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآنِ عَرَبی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اُس کو دُور کرنے کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعے سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دُوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریر کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دُور ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں، جیسا کہ ابھی مَیں اشارتاً عرض کر چکا ہوں، قرآنِ مجید کی ہر سُورت دراصل ایک تقریر تھی جو دعوتِ اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوتی تھی۔ اس کا ایک خاص پَس منظر ہوتا تھا۔ کچھ مخصُوص حالات اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پُورا کرنے کے لیے وہ اُترتی تھی۔ اپنے اُس پَس منظر اور اپنی اُس شانِ نزُول کے ساتھ قرآن کی اِن سُورتوں کا تعلّق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرّد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا، اور بعض باتوں کو اُلٹا سمجھ جائے گا، اور قرآن کا پورا مدّعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں۔ قرآنِ عربی کے معاملے میں اس مشکل کو دُور کرنے

کے لیے تفسیر سے مدد لینی پڑتی ہے، کیونکہ اصل قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دُوسری زبان میں ہم اتنی آزادی برت سکتے ہیں کہ قرآن کی ترجمانی کرتے وقت کلام کو کسی نہ کسی حد تک اس کے پَسِ منظر اور اس کے حالاتِ نُزُول کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں، تاکہ ناظر کے لیے وہ پُوری طرح بامعنیٰ ہو سکے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن اگرچہ عربیِ مُبِین میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصُوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لُغوِی معنیٰ سے ہٹا کر ایک خاص معنیٰ میں استعمال کیا ہے، اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہُومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیِ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کیے جاتے ہیں، ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے، اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی اُلجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک لفظ کفر کو لیجیے جو قرآن کی اصطلاح میں اصل عربی لُغت اور ہمارے فقہا و متکلّمین کی اصطلاح دونوں سے مختلف معنیٰ رکھتا ہے، اور پھر خود قرآن میں بھی ہر جگہ ایک ہی معنیٰ میں استعمال نہیں ہُوا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمّل غیر ایمانی حالت ہے۔ کہیں یہ مجرّد انکار کے معنیٰ میں آیا ہے۔ کہیں اس سے محض ناشکری اور احسان فراموشی مراد لی گئی ہے۔ کہیں مُقتضیاتِ ایمان میں سے کسی کو پورا نہ کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مختلف مواقع پر اگر ہم ہر جگہ کفر کا ترجمہ کفر ہی کرتے چلے جائیں، یا اَور کسی لفظ کا التزام کر لیں، تو بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہو گا لیکن ناظرین کہیں مطلب سے محرُوم رہ جائیں گے، کہیں کسی غلط فہمی کے شکار ہوں گے، اور کہیں خَلجان میں پڑ جائیں گے۔

لفظی ترجمے کے طریقے میں کَسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے مَیں نے ”ترجمانی“ کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اُردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہُوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے، اسے حتّی الامکان صحّت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دُوں۔ اُسلوبِ بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عَرَبیِ مُبِین کی ترجمانی اُردوئے مُبِین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے

سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلامِ الٰہی کا مطلب و مدّعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی، جہاں تک بس چلے، ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہرحال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطالب کی جسارت کی جائے، لیکن معاملہ کلامِ الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجایش دیتی ہے، اس سے تجاوُز نہ ہونے پائے۔

پھر چونکہ قرآن کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ارشادات کا پَس منظر بھی آدمی کے سامنے ہو، اور یہ چیز ترجمانی میں پُوری طرح نمایاں نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر سُورہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے، جس میں اپنی حد تک پُوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سُورہ کس زمانے میں نازل ہوئی، اُس وقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلے میں تھی، کیا اس کی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اُس وقت درپیش تھے۔ نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعۂ آیات کی کوئی الگ شانِ نُزُول ہے، وہاں میں نے اُسے حاشیے میں بیان کر دیا ہے۔

حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجّہ قرآن سے ہٹا کر کسی دُوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے حاشیے بھی میں نے لکھے ہیں، دو ہی قسم کے مقامات پر لکھے ہیں۔ ایک وہ جہاں مجھے محسُوس ہُوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا، یا اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوگا، یا وہ کسی شبہے میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ ہُوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گزر جائے گا اور قرآن کے ارشاد کی اصل رُوح اس پر واضح نہ ہوگی۔

جو لوگ اس کتاب سے پُورا فائدہ اُٹھانا چاہیں، اُن کو میں مشورہ دُوں گا کہ پہلے ہر سُورت کے دیباچے کو بغور پڑھ لیا کریں، اور جب تک وہ سُورت ان کے زیرِ مُطالعہ رہے، وقتاً فوقتاً اس کے دیباچے پر نظر ڈالتے رہیں۔ پھر روزانہ قرآنِ مجید کا جتنا حصّہ وہ معمولاً پڑھتے ہوں، اس کی ایک ایک آیت کا لفظی ترجمہ پہلے پڑھ لیں۔ اس غرض کے لیے فارسی، اُردو، انگریزی تراجم میں سے جس کو وہ چاہیں منتخب

کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تفہیم القرآن کی ترجمانی کو حواشی کی طرف توجہ کیے بغیر مسلسل ایک عبارت کے طور پر پڑھیں، تاکہ قرآن کے اس حصے کا پورا مضمون بیک وقت ان کے سامنے آ جائے۔ پھر ایک ایک آیت کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے حواشی کا مطالعہ کریں۔ اس طرح پڑھنے سے مجھے توقّع ہے کہ ایک عام ناظر کو قرآنِ مجید کی عالمانہ واقفیت نہ سہی، عامیانہ واقفیت اِن شاء اللہ بخوبی حاصل ہو جائے گی۔

اِس کتاب کو مَیں نے مُحرّم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲ء) میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدّت تک اس کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سُورۂ یوسُفؑ کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہوگئی۔ اس کے بعد پے دَر پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی مُیَسّر آ سکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا، اسی کو نظرِ ثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صُورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا سُوءِ اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے، وہ پُوری ہو اور یہ کتاب قرآنِ مجید کے فہم میں بندگانِ خدا کے لیے واقعی کچھ مددگار ثابت ہو سکے، وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيْمِ۔

نیو سنٹرل جیل - ملتان ابُوالاعلیٰ
۱۷ ذی القعدہ ۱۳۶۸ھ (۱۱/ستمبر ۱۹۴۹ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقَدِّمَہ

اِن گزارشوں کے عنوان میں لفظ ’’مقدّمہ‘‘ دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدّمہ لکھ رہا ہوں۔ یہ قرآن کا نہیں، تفہیمُ القرآن کا مقدّمہ ہے، اور اس کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر دو مقصد ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک عام ناظر اُن باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کو ابتدا ہی میں سمجھ لینے سے فہمِ قرآن کی راہ آسان ہو جاتی ہے، ورنہ یہ باتیں دَورانِ مطالعہ میں بار بار کھٹکتی ہیں اور بسا اوقات محض اِن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں تک معانیِ قرآن کی سطح ہی پر گھومتا رہتا ہے، گہرائی میں اُترنے کا راستہ اُسے نہیں ملتا۔

دوم یہ کہ اُن سوالات کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے جو قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت بالعموم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہُوا کرتے ہیں۔ مَیں اس مقدّمے میں صرف اُن سوالات کا جواب دُوں گا جو خود میرے ذہن میں اوّل اوّل پیدا ہوئے تھے، یا جن سے بعد میں مجھ کو سابقہ پیش آیا۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سوالات بھی جواب طلب باقی رہ گئے ہوں تو ان سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ اُن کا جواب اِن شاء اللہ آیندہ اشاعت کے موقع پر اس مقدّمے میں بڑھا دیا جائے گا۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعیّن موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے

ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ”کتاب“ ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعیُّن ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فُصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی، اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلّق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مُطالَعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دُوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اَخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلّی، دلائل، شواہد، تاریخی قصّے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دُوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دُہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دُوسرا اور دُوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے۔ مخاطَب اور مُتکلّم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سَمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ و مابعد الطبیعیات ہیں تو مَنطِق و فلسفہ کی زبان میں نہیں۔ انسان اور موجوداتِ عالَم کا ذکر ہے تو عُلُومِ طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدُّن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو عُلُومِ عمران کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اُصُولِ قانون کا بیان ہے تو مُقنّنوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف۔ اَخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اَخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جُدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصوُّر کے خلاف پا کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اُسے یوں محسُوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مُرتّب، غیر مَربُوط، مُنتشِر کلام ہے جو اوّل سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شَذرات پر مشتمل ہے، مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے، اور مُوافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنیٰ کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شُکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقے سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی ”نظریۂ شَذرات“ کو قبول کر لیتا ہے، جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنیٰ آفرینیوں کی آماج گاہ

بن جاتی ہے جو قائل کے منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدّعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیّت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصُوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلّق رکھتے ہوں، وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں، ان میں یہ چیزیں بآسانی مِل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اُس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دُوسری کتابوں میں انھیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیّت لے کر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدّعا اور مرکزی مضمون کا سُراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اُسے کچھ اجنبی سا محسُوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پَس منظر بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں، ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی رُوح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نِکات و فوائد پر قناعت کر لینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شُبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انھیں بکھرے ہُوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کُھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نُورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاقِ عبارت میں بالکل بے جوڑ محسُوس ہوتی ہیں، متعدّد مقامات پر تعبیرات اور اُسلوبِ بیان کی ناواقفیت انھیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اَور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پَس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اِس کے نُزُول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا

موضوعِ گفتگو کیا ہے؟ اس کی ساری بحث کس مُدّعا کے لیے ہے؟ کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النّوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرزِ اِستدلال اور کیا طرزِ بیان اس نے اپنے مُدّعا کے لیے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی دُوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبُّر کی راہیں کشادہ ہوسکتی ہیں۔ جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اُس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان مبادی سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کرتا ہے کہ وہ ”مذہب کے موضوع پر ایک کتاب“ پڑھنے چلا ہے۔ ”مذہب کا موضوع“ اور ”کتاب“، ان دونوں کا تصوّر اس کے ذہن میں وہی ہوتا ہے جو بالعُموم ”مذہب“ اور ”کتاب“ کے متعلق ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر جب وہاں اسے اپنے ذہنی تصوّر سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کر سکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث بَین السُّطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی ”تصنیف“ دُنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمھارے ذہن کا وہ ”کتابی“ سانچا جو اَب تک کی کُتُب بینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا بلکہ اُلٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خُصُوصیات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

۱- خداوندِ عالَم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے

اس حصّے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور بُرائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرّف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجُملہ ایک طرح کی خود اختیاری (autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲- اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالَم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمھارا اور تمام جہان کا مالک، معبُود اور حاکم مَیں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دُوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمھیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے، دراصل تمھارے لیے ایک امتحان کی مدّت ہے، جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمھارے لیے صحیح رَوِیّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبُود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دَارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شُعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رَوِیّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رَوِیّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں اَبَدی راحت و مَسَرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے۔ اور اگر دُوسرے کسی رَوِیّے پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دُنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالَمِ آخرت میں جب آؤ گے تو اَبَدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳- یہ فہمایش کر کے مالکِ کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نَوع کے اوّلین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پُوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انھیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔

اُن کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا، اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیعِ خدا (مُسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رَوِیّوں کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے غفلت سے اس کو گُم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مَسخ بھی کر ڈالا۔ انھوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادّی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انھوں نے خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اَوہام اور نظریّوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انھوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے عادلانہ اُصولِ اَخلاق و تمدُّن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے تعصُّبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴- خدا نے جو محدُود خود اختیاری انسان کو دی تھی، اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رَوِیّے کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مُہلت اِس نَوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی، اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اِس بغاوت کے رُونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اُس نے اپنے ذمّے لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اُس کی مُہلتِ عمل کے دَوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اِس خود عائد کردہ ذمّہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمایندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علمِ حقیقت بخشا۔ انھیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا۔ اور انھیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اُسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵- یہ پیغمبر مختلف قوموں اور مُلکوں میں اُٹھتے رہے۔ ہزار ہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رَوِیّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پَیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدُّن کے وہ اَزَلی و اَبَدی اُصُول جو آغاز

ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اِس دین اور اِس ہدایت کی طرف اپنے اَبنائے نَوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی اُمّت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اِس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جِدّوجُہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دَور میں اپنے اِس مشن کو پُوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی، اور جنھوں نے اُسے قبول کر کے اُمّتِ مُسلِمہ کی حیثیت اختیار کی، وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتّٰی کہ ان میں سے بعض اُمّتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مَسخ کر دیا۔

۶- آخرِ کار خداوندِ عالم نے سرزمینِ عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاؑ آتے رہے تھے۔ اُن کے مُخاطَب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاؑ کے بگڑے ہوئے پَیرو بھی۔ سب کو صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا، سب کو ازسرِنو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں، اُنھیں ایک ایسی اُمّت بنا دینا اُن کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دُوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جِدّوجُہد کرے ـــــ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مُدّعا کیا ہے۔

اُس کا موضوع انسان ہے اِس اِعتبار سے کہ بلحاظِ حقیقتِ نفس الامری اُس کی فلاح اور اُس کا خُسران کس چیز میں ہے۔

اُس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دُنیوی زندگی کے متعلق جو نظریّات قائم کیے ہیں، اور اُن نظریّات کی بنا پر

جو رَوِیّے اختیار کر لیے ہیں، وہ سب حقیقتِ نفسُ الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کُن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رَوِیّہ دُرست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم ’’صحیح رَوِیّہ‘‘ کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

اُس کا مُدّعا انسان کو اُس صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اُس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گُم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

اِن تین بنیادی اُمور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدّعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النّوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جُڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی ساخت پر، انسان کی خِلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد و اَخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطّبیعی اُمور و مسائل کی تشریح کرتا ہے، اور بہت سی دُوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفسُ الامری کے متعلّق انسان کی غلط فہمیاں دُور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلافِ حقیقت رَوِیّے کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے، اور اُس رَوِیّے کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اُس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مُدّعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رُجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ ’’دعوت‘‘ کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرزِ بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اُس وقت تک اچھی طرح

نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اِس کی کیفیّتِ نُزول کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیّت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اِسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اِسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رَوِیّہ زندگی کی طرف بُلائیں۔ نیز یہ اِس نوعیّت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنّفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلّق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اُسلُوب۔ دراصل اِس کی نوعیّت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہرِ مکّہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اُسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں:

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کِس طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات، اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردوپیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رَوِیّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رَوِیّے کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اُصولِ اَخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح وسعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے، جن کی زبان نہایت شُستہ، نہایت شیریں، نہایت پُر اثر اور مُخاطَب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر ونشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنُّم کی وجہ سے ان کی طرف متوجّہ ہوں، اور زبانیں ان کے حُسنِ تناسُب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر اُنھیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالَم گیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل وشواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مُخاطَب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انھی کی تاریخ، انھی کی روایات، انھی کے روزمرّہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور انھی کی اعتقادی واَخلاقی اور اجتماعی

خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا، اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ردِّعمل تین صورتوں میں ظاہر ہُوا:

(١) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے اُمّتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

(٢) ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقے کی محبّت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

(٣) مکّے اور قریش کی حُدُود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اس دعوت کا دُوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اِس تحریک اور پُرانی جاہلیّت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کشمکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حِصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیّت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تُل گئے۔ اُنھوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھُوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شُبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام النّاس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اِسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم ڈھائے، ان کا مَعاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حَبَش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبُور ہوئے، اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدّت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِپیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لُطف یہ ہے کہ جو لوگ پُرانی جاہلیّت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نَوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے، وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اِتنے نیک،

اتنے راست باز اور اتنے پاکیزہ اَخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دنیا اُس دعوت کی برتری محسُوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انھیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اس طویل اور شدید کش مکش کے دَوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز وتُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ اُن خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو اُن کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعُور پیدا کیا گیا، انھیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیِ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انھیں صبر وثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جِدّوجُہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ اُن میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دُوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خودمختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے بَیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شُبہے کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دُوسروں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیّت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل وخِرَد کی دنیا میں اس کے لیے ٹھیرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنّم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، ان کے بُرے اَخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رُسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انھیں ملامت کی گئی، اور اَخلاق وتمدُّن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اُصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جِدّوجُہد اور مُزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا ـــــ یہ ہے قرآنِ مجید کی مکّی سورتوں کا پَس منظر۔

مکّے میں اس تحریک کو اپنا کام کرتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ گیا جہاں اس کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ عرب کے تمام حصّوں سے اپنے پیروؤں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کر لے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بیشتر مُتّبعینِ اسلام ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ اِس طرح یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ اُمّتِ مُسلِمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بِنا ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ پُرانی جاہلیّت کے عَلَم برداروں سے مسلح مقابلہ شروع ہُوا۔ پچھلے انبیاؑ کی اُمّتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود اُمّتِ مُسلِمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گُھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور دس سال کی شدید کش مکش سے گزر کر آخر کار یہ تحریک کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیرِ نگیں ہو گیا اور عالَم گیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کُھل گئے۔

اِس مرحلے کی بھی مختلف منزلیں تھیں اور ہر منزل میں اِس تحریک کی مخصوص ضرورتیں تھیں۔ اِن ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی مُعلّمانہ درس و تعلیم کا، اور کبھی مُصلِحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور تمدّنِ صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شُعبوں کو کن اُصول و ضوابط پر قائم کیا جائے، مُنافقین سے کیا سلوک ہو، ذِمّی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہلِ کتاب سے تعلّقات کی کیا نوعیت رہے، برسرِ جنگ دشمنوں اور مُعاہِد قوموں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے، اور مُنظّم اہلِ ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوندِ عالَم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح تیار کرے۔ اِن تقریروں میں ایک طرف مسلمانوں کی تعلیم و

تربیت کی جاتی تھی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی جاتی تھی، ان کو راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُبھارا جاتا تھا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا، اور انھیں اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دُوسری طرف اُن لوگوں کو جو دائرۂ ایمان سے باہر تھے، اہلِ کتاب، منافقین، کُفّار و مُشرکین، سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ان پر حُجّت تمام کر دی جائے۔

یہ ہے قرآنِ مجید کی مَدَنی سورتوں کا پَس منظر۔

اِس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید ایک دعوت کے ساتھ اُترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تیئس سال کی مدّت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی، ان کی مختلفُ النّوَع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصّے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مَقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصّے نازل ہوئے، وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے، بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے، اس لیے ان کا اُسلُوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اُسلُوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات، ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دُنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اُٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم اُبھارنا، دشمنوں کو دوست، اور منکروں کو مُعترف بنانا، مخالفین کی حُجت مُنقطع کرنا اور ان کی اَخلاقی طاقت کا اِستیصال کر دینا، غرض اُسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک

دعوت کے عَلَم بردار اور ایک تحریک کے رہنما کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں، اُن کا طرزِ خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسبِ حال ہوتا ہے، اُن میں کالج کے لیکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی اس قدر تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اُس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے، بلکہ اُسی مرحلے کی باتوں کا اِعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صَرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اِعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جاتا رہے تو کان انھیں سُنتے سُنتے تھک جاتے ہیں اور طبیعتیں اکتانے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انھیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اُسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے، تاکہ نہایت خوش گوار طریقے سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی بُنیاد جن عقائد اور اصولوں پر ہو، اُنھیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے، بلکہ ان کا اِعادہ بہر حال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سُورتیں نازل ہوئی ہیں، ان سب میں بالعُموم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور اس کی بازپُرس اور جزا و سزا، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکُّل اور اسی قسم کے دُوسرے بُنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے، کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غفلت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بُنیادی تصوّرات اگر ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو اسلام کی یہ تحریک اپنی صحیح رُوح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اِسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی

ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مُرتَّب کر دیا جس کے ساتھ وہ نازل ہُوا تھا۔

اُوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تیئس سال تک قرآن کا نُزُول اُس ترتیب سے ہوتا رہا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا اِرتقا ہُوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دعوت کی تکمیل کے بعد ان نازل شدہ اجزا کے لیے وہ ترتیب کسی طرح دُرست نہ ہوسکتی تھی جو صرف ارتقائے دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اب تو اُن کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صُورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ ابتدا میں اُس کے مُخاطب اوّل وہ لوگ تھے جو اسلام سے نا آشنائے محض تھے، اس لیے اُس وقت بالکل نقطۂ آغاز سے تعلیم و تلقین شروع کی گئی۔ مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اس کے مُخاطَبِ اوّل وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لا کر ایک اُمّت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمّہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبرؑ نے نظریّے اور عمل، دونوں حیثیتوں سے مکمّل کر کے ان کے حوالے کیا تھا۔ اب لامحالہ مُقدّم چیز یہ ہو گئی کہ پہلے یہ لوگ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے، اور اُن فتنوں سے جو پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمّتوں میں رُونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف ہو لیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

علاوہ بریں قرآنِ مجید جس طرز کی کتاب ہے، اسے اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اس پر خود ہی یہ حقیقت مُنکَشِف ہو جائے گی کہ ایک ایک طرح کے مضامین کو ایک ایک جگہ جمع کرنا اِس کتاب کے مزاج ہی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے مزاج کا تو تقاضا یہی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے سامنے مَدَنی مرحلے کی باتیں مکّی دَور والی تعلیم کے درمیان، اور مکّی مرحلے کی باتیں مَدَنی دَور والی تقریروں کے درمیان، اور ابتدا کی گفتگوئیں آخر کی تلقینات کے بیچ میں، اور آخری دَور کی ہدایات آغازِ کار کی تعلیمات کے پہلو میں بار بار آتی چلی جائیں، تاکہ اسلام کا پورا منظر اور جامع نقشہ اس کی نگاہ میں رہے اور کسی وقت بھی وہ یک رُخا نہ ہونے پائے۔

پھر اگر قرآن کو اس کی نُزُولی ترتیب پر مُرتَّب کیا بھی جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لیے صرف اُسی صُورت میں بامعنیٰ ہو سکتی تھی جب کہ قرآن کے ساتھ اس کی پُوری تاریخِ نُزُول اور اس کے ایک ایک جُز کی کیفیتِ نُزُول و شانِ نُزُول لکھ کر لگا دی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہ بات اُس

مقصد کے خلاف تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا یہ مجموعہ مُرتَّب اور محفوظ کرایا تھا۔ وہاں تو پیشِ نظر چیز ہی یہ تھی کہ خالص کلامِ الٰہی بغیر کسی دُوسرے کلام کی آمیزش یا شُمُول کے، اپنی مختصر صُورت میں مُرتَّب ہو، جسے بچّے، جوان، بُوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہر حالت میں پڑھیں، اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اُس کا خدا اُس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد فوت ہو جاتا اگر اس مجمُوعۂ کلامِ الٰہی کے ساتھ ایک لمبی چوڑی تاریخ بھی لگی ہوئی ہوتی اور اس کی تلاوت بھی لازم کر دی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، وہ اس کتاب کے مقصد و مُدّعا سے صرف نابلد ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ یہ کتاب محض علمِ تاریخ اور فلسفۂ عمران کے طَلَبَہ ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ترتیبِ قرآن کے سلسلے میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہو جانی چاہیے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی ہُوئی نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے قرآن کو اس طرح مُرتَّب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سُورت نازل ہوتی تو آپؐ اُسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بُلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلم بند کرانے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ یہ سُورت فُلاں سُورہ کے بعد اور فُلاں سُورہ سے پہلے رکھی جائے۔ اسی طرح اگر قرآن کا کوئی ایسا حصّہ نازل ہوتا جس کو مستقل سُورت بنانا پیشِ نظر نہ ہوتا، تو آپؐ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اسے فُلاں سُورَہ میں فُلاں مَقام پر درج کیا جائے۔ پھر اسی ترتیب سے آپؐ خود بھی نماز میں اور دُوسرے مواقع پر قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق صحابۂ کرامؓ بھی اس کو یاد کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک ثابت شُدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید کا نُزُول جس روز مکمّل ہُوا اُسی روز اس کی ترتیب بھی مکمّل ہو گئی۔ جو اُس کا نازِل کرنے والا تھا، وہی اس کا مُرتَّب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا، اُسی کے ہاتھوں اسے مُرتَّب بھی کرا دیا گیا۔ کسی دُوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔

چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمانوں پر فرض تھی[1]، اور تلاوتِ قرآن کو نماز کا ایک ضروری جُز قرار دیا گیا تھا، اس لیے نزولِ قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظِ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا اور جیسے جیسے قرآن اُترتا گیا، مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف کھجور کے اُن پتّوں اور ہڈّی اور جھلّی کے اُن ٹکڑوں ہی پر نہ تھا جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے کاتبوں سے اس کو قلم بند کرایا کرتے تھے، بلکہ وہ اُترتے ہی بیسیوں، پھر سیکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان ہی نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ کا بھی ردّ و بدل کر سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب عرب میں اِرتداد کا طوفان اُٹھا اور اس کے فرو کرنے کے لیے صحابۂ کرامؓ کو سخت خوں ریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، تو ان معرکوں میں ایسے صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد شہید ہو گئی جن کو پُورا قرآن حفظ تھا۔ اِس سے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہُوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعے پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں ہے، بلکہ الواحِ قلب کے ساتھ ساتھ صفحاتِ قِرطاس پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کی ضرورت انھوں نے حضرت ابوبکرؓ پر واضح کی اور انھوں نے کچھ تأمُّل کے بعد اس سے اتفاق کر کے حضرت زیدؓ بن ثابت انصاری کو، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب (سیکرٹری) رہ چکے تھے، اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ تمام لکھے ہوئے اجزا فراہم کر لیے جائیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑے ہیں، دُوسری طرف صحابۂ کرامؓ میں سے بھی جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصّہ لکھا ہوا ملے، وہ ان سے لے لیا جائے[2]، اور پھر حُفّاظِ قرآن سے بھی مدد لی جائے، اور ان تینوں ذرائع کی مُتّفِقہ شہادت پر، کامل صحّت کا اطمینان کرنے کے بعد، قرآن کا ایک ایک لفظ مُصحَف میں ثَبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآنِ مجید کا ایک مُستند نسخہ تیار کر کے اُمّ المومنین حضرت حَفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رکھوا دیا گیا

---

[1] واضح رہے کہ پنج وقتہ نماز تو بِعثَت کے کئی سال بعد فرض ہوئی، لیکن نماز بجائے خود اوّل روز ہی سے فرض تھی۔ اسلام کی کوئی ساعت بھی ایسی نہیں گزری ہے جس میں نماز فرض نہ ہو۔

[2] معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعدد صحابہؓ نے قرآن کو یا اس کے مختلف اجزا کو اپنے پاس قلم بند کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرات عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، سالم مَولیٰ حُذَیفہ، زید بن ثابت، مُعاذ بن جَبَل، اُبَیّ بن کَعب اور ابوزید قیس بن السَّکَن رضی اللہ عنہم کے ناموں کی تصریح ملتی ہے۔

اور لوگوں کو عام اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کرے اور جو چاہے اِس سے مقابلہ کر کے اپنے نسخے کی تصحیح کر لے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں ویسے ہی فرق پائے جاتے تھے جیسے ہمارے مُلک میں شہر شہر کی بولی اور ضلع ضلع کی بولی میں فرق ہے، حالانکہ زبان سب کی وہی ایک اُردو یا پنجابی یا بنگالی وغیرہ ہے۔ قرآنِ مجید اگرچہ نازل اُس زبان میں ہُوا تھا جو مکّے میں قریش کے لوگ بولتے تھے، لیکن ابتداءً اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ دُوسرے علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق اسے پڑھ لیا کریں، کیونکہ اس طرح معنیٰ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، صرف عبارت اُن کے لیے ملائم ہو جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر دُنیا کے ایک بڑے حصّے کو فتح کر لیا، اور دُوسری قوموں کے لوگ بھی دائرۂ اسلام میں آنے لگے، اور بڑے پیمانے پر عرب وعجم کے اِختلاط سے عربی زبان متأثّر ہونے لگی، تو یہ اندیشہ پیدا ہُوا کہ اگر اب بھی دُوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کسی دُوسرے شخص کو غیر مانوس طریقے پر کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے سُنے گا اور یہ سمجھ کر اس سے لڑ پڑے گا کہ وہ دانستہ کلامِ الٰہی میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ کہ یہ لفظی اختلافات رفتہ رفتہ واقعی تحریفات کا دروازہ کھول دیں گے۔ یا یہ کہ عرب وعجم کے اختلاط سے جن لوگوں کی زبان بگڑے گی، وہ اپنی بگڑی ہوئی زبان کے مطابق قرآن میں تصرّف کر کے اس کے حُسنِ کلام کو بگاڑ دیں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں صرف اُس معیاری نسخۂ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا، اور باقی تمام دُوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مَصاحِف کی اشاعت ممنوع قرار دے دی جائے۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ٹھیک ٹھیک اُسی مُصحَفِ صدّیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام دیار و امصار میں بھجوائی تھیں۔ اِس وقت بھی دُنیا میں متعدّد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ کسی کو اگر قرآن کی محفوظیّت میں ذرّہ برابر بھی شک ہو تو وہ اپنا اطمینان اس

طرح کر سکتا ہے کہ مغربی افریقا میں کسی کتاب فروش سے قرآن کا ایک نسخہ خریدے، اور جاوا میں کسی حافظ سے زبانی قرآن سُن کر اس کا مقابلہ کرے، اور پھر دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں حضرت عثمانؓ کے وقت سے لے کر آج تک مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے جو مَصاحِف رکھے ہیں ان سے اس کا تقابُل کر لے۔ اگر کسی حرف یا شوشے کا فرق وہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ دُنیا کو اس سب سے بڑے تاریخی انکشاف سے ضرور مُطّلَع کرے۔ کوئی شک نواز قرآن کے مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے، یہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی قرآن ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یہ تو ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی دُوسری چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس قدر قطعی الثُّبوت ہو۔ اگر کوئی شخص اس کی صحت میں شک کرتا ہے تو وہ پھر اس میں بھی شک کر سکتا ہے کہ رومن امپائر نامی کوئی سلطنت دُنیا میں رہ چکی ہے، اور کبھی مغل ہندوستان پر حکومت کر چکے ہیں، اور ”نپولین“ نام کا کوئی شخص بھی دنیا میں پایا گیا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حقائق پر شکوک کا اظہار کرنا علم کا نہیں، جہالت کا ثبوت ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف دُنیا میں بے شمار انسان بے شمار مقاصد لے کر رُجوع کرتے ہیں۔ ان سب کی ضروریات اور اغراض کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی مشورہ دینا آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طالبوں کے اس ہُجوم میں مجھ کو صرف ان لوگوں سے دلچسپی ہے جو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ یہ کتاب انسان کے مسائلِ زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں یہاں طریقِ مطالعۂ قرآن کے بارے میں کچھ مشورے دُوں گا اور کچھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کروں گا جو بالعُموم انسان کو اس معاملے میں پیش آتی ہیں۔

کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہر حال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اوّلیں کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصوُّرات اور نظریات سے، اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کر لے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کُھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں، وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں، قرآن کی اُن کو ہَوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ یہ طریقِ مطالعہ کسی کتاب کو پڑھنے

کے لیے بھی صحیح نہیں ہے، مگر خصُوصیّت کے ساتھ قرآن تو اس طرز کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے مَعانی کے دروازے کھولتا ہی نہیں۔

پھر جو شخص محض سرسری سی واقفیّت بہم پہنچانا چاہتا ہو، اُس کے لیے تو شاید ایک دفعہ پڑھ لینا کافی ہو جائے، لیکن جو اس کی گہرائیوں میں اُترنا چاہے اس کے لیے دو چار دفعہ کا پڑھنا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کو بار بار پڑھنا چاہیے، ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنا چاہیے، اور ایک طالبِ علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہیے، تاکہ ضروری نِکات نوٹ کرتا جائے۔ اِس طرح جو لوگ پڑھنے پر آمادہ ہوں، اُن کو کم از کم دو مرتبہ پُورے قرآن کو صرف اس غرض کے لیے پڑھنا چاہیے کہ ان کے سامنے بحیثیتِ مجموعی وہ پُورا نظامِ فکر و عمل آ جائے جسے یہ کتاب پیش کرنا چاہتی ہے۔ اِس ابتدائی مطالعے کے دَوران میں وہ قرآن کے پُورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ یہ کتاب کیا بُنیادی تصوُّرات پیش کرتی ہے اور پھر ان تصوُّرات پر کس قسم کا نظامِ زندگی تعمیر کرتی ہے۔ اِس اثنا میں اگر کسی مَقام پر کوئی سوال ذہن میں کھٹکے تو اس پر وہیں اُسی وقت کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں بلکہ اسے نوٹ کر لیں اور صبر کے ساتھ آگے مطالعہ جاری رکھیں۔ اغلب یہ ہے کہ آگے کہیں نہ کہیں انھیں اس کا جواب مِل جائے گا۔ اگر جواب مل جائے تو اپنے سُوال کے ساتھ اسے نوٹ کر لیں۔ لیکن اگر پہلے مطالعے کے دَوران میں انھیں اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملے تو صبر کے ساتھ دُوسری بار پڑھیں۔ مَیں اپنے تجرِبے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ دُوسری بار کے غائر مطالعے میں شاذ و نادر ہی کوئی سوال جواب طلب باقی رہ جاتا ہے۔

اِس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کر لینے کے بعد تفصیلی مطالعے کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ناظر کو تعلیماتِ قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ مثلاً وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسانیّت کا کون سا نمونہ ہے جسے قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور کس نمونے کے انسان اس کے نزدیک مبغوض و مردُود ہیں۔ اس مضمُون کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لانے کے لیے اس کو چاہیے کہ اپنی کاپی پر ایک طرف ”پسندیدہ انسان“ اور دُوسری طرف ”ناپسندیدہ انسان“ کی خصُوصیّات آمنے سامنے نوٹ کرتا چلا جائے۔ یا مثلاً وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فلاح و نجات کا مدار کن اُمُور پر ہے، اور کیا چیزیں ہیں جن کو وہ انسان کے لیے نقصان اور ہلاکت اور بربادی کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس مضمون کو بھی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ

جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کاپی پر ”مُوجباتِ فلاح“ اور ”مُوجباتِ خُسران“ کے دوعنوانات ایک دُوسرے کے مقابل قائم کر لے اور مطالعۂ قرآن کے دَوران میں روزانہ دونوں قسم کی چیزوں کو نوٹ کرتا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس عقائد، اَخلاق، حُقوق، فرائض، معاشرت، تمدُّن، معیشت، سیاست، قانون، نظمِ جماعت، صلح، جنگ، اور دُوسرے مسائلِ زندگی میں سے ایک ایک کے متعلّق قرآن کی ہدایات کو آدمی نوٹ کرتا چلا جائے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ ان میں سے ہر ہر شعبے کی مجموعی شکل کیا بنتی ہے اور پھر ان سب کو ملا کر جوڑ دینے سے پُورا نقشۂ زندگی کس قسم کا بنتا ہے۔

پھر جب آدمی کسی خاص مسئلۂ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے کہ قرآن کا نقطۂ نظر اس کے متعلّق کیا ہے، تو اس کے لیے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اس مسئلے کے متعلّق قدیم و جدید لٹریچر کا گہرا مطالعہ کر کے واضح طور پر یہ معلوم کر لے کہ اس مسئلے کے بُنیادی نِکات کیا ہیں، انسان نے اب تک اس پر کیا سوچا اور سمجھا ہے، کیا اُمور اس میں تصفیہ طلب ہیں، اور کہاں جا کر انسانی فکر کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اس کے بعد انھی تصفیہ طلب مسائل کو نگاہ میں رکھ کر آدمی کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح جب آدمی کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسی ایسی آیتوں میں اپنے سوالات کا جواب ملتا ہے جنھیں وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوتا ہے اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہاں یہ مضمون بھی چھپا ہُوا ہے۔

لیکن فہمِ قرآن کی اِن ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی رُوح سے پُوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریّات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصوُّرِ مذہب کے مطابق ایک نِری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رُمُوز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدِمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پِھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اُٹھوائی اور وقت کے عَلَم برداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک

سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پُکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گُسل کش مکش کے دَوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیّت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہُوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پُوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت اِلَی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُس طرح قدم اُٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجرِبات آپ کو پیش آئیں گے جو نزُولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکّے اور حَبَش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحُد سے لے کر حُنَین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابُوجہل اور ابُولَہَب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہُود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقینِ اوّلین سے لے کر مُؤَلَّفۃُ القُلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اَور ہی قسم کا ’’سُلوک‘‘ ہے، جس کو میں ’’سُلُوکِ قرآنی‘‘ کہتا ہوں۔ اِس سُلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اور نَحو اور معانی اور بیان کے کچھ نِکات سالک کی نگاہ سے چھُپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بُخل برت جائے۔

پھر اسی کُلیّے کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اَخلاقی تعلیمات، اس کی مَعاشی اور تمدّنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصُول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے

ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی رَوِش کے خلاف چل رہے ہوں۔

قرآن کے اس دعوے سے ہر کہ و مہ واقف ہے کہ وہ تمام نَوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا رُوئے سُخَن زیادہ تر اپنے زمانۂ نُزُول کے اہلِ عرب کی طرف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بنی آدم اور عامۃ النّاس کو بھی پکارتا ہے، لیکن اکثر باتیں وہ ایسی کہتا ہے جو عرب کے مذاق، عرب ہی کے ماحول، عرب ہی کی تاریخ، اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلّق رکھتی ہیں۔ اِن چیزوں کو دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ جو چیز عام انسانوں کی ہدایت کے لیے اُتاری گئی تھی اس میں وقتی اور مقامی اور قومی عُنصر اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ چیز اصل میں تو اپنے ہم عصر اہلِ عرب ہی کی اصلاح کے لیے تھی، لیکن بعد میں زبردستی کھینچ تان کر اسے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے کتابِ ہدایت قرار دے دیا گیا۔

جو شخص یہ اعتراض محض اعتراض کی خاطر نہیں اُٹھاتا، بلکہ فی الواقع اسے سمجھنا چاہتا ہے، اُسے مَیں مشورہ دُوں گا کہ وہ پہلے خود قرآن کو پڑھ کر ذرا اُن مَقامات پر نشان لگائے جہاں اُس نے کوئی ایسا عقیدہ، یا خیال، یا تصوُّر پیش کیا ہو، یا کوئی ایسا اَخلاقی اُصُول، یا عَملی قاعدہ و ضابطہ بیان کیا ہو جو صرف عرب ہی کے لیے مخصُوص ہو، اور جس کو وقت اور زمانے اور مقام نے فی الواقع محدُود کر رکھا ہو۔ محض یہ بات کہ وہ ایک خاص مقام اور زمانے کے لوگوں کو خطاب کر کے ان کے مُشرکانہ عقائد اور رُسُوم کی تردید کرتا ہے، اور انھی کے گرد و پیش کی چیزوں کو موادِ اِستدلال کے طور پر لے کر توحید کے دلائل قائم کرتا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی دعوت اور اس کا اپیل بھی وقتی اور مقامی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شرک کی تردید میں جو کچھ وہ کہتا ہے کیا وہ دُنیا کے ہر شرک پر اُسی طرح چسپاں نہیں ہوتا جس طرح مُشرکینِ عرب کے شرک پر چسپاں ہوتا تھا؟ کیا انھی دلائل کو ہم ہر زمانے اور ہر ملک کے مشرکین کی اصلاحِ خیال کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟ اور کیا اثباتِ توحید کے لیے قرآن کے طرزِ اِستدلال کو تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ کام میں نہیں لایا جا سکتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک عالَم گیر تعلیم کو صرف اس بنا پر وقتی و مقامی قرار دیا جائے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص قوم کو

خطاب کر کے وہ پیش کی گئی تھی۔ دُنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظامِ زندگی اور کوئی مذہبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کی ساری باتیں از اوّل تا آخر تجریدی (abstract) طرزِ بیان میں پیش کی گئی ہوں اور کسی متعیّن حالت یا صُورت پر اس کو چسپاں کر کے اُن کی توضیح نہ کی گئی ہو۔ ایسی مکمّل تجرید اوّل تو ممکن نہیں ہے، اور ممکن ہو بھی تو جو چیز اِس طریقے پر پیش کی جائے گی وہ صرف صفحۂ کاغذ ہی پر رہ جائے گی، انسانوں کی زندگی میں اس کا جذب ہو کر ایک عملی نظام میں تبدیل ہونا محال ہے۔

پھر کسی فکری و اَخلاقی اور تمدّنی تحریک کو اگر بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانا مقصُود ہو، تو اس کے لیے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مفید بھی نہیں ہے، کہ شروع سے اس کو بالکل ہی بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت اس کا صحیح عملی طریقہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن افکار اور نظریّات اور اُصُولوں پر وہ تحریک انسانی زندگی کے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے، انھیں پُوری قوّت کے ساتھ خود اُس مُلک میں پیش کیا جائے جہاں سے اس کی دعوت اُٹھی ہو، اُن لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے جن کی زبان اور مزاج اور عادات و خصائل سے اس تحریک کے داعی بخوبی واقف ہوں، اور پھر اپنے ہی ملک میں ان اُصُولوں کو عملاً برت کر اور ان پر ایک کامیاب نظامِ زندگی چلا کر دُنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا جائے۔ تبھی دُوسری قومیں اس کی طرف توجّہ کریں گی اور ان کے ذہین آدمی خود آگے بڑھ کر اسے سمجھنے اور اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ لٰہذا محض یہ بات کہ کسی نظامِ فکر و عمل کو ابتداءً ایک ہی قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور اِستِدلال کا سارا زور اسی کو سمجھانے اور مطمئن کرنے پر صَرف کر دیا گیا تھا، اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نظامِ فکر و عمل محض قومی ہے۔ فی الواقع جو خُصُوصیّات ایک قومی نظام کو ایک بین الاقوامی نظام سے اور ایک وقتی نظام کو ایک اَبدی نظام سے مُمیّز کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قومی نظام یا تو ایک قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حُقوق کا مدّعی ہوتا ہے، یا اپنے اندر کچھ ایسے اُصُول اور نظریّات رکھتا ہے جو دُوسری اقوام میں نہیں چل سکتے۔ اس کے برعکس جو نظام بین الاقوامی ہوتا ہے، وہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ اور برابر کے حُقوق دینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور اُس کے اُصُولوں میں بھی عالم گیریّت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقتی نظام لازمی طور پر اپنی بُنیاد کچھ ایسے اُصُولوں پر رکھتا ہے جو زمانے کی چند پلٹیوں کے بعد صریحاً ناقابلِ عمل ہو جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک

ابدی نظام کے اُصُول تمام بدلتے ہوئے حالات پر منطبق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان خُصُوصیّات کو نگاہ میں رکھ کر کوئی شخص خود قرآن کو پڑھے اور اُن چیزوں کو ذرا متعیّن کرنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر واقعی یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ قرآن کا پیش کردہ نظام وقتی اور قومی ہے۔

قرآن کے متعلّق یہ بات بھی ایک عام ناظر کے کان میں پڑی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ایک مفصّل ہدایت نامہ اور ایک کتابِ آئین ہے۔ مگر جب وہ اسے پڑھتا ہے تو اس میں معاشرت اور تمدّن اور سیاست اور معیشت وغیرہ کے تفصیلی احکام وضوابط اس کو نہیں ملتے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے متعلق بھی، جن پر قرآن بار بار اِس قدر زور دیتا ہے، اس نے کوئی ایسا ضابطہ تجویز نہیں کیا ہے جس میں تمام ضروری احکام کی تفصیل درج ہو۔ یہ چیز بھی آدمی کے ذہن میں خَلجان پیدا کرتی ہے کہ آخر یہ کس معنیٰ میں ہدایت نامہ ہے۔

اس معاملے میں ساری اُلجھن صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہ سے حقیقت کا ایک پہلو بالکل اوجھل رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبرؐ بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اگر اصل اسکیم یہ ہو کہ بس ایک نقشۂ تعمیر لوگوں کو دے دیا جائے اور لوگ اس کے مطابق خود عمارت بنا لیں، تو اس صورت میں بلاشبہ تعمیر کے ایک ایک جُز کی تفصیل ہم کو ملنی چاہیے۔ لیکن جب تعمیری ہدایات کے ساتھ ایک انجینیر بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دے، تو پھر انجینیر اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو نظر انداز کر کے صرف نقشے ہی میں تمام جُزئیات کی تفصیل تلاش کرنا، اور پھر اسے نہ پا کر نقشے کی ناتمامی کا شکوہ کرنا غلط ہے۔ قرآن جُزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اُصُول اور کُلّیات کی کتاب ہے۔ اُس کا اصل کام یہ ہے کہ نظامِ اسلامی کی فکری اور اَخلاقی بنیادوں کو پُوری وضاحت کے ساتھ نہ صرف پیش کرے بلکہ عقلی استدلال اور جذباتی اپیل، دونوں کے ذریعے سے خوب مستحکم بھی کر دے۔ اب رہی اسلامی زندگی کی عملی صُورت، تو اس معاملے میں وہ انسان کی رہنمائی اس طریقے سے نہیں کرتا کہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلّق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتائے، بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حُدُودِ اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے، جو اس بات کا تعیّن کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اِن شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر

ہونی چاہیے۔ اِن ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صُورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ اُنھیں مامور ہی اِس لیے کیا گیا تھا کہ دُنیا کو اُس انفرادی سیرت و کردار اور اُس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھادیں جو قرآن کے دیے ہوئے اُصُولوں کی عملی تعبیر وتفسیر ہو۔

ایک اور سوال جو بالعُموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن اُن لوگوں کی انتہائی مَذمّت کرتا ہے جو کتابُ اللہ کے آجانے کے بعد تفرِقے اور اختلاف میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اور دُوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر وتفسیر میں صرف مُتأخّرین ہی نہیں، ائمہ اور تابعین اور خود صحابہؓ تک کے درمیان اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی احکامی آیت ایسی نہ ملے گی جس کی ایک تفسیر بالکل مُتَّفَق عَلَیْہ ہو۔ کیا یہ سب لوگ اُس مَذمّت کے مِصداق ہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ کون سا تَفرِقہ واختلاف ہے جس سے قرآن منع کرتا ہے؟

یہ ایک نہایت وسیع الاطراف مسئلہ ہے جس پر مفصّل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں قرآن کے ایک عامی طالبِ علم کی اُلجھن دُور کرنے کے لیے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ قرآن اُس صحّت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظامِ جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام وقوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مَذمّت اُس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی ونزاعِ باہمی تک نوبت پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دُوسرے سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی رُوح ہے۔ وہ ہر اُس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل وفکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہوسکتی ہے جو ذہین انسانوں سے نہیں بلکہ لکڑی کے کُندوں سے مُرَکّب ہو۔ رہا دُوسری قسم کا اختلاف، تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اُٹھایا اُس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رُونما ہونا صحت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اور اس کے نتائج کبھی کسی اُمّت کے حق میں بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

ان دونوں قسم کے اختلافات کا فرق واضح طور پر یوں سمجھیے کہ:

ایک صُورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسُولؑ کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنّت کو مانا جائے، اور پھر دو عالم کسی جُزوی مسئلے کی تحقیق میں، یا دو قاضی کسی مقدّمے کے فیصلے میں ایک دُوسرے سے اختلاف کریں، مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو، اور اس میں اپنی رائے کو مدارِ دین بنائے اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کر دیں، اور یہ بات رائے عام پر، یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظامِ جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صُورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بُنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے، یا یہ کہ کوئی عالم یا صُوفی یا مُفتی یا مُتکلّم یا لیڈر کسی ایسے مسئلے میں جس کو خدا اور رسُول نے دین کا بُنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا، ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو دین کا بُنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اس سے اختلاف کرے اس کو خارج از دین و ملّت قرار دے، اور اپنے حامیوں کا ایک جتھا بنا کر کہے کہ اصل اُمّتِ مُسلِمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنّمی ہیں، اور ہانک پُکار کر کہے کہ مُسلِم ہے تو بس اس جتّھے میں آ جا ورنہ تو مُسلِم ہی نہیں ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے، اُس سے اس کی مراد یہ دُوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف، تو اس کی متعدّد مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آ چکی تھیں، اور آپؐ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا، بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اس لیے کہ وہ اختلاف تو اس بات کا پتا دیتا ہے کہ جماعت میں غور و فکر اور تحقیق و تجسُّس اور فہم و تَفَقُّہ کی صلاحیّتیں موجود ہیں، اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اس کے احکام سے دلچسپی ہے، اور ان کی ذہانتیں اپنے مسائلِ زندگی کا حل دین کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں، اور جماعت بحیثیتِ مجموعی اِس زرّیں قاعدے پر عامل ہے کہ اُصُول میں متفق رہ کر اپنی وحدت برقرار رکھے اور پھر اپنے اہلِ علم و فکر کو صحیح حُدُود کے اندر تحقیق و اجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ ، علیہ توکلت والیہ انیب

اس مُقدّمے میں تمام اُن مسائل کا اِستِقصا کرنا میرے پیشِ نظر نہیں ہے جو مطالعۂ قرآن کے دَوران میں ایک ناظر کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوالات کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی آیت یا سُورت کے سامنے آنے پر ذہن کو کھٹکتا ہے، اور اس کا جواب تفہیمُ القرآن میں برسرِ موقع دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے سوالات کو چھوڑ کر مَیں نے یہاں صرف اُن جامع مسائل سے بحث کی ہے جو بحیثیتِ مجموعی پُورے قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرینِ کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدّمے کو دیکھ کر ہی اس کے تِشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کر دیں، بلکہ پُوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں، یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مُطّلع فرمائیں۔

تفہیم القرآن

الفاتحہ ——— (۱)

و

البقرہ ——— (۲)

الفاتحہ

نام اِس کا نام ”الفاتحہ“ اِس کے مضمون کی مناسبت سے ہے۔ ”فاتحہ“ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون، یا کتاب، یا کسی شے کا افتتاح ہو۔ دُوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ نام ”دیباچہ“ اور آغازِ کلام کا ہم معنٰی ہے۔

زمانۂ نزول یہ نبوّتِ محمدیؐ کے بالکل ابتدائی زمانے کی سُورت ہے۔ بلکہ معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمّل سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ یہی ہے۔ اِس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سُورۂ عَلَق، سُورۂ مُزّمّل اور سورۂ مُدّثّر وغیرہ میں شامل ہیں۔

مضمون دراصل یہ سُورہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہراُس انسان کو سکھائی ہے جو اس کی کتاب کا مُطالَعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوندِ عالَم سے یہ دعا کرو۔

انسان فطرتاً دُعا اُسی چیز کی کیا کرتا ہے جس کی طلب اور خواہش اس کے دل میں ہوتی ہے، اور اُسی صورت میں کرتا ہے جب کہ اُسے یہ احساس ہو کہ اس کی مطلوب چیز اُس ہستی کے اختیار میں ہے جس سے وہ دُعا کر رہا ہے۔ پس قرآن کی ابتدا میں اِس دُعا کی تعلیم دے کر گویا انسان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو راہِ راست کی جستجو کے لیے پڑھے، طالبِ حق کی سی ذہنیت لے کر پڑھے، اور یہ جان لے کہ علم کا سرچشمہ خداوندِ عالَم ہے، اس لیے اُسی سے رہنمائی کی درخواست کر کے پڑھنے کا آغاز کرے۔

اِس مضمون کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور سورۂ فاتحہ کے درمیان حقیقی تعلق کتاب اور اس کے مُقدّمے کا سا نہیں بلکہ دُعا اور جوابِ دُعا کا سا ہے۔ سُورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے، اور قرآن اُس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے پروردگار! میری رہنمائی کر۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے۔

آیاتها ۷ رکوعاتها ۱

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ

المنزل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم[1] ہے۔

تعریف اللہ ہی کے لیے[2] ہے جو تمام کائنات کا رب[3] ہے، رحمٰن اور رحیم[4] ہے،

---

۱ - اِسلام جو تہذیب انسان کو سکھاتا ہے، اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہر کام کی ابتدا خدا کے نام سے کرے۔ اِس قاعدے کی پابندی اگر شعور اور خلوص کے ساتھ کی جائے تو اس سے لازماً تین فائدے حاصل ہوں گے: ایک یہ کہ آدمی بہت سے بُرے کاموں سے بچ جائے گا، کیونکہ خدا کا نام لینے کی عادت اُسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر خدا کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟ دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح اور نیک کاموں کی ابتدا کرتے ہوئے خدا کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سَمت اختیار کر لے گی اور وہ ہمیشہ صحیح ترین نقطے سے اپنی حرکت کا آغاز کرے گا۔ تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ خدا کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو خدا کی تائید اور توفیق اس کے شاملِ حال ہوگی، اس کی سعی میں برکت ڈالی جائے گی اور شیطان کی فساد انگیزیوں سے اُس کو بچایا جائے گا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب بندہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ بھی بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔

۲ - جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، سُورۂ فاتحہ اصل میں تو ایک دُعا ہے، لیکن دُعا کی ابتدا اس ہستی کی تعریف سے کی جا رہی ہے جس سے ہم دُعا مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا اس امر کی تعلیم ہے کہ دُعا جب مانگو تو مہذب طریقے سے مانگو۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ منہ کھولتے ہی جھٹ اپنا مطلب پیش کر دیا۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ جس سے دُعا کر رہے ہو، پہلے اُس کی خوبی کا، اس کے احسانات اور اس کے مرتبے کا اعتراف کرو۔

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں، دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں: ایک، یہ کہ وہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو، قطعِ نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دُوسرے، یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رَطب اللّسان ہوں۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لیے ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ ”تعریف اللہ ہی“ کے لیے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے، اور وہ حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں، جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے، اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ

روزِ جزا کا مالک[5] ہے۔

ہم تیری ہی[6] عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں[7]۔

ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی دیوتا، کسی سیارے، غرض کسی مخلوق کا کمال بھی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عَطِیّہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند اور شکر گزار، نیاز مند اور خدمت گار بنیں، تو وہ خالقِ کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال۔

۳- ربّ کا لفظ عربی زبان میں تین معنوں میں بولا جاتا ہے: (۱) مالک اور آقا۔ (۲) مُرَبّی، پرورش کرنے والا، خبر گیری اور نگہبانی کرنے والا۔ (۳) فرمانروا، حاکم، مدبّر اور منتظم۔ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے۔

۴- انسان کا خاصّہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغے کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے، اور اگر ایک مبالغے کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا، تو پھر وہ اسی معنیٰ کا ایک اَور لفظ بولتا ہے، تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغے میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغے کا صیغہ ہے۔ لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حد وحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغے کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لیے اس کی فراوانی کا حق ادا کرنے کے لیے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ”سخی“ کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ”داتا“ کا اضافہ کرتے ہیں۔ رنگ کی تعریف میں جب ”گورے“ کو کافی نہیں پاتے تو اس پر ”چِٹّے“ کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازیِ قد کے ذکر میں جب ”لمبا“ کہنے سے تسلّی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ”تڑنگا“ بھی کہتے ہیں۔

۵- یعنی اُس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامۂ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن اور رحیم کہنے کے بعد مالکِ روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ بڑا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ مُنصف بھی ہے، اور منصف بھی ایسا بااختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا، نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی رُبُوبیّت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبّت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور بُرائی بالکلیّہ اُسی کے اختیار میں ہے۔

۶- عبادت کا لفظ بھی عربی زبان میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) پُوجا اور پرستش۔ (۲) اطاعت اور

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ع

۱ ع ۷

ہمیں سیدھا راستہ دکھا[۸]، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا[۹]، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں[۱۰]۔ ع

فرماں برداری۔ (۳) بندگی اور غلامی۔ اس مقام پر تینوں معنیٰ بیک وقت مراد ہیں۔ یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیعِ فرمان بھی اور بندہ و غلام بھی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تیرے ساتھ یہ تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ تعلق صرف تیرے ہی ساتھ ہے۔ اِن تینوں معنوں میں سے کسی معنیٰ میں بھی کوئی دوسرا ہمارا معبُود نہیں ہے۔

۷- یعنی تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت ہی کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تُو ہی ہے، اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے، اس لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رُجوع کرتے ہیں، تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی یہ درخواست لے کر تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔

۸- یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو، جس میں غلط بینی اور غلط کاری اور بد انجامی کا خطرہ نہ ہو، جس پر چل کر ہم سچّی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں —— یہ ہے وہ درخواست جو قرآن کا مُطالَعَہ شروع کرتے ہوئے بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے۔ اس کی گزارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بُھلَیّاں میں حقیقتِ نفس الامری کیا ہے، اَخلاق کے ان مختلف نظریات میں صحیح نظامِ اَخلاق کون سا ہے، زندگی کی اِن بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی سیدھی اور صاف شاہراہ کون سی ہے۔

۹- یہ اُس سیدھے راستے کی تعریف ہے جس کا علم ہم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں۔ یعنی وہ راستہ جس پر ہمیشہ سے تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں۔ وہ بے خطا راستہ کہ قدیم ترین زمانے سے آج تک جو شخص اور جو گروہ بھی اس پر چلا، وہ تیرے انعامات کا مستحق ہوا اور تیری نعمتوں سے مالا مال ہو کر رہا۔

۱۰- یعنی ”انعام“ پانے والوں سے ہماری مراد وہ لوگ نہیں ہیں جو بظاہر عارضی طور پر تیری دُنیوی نعمتوں سے سرفراز تو ہوتے ہیں مگر دراصل وہ تیرے غضب کے مستحق ہُوا کرتے ہیں اور اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سلبی تشریح سے یہ بات خود کھل جاتی ہے کہ ”انعام“ سے ہماری مراد حقیقی اور پائدار انعامات ہیں جو راست روی اور خدا کی خوشنودی کے نتیجے میں ملا کرتے ہیں، نہ کہ وہ عارضی اور نمایشی انعامات جو پہلے بھی فرعونوں اور نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو ملے ہوئے ہیں۔

اَلبَقَرَہ

نام اور وجہ تسمیہ اِس سورت کا نام ”بقرہ“ اِس لیے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر آیا ہے۔ قرآنِ مجید کی ہر سورت میں اس قدر وسیع مضامین بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لیے مضمون کے لحاظ سے جامع عنوانات تجویز نہیں کیے جا سکتے۔ عربی زبان اگرچہ اپنی لغت کے اعتبار سے نہایت مال دار ہے، مگر بہرحال ہے تو انسانی زبان ہی۔ انسان جو زبانیں بھی بولتا ہے وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ وہ ایسے الفاظ یا فقرے فراہم نہیں کر سکتیں جو ان وسیع مضامین کے لیے جامع عنوان بن سکتے ہوں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے قرآن کی بیشتر سُورتوں کے لیے عنوانات کے بجائے نام تجویز فرمائے جو محض علامت کا کام دیتے ہیں۔ اس سُورت کو بقرہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں گائے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ”وہ سورت جس میں گائے کا ذکر آیا ہے۔“

زمانۂ نزول اِس سُورت کا بیشتر حصّہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مَدَنی زندگی کے بالکل ابتدائی دَور میں نازل ہوا ہے، اور کمتر حصّہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبتِ مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ سُود کی مُمانعت کے سلسلے میں جو آیات نازل ہوئی ہیں، وہ بھی اس میں شامل ہیں، حالانکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانے میں اُتری تھیں۔ سورت کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے، وہ ہجرت سے پہلے مکے میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے ان کو بھی اِسی سورت میں ضم کر دیا گیا ہے۔

شانِ نزول اِس سورت کو سمجھنے کے لیے پہلے اِس کا تاریخی پَس منظر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

(۱) ہجرت سے قبل جب تک مکے میں اسلام کی دعوت دی جاتی رہی، خطاب بیشتر مشرکینِ عرب سے تھا، جن کے لیے اسلام کی آواز ایک نئی اور غیر مانوس آواز تھی۔ اب ہجرت کے بعد سابقہ یہودیوں سے پیش آیا جن کی بستیاں مدینے سے بالکل متّصل ہی واقع تھیں۔ یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس ضابطۂ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی طرف سے اُن کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اُصولاً اُن کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ لیکن صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دور ہٹا دیا[1] تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے تورات میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں بکثرت ایسے رُسوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے تورات میں کوئی ثبوت نہ تھا۔ خود تورات کو اُنھوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط

---

[1] اس وقت حضرت موسیٰؑ کو گزرے ہوئے تقریباً ۱۹ صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰؑ نے ۱۲۷۲ قبلِ مسیح میں وفات پائی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶۱۰ بعدِ مسیح میں منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے۔

کر دیا تھا، اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معناً محفوظ تھا، اس کو بھی انھوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی رُوح ان میں سے نِکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیّت کا محض ایک بے جان ڈھانچا باقی تھا جس کو وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے علما اور مشائخ، ان کے سردارانِ قوم اور ان کے عوام، سب کی اعتقادی، اَخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی، اور اپنے اس بگاڑ سے ان کو ایسی مَحبّت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انھیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، مُوشگافیوں اور فرقہ بندیوں، اُستُخواں گیری دمغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام ”مسلم“ تک بُھول گئے تھے، محض ”یہُودی“ بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انھوں نے محض نسلِ اسرائیل کی آبائی وِراثَت بنا کر رکھ دیا تھا۔ پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اصل دین کی طرف دعوت دیں، چنانچہ سُورۂ بقرہ کے ابتدائی پندرہ سولہ رُکوع اسی دعوت پر مشتمل ہیں۔ ان میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کی اَخلاقی و مذہبی حالت پر جس طرح تنقید کی گئی ہے، اور جس طرح ان کے بگڑے ہوئے مذہب و اخلاق کی نمایاں خُصوصیات کے مقابلے میں حقیقی دین کے اُصُول پہلو بہ پہلو پیش کیے گئے ہیں، اس سے یہ بات بالکل آئینے کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایک پیغمبر کی اُمّت کے بگاڑ کی نوعیت کیا ہوتی ہے، رسمی دین داری کے مقابلے میں حقیقی دین داری کس چیز کا نام ہے، دینِ حق کے بنیادی اُصُول کیا ہیں، اور خدا کی نگاہ میں اصل اہمیّت کن چیزوں کی ہے۔

(۲) مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ مکے میں تو معاملہ صرف اُصُولِ دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تَربیَت تک محدُود تھا، مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بُنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدُّن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق بھی اُصولی ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظامِ زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔ اس سورت کے آخری ۲۳ رکوع زیادہ تر انھی ہدایات پر مشتمل ہیں، جن میں سے اکثر ابتدا ہی میں بھیج دی گئی تھیں اور بعض متفرق طور پر حسبِ ضرورت بعد میں بھیجی جاتی رہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد اسلام اور کفر کی کش مکش بھی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہجرت سے پہلے اسلام کی دعوت خود کفر کے گھر میں دی جا رہی تھی اور متفرق قبائل میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ رہ کر ہی دین کی تبلیغ کرتے اور جواب میں مصائب اور مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے۔ مگر ہجرت کے بعد جب یہ منتشر مسلمان مدینے میں جمع ہو کر ایک جتھا بن گئے اور اُنھوں نے ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم کر لی تو صورتِ حال یہ ہو گئی کہ ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی تھی اور دُوسری طرف تمام عرب اس کا اِستیصال کر دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ اب اِس مٹھی بھر جماعت کی کامیابی کا ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا انحصار بھی اس بات پر تھا

کہ اوّلاً، وہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے مسلک کی تبلیغ کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے۔ ثانیاً، وہ مخالفین کا برسرِ باطل ہونا اس طرح ثابت و مُبَرہَن کر دے کہ کسی ذی عقل انسان کو اس میں شبہ نہ رہے۔ ثالثاً، بے خانماں ہونے اور تمام ملک کی عداوت و مُزاحمت سے دوچار ہونے کی بنا پر فقر وفاقہ اور ہمہ وقت بے امنی و بے اطمینانی کی جو حالت ان پر طاری ہوگئی تھی اور جن خطرات میں وہ چاروں طرف سے گِھر گئے تھے، ان میں وہ ہراساں نہ ہوں، بلکہ پورے صبر وثبات کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے عزم میں ذرا تزلزل نہ آنے دیں۔ رابعاً، وہ پوری دلیری کے ساتھ ہر اس مسلّح مزاحمت کا مسلّح مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو ان کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے کسی طاقت کی طرف سے کی جائے، اور اس بات کی ذرا پروا نہ کریں کہ مخالفین کی تعداد اور ان کی مادی طاقت کتنی زیادہ ہے۔ خامساً، ان میں اتنی ہمت پیدا کی جائے کہ اگر عرب کے لوگ اس نئے نظام کو، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، فہمائش سے قبول نہ کریں، تو انھیں جاہلیت کے فاسد نظامِ زندگی کو بزور مٹا دینے میں بھی تأمّل نہ ہو ـــ اللہ تعالیٰ نے اِس سورت میں ان پانچوں اُمور کے متعلق ابتدائی ہدایات دی ہیں۔

(۴) دعوتِ اسلامی کے اس مرحلے میں ایک نیا عُنصر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا، اور یہ منافقین کا عُنصر تھا۔ اگرچہ نِفاق کے ابتدائی آثار مکے کے آخری زمانے میں بھی نمایاں ہونے لگے تھے، مگر وہاں صرف اس قسم کے منافق پائے جاتے تھے جو اسلام کے برحق ہونے کے تو معترف تھے اور ایمان کا اقرار بھی کرتے تھے، لیکن اس کے لیے تیار نہ تھے کہ اس حق کی خاطر اپنے مفاد کی قربانی اور اپنے دُنیوی تعلقات کا انقطاع اور اُن مصائب وشدائد کو بھی برداشت کر لیں جو اس مسلکِ حق کو قبول کرنے کے ساتھ ہی نازل ہونے شروع ہو جاتے تھے۔ مدینہ پہنچ کر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قِسموں کے منافق بھی اسلامی جماعت میں پائے جانے لگے۔ ایک قسم کے منافق وہ تھے جو قطعاً اسلام کے منکر تھے اور محض فتنہ برپا کرنے کے لیے جماعتِ مسلمین میں داخل ہو جاتے تھے۔ دوسری قسم کے منافق وہ تھے جو اسلامی جماعت کے دائرہ اقتدار میں گِھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے کہ ایک طرف مسلمانوں میں بھی اپنا شمار کرائیں اور دوسری طرف مخالفینِ اسلام سے بھی ربط رکھیں، تاکہ دونوں طرف کے فوائد سے مُتمتّع ہوں اور دونوں طرف کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان متردّد تھے۔ انھیں اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان نہ تھا۔ مگر چونکہ ان کے قبیلے یا خاندان کے بیشتر لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے یہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ شامل تھے جو امرِ حق ہونے کی حیثیت سے تو اسلام کے قائل ہو چکے تھے، مگر جاہلیت کے طریقے اور اَوہام اور رسمیں چھوڑنے اور اَخلاقی پابندیاں قبول کرنے اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے سے ان کا نفس انکار کرتا تھا۔

سورۂ بقرہ کے نُزول کے وقت ان مختلف اقسام کے منافقین کے ظہور کی محض ابتدا تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صرف اجمالی اشارات فرمائے ہیں۔ بعد میں جتنی جتنی اِن کی صفات اور حرکات نمایاں ہوتی گئیں، اُسی قدر تفصیل کے ساتھ بعد کی سورتوں میں ہر قسم کے منافقین کے متعلق ان کی نوعیت کے لحاظ سے الگ الگ ہدایات بھیجی گئیں۔

الجزء ۱

۲۸۶ آیاتہا

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ

۴۰ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚۛ فِيْهِ ۚۛ هُدًى معانقة ۱

الف، لام، میم۔[۱] یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔[۲] ہدایت ہے

---

[۱] یہ حُرُوفِ مُقَطَّعات قرآنِ مجید کی بعض سُورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں قرآنِ مجید نازل ہوا ہے، اُس دَور کے اسالیبِ بیان میں اِس طرح کے حُرُوفِ مُقَطَّعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعرا دونوں اِس اُسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلامِ جاہلیّت کے جو نمونے محفوظ ہیں، ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اِس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مُقَطَّعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعُموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنیٰ حُرُوف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی رِوایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنیٰ پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اُسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسّرین کے لیے ان کے معانی متعیّن کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حُرُوف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنیٰ نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی نَقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

[۲] اس کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ ”بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔“ مگر ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جتنی کتابیں اُمورِ مابعد الطبیعت اور حقائقِ ماورائے اِدراک سے بحث کرتی ہیں، وہ سب قیاس و گمان پر مبنی ہیں، اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے، خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سراسر علمِ حقیقت پر مبنی ہے، اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے، اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دُوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں۔

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿٣﴾ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

اُن پرہیزگار لوگوں کے[۳] لیے جو غیب پر ایمان لاتے[۴] ہیں، نماز قائم کرتے ہیں[۵]، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶]، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن)

۳- یعنی یہ کتاب ہے تو سراسر ہدایت و رہنمائی، مگر اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ آدمی ''پرہیزگار'' ہو۔ بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو۔ بُرائی سے بچنا چاہتا ہو۔ بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ رہے وہ لوگ، جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں، جنھیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو، یا جدھر خواہشِ نفس دھکیل دے، یا جدھر قدم اُٹھ جائیں، اسی طرف چل پڑتے ہوں، تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے۔

۴- یہ قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے دوسری شرط ہے۔ ''غیب'' سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے تجربہ و مُشاہدہ میں نہیں آتیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنّت، دوزخ وغیرہ۔ اِن حقیقتوں کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ نبیؐ ان کی خبر دے رہا ہے، ایمان بالغیب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار ہو، صرف وہی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ رہا وہ شخص جو ماننے کے لیے دیکھنے اور چکھنے اور سُونگھنے کی شرط لگائے، اور جو کہے کہ میں کسی ایسی چیز کو نہیں مان سکتا جو ناپی اور تولی نہ جا سکتی ہو، تو وہ اس کتاب سے ہدایت نہیں پا سکتا۔

- یہ تیسری شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صرف مان کر بیٹھ جانے والے ہوں وہ قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایمان لانے کے بعد فوراً ہی عملی اطاعت کے لیے آمادہ ہو جائے۔ اور عملی اطاعت کی اوّلین علامت اور دائمی علامت نماز ہے۔ ایمان لانے پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرتے کہ مُؤذِّن نماز کے لیے پکارتا ہے اور اسی وقت فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیے بھی تیار ہے یا نہیں۔ پھر یہ مُؤذِّن روز پانچ وقت پکارتا رہتا ہے، اور جب بھی انسان اس کی پکار پر لبّیک نہ کہے، اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ مدّعیِ ایمان اطاعت سے خارج ہو گیا ہے۔ پس ترکِ نماز دراصل ترکِ اطاعت ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جو شخص کسی کی ہدایت پر کاربند ہونے کے لیے تیار ہی نہ ہو، اُس کے لیے ہدایت دینا اور نہ دینا یکساں ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اقامتِ صلوٰۃ ایک جامع اِصطلاح ہے۔ اس کے معنیٰ صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی بستی میں ایک ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو، لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کے ادا کرنے کا نظم نہ ہو، تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں

إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ؕ ④
أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں[۷]، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں[۸]۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

نماز قائم کی جا رہی ہے۔

۶ - یہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے چوتھی شرط ہے کہ آدمی تنگ دل نہ ہو، زر پرست نہ ہو، اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حُقوق مقرر کیے جائیں اُنھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہو، جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں بھی دریغ نہ کرے۔

۷ - یہ پانچویں شرط ہے کہ آدمی اُن تمام کتابوں کو برحق تسلیم کرے جو وحی کے ذریعے سے خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیا پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں۔ اس شرط کی بنا پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ اُن سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس ضرورت ہی کے قائل نہ ہوں کہ انسان کو خدا کی طرف سے ہدایت ملنی چاہیے، یا اس ضرورت کے تو قائل ہوں مگر اس کے لیے وحی و رسالت کی طرف رُجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے ہوں اور خود کچھ نظریات قائم کر کے انھی کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں، یا آسمانی کتابوں کے بھی قائل ہوں، مگر صرف اُس کتاب یا اُن کتابوں پر ایمان لائیں جنھیں ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں، رہیں اُسی سرچشمے سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات، تو وہ اُن کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ایسے سب لوگوں کو الگ کر کے قرآن اپنا چشمۂ فیض صرف اُن لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج بھی مانتے ہوں، اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ خدا کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے ذریعے سے ہی خلق تک پہنچتی ہے، اور پھر وہ کسی نسلی و قومی تعصّب میں بھی مُبتلا نہ ہوں بلکہ خالص حق کے پرستار ہوں، اس لیے حق جہاں جہاں جس شکل میں بھی آیا ہے، اس کے آگے سر جھکا دیں۔

۸ - یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ ”آخرت“ ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اِس دنیا میں غیر ذمّہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۲) یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام اَبدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳) یہ کہ اس عالَم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ
تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ
سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾ ع
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ

جن لوگوں نے (اِن باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا[9]، اُن کے لیے یکساں ہے، خواہ تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مُہر لگا دی[10] ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ ع

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ

---

(۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنّت میں جائیں گے، اور جو لوگ بد ٹھیریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوش حالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھیرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اِس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو، وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو، تو وہ اس راستے پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔

[9] – یعنی وہ چھ کی چھ شرطیں، جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، پوری نہ کیں، اور ان سب کو، یا اِن میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

[10] – اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مُہر لگا دی تھی، اِس لیے انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اُنھوں نے اُن بنیادی اُمور کو رد کر دیا جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستے کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا، تو اللہ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی۔ اِس مُہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے، تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سمت میں چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، اور آپ کے طریقے کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے

بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ
اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا

مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شُعور نہیں[11] ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا[12]، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں، اس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ جب کبھی اُن سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ــــ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انھیں شُعور نہیں ہے۔ اور جب

کہ فی الواقع اس کے دل پر مُہر لگی ہوئی ہے۔

۱۱– یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مُبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ رَوِش ان کے لیے مفید ہوگی، حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں ایک منافق چند روز کے لیے تو لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے مگر ہمیشہ اس کا دھوکا نہیں چل سکتا۔ آخرِ کار اس کی منافقت کا راز فاش ہو کر رہتا ہے، اور پھر معاشرے میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ رہی آخرت، تو وہاں ایمان کا زبانی دعویٰ کوئی قیمت نہیں رکھتا اگر عمل اس کے خلاف ہو۔

۱۲– بیماری سے مراد منافقت کی بیماری ہے۔ اور اللہ کے اس بیماری میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ منافقین کو ان کے نِفاق کی سزا فوراً نہیں دیتا بلکہ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منافق لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ مکمل منافق بنتے چلے جاتے ہیں۔

قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَ اِذَا
لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان[۱۳] لاؤ، تو انھوں نے یہی جواب دیا: ”کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں[۱۴]؟“ —— خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں، مگر یہ جانتے نہیں ہیں۔ جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، اور جب علیٰحدگی میں اپنے شیطانوں[۱۵] سے ملتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں —— اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے، وہ اِن کی رسّی دراز کیے جاتا ہے، اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔

---

۱۳ – یعنی جس طرح تمھاری قوم کے دوسرے لوگ سچائی اور خلوص کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، اسی طرح تم بھی اگر اسلام قبول کرتے ہو تو ایمان داری کے ساتھ سچّے دل سے قبول کرو۔

۱۴ – وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں اور مشقّتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق اور راستی کی خاطر تمام مُلک کی دشمنی مول لے لی جائے۔ ان کے خیال میں عقل مندی یہ تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے، بلکہ ہر معاملے میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔

۱۵ – شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرّد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جِنّ، دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطینِ جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مُراد ہیں اور کہاں جِن۔ اِس مقام پر شیاطین کا لفظ اُن بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى
اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ ۙ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ
وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ

یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، مگر یہ سودا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ اِن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اُس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا، تو اللہ نے اِن کا نورِ بصارت سَلب کر لیا اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں[۱۶] آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں[۱۷]، یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سُن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں اُنگلیاں

۱۶– مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا، تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے، ان پر تو ساری حقیقتیں روشن ہوگئیں، مگر یہ منافق، جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے، ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔ ’’اللہ نے نورِ بصارت سلب کر لیا‘‘ کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب اُنھوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انھیں اسی کی توفیق عطا فرما دی۔

۱۷– حق بات سننے کے لیے بہرے، حق گوئی کے لیے گونگے، حق بینی کے لیے اندھے۔

حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾ یَکَادُ الْبَرْقُ
یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙ
وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ ع

[18] ٹھونسے لیتے ہیں، اور اللہ اِن منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی اِن کی بصارت اُچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دُور چل لیتے ہیں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں[19] —— اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سَلب کر لیتا[20]، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ع

---

۱۸ – یعنی کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر وہ اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے اس غلط فہمی میں تو ڈال سکتے ہیں کہ ہلاکت سے بچ جائیں گے مگر فی الواقع اس طرح وہ بچ نہیں سکتے، کیونکہ اللہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ان پر محیط ہے۔

۱۹ – پہلی مثال اُن منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مَصلَحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ اور یہ دُوسری مثال اُن کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضُعفِ ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے، مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مُراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مُجاہَدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلے میں اہلِ جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آ رہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان منافقین کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں، اور جب مشکلات کے دَل بادَل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصّباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے، تو ٹھِٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۲۰ – یعنی جس طرح پہلی قسم کے منافقین کا نورِ بصارت اس نے بالکل سَلب کر لیا، اسی طرح اللہ ان کو بھی حق کے لیے اندھا بہرا بنا سکتا تھا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ جو کسی حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہو، اسے اُتنا بھی نہ دیکھنے سُننے دے۔ جس قدر حق دیکھنے اور حق سُننے کے لیے یہ تیار تھے، اسی قدر سماعت و بصارت اللہ نے ان کے پاس رہنے دی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ
بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا
لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ
رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا

لوگو![21] بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع [22] اِسی صورت سے ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دُوسروں کو اللہ کا مدِّ مقابل[23] نہ ٹھیراؤ۔

اور اگر تمہیں اِس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو

---

۲۱ – اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی پر اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں اُٹھا سکتے۔ اِس کے بعد اب تمام نوعِ انسانی کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بُلانے کے لیے قرآن آیا ہے۔

۲۲ – یعنی دنیا میں غلط بینی و غلط کاری سے اور آخرت میں خدا کے عذاب سے بچنے کی توقع۔

۲۳ – یعنی جب تم خود بھی اِس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں، تو پھر تمہاری بندگی اسی کے لیے خاص ہونی چاہیے، دوسرا کون اس کا حق دار ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ؟ دوسروں کو اللہ کا مدِمقابل ٹھیرانے سے مُراد یہ ہے کہ بندگی و عبادت کی مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رَوِیّہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی سے تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ عبادت کی وہ اقسام کون کون سی ہیں جنھیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے اور جن میں دوسروں کو شریک ٹھیرانا وہ ”شرک“ ہے، جسے روکنے کے لیے قرآن آیا ہے۔

شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ
وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا
مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا
بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا

بُلالو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔[۲۴] لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اُس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر،[۲۵] جو مہیا کی گئی ہے منکرینِ حق کے لیے۔

اور اے پیغمبرؐ! جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کر لیں، انھیں خوش خبری دے دو کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے۔ جب کوئی پھل انھیں کھانے کو دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔[۲۶] ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی،[۲۷] اور وہ وہاں

---

۲۴ - اِس سے پہلے مکّے میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اِس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینے پہنچ کر پھر اس کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہُود، آیت ۱۳۔ بنی اسرائیل، آیت ۸۸۔ الطُّور، آیات ۳۳، ۳۴)

۲۵ - اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ بنو گے، بلکہ تمھارے وہ بُت بھی وہاں تمھارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنھیں تم نے اپنا معبود و مسجود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے تھے۔

۲۶ - یعنی نرالے اور اجنبی پھل نہ ہوں گے، جن سے وہ نامانوس ہوں۔ شکل میں اُنھی پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے جن سے وہ دُنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وہ ان سے بدرجہا زیادہ بڑھے ہوئے ہوں گے۔ دیکھنے میں مثلاً آم اور انار

خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً
فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ وقف لازم
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ

ہمیشہ رہیں گے۔

ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھّر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں[28] دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انھی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انھیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے[29]۔ اور گمراہی میں وہ انھی کو مبتلا کرتا ہے، جو

اور سنترے ہی ہوں گے۔ اہلِ جنّت ہر پھل کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ آم ہے اور یہ انار ہے اور یہ سنترا۔ مگر مزے میں دُنیا کے آموں اور اناروں اور سنتروں کو ان سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔

۲۷ - عربی متن میں اَزْوَاجٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں ”جوڑے“۔ اور یہ لفظ شوہر اور بیوی، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شوہر کے لیے بیوی ”زوج“ ہے اور بیوی کے لیے شوہر ”زوج“۔ مگر وہاں یہ ازواج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے۔ اگر دُنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے، تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دُوسری نیک بیوی دے دی جائے گی۔ اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد، تو وہاں وہ اِس بُرے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی اور کوئی نیک مرد اس کا شریکِ زندگی بنا دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں کوئی شوہر اور بیوی دونوں نیک ہیں، تو وہاں ان کا یہی رشتہ اَبَدی و سرمدی ہو جائے گا۔

۲۸ - یہاں ایک اعتراض کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ قرآن میں متعدِد مقامات پر توضیحِ مدّعا کے لیے مکڑی، مکھی، مچھّر وغیرہ کی جو تمثیلیں دی گئی ہیں، اُن پر مخالفین کو اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلامِ الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں۔

۲۹ - یعنی جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے، اُن کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں

إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ (٢٦) الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ
مِيْثَاقِهٖ ۖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (٢٧) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ
وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ

فاسق ہیں[۳۰]، اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[۳۱]، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں[۳۲]، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں[۳۳]۔ حقیقت میں یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

تم اللہ کے ساتھ کفر کا رَوِیَّہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمھاری جان سَلب کرے گا، پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا، پھر

اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے اُلٹے نتائج نکال کر حق سے اَور زیادہ دُور چلے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں، ان کو انھی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔

۳۰- فاسق: نافرمان، اطاعت کی حد سے نکل جانے والا۔

۳۱- بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایات جاری کرتا ہے، ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے، جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے۔ ”مضبوط باندھ لینے کے بعد“ سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدمؑ کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۲ میں اس عہد و اقرار پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۲- یعنی جن روابط کے قیام اور استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے، اور جنھیں دُرست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس مختصر سے جملے میں اس قدر وسعت ہے کہ انسانی تمدّن و اَخلاق کی پوری دنیا پر، جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات تک پھیلی ہوئی ہے، صرف یہی ایک جملہ

اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ
جَمِيۡعًا ۚ ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ
هُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾ ع وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ ۳ ع ۳

اسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔ وہی تو ہے، جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر اوپر کی طرف توجّہ فرمائی اور سات آسمان[۳۴] اُستوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے[۳۵]۔ ع

پھر ذرا[۳۶] اس وقت کا تصوّر کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں[۳۷] سے کہا تھا کہ ”میں

حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مُراد محض تعلقاتِ انسانی کا انقطاع ہی نہیں ہے، بلکہ تعلقات کی صحیح اور جائز صُورتوں کے سوا جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی، وہ سب اسی ذیل میں آجائیں گی، کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطعِ روابط کا ہے، یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظامِ اَخلاق وتمدّن کی بربادی۔

۳۳- ان تین جُملوں میں فسق اور فاسق کی مکمل تعریف بیان کر دی گئی ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق اور انسان اور انسان کے تعلق کو کاٹنے یا بگاڑنے کا لازمی نتیجہ فساد ہے، اور جو اس فساد کو برپا کرتا ہے، وہی فاسق ہے۔

۳۴- سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعیُّن مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان، یا بالفاظِ دیگر، ماورائے زمین کے متعلق اپنے مُشاہَدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصوّرات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا اُن میں سے کسی تصوّر کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہُوم متعیّن کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مُجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

۳۵- اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر مُتنَبِّہ فرمایا گیا ہے: ایک، یہ کہ تم اس خدا کے مقابلے میں کفر و بغاوت کا رَوِیّہ اختیار کرنے کی جُراَت کیسے کرتے ہو جو تمھاری تمام حرکات سے باخبر ہے، جس سے تمھاری کوئی حرکت چُھپی نہیں رہ سکتی۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے، اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو، اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے، جب اس کے سوا اور کہیں سے وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو، تو آخر اُس سے رُوگردانی کرنے میں کیا فائدہ تم نے دیکھا ہے؟

۳۶- اُوپر کے رُکوع میں بندگیِ رب کی دعوت اِس بُنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمھارا خالق ہے، پروردگار ہے،

جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

زمین میں ایک خلیفہ[۳۸] بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا؟[۳۹] آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح

اُسی کے قبضۂ قدرت میں تمھاری زندگی و موت ہے، اور جس کائنات میں تم رہتے ہو، اس کا مالک و مدبّر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمھارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بُنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دُنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمھارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے، تو بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دُوسرا ذریعہ انسان کو مُیسّر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ اُن نتائج سے بہت زیادہ قیمتی ہیں جو زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس و تخمین سے ربط دے کر آدمی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۷- مَلَک کے اصل معنٰی عربی میں "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرّد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخّص نہ رکھتی ہوں، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں، جن سے اللہ اپنی اِس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یُوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

۳۸- خلیفہ: وہ جو کسی کی مِلک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے، بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کرکے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے، تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

۳۹- یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا بلکہ اِستفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔

وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ
اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ
اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا

اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہتے[۴۰] ہیں۔" فرمایا: "میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں[۴۱] جانتے۔" اس کے بعد اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھائے[۴۲]، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: "اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا)، تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" انھوں نے عرض کیا:

وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیرِ تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات سپُرد کیے جانے والے ہیں، مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنتِ کائنات کے اس نظام میں کسی بااختیار مخلوق کی گنجایش کیسے ہوسکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں، تو سلطنت کے جس حصّے میں بھی ایسا کیا جائے گا، وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اسی بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

۴۰- اس فقرے سے فرشتوں کا مدّعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں، مرضیِ مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد وثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدامِ ادب کر رہے ہیں، اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مَصلحت نہیں سمجھ سکے۔ (تسبیح کا لفظ ذُو معنیین ہے۔ اس کے معنٰی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنٰی ہیں: ایک، تقدس کا اظہار و بیان۔ دُوسرے، پاک کرنا)۔

۴۱- یہ فرشتوں کے دوسرے شبہے کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مَصلحت مَیں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ کافی نہیں ہیں، بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔ اسی لیے زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کیے جائیں۔

۴۲- انسان کے علم کی صُورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیا کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیا پر مشتمل ہیں۔ آدمؑ کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیا کا علم دینا تھا۔

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ
الۡحَكِيۡمُ (۳۲) قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ
بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ (۳۳) وَاِذۡ
قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى

”نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔[۴۳] حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔“ پھر اللہ نے آدمؑ سے کہا: ”تم اِنھیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔“ جب اس نے ان کو اُن سب کے نام بتا دیے،[۴۴] تو اللہ نے فرمایا: ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اُسے بھی میں جانتا ہوں۔“

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ، تو سب جھک گئے،[۴۵] مگر ابلیس[۴۶] نے انکار کیا۔

---

۴۳ – ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صِنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں، وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں، مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دُوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اُس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے، وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے۔

۴۴ – یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہے کا جواب تھا۔ گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا کہ میں آدمؑ کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمھیں ہوا، وہ اس معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ دُوسرا پہلو صلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

۴۵ – اِس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں،

وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا

وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔[۴۷]

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس

ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مُسخّر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا، اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط، جس کام میں بھی انسان اپنے اُن اختیارات کو، جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں، استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مَشِیّت کے تحت اسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں، تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو، وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لیے جائے، دونوں صُورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اِذن دے رہے ہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر اِس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرماں روا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صُوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے، تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں، ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں، اور جب تک فرماں روا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے، اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں، قطعِ نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے یا غلط کام میں۔ البتہ جب جس کام کے بارے میں بھی فرماں روا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے، تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتّٰی کہ جس وقت فرماں روا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزُولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے، تو وہی ماتحت و خُدّام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں کُشاں کُشاں دارُالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدمؑ کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا، اُس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخّر ہو جانے ہی کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو، اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۴۶ – اِبْلِیس: لفظی ترجمہ "انتہائی مایوس"۔ اِصطلاحاً یہ اُس جِنّ کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مطیع و مُسخَّر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو "الشَّیْطٰن" بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شیطان اور ابلیس بھی محض کسی مجرّد قوت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ بھی انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخُّص ہستی ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ

درخت کا رُخ نہ کرنا[۴۸]، ورنہ ظالموں[۴۹] میں شمار ہو گے۔" آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت

چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ آگے چل کر قرآن نے خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جِنوں میں سے تھا، جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صِنف ہیں۔

۴۷ – اِن الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا، بلکہ جِنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی، اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "وہ کافروں میں سے تھا۔" اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جِنّوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعُموم "شیاطین" کا لفظ اِنھی جِنّوں اور ان کی ذُرِّیت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے، اور جہاں شیاطین سے انسان مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہ ہو، وہاں یہی شیاطینِ جن مراد ہوتے ہیں۔

۴۸ – اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین، یعنی اپنی جائے تقرُّر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے، ان دونوں کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رُجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چُن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کون سا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم وحوا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مَقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمھارے لیے تمھارے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مَقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے منحرف ہو جاؤ گے، تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے، اسی طرح آخر میں بھی محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقام لائق کی، اپنی اِس فردوسِ گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اسی طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو جو تمھیں فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

۴۹ – ظالم کا لفظ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بُنیادی حقوق تلف کرتا ہے: اوّلاً، خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری کی جائے۔ ثانیاً، اُن تمام چیزوں کے حُقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔

عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقّٰٓى
اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا، جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ ”اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو[50] اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھیرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔“ اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی،[51] جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور

اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قُوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیا جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے، تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً، خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے، تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انھی وُجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

۵۰ – یعنی انسان کا دشمن شیطان، اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرماں برداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے، مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے، ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنالیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ حقیقتاً دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی، بلکہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

۵۱ – یعنی آدمؑ کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں، تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دُعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

توبہ کے اصل معنٰی رُجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا، طریقِ بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا، پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

رحم فرمانے والا ہے۔[۵۲]

ہم نے کہا کہ ”تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔[۵۳] پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا،

---

۵۲ - قرآن اِس نظریّے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں، اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کُن نظریات میں سے ایک بڑا گمراہ کُن نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہ گارانہ زندگی میں مبتلا ہوگیا، اُس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے، اور اگر اپنی غلطی پر مُتنبِّہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آیندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے، تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی اُمید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمھیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمھاری بھلائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس بُرائی پر تمھیں سزا ملتی ہے، وہ بھی بُرائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مُترتّب ہو کر ہی رہے، بلکہ اللہ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے، اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچّی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رَد کر دیتا ہے، اُسے اس بنا پر رَد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی، مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اُس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکابِ جُرم کی خواہش موجود ہو۔ اور اپنی رحمت سے معافی اُس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹّے سے کٹّے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم، اور بغاوت کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کی رَوِش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

۵۳ - اِس فقرے کا دوبارہ اعادہ معنیٰ خیز ہے۔ اُوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کرلی۔ اِس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھوڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ! خدا کو اپنا اِکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انھیں نبوّت سے بھی سرفراز کیا، تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ ع

۴ ع ۴

اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات[54] کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں[55] گے۔ ’’ع

جنت سے نکلنے کا حکم پھر دُہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصُود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مُقتضا نہ تھا کہ آدمؑ کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارُ العذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اُتارے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنّت اُن کی اصلی جائے قیام نہ تھی۔ وہاں سے نکلنے کا حکم اُن کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اُتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے اُن کو اُس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا، جس کا ذکر اُوپر حاشیہ ۴۸ میں کیا جا چکا ہے۔

۵۴ - اٰیات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنٰی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستُور ہے۔ کہیں اُن معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرماں روائے کائنات کے نمایندے ہیں۔ کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مُصنّف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں ـــــ ہر جگہ عبارت کے سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ’’آیت‘‘ کا لفظ کس معنٰی میں آیا ہے۔

۵۵ - یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رُکوع میں اللہ کے ’’عہد‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے، بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگُونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامُور ہے کہ اُس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اُس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صُورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ اِن دو صُورتوں کے ماسوا ہر صُورت غلط ہے، بلکہ غلط ہی نہیں، سراسر بغاوت بھی ہے، جس کی سزا جہنّم کے سوا اور کچھ نہیں۔

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ

اے بنی اسرائیل![۵۶] ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی،

قرآنِ مجید میں آدمؑ کی پیدایش اور نوعِ انسانی کی ابتدا کا یہ قصّہ سات مقامات پر آیا ہے، جن میں سے پہلا مَقام یہ ہے اور باقی مقامات حسبِ ذیل ہیں: الاعراف، رکوع ۲- الحِجر، رکوع ۳- بنی اسرائیل، رکوع ۷- الکہف، رکوع ۷- طٰہٰ، رکوع ۷- صٓ، رکوع ۵- بائبل کی کتابِ پیدایش، باب اوّل، دوم وسوم میں بھی یہ قصّہ بیان ہوا ہے، لیکن دونوں کا مقابلہ کرنے سے ہر صاحبِ نظر انسان محسُوس کرسکتا ہے کہ دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے۔ (بقیہ حاشیہ مُلاحظہ ہو صفحہ ۲۲۶ پر)۔

۵۶- اسرائیل کے معنٰی ہیں: عبداللہ یا بندۂ خدا۔ یہ حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا، جواُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ انھی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ پچھلے چار رُکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اِس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے، جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکینِ عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پِھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسبِ ذیل باتوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

اوّلاً، اِس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروںؑ کی اُمت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر وصلاح کا عُنصر موجود ہے، انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اُس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بتایا جارہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبیؐ وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمھارے انبیاؑ اور تمھارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بُلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو کیا کرتے، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمھاری تاریخ اور تمھاری قوم کی موجودہ اَخلاقی و دینی حالت خود تمھارے بگاڑ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمھاری اپنی چیز ہے۔ لٰہذا جانتے بُوجھتے حق کی مُخالفت نہ کرو، بلکہ اسے قبول کرلو۔ جو کام تمھارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اُٹھے ہیں، ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حُجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اَخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمھارے انبیاؑ لے کر آئے تھے۔ اُصولِ دین میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ جو ہدایت تمھیں دی گئی تھی، اس کی پیروی کرنے میں، اور جو رہنمائی کا منصب تمھیں دیا گیا تھا، اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوئے ہو۔ اس کے ثبوت

وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اُسے تم پورا کرو، تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں، اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

میں ایسے واقعات سے اِستشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکّاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جارہی ہے، جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے، جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اِس طرح اِتمامِ حُجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عُنصر تھا، اس کی آنکھیں کُھل گئیں، دوسری طرف مدینے کے عوام پر اور بالعُموم مشرکینِ عرب پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا، وہ ختم ہو گیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ وہ اُس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلے میں کھڑے نہ ہو سکے جس کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رُکوعوں میں نوعِ انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا، اسی کے سلسلے میں ایک خاص قوم کی معیّن مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوامِ عالَم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایتِ الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رُونما ہو سکتے ہیں، وہ سب اس قوم کی عبرت ناک سرگزشت میں نظر آجاتے ہیں۔

رابعاً، اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاؑ کے پیرو گر گئے۔ یہُودیوں کی اَخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں، تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلے میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخرِ کار پچھلی اُمتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے، حتّٰی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گھسے ہیں، تو تم بھی اسی میں گھسو گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: یا رسولؐ اللہ! کیا یہُود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اور کون؟ نبیِ اکرمؐ کا یہ ارشاد محض ایک تَوبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپؐ یہ جانتے تھے کہ انبیاؑ کی اُمتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور مَیں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اُس کتاب کی تائید میں ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[57] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مُشتَبَہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپانے کی کوشش کرو۔[58]

---

۵۷ - تھوڑی قیمت سے مُراد وہ دُنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہر حال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے، کیونکہ حق یقیناً اس سے گراں تر چیز ہے۔

۵۸ - اِس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اہلِ عرب بالعُموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شُہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رُعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علما اور مشائخ نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رُعب کو اور بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اُسی طرح شدّت کے ساتھ متاثّر تھے جس طرح ایک اَن پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدّن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخُّص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثّر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی، تو قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہلِ کتاب یہُودیوں سے جا کر پُوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوّت کا دعویٰ لے کر اُٹھے ہیں، اِن کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکے کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا، اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہُودی علما کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے۔ مگر ان علما نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، غلط ہے، یا انبیاؑ اور کتبِ آسمانی اور ملائکہ اور آخرت

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۵۹]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں، ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟ صبر اور نماز[۶۰] سے مدد لو،

کے بارے میں جو کچھ آپؐ کہہ رہے ہیں، اس میں کوئی غَلَطی ہے، یا وہ اَخلاقی اُصول، جن کی آپؐ تعلیم دے رہے ہیں، ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ لیکن وہ صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپؐ پیش کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچّائی کی کُھلی کُھلی تردید کر سکتے تھے، نہ سیدھی طرح اس کو سچّائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپؐ کی جماعت کے خلاف، اور آپؐ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپؐ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک وشبہات میں پڑ جائیں، اور طرح طرح کے اُلجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے، تاکہ لوگ ان میں خود بھی اُلجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیروؤں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رَوِیّہ تھا، جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شُبہات واعتراضات سے حق کو دبانے اور چُھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق وباطل کو خَلَط مَلَط کر کے دُنیا کو دھوکا نہ دو۔

۵۹- نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاؑ کی طرح انبیائے بنی اسرائیل نے بھی اس کی سخت تاکید کی تھی۔ مگر یہُودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نمازِ باجماعت کا نظام ان کے ہاں تقریباً بالکل درہم برہم ہو چکا تھا۔ قوم کی اکثریت انفرادی نماز کی بھی تارک ہو چکی تھی، اور زکوٰۃ دینے کے بجائے یہ لوگ سُود کھانے لگے تھے۔

۶۰- یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دُشواری محسُوس ہوتی ہے تو اس دُشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صَبْر کے لُغوی معنیٰ روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مُراد ارادے کی وہ مضبوطی، عَزْم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ اِنضباط ہے، جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ
مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا
نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

۵ ع ۵ ربع

بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر ان فرماں بردار بندوں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[۶۱] ع

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اُس نعمت کو، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔[۶۲] اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔[۶۳]

پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔ ارشادِ الٰہی کا مدعا یہ ہے کہ اس اَخلاقی صِفَت کو اپنے اندر پرورش کرو اور اس کو باہر سے طاقت پہنچانے کے لیے نماز کی پابندی کرو۔

۶۱ – یعنی جو شخص خدا کا فرماں بردار نہ ہو اور آخرت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، اس کے لیے تو نماز کی پابندی ایک ایسی مصیبت ہے جسے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا۔ مگر جو برضا و رغبت خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر چکا ہو اور جسے یہ خیال ہو کہ کبھی مر کر اپنے خدا کے سامنے جانا بھی ہے، اس کے لیے نماز ادا کرنا نہیں، بلکہ نماز کا چھوڑنا مشکل ہے۔

۶۲ – یہ اُس دَور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دُنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علمِ حق تھا اور جسے اقوامِ عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا، تاکہ وہ بندگیِ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے۔

۶۳ – بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاؑ کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیا، صُلَحا اور زُہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو اُنھی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ
يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۴۹) وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ
فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۰) وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا

یاد کرو[۶۴] وہ وقت، جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۶۵] کی غلامی سے نجات بخشی ـــــ اُنھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی۔[۶۶]

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گزروا دیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بُلایا،[۶۷] تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود[۶۸] بنا بیٹھے۔ اُس وقت تم نے بڑی زیادتی کی تھی، مگر اس پر بھی ہم نے تمھیں معاف

کیسے پا سکتا ہے۔ اِنھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکّر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی اِن غلط فہمیوں کو دُور کیا گیا ہے۔

۶۴ – یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں، جنھیں اس قوم کا بچّہ بچّہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعے کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس تاریخی بیان میں دراصل یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک طرف یہ اور یہ احسانات ہیں جو خدا نے تم پر کیے، اور دُوسری طرف یہ اور یہ کرتوت ہیں جو ان احسانات کے جواب میں تم کرتے رہے۔

۶۵ – "اٰلِ فِرْعَوْنَ" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فَراعِنہ اور مصر کا حکمراں طبقہ دونوں شامل ہیں۔

۶۶ – آزمائش اس امر کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نِری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقے پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے بنتے ہو یا نہیں۔

۶۷ – مصر سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے، تو حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے

عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ
بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

کر دیا کہ شاید اب تم شکر گزار بنو۔

یاد کرو کہ (ٹھیک اُس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے) ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فُرقان[۶۹] عطا کی، تاکہ تم اس کے ذریعے سے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو جب موسیٰؑ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا، تو اُس) نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اُوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو،[۷۰] اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے۔" اُس وقت تمھارے خالق نے تمھاری توبہ قبول کر لی، کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

چالیس شب و روز کے لیے کوہِ طور پر طلب فرمایا، تاکہ وہاں اس قوم کے لیے، جو اَب آزاد ہو چکی تھی، قوانینِ شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا کی جائیں۔ (ملاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۲۴ تا ۳۱)

۶۸ – گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا۔ (بچھڑے کی پرستش کا یہ واقعہ بائبل کتابِ خُروج، باب ۳۲ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے)۔

۶۹ – فُرقان: وہ چیز جس کے ذریعے سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اُردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔ یہاں فُرقان سے مُراد دین کا وہ علم اور فہم ہے، جس سے آدمی حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔

۷۰ – یعنی اپنے اُن آدمیوں کو قتل کرو جنھوں نے گوسالے کو معبود بنایا اور اس کی پرستش کی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ
الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا

یاد کرو جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم تمھارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے، جب تک کہ اپنی آنکھوں سے عَلانِیَہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں۔ اس وقت تمھارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقے نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گزار بن جاؤ۔[۷۱]
ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا،[۷۲] مَن و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[۷۳] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں، انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا، وہ ہم پر ظلم نہ تھا،

---

۷۱ - یہ اشارہ جس واقعے کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر جب حضرت موسیٰؑ طُور پر تشریف لے گئے تھے، تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستّر نمایندے بھی لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فُرقان عطا کی، تو آپ نے اسے ان نمایندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمھارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انھیں سزا دی گئی۔ لیکن بائبل کہتی ہے کہ:

> ”اور انھوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترا سا تھا، جو آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اُس نے بنی اسرائیل کے شُرفا پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سو انھوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا اور پیا۔“ (خُروج، باب ۲۴، آیت ۱۰-۱۱)

لُطف یہ ہے کہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا کہ مجھے اپنا جلال دکھا دے، تو اُس نے فرمایا کہ تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ (دیکھو: خُروج، باب ۳۳، آیت ۱۸-۲۳)

۷۲ - یعنی جزیرہ نمائے سینا میں، جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسّر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل کر آئے تھے

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ
الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر یاد کرو جب ہم نے کہا تھا کہ "یہ بستی[۷۴]، جو تمھارے سامنے ہے، اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار، جس طرح چاہو، مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا: حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ[۷۵]، ہم تمھاری خطاؤں سے درگزر کریں گے اور نیکو کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔"

اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اُس زمانے میں اگر خدا کی طرف سے ایک مدت تک آسمان کو ابر آلود نہ رکھا جاتا، تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی۔

۷۳ - مَنّ اور سَلوٰیٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس مہاجرت کے زمانے میں اُن لوگوں کو چالیس برس تک مسلسل ملتی رہیں۔ مَنّ دھنیے کے بیج جیسی ایک چیز تھی، جو اوس کی طرح گرتی اور زمین پر جم جاتی تھی۔ اور سَلوٰیٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انھی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اُٹھانی پڑی، حالانکہ آج کسی نہایت متمدّن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں، تو اُن کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ (مَنّ اور سَلوٰیٰ کی تفصیلی کیفیت کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۱۶۔ گنتی، باب ۱۱، آیت ۷-۹ و ۳۱، ۳۲ و یشوع، باب ۵- آیت ۱۲)

۷۴ - یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے مُراد کون سی بستی ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے، وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا ہی میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ نما کا کوئی شہر ہو گا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے مُراد شِطّیم ہو، جو یَریحُو کے بالمقابل دریائے اُردُن کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں، جن کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے۔ (گنتی- باب ۲۵، آیت ۱-۸)

۷۵ - یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اَکڑتے ہوئے نہ گھسنا بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتحِ مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حِطّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ع ﴿٥٩﴾ وَاِذِ
اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا
وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَ
اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَ

مگر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔ یہ سزا تھی اُن نافرمانیوں کی، جو وہ کر رہے تھے۔ ع

یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پُھوٹ نکلے[۷۶] اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اُس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰؑ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ، ترکاری، کھیرا، ککڑی، گیہوں، لہسن،

عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔

۷۶۔ وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیّاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ۱۲ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیل کے قبیلے بھی ۱۲ ہی تھے۔ خدا نے ہر ایک قبیلے کے لیے الگ چشمہ نکال دیا تا کہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔

عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۗ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ۗ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

ع۷

پیاز، دال وغیرہ پیدا کرے۔" تو موسیٰؑ نے کہا: " کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجے کی چیزیں لینا چاہتے ہو؟[۷۷] اچھا، کسی شہری آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگتے ہو، وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلّت و خواری اور پستی و بدحالی اُن پر مسلّط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اِس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے[۷۸] لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے[۷۹] لگے۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حُدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔ ع

---

۷۷ – یہ مطلب نہیں ہے کہ مَنّ و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مَشَقَّت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لیے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرا نَوَردی تم سے کرائی جا رہی ہے، اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دَہن کی لذّت اتنی مرغوب ہے کہ اُس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدّت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (تقابُل کے لیے مُلاحَظہ ہو: گنتی، باب ۱۱، آیت ۴-۹)

۷۸ – آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً، ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات یا خواہشات کے خلاف پائی، اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے، پوری ڈِھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروانہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مطلب و مفہُوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

۷۹ – بنی اسرائیل نے اپنے اِس جُرم کو اپنی تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت سلیمانؑ کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دو ریاستوں (یروشلم کی دولتِ یہودیہ اور سامریہ کی دولتِ اسرائیل) میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے

اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دِمَشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرماں روا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲-تواریخ، باب ۱۶، آیت ۷-۱۰)

(۲) حضرت الیاس (اِیلیّاہ Elliah) علیہ السّلام نے جب بَعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور از سرِ نَو توحید کی دعوت کا صُور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اَخی اَب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا، حتّٰی کہ انھیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقع پر جو دُعا حضرت الیاسؑ نے مانگی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا...... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں، سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔“ (۱-سلاطین، باب ۱۹، آیت ۱۰)

(۳) ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اَخی اَب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (۱-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۲۶-۲۷)

(۴) پھر جب یہُودیہ کی ریاست میں عَلانیہ بُت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریاہ نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی، تو شاہِ یہُوداہ یوآس کے حکم سے انھیں عین ہیکلِ سلیمانی میں ”مَقدِس“ اور ”قربان گاہ“ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔ (۲-تواریخ، باب ۲۴، آیت ۲۱)

(۵) اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست اَشُوریوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی اور یروشلم کی یہودی ریاست کے سر پر تباہی کا طوفان تُلا کھڑا تھا، تو ”یرمیاہ“ نبی اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اُٹھے اور کُوچے کُوچے انھوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تمھارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر قوم کی طرف سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار کی بارش ہوئی، پیٹے گئے، قید کیے گئے، رسّی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیے گئے، تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ سوکھ کر مر جائیں، اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدّار ہیں، بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ، باب ۱۵، آیت ۱۰- باب ۱۸، آیت ۲۰-۲۳۔ باب ۲۰، آیت ۱-۱۸۔ باب ۳۶ تا باب ۴۰)

(۶) ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ جب انھوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے بُرے انجام سے خبردار کیا، تو انھیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوّت کرو۔ (عاموس، باب ۷، آیت ۱۰-۱۳)

(۷) حضرت یحییٰ (یُوحنّا) علیہ السّلام نے جب ان بد اخلاقیوں کے خلاف آواز اُٹھائی جو یہودیہ کے فرماں روا ہیرودیس کے دربار میں کُھلّم کُھلّا ہو رہی تھیں، تو پہلے وہ قید کیے گئے، پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔ (مرقس، باب ۶، آیت ۱۷-۲۹)

(۸) آخر میں حضرت عیسیٰؑ پر بنی اسرائیل کے علما اور سردارانِ قوم کا غصہ بھڑکا، کیونکہ وہ انھیں ان کے گناہوں اور ان کی ریاکاریوں پر ٹوکتے تھے اور ایمان و راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا، رومی

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

یقین جانو کہ نبیِ عربیؐ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔[80]

عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ حاصل کیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطُس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمھاری خاطر یسُوع اور برابّا ڈاکو، دونوں میں سے کس کو رہا کروں، تو ان کے پُورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ برابّا کو چھوڑ دے اور یسُوع کو پھانسی پر لٹکا۔ (متّی، باب ۲۷۔ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی داستانِ جرائم کا ایک نہایت شرم ناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنے فُسّاق و فُجّار کو سرداری و سربراہ کاری کے لیے اور اپنے صُلَحا و اَبرار کو جیل اور دار کے لیے پسند کیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی لعنت کے لیے پسند نہ کرتا تو آخر اور کیا کرتا؟

[80] سلسلۂ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہُودیوں کے اِس زَعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دُوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہر حال نجات اس کے لیے مقدر ہے، اور باقی تمام انسان، جو ان کے گروہ سے باہر ہیں، وہ صرف جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں، بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے، وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہو گا، وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔ خدا کے ہاں فیصلہ آدمی کی صفات پر ہو گا نہ کہ تمھاری مردُم شماری کے رجسٹروں پر۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ
اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶۳) ثُمَّ
تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ
لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ (۶۴) وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ (۶۵) ۚ فَجَعَلْنٰهَا

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے طُور کو تم پر اُٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا اور کہا تھا[۸۱] کہ ”جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعے سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکو گے۔“ مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا، ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے اُن لوگوں کا قصّہ تو معلوم ہی ہے جنھوں نے سَبْت[۸۲] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دُھتکار پھِٹکار پڑے[۸۳]۔ اس طرح ہم نے

---

۸۱ – اس واقعے کو قرآن میں مختلف مَقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں یہ ایک مشہور و معرُوف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۱۳۲)

۸۲ – سَبْت، یعنی ہفتے کا دن۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتے کو آرام اور عبادت کے لیے مخصُوص رکھیں۔ اس روز کسی قسم کا دُنیوی کام، حتّٰی کہ کھانا پکانے کا کام بھی نہ خود کریں، نہ اپنے خادموں سے لیں۔ اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حُرمت کو توڑے، وہ واجب القتل ہے۔ (مُلاحظہ ہو: خُروج، باب ۳۱، آیت ۱۲–۱۷) لیکن جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و دینی انحطاط کا دَور آیا تو وہ علی الاعلان سَبْت کی

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَاِذْ
قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ

اُن کے انجام کو اُس زمانے کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو، جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے: کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے: اچھا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰؑ نے کہا: اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو۔ لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے: اپنے رب سے یہ اور پُوچھ دو کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا: وہ فرماتا ہے

بے حُرمتی کرنے لگے، حتّٰی کہ اُن کے شہروں میں کُھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی۔

۸۳- اس واقعے کی تفصیل آگے سورۂ اعراف، رُکوع ۲۱ میں آتی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنیٰ لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اَخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔

اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸ ۱۰ ۸ وَاِذْ
قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ۚ

زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے، جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے: اپنے رب سے صاف صاف پُوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ اللہ نے چاہا، تو ہم اس کا پتا پالیں گے۔ موسیٰؑ نے جواب دیا: اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پُکار اُٹھے کہ ہاں، اب تم نے ٹھیک پتا بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔[۸۴] ع

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چُھپاتے ہو، اسے کھول کر رکھ دے گا۔

---

[۸۴] – چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چُھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں، اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پُوری طرح ایمان اُترا ہوا نہ تھا، اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے، اتنے ہی گِھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخرِ کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر، جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائبل میں بھی اس واقعے

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (٧٣) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ
كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ
الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (٧٤)

اُس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ۔ دیکھو، اس طرح اللہ مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو[٨٥]—— مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمھارے دل سخت ہوگئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پُھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمھارے کرتُوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

کی طرف اشارہ ہے، مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ (مُلاحظہ ہو: گنتی، باب ۱۹، آیت ۱-۱۰)

٨٥- اِس مَقام پر یہ بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتا بتا دے۔ لیکن اس غَرَض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی، یعنی ’’لاش کو اس کے ایک حصّے سے ضرب لگاؤ‘‘، اس کے الفاظ میں کچھ اِبہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہُوم وہی ہے جو قدیم مُفسّرین نے بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اُوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک، یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دُوسرے، یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبُودیّت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبُود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی، تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، نہ کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا مفید ثابت ہو۔

اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـكُمۡ وَقَدۡ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

اے مسلمانو! اب کیا اِن لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟[۸۶] حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سُنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف[۸۷] کی۔

۸۶- یہ خطاب مدینے کے اُن نَومسلموں سے ہے جو قریب کے زمانے ہی میں نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوّت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ سب انھوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انھوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دُنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں، اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دُنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا سن کر آپؐ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جُوق در جُوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیا اور کُتُبِ آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمتِ ایمان میسر ہوئی ہے، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش نو مسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تو منافقین اور مخالفینِ اسلام اس سے یہ اِستدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مُشتبَہ ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہلِ کتاب کے علما اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بُوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے۔ اِس بنا پر بنی اسرائیل کی تاریخی سرگزشت بیان کرنے کے بعد اب ان سادہ دل مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں، ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو، ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی، تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کی جن آیات کو سُن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں۔ دینِ حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دَوڑے چلے آئیں گے۔

۸۷- ”ایک گروہ“ سے مُراد ان کے علما اور حاملینِ شریعت ہیں۔ ”کلام اللہ“ سے مراد توراۃ، زَبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاؑ کے ذریعے سے پہنچیں۔ ”تحریف“ کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنٰی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنٰی پہنا دینا، جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیّر و تبدُّل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں — علمائے بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلامِ الٰہی میں کی ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ
قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ
وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ
اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ق

النصف

(محمدؐ رسول اللہ پر) ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں، اور جب آپس میں ایک دُوسرے سے تخلیے کی بات چیت ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بے وقوف ہو گئے ہو؟ اِن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلے میں انھیں حُجّت میں پیش کریں؟[88] —— اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھُپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے؟ —— ان میں ایک دُوسرا گروہ اُمّیوں کا ہے، جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بُنیاد اُمّیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم وگمان پر چلے جا رہے ہیں۔[89] پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوِشتہ لکھتے ہیں،

۸۸- یعنی وہ آپس میں ایک دُوسرے سے کہتے تھے کہ توراۃ اور دیگر کُتُبِ آسمانی میں جو پیشین گوئیاں اِس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ رَوِش پر گرفت ہوسکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمھارے رب کے سامنے ان کو تمھارے خلاف حجّت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دُنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھُپالے گئے، تو آخرت میں ان پر مقدّمہ نہ چل سکے گا۔ اِسی لیے بعد کے جُملۂ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

۸۹- یہ ان کے عوام کا حال تھا۔ علمِ کتاب سے کورے تھے۔ کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اُصُول بتائے ہیں، اَخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح وخُسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور

ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ
فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَ
قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــَٔتُهٗ

پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔[۹۰] ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجبِ ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں اِلّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔[۹۱] اِن سے پوچھو: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے، جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا بات یہ ہے کہ تم اللہ کے ذمّے ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ اُس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمھیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھُوئے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکّر میں پڑا رہے گا،

جھوٹی توقّعات پر جی رہے تھے۔

۹۰ – یہ اُن کے علما کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے مَعانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اَوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط مَلط کر دیا، اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسّر کی تاویل، ہر مُتکلّم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعۂ کُتُبِ مقدسہ (بائبل) میں جگہ پالی، اللہ کا قول (word of God) بن کر رہ گیا۔ اُس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھرنے کے معنٰی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔

۹۱ – یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے، جس میں ان کے عامی اور عالم سب مُبتلا تھے۔ وہ

فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (٨١) وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ ج هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ (٨٢) ع وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا ٩ ع ١١ ٩
تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ
مُّعْرِضُوْنَ (٨٣) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (٨٤) ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہی جنّتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع

یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو

سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں، لہٰذا جہنّم کی آگ ہم پر حرام ہے، اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی، تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنّت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ
عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ
مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ

قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیے کا لین دین کرتے ہو، حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دُوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟[۹۲] پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو —— یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دُنیا کی زندگی خرید لی ہے،

---

۹۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینے کے اطراف کے یہودی قبائل نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں (اَوس اور خَزرَج) سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ دُوسرے قبیلے سے برسرِ جنگ ہوتا، تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بُوجھتے کتاب اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلے کے اسیرانِ جنگ دُوسرے یہودی قبیلے کے ہاتھ آتے تھے، تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیے کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے اِستدلال کیا جاتا تھا۔ گویا وہ کتاب اللہ کی اِس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ع ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز وَفَرِيْقًا
تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

لٰہذا نہ اِن کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انھیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع

ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، آخر کار عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی۔[۹۳] پھر یہ تمھارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا! ـــــ وہ کہتے ہیں: ہمارے دل محفوظ ہیں۔[۹۴] نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ـــــ اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟

کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے، مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

۹۳ - ''رُوحِ پاک'' سے مراد علمِ وحی بھی ہے، اور جبریلؑ بھی جو وحی کا علم رکھتے تھے، اور خود حضرت مسیحؑ کی اپنی پاکیزہ رُوح بھی، جس کو اللہ نے قُدسی صفات بنایا تھا۔ ''روشن نشانیوں'' سے مُراد وہ کُھلی کُھلی علامات ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالبِ حق انسان یہ جان سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

۹۴ - یعنی ہم اپنے عقیدہ و خیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو، ہمارے دلوں پر تمھاری بات کا اثر نہ ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو تمام ایسے ہٹ دھرم لوگ کہا کرتے ہیں جن کے دل و دماغ پر جاہلانہ تعصّب کا تسلّط ہوتا ہے۔ وہ اسے عقیدے کی مضبوطی کا نام دے کر ایک خوبی شمار کرتے ہیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نُصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا[۹۵]۔ خدا کی لعنت ان مُنکرین پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلّی حاصل کرتے ہیں[۹۶] کہ جو ہدایت اللہ نے

اپنے موروثی عقائد و افکار پر جم جانے کا فیصلہ کر لے، خواہ ان کا غلط ہونا کیسے ہی قوی دلائل سے ثابت کر دیا جائے۔

۹۵ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جس کی بِعثت کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاؑ نے کی تھیں۔ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عُروج کا دَور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بِعثتِ محمدؐی سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی اُمّید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیۂ کلام یہی تھا کہ ”اچھا، اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے، جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔“ اہلِ مدینہ یہ باتیں سُنے ہوئے تھے، اسی لیے جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا، کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو، پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی، جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گِن رہے تھے، اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”وہ اس کو پہچان بھی گئے“، تو اس کے متعدّد ثبوت اُسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ معتبر شہادت اُمّ المومنین حضرت صَفِیّہؓ کی ہے، جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور ایک دُوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے، تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم! ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ
فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَ اِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ
تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ

نازل کی ہے، اس کو قبول کرنے سے صرف اِس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا، نواز دیا![۹۷] لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلّت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، تو وہ کہتے ہیں: ”ہم تو صرف اُس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو ہمارے ہاں (یعنی نسلِ اسرائیل میں) اُتری ہے۔“ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ حق ہے اور اُس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا، ان سے کہو: اگر تم اُس تعلیم ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی، تو اس سے پہلے اللہ کے اُن پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟

والد: ہاں۔

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے، اس کی مُخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(ابنِ ہشام، جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید)

۹۶ – اِس آیت کا دُوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”کیسی بُری چیز ہے، جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔“ یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ

تمھارے پاس موسیٰؑ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آیا۔ پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ پھر ذرا اُس میثاق کو یاد کرو، جو طُور کو تمھارے اوپر اُٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں، ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سُن لیا، مگر مانیں گے نہیں۔ اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہُوا تھا۔ کہو: اگر تم مومن ہو، تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بُری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

اِن سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو[۹۸]، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو ــــ یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے

---

۹۷ - یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دُوسری قوم میں پیدا ہوا، جسے وہ اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے، تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا، جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا، نواز دیا، تو وہ بگڑ بیٹھے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ
بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

معانقۃ ۲

۱۱ ع ۱۱

(کہ یہ وہاں جانے کی تمنّا نہ کریں)، اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے،[۹۹] حتّٰی کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے، حالانکہ لمبی عمر بہرحال اُسے عذاب سے تو دُور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں، اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔ ع

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو،[۱۰۰] اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریلؑ نے اللہ ہی کے اِذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے،[۱۰۱] جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے[۱۰۲] اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔[۱۰۳]

---

۹۸ – یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے اُن کی دُنیا پرستی پر۔ جن لوگوں کو واقعی دارِ آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے، وہ دُنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

۹۹ – اصل میں عَلٰی حَیٰوۃٍ کا لفظ ارشاد ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: کسی نہ کسی طرح کی زندگی۔ یعنی انھیں محض زندگی کی حرص ہے، خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزّت اور شرافت کی ہو یا ذلّت اور کمینہ پن کی۔

۱۰۰ – یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں ہی کو بُرا نہ کہتے تھے، بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریلؑ کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔ وہ رحمت کا نہیں، عذاب کا فرشتہ ہے۔

۱۰۱ – یعنی اس بنا پر تمھاری گالیاں جبریلؑ پر نہیں بلکہ خداوندِ برتر کی ذات پر پڑتی ہیں۔

۱۰۲ – مطلب یہ ہے کہ یہ گالیاں تم اسی لیے تو دیتے ہو کہ جبریلؑ یہ قرآن لے کر آیا ہے، اور حال یہ ہے کہ یہ قرآن سراسر توراۃ کی تائید میں ہے۔ لہٰذا تمھاری گالیوں میں توراۃ بھی حصّے دار ہوئی۔

۱۰۳ – اِس میں لطیف اشارہ ہے اس مضمون کی طرف کہ نادانو! اصل میں تمھاری ساری ناراضی ہدایت اور راہِ راست

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ
اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا
يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ
اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

(اگر جبریل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے، تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کے دشمن ہیں، اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں۔ اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انھوں نے کوئی عہد کیا، تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اُسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں، جو سچّے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی، تو اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پسِ پُشت ڈالا، گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین، سلیمانؑ کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے[۱۰۴] تھے، حالانکہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا،

کے خلاف ہے، تم لڑ رہے ہو اُس صحیح رہنمائی کے خلاف، جسے اگر سیدھی طرح مان لو تو تمھارے ہی لیے کامیابی کی بشارت ہو۔

۱۰۴ – شیاطین سے مراد شیاطینِ جن اور شیاطینِ اِنس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ
اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

کُفر کے مُرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادُوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابِل میں دو فرشتوں، ہارُوت و مارُوت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے، تو پہلے صاف طور پر مُتنبّہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کُفر میں مُبتلا نہ ہو[105]۔" پھر بھی

جب بنی اسرائیل پر اَخلاقی و مادّی انحطاط کا دَور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت وافلاس اور ذلّت وپستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اُولُوا العزمی باقی نہ چھوڑی، تو ان کی توجُّہات جادو ٹونے اور طِلسمات و "عملیات" اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مَشقّت اور جِدّوجُہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمانؑ کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نُقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمھیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمتِ غیر مُترَقّبہ سمجھ کر اِن چیزوں پر ٹوٹ پڑے، اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعیِ حق کی آواز انھوں نے سُن کر دی۔

۱۰۵ - اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پُوری قوم بابِل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لُوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پِیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انھوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دُوسری طرف وہ اِتمامِ حُجّت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو، ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نُقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کار پرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد وپیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آ کر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سِکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں، تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جُرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجایش باقی نہ رہنے دیں۔

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا
يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ؕ۫ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جُدائی ڈال دیں[۱۰۶]۔ ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا، اس کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انھیں معلوم ہوتا!

---

۱۰۶ – مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کر لے۔ یہ اَخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا، جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اَخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

اِزدِواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدُّن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی دُرستی پر پورے انسانی تمدُّن کی دُرستی کا، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدُّن کی خرابی کا مدار ہے۔ لٰہذا وہ شخص بدترین مُفسِد ہے جو اُس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اُس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ابلیس اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ ایجنٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں فتنہ برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے: میں نے فُلاں شر کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جُدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سُن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے، انھیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا ''عمل'' ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اَخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

۱۳ ع ۱۲ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ

اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے، تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا، وہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ کاش اُنھیں خبر ہوتی! ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رَاعِنَا[107] نہ کہا کرو، بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو،[108]

---

۱۰۷ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رُکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو اسلام اور اسلامی جماعت کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، اُن شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور اُن خاص خاص نِکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی، تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی مُوشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری اِن سیدھے اور سچّے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے اور خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر پُرفریب مکّارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیّت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

۱۰۸ – یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے، تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذُومعنیٰ الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپؐ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدّد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذُومعنیٰ لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے، تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے مِلتا جُلتا ایک لفظ تھا، جس کے معنیٰ تھے: ”سُن، تو بہرا ہو جائے۔“ اور خود عربی میں اس کے ایک معنیٰ صاحبِ رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو، تو ہم تمھاری سنیں۔ اور ذرا زبان کو لچکا دے کر رَاعِیْنَا بھی بنا لیا جاتا تھا، جس کے معنیٰ ”اے ہمارے چرواہے“ کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ ”توجہ سے بات کو سنو“، یعنی یہودیوں کو تو بار بار

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ
الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿١٠٥﴾
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ

یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے، اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔[109] کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی

یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبیؐ کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دَوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہییں، تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

۱۰۹ - یہ ایک خاص شبہے کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے، تو اُن کے بعض احکام کی جگہ اِس میں دُوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمھارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصّے کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں، بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے مِن جانبِ اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں، حافظوں سے محو کر دوں۔ مگر جس چیز کو مَیں منسوخ یا محو کرتا ہوں، اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں، یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا
نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى
مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟

پھر کیا تم اپنے رسولؐ سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو، جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے جا چکے ہیں؟[110] حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا، وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔ اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو،[111] یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ (تعالیٰ)

اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔

۱۱۰ – یہودی مُوشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبیؐ سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مُتنبّہ فرما رہا ہے کہ اس معاملے میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی مسلمانوں کو بار بار مُتنبّہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمّتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا، ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے، اس کی پیروی کرو اور جن اُمور سے منع کیا جاتا ہے، ان سے رُک جاؤ،

عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا
تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ
اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳ ع ۳

ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ اُن کی تمنائیں ہیں[112]۔ ان سے کہو: اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیّت ہے، نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ ع

دُور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صَرف کرو۔

۱۱۱ – یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحثیں اور مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ فضولیات میں اپنی قوتیں صَرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صَرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے، نہ کہ وہ۔

۱۱۲ – یعنی دراصل یہ ہیں تو محض ان کے دل کی خواہشیں اور آرزوئیں، مگر وہ انھیں بیان اس طرح کر رہے ہیں کہ گویا فی الواقع یہی کچھ ہونے والا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى
لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ
يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں: یہودیوں کے پاس کچھ نہیں ــــ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں ــــ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں، جن کے پاس کتاب کا علم نہیں[۱۱۳] ہے۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے روز کر دے گا۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں، اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں[۱۱۴]۔ ان کے لیے تو دُنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں

---

[۱۱۳] یعنی مشرکینِ عرب۔

[۱۱۴] یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اس قسم کے ظالم لوگوں کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے مُتوَلّی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے مُتوَلّی رہیں، تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی، تو انھیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے ــــ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکّہ کے اِس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے اُن لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے، بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا۔

عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۗ
بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ

عذابِ عظیم۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔[۱۱۵] اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔[۱۱۶]

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی مِلک ہیں، سب کے سب اس کے مطیعِ فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ”ہو جا“ اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں

---

۱۱۵ – یعنی اللہ نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ وہ تمام سَمتوں اور مَقاموں کا مالک ہے، مگر خود کسی سَمت یا کسی مَقام میں مُقیّد نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کے لیے کسی سَمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس طرف رہتا ہے۔ اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سَمت کو کیوں بدل دیا۔

۱۱۶ – یعنی اللہ تعالیٰ محدود، تنگ دل، تنگ نظر اور تنگ دست نہیں ہے، جیسا کہ تم لوگوں نے اپنے اوپر قیاس کر کے اسے سمجھ رکھا ہے، بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویۂ نظر اور دائرۂ فیض بھی وسیع، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں، کس وقت، کس نیت سے اس کو یاد کر رہا ہے۔

اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ
قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ
بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنۡ
تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ

آتی؟[۱۱۷] ایسی ہی باتیں اِن سے پہلے لوگ بھی کیا کرتے تھے۔ اِن سب (اگلے پچھلے گمراہوں) کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔[۱۱۸] یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔[۱۱۹] (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہوگی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔[۱۲۰] اب جو لوگ جہنّم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں، ان کی طرف سے تم ذمّہ دار و جواب دِہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔[۱۲۱] صاف کہہ دو

---

۱۱۷ – اُن کا مطلب یہ تھا کہ خدا، یا تو خود ہمارے سامنے آ کر کہے کہ یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے احکام ہیں، تم لوگ ان کی پیروی کرو، یا پھر ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھائی جائے، جس سے ہمیں یقین آ جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خدا کی طرف سے ہے۔

۱۱۸ – یعنی آج کے گمراہوں نے کوئی اعتراض اور کوئی مُطالبہ ایسا نہیں گھڑا ہے، جو ان سے پہلے کے گمراہ پیش نہ کر چکے ہوں۔ قدیم زمانے سے آج تک گمراہی کا ایک ہی مزاج ہے اور وہ بار بار ایک ہی قسم کے شبہات اور اعتراضات اور سوالات دُہراتی رہتی ہے۔

۱۱۹ – یہ بات کہ خدا خود آ کر ہم سے بات کیوں نہیں کرتا، اس قدر مُہمَل تھی کہ اس کا جواب دینے کی حاجت نہ تھی۔ جواب صرف اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہمیں نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ اور جواب یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار موجود ہیں، مگر جو ماننا چاہتا ہی نہ ہو، اسے آخر کون سی نشانی دکھائی جا سکتی ہے۔

۱۲۰ – یعنی دُوسری نشانیوں کا کیا ذکر، نمایاں ترین نشانی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی شخصیت ہے۔ آپؐ کے نبوت سے پہلے کے حالات، اور اُس قوم اور ملک کے حالات جس میں آپؐ پیدا ہوئے، اور وہ حالات جن میں آپؐ نے پرورش پائی اور ۴۰ برس زندگی بسر کی، اور پھر وہ عظیم الشان کارنامہ جو نبی ہونے کے بعد آپؐ نے انجام دیا، یہ سب کچھ

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

وقف منزل

ع ۱۴ ۱۴

کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچّے دل سے ایمان لاتے ہیں۔[۱۲۲] اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویّہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں ع

ایک ایسی روشن نشانی ہے جس کے بعد کسی اور نشانی کی حاجت نہیں رہتی۔

۱۲۱ – مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ناراضی کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ وہ سچّے طالبِ حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے۔ وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اُصول و احکام کو اپنے تخیُّلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اُس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جَو فروشی کیوں نہ کی، جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے۔ لہٰذا انھیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرلو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد و اعمال کی اُنھی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں، اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

۱۲۲ – یہ اہلِ کتاب کے صالح عُنصر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رُو سے حق ہے، اُسے حق مان لیتے ہیں۔

يٰبَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ
فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ
شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

---

[۱۲۳] اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت، جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا، اور یہ کہ مَیں نے تمھیں دُنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی تھی۔ اور ڈرو اُس دن سے، جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی، اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

۱۲۳- یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل اُمور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

(۱) حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرقِ اُردُن میں اپنے بھتیجے حضرت لُوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو، اور اندرُونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا، جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک، حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دُوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ اُن کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثّر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انھی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے، حضرت اسحاقؑ کی اولاد، جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسُفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیا علیہم السلام پیدا ہوئے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا، اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اُن کی تبلیغ سے جن دُوسری قوموں نے اُن کا دین قبول کیا، انھوں نے یا تو اپنی انفرادیّت ہی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً اِن کے متّبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزُّل کا دَور آیا، تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

(۳) حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دُنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت

کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام دُرست کرتا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دُنیا میں اُس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی، جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا، جو حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیا پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سُپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالَم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی، جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المَقدِس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المَقدِس ہی دعوت اِلی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔

(۴) پچھلے دس رُکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن کی تاریخی فردِ قرار دادِ جُرم اور ان کی وہ موجودہ حالت، جو نُزولِ قرآن کے وقت تھی، بے کم و کاست پیش کر دی ہے اور ان کو بتا دیا ہے کہ تم ہماری اُس نعمت کی انتہائی ناقدری کر چکے ہو جو ہم نے تمھیں دی تھی۔ تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ منصبِ امامت کا حق ادا کرنا چھوڑ دیا، بلکہ خود بھی حق اور راستی سے پھر گئے، اور اب ایک نہایت قلیل عُنصرِ صالح کے سوا تمھاری پوری اُمّت میں کوئی صلاحیّت باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) اس کے بعد اب انھیں بتایا جا رہا ہے کہ امامت ابراہیمؑ کے نُطفے کی میراث نہیں ہے، بلکہ یہ اس سچّی اطاعت و فرماں برداری کا پھل ہے، جس میں ہمارے اُس بندے نے اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا، اور اس کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے طریقے پر خود چلیں اور دُنیا کو اس طریقے پر چلانے کی خدمت انجام دیں۔ چونکہ تم اس طریقے سے ہٹ گئے ہو اور اس خدمت کی اہلیّت پُوری طرح کھو چکے ہو، لہٰذا تمھیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے۔

(۶) ساتھ ہی اشاروں میں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جو غیر اسرائیلی قومیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑتی ہیں، وہ بھی ابراہیمی طریقے سے ہٹی ہوئی ہیں۔ نیز مشرکینِ عرب بھی، جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں، محض نسل و نسب کے فخر کو لیے بیٹھے ہیں۔ ورنہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے طریقے سے اب ان کو دور کا واسطہ بھی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا ان میں سے بھی کوئی امامت کا مستحق نہیں ہے۔

(۷) پھر یہ بات ارشاد ہوتی ہے کہ اب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دُوسری شاخ، بنی اسماعیلؑ میں وہ رسولؐ پیدا کیا ہے، جس کے لیے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دُعا کی تھی۔ اس کا طریقہ وہی ہے، جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور دُوسرے تمام انبیاؑ کا تھا۔ وہ اور اس کے پیرو تمام ان پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں جو دنیا میں خدا کی طرف سے آئے ہیں، اور اسی راستے کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں جس کی طرف سارے انبیاؑ دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا اب امامت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس رسول کی پیروی کریں۔

(۸) تبدیلیِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا[۱۲۴] اور وہ اُن سب میں پُورا اُتر گیا، تو اس نے کہا: ”میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“ ابراہیمؑ نے عرض کیا: ”اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟“ اس نے جواب دیا: ”میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں[۱۲۵] ہے۔“

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ

جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا، بیت المَقْدِس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المَقْدِس ہی کو قبلہ بنائے رہے۔ مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باضابطہ معزول کر دیے گئے، تو بیت المَقْدِس کی مرکزیّت آپ سے آپ ختم ہوگئی۔ لہٰذا اعلان کیا گیا کہ اب وہ مَقام دینِ الٰہی کا مرکز ہے، جہاں سے اِس رسول کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ اور چونکہ ابتدا میں ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا مرکز بھی یہی مَقام تھا، اس لیے اہلِ کتاب اور مشرکین، کسی کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ قبلہ ہونے کا زیادہ حق کعبے ہی کو پہنچتا ہے۔ ہٹ دھرمی کی بات دُوسری ہے کہ وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی اعتراض کیے چلے جائیں۔

(۹) اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت اور کعبے کی مرکزیّت کا اعلان کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے اُنیسویں رکوع سے آخر سورۂ بَقَرہ تک مسلسل اس اُمّت کو وہ ہدایات دی ہیں، جن پر اسے عمل پیرا ہونا چاہیے۔

۱۲۴ – قرآن میں مختلف مَقامات پر اُن تمام سخت آزمایشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے، جن سے گزر کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آپ کو اس بات کا اہل ثابت کیا تھا کہ انھیں بنی نوعِ انسان کا امام و رہنما بنایا جائے۔ جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا، اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں، جن سے انسان محبّت کرتا ہے، اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں، جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا، جسے انھوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔

۱۲۵ – یعنی یہ وعدہ تمھاری اولاد کے صرف اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو۔ ان میں سے جو ظالم ہوں گے، اُن کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسمٰعیل

اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ
اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

ابراہیمؑ جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔[۱۲۶]

اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دُعا کی: ”اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔“ جواب میں اس کے رب نے فرمایا: ”اور جو نہ مانے گا، دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں گا،[۱۲۷] مگر آخر کار اُسے عذابِ جہنّم کی طرف گھسیٹوں گا، اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔“

اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں۔

۱۲۶- پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اُسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دُوسرے کو مالک، معبود، حاجت روا اور فریاد رَس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اُسے گندا کر دیا۔ یہ آیت ایک نہایت لطیف طریقے سے مشرکینِ قریش کے جُرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ ظالم لوگ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے وارث ہونے پر فخر تو کرتے ہیں، مگر وِراثت کا حق ادا کرنے کے بجائے اُلٹا اس حق کو پامال کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا، اس سے جس طرح بنی اسرائیل مُستثنیٰ ہو گئے ہیں، اسی طرح یہ مشرک بنی اسماعیل بھی اس سے مُستثنیٰ ہیں۔

۱۲۷- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصبِ امامت کے متعلق پوچھا تھا، تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمھاری اولاد کے صرف مومن و صالح لوگوں کے لیے ہے، ظالم اس سے مُستثنیٰ ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا
وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۸ ۱۵
وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور یاد کرو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اُٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: ”اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تُو سب کی سُننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب! ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا، جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تُو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے رب! ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اُٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے[۱۲۸]۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے[۱۲۹]۔“ ع

اب کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو، اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟

رزق کے لیے دُعا کرنے لگے، تو سابق فرمان کو پیشِ نظر رکھ کر اُنھوں نے صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لیے دُعا کی، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انھیں بتایا کہ امامتِ صالحہ اور چیز ہے اور رزقِ دُنیا دُوسری چیز۔ امامتِ صالحہ صرف مومنینِ صالحین کو ملے گی، مگر رزقِ دُنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزقِ دُنیا فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو، تو وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور وہی خدا کی طرف سے پیشوائی کا مستحق بھی ہے۔

۱۲۸ – زندگی سنوارنے میں خیالات، اَخلاق، عادات، معاشرت، تمدُّن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى
بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ
فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ
يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا
نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

ابراہیمؑ تو وہ شخص ہے، جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چُن لیا تھا، اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا: ”مُسلم[۱۳۰] ہوجا“، تو اس نے فوراً کہا: ”میں مالکِ کائنات کا ”مسلم“ ہوگیا۔“ اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیّت[۱۳۱] یعقوبؑ اپنی اولاد کو کر گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ”میرے بچّو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین[۱۳۲] پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔“ پھر کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پُوچھا: ”بچّو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟“ ان سب نے جواب دیا: ”ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے، جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے

---

۱۲۹ - اس سے یہ بتانا مقصُود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا جواب ہے۔

۱۳۰ - مُسْلِم: وہ جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خَم کردے، خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبُود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سُپرد کردے اور اُس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے، جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے اور اس طرزِ عمل کا نام ”اسلام“ ہے اور یہی تمام انبیاؑ کا دین تھا جو ابتدائے آفرینش سے دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں آئے۔

۱۳۱ - حضرت یعقوبؑ کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل براہِ راست انھی کی اولاد تھے۔

۱۳۲ - دین، یعنی طریقِ زندگی، نظامِ حیات، وہ آئین جس پر انسان دُنیا میں اپنے پُورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل

وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝١٣٣ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٣٤ وَ
قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا

خدا مانا ہے اور ہم اُسی کے مسلم ہیں۔[۱۳۳]''

وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر گئے۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔[۱۳۴]

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ اِن سے کہو: ''نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔ اور ابراہیمؑ مشرکوں

کی بنا رکھے۔

۱۳۳- بائبل میں حضرت یعقوبؑ کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے، مگر حیرت ہے کہ اس وصیّت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تَلمُود میں جو مفصّل وصیت درج ہے، اس کا مضمون قرآن کے بیان سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں حضرت یعقوبؑ کے یہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں:

> ''خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا، وہ تمھیں اُسی طرح تمام آفات سے بچائے گا، جس طرح تمھارے آبا و اجداد کو بچاتا رہا ہے...... اپنے بچوں کو خدا سے محبّت کرنے اور اس کے احکام بجالانے کی تعلیم دینا، تاکہ ان کی مُہلتِ زندگی دراز ہو، کیوں کہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے، جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک چلتے ہیں۔'' جواب میں اُن کے لڑکوں نے کہا: ''جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے، ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو!'' تب یعقوبؑ نے کہا: ''اگر تم خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے، تو خدا ضرور تمھارے ساتھ رہے گا۔''

۱۳۴- یعنی اگرچہ تم اُن کی اولاد سہی، مگر حقیقت میں تمھیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اُن کا نام لینے کا تمھیں کیا حق ہے جب کہ تم اُن کے طریقے سے پھر گئے۔ اللہ کے ہاں تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمھارے باپ دادا کیا کرتے تھے، بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ تم خود کیا کرتے رہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ''جو کچھ اُنھوں نے کمایا، وہ اُن کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے، وہ تمھارے لیے ہے''، یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں، قرآن اپنی زبان میں اسے کسب یا کمائی کہتا ہے۔

كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

میں سے نہ تھا۔[۱۳۵]'' مسلمانو! کہو کہ: ''ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق

ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا بُرا نتیجہ رکھتا ہے، جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیّت اسی نتیجے کی ہے، اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے ''کسب'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

۱۳۵۔ اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں نگاہ میں رکھیے:

ایک، یہ کہ یہُودیّت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ ''یہُودیت'' اپنے اِس نام اور اپنی مذہبی خُصُوصیات اور رُسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبلِ مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور ''عیسائیت'' جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے، وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسرِ ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے، تو حضرت ابراہیمؑ اور دُوسرے انبیاؑ اور نیک لوگ، جو اِن مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ''یہُودیّت'' اور ''عیسائیت'' نہ تھی۔ لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار اُن مذہبی خصوصیّات پر نہیں ہے، جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں، بلکہ دراصل اس کا مدار اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے، جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دُوسرے، یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دُوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی کی صفات و خصوصیّات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرایا جائے۔ لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اُس راہِ راست سے منحرف ہوگئی ہیں، جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔

مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ

نہیں کرتے[۱۳۶] اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔"

پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو، تو ہدایت پر ہیں، اور اگر اس سے منہ پھیریں، تو کھُلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلے میں اللہ تمھاری حمایت کے لیے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔
کہو: "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔[۱۳۷] اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟

---

۱۳۶ – پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہیں کرتے کہ فُلاں حق پر تھا اور فُلاں حق پر نہ تھا، یا یہ کہ ہم فُلاں کو مانتے ہیں اور فُلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں، سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے آئے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنیٰ میں حق پرست ہے، اُس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اُس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں، جسے وہ مانتے ہیں، کیونکہ انھوں نے دراصل اُس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں پایا ہے، جسے حضرت موسیٰؑ، یا عیسیٰؑ، یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا، بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ اُن کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصّب اور آبا و اجداد کی اندھی تقلید ہے، نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی۔

۱۳۷ – اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ "ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا"، دوسرے، یہ کہ "اللہ کا رنگ اختیار کرو۔" مسیحیّت کے ظہور سے پہلے یہودیوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جو شخص اُن کے مذہب میں داخل ہوتا، اُسے غسل دیتے تھے اور اِس غُسل کے معنیٰ ان کے ہاں یہ تھے کہ گویا اس کے گناہ دُھل گئے اور اس نے زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔ یہی چیز بعد میں مسیحیوں نے اختیار کر لی۔ اس کا اصطلاحی نام ان کے ہاں اِصطباغ (بپتسمہ) ہے اور یہ اِصطباغ نہ صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اُن کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں، بلکہ بچوں کو بھی دیا جاتا ہے۔ اسی کے متعلق قرآن کہتا ہے: اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے؟ اللہ کا رنگ اختیار کرو، جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا، بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ
رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ
مُخْلِصُوْنَ (۱۳۹) ۙ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ
ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً

اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔“

اے نبیؐ! ان سے کہو: ”کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔[۱۳۸] ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، تمھارے اعمال تمھارے لیے، اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔[۱۳۹] یا پھر کیا تمھارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ سب کے سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ کہو: ”تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟[۱۴۰] اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمّے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور

---

۱۳۸ - یعنی ہم یہی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہم سب کا رب ہے اور اسی کی فرماں برداری ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو؟ جھگڑے کا اگر کوئی موقع ہے بھی، تو وہ ہمارے لیے ہے، نہ کہ تمھارے لیے، کیونکہ اللہ کے سوا دُوسروں کو بندگی کا مستحق تم ٹھیرا رہے ہو نہ کہ ہم۔

”اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ“ کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”کیا تمھارا جھگڑا ہمارے ساتھ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہے؟“ اِس صُورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر واقعی تمھارا یہ جھگڑا نفسانی نہیں ہے، بلکہ خدا واسطے کا ہے، تو یہ بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔

۱۳۹ - یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر اپنی بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دُوسروں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیرا کر ان کی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو، تو تمھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس کا انجام خود دیکھ لو گے۔ ہم تمھیں زبردستی اس سے روکنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہم نے اپنی بندگی، اطاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے۔ اگر تم تسلیم کر لو کہ ہمیں بھی ایسا کرنے کا اختیار ہے، تو خواہ مخواہ کا یہ جھگڑا آپ ہی ختم ہو جائے۔

۱۴۰ - یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے اُن جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلیل القدر

عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾
تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶ ۱۶ ۱۲

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ الجزء ۲
كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

وہ اُسے چھپائے؟ تمھاری حرکات سے اللہ غافل تو نہیں ہے[۱۴۱] ـــــ وہ کچھ لوگ تھے، جو گزر چکے۔ اُن کی کمائی اُن کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے۔ تم سے اُن کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔‘‘ ع

نادان لوگ ضرور کہیں گے: انھیں کیا ہُوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس سے یکایک پھر گئے؟[۱۴۲] اے نبیؐ! ان سے کہو: ’’مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔[۱۴۳] اور اِسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک ’’اُمّتِ وَسَط‘‘ بنایا ہے

انبیاؑ سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

۱۴۱ – یہ خطاب اُن کے علما سے ہے، جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاؑ کے مدّتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، صُوفیہ اور متکلّمین نے وضع کیے، اُنھی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علما سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ انبیا علیہم السّلام آخر تمھارے اِن فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے، تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انھیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاؑ نہ یہودی تھے، نہ عیسائی، تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔

۱۴۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المَقدِس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ پھر کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔[۱۴۴]

۱۴۳ - یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اُن کے دماغ تنگ تھے، نظر محدود تھی، سَمت اور مقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سَمت میں مُقیَّد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کی تردید میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ کسی سَمت کو قبلہ بنانے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی طرف ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے، وہ اس قسم کی تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لیے عالمگیر حقیقتوں کے اِدراک کی راہ کُھل جاتی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

۱۴۴ - یہ اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ ”اسی طرح“ کا اشارہ دونوں طرف ہے: اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پَیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ ”اُمّتِ وَسَط“ قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سَمت سے دُوسری سَمت کی طرف پِھرنا سمجھ رہے ہیں، حالانکہ دراصل بیت المَقدِس سے کعبے کی طرف سَمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

”اُمّتِ وَسَط“ کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں ”اُمّتِ وَسَط“ اس لیے بنایا گیا ہے کہ ”تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو“، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اُس وقت رسولؐ ہمارے ذمہ دار نمایندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مَقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسولؐ نے تمھیں دکھایا تھا، وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مَقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے، وہیں ذمّہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا
عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ

پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے، اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔[۱۲۵] یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر اُن لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہُوا، جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمھارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا،

عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اِسی طرح اِس اُمت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتّٰی کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنٰی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری بڑی سخت تھی، حتّٰی کہ اگر وہ اِس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے ہاں ماخوذ ہوتے، اُسی طرح دُنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمّہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسولؐ کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دَور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، اُن سب کے لیے ائمّۂ شر اور شیاطینِ اِنس و جنّ کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے۔

۱۲۵ – یعنی اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیّت کے تعصُّبات اور خاک و خون کی غلامی میں مبتلا ہیں، اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہلِ عرب اپنے وطنی و نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کَعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المَقدِس کو قبلہ بنانا ان کی اِس قوم پرستی کے بُت پر نا قابلِ برداشت ضرب تھا۔ دُوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دُوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اُس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسولؐ انھیں بُلا رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے ان بُت پرستوں کو سچّے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المَقدِس کو قبلہ مقرر کیا، تاکہ جو لوگ عَربیّت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا، تاکہ جو اسرائیلیّت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں۔

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ

یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں نہایت شفیق و رحیم ہے۔

یہ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو، ہم اُسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجدِ حرام کی طرف رُخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔[۱۴۶]

اِس طرح صرف وہ لوگ رسولؐ کے ساتھ رہ گئے، جو کسی بت کے پرستار نہ تھے، محض خدا کے پرستار تھے۔

۱۴۶- یہ ہے وہ اصل حکم، جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم رجب یا شعبان ۲ ہجری میں نازل ہوا۔ ابنِ سعد کی رِوایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بِشرؓ بن براء بن مَعرُور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپؐ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی وقت آپؐ اور آپؐ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المَقدِس سے کعبے کے رُخ پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی عام مُنادی کی گئی۔ براءؓ بن عازِب کہتے ہیں کہ ایک جگہ مُنادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رُکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مُڑ گئے۔ اَنسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سَلَمہ میں یہ اطلاع دُوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: ”خبردار رہو! قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔“ سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رُخ بدل دیا۔

خیال رہے کہ بیت المَقدِس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں۔ نمازِ باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہو گا اور مقتدیوں کو صرف رُخ ہی نہ بدلنا پڑا ہو گا، بلکہ کچھ نہ کچھ انھیں بھی چل کر اپنی صفیں دُرست کرنی پڑی ہوں گی۔ چنانچہ بعض رِوایات میں یہی تفصیل مذکور بھی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”ہم تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں“ اور یہ کہ ”ہم اسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں، جسے تم پسند کرتے ہو“، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِس کے منتظر تھے۔ آپؐ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت کا دَور ختم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ بیت المَقدِس کی مرکزیت بھی رخصت ہوئی۔ اب اصل مرکزِ ابراہیمی کی طرف رُخ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ
مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وقف لازم

یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویلِ قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے ہے اور برحق ہے، مگر اس کے باوجود جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم ان اہلِ کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمھارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمھارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دُوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد، جو تمھارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو یقیناً تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔[۱۴۷]

مسجد حرام کے معنیٰ ہیں: حُرمت اور عزّت والی مسجد۔ اس سے مراد وہ عبادت گاہ ہے، جس کے وسط میں خانۂ کعبہ واقع ہے۔

کعبے کی طرف رُخ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی خواہ دُنیا کے کسی کونے میں ہو، اُسے بالکل ناک کی سیدھ میں کعبے کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت، ہر شخص کے لیے، ہر جگہ مشکل ہے۔ اسی لیے کعبے کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ کہ کعبے کی سیدھ میں۔ قرآن کی رُو سے ہم اس بات کے لیے ضرور مُکلّف ہیں کہ حتیّ الامکان صحیح سَمتِ کعبہ کی تحقیق کریں، مگر اس بات پر مُکَلَّف نہیں ہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سَمت معلوم کرلیں۔ جس سَمت کے متعلق ہمیں امکانی تحقیق سے ظنِ غالب حاصل ہوجائے کہ یہ سَمتِ کعبہ ہے، اُدھر نماز پڑھنا یقیناً صحیح ہے۔ اور اگر کہیں آدمی کے لیے سَمتِ قبلہ کی تحقیق مشکل ہو، یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلے کی طرف اپنی سَمت قائم نہ رکھ سکتا ہو (مثلاً ریل یا کشتی میں)، تو جس طرف اسے قبلے کا گمان ہو، یا جس طرف رخ کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر دورانِ نماز میں صحیح سَمتِ قبلہ معلوم ہوجائے یا صحیح سَمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہوجائے، تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیے۔

۱۴۷ – مطلب یہ ہے کہ قبلے کے متعلق جو حُجّت وبحث یہ لوگ کرتے ہیں، اُس کا فیصلہ نہ تو اِس طرح ہوسکتا ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ
هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ
بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾

وقف منزل

ع ١٧ ١

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس مقام کو (جسے قبلہ بنایا گیا ہے) ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں،[١٤٨] مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بُوجھتے حق کو چُھپا رہا ہے۔ یہ قطعی ایک امرِ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی شک میں نہ پڑو۔ ع

ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے، جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔[١٤٩] جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تمھیں پا لے گا۔ اُس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

دلیل سے انھیں مطمئن کر دیا جائے، کیونکہ یہ تعصُّب اور ہٹ دھرمی میں مُبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اُس قبلے کو چھوڑ نہیں سکتے، جسے یہ اپنی گروہ بندی کے تعصُّبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں۔ اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلے کو اختیار کر لو، کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے، جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اسے اختیار کر لینے سے قبلے کا جھگڑا اُچک جائے۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں۔ ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی گروہ کو راضی کر سکو گے۔ دُوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھارا یہ کام ہے ہی نہیں کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اُصُول پر مُصالحَت کیا کرو۔ تمھارا کام تو یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمھیں دیا ہے، سب سے بے پروا ہو کر صرف اُسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے، تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کرو گے اور اُس نعمت کی ناشکری کرو گے، جو دنیا کا امام بنا کر ہم نے تمھیں بخشی ہے۔

١٤٨- یہ عرب کا محاورہ ہے۔ جس چیز کو آدمی یقینی طَور پر جانتا ہو اور اُس کے متعلق کسی قسم کا شک و اشتباہ نہ رکھتا و، اُسے یُوں کہتے ہیں کہ وہ اس چیز کو ایسا پہچانتا ہے، جیسا اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔ یعنی جس طرح اُسے اپنے بچوں کو بچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح وہ بِلا کسی شک کے یقینی طور پر اس چیز کو بھی جانتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے ما حقیقت میں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کعبے کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا اور اس کے برعکس بیت المقدِس

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ
حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَ

تمھارا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہیں سے اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف پھیر دو، کیونکہ یہ تمھارے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے، اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور جہاں سے بھی تمھارا گزر ہو، اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف پھیرا کرو، اور جہاں بھی تم ہو، اُسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو، تاکہ لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حُجّت نہ ملے[150] — ہاں جو ظالم ہیں، اُن کی زبان کسی حال میں بند نہ ہو گی۔ تو اُن سے تم نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو — اور

اُس کے ۱۳ سو برس بعد حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں تعمیر ہوا اور اُنھی کے زمانے میں قبلہ قرار پایا۔ اس تاریخی واقعے میں ان کے لیے ذرہ برابر کسی اشتباہ کی گنجایش نہ تھی۔

۱۴۹- پہلے فقرے اور دُوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، جسے سامع خود تھوڑے سے غور و فکر سے بھر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز جسے پڑھنی ہو گی، اسے بہر حال کسی نہ کسی سَمت کی طرف تو رُخ کرنا ہی ہو گا۔ مگر اصل چیز وہ رُخ نہیں ہے، جس طرف تم مڑتے ہو، بلکہ اصل چیز وہ بھلائیاں ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لیے تم نماز پڑھتے ہو۔ لہٰذا سَمت اور مقام کی بحث میں پڑنے کے بجائے تمھیں فکر بھلائیوں کے حُصُول ہی کی ہونی چاہیے۔

۱۵۰- یعنی ہمارے اس حکم کی پُوری پابندی کرو۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سَمت کے سوا کسی دُوسری سَمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے۔ ورنہ تمھارے دُشمنوں کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ کیا خوب اُمّتِ وَسَط ہے، کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں، جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔

لِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۙ﴿۱۵۰﴾ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ
رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ
معانقة ۳ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۱۵۱﴾
۱۸ ع ۲ فَاذۡكُرُوۡنِىۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ع ﴿۱۵۲﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اس لیے کہ مَیں تم پر اپنی نعمت پُوری کر دوں[۱۵۱] اور اس توقع پر[۱۵۲] کہ میرے اس حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح کا راستہ پاؤ گے جس طرح (تمھیں اِس چیز سے فلاح نصیب ہوئی کہ) میں نے تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسولؐ بھیجا، جو تمھیں میری آیات سناتا ہے تمھاری زندگیوں کو سنوارتا ہے، تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے، جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔ ع

اے[۱۵۳] لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے

۱۵۱- نعمت سے مُراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے، جو بنی اسرائیل سے سَلب کر کے اس اُمّت کو دی گئی تھی۔ دُنیا میں ایک اُمّت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے اَمرِ تشریعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلانے کی خدمت اس کے سُپرد کی جائے۔ یہ منصب جس اُمّت کو دیا گیا، حقیقت میں اُس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ یہاں یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمھاری سرفرازی کا نشان ہے، لہٰذا تمھیں اس لیے بھی ہمارے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری و نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھین نہ لیا جائے۔ اس کی پیروی کرو گے، تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔

۱۵۲- یعنی اس حکم کی پَیروی کرتے ہوئے یہ اُمید رکھو۔ یہ شاہانہ اندازِ بیان ہے۔ بادشاہ کا اپنی شانِ بے نیازی کے ساتھ کسی نوکر سے یہ کہہ دینا کہ ہماری طرف سے فُلاں عنایت و مہربانی کے اُمیدوار رہو، اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے کہ وہ ملازم اپنے گھر شادیانے بجوا دے اور اسے مبارک بادیاں دی جانے لگیں۔

۱۵۳- منصبِ امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس اُمّت کو ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں۔ مگر تمام دُوسری

الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۳) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ
الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵) الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا

ساتھ ہے۔[۱۵۴] اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی زندگی کا شُعور نہیں ہوتا۔[۱۵۵] اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مُبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ

باتوں سے پہلے انھیں جس بات پر مُتنبّہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر آپ حضرات لِٹائے جا رہے ہوں۔ یہ تو ایک عظیم الشّان اور پُرخطر خدمت ہے، جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمایشوں میں ڈالے جاؤ گے، طرح طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑیں گے۔ اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھے چلے جاؤ گے، تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔

۱۵۴- یعنی اس بھاری خدمت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے، وہ تمھیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی: ایک، یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پرورش کرو۔ دوسرے، یہ کہ نماز کے عمل سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ آگے چل کر مختلف مَقامات پر اس امر کی تشریحات ملیں گی کہ صبر بہت سے اہم ترین اَخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے۔ اور حقیقت میں یہ وہ کلیدِ کامیابی ہے، جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آگے چل کر نماز کے متعلق بھی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ وہ کس کس طرح افرادِ مومنین اور جماعتِ مومنین کو اس کارِ عظیم کے لیے تیار کرتی ہے۔

۱۵۵- موت کا لفظ اور اس کا تصوُّر انسان کے ذہن پر ایک ہمّت شکن اثر ڈالتا ہے۔ اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شُہدائے فی سبیل اللہ کو مُردہ کہا جائے، کیونکہ اس سے جماعت کے لوگوں میں جذبۂ جہاد و قتال اور رُوحِ جاں فروشی کے سرد پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے بجائے ہدایت کی گئی کہ اہلِ ایمان اپنے ذہن میں یہ تصوّر جمائے رکھیں کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے، وہ حقیقت میں حیاتِ جاوداں پاتا ہے۔ یہ تصوّر مطابقِ واقعہ بھی ہے اور اس سے رُوحِ شجاعت بھی تازہ ہوتی اور تازہ رہتی ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ط ﴿١٥٦﴾ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾ إِنَّ
الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ج فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ
اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ط وَمَنْ تَطَوَّعَ

”ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے“[۱۵۶]، انھیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔

یقیناً صَفا اور مَروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عُمرہ کرے[۱۵۷]، اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کرلے[۱۵۸] اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا

---

[۱۵۶] کہنے سے مُراد صرف زبان سے یہ الفاظ کہنا نہیں ہے، بلکہ دل سے اس بات کا قائل ہونا ہے کہ ”ہم اللہ ہی کے ہیں“۔ اس لیے اللہ کی راہ میں ہماری جو چیز بھی قربان ہوئی، وہ گویا ٹھیک اپنے مَصرف میں صَرف ہوئی، جس کی چیز تھی اسی کے کام آ گئی۔ اور یہ کہ ”اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹنا ہے“، یعنی بہرحال ہمیشہ اس دُنیا میں رہنا نہیں ہے۔ آخرکار، دیر یا سویر، جانا خدا ہی کے پاس ہے۔ لہٰذا کیوں نہ اس کی راہ میں جان لڑا کر اس کے حُضور حاضر ہوں۔ یہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم اپنے نفس کی پرورش میں لگے رہیں اور اسی حالت میں، اپنی موت ہی کے وقت پر کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہو جائیں۔

[۱۵۷] ذُوالحجّہ کی مقرر تاریخوں میں کعبے کی جو زیارت کی جاتی ہے، اس کا نام حج ہے اور ان تاریخوں کے ماسوا دُوسرے کسی زمانے میں جو زیارت کی جائے وہ عُمرہ ہے۔

[۱۵۸] صَفا اور مَروہ مسجدِ حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جن کے درمیان دوڑنا من جملہ اُن مناسک کے تھا، جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکہ اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مُشرکانہ جاہلیّت پھیل گئی، تو صفا پر ”اِساف“ اور مَروہ پر ”نائلہ“ کے اِستھان بنا لیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہلِ عرب تک پہنچی، تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صَفا اور مَروہ کی سَعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے، اور یہ کہ اس سَعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ

خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (۱۵۸) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ
مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ
لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللّٰعِنُوْنَ (۱۵۹) ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۶۰)

کام کرے[۱۵۹] گا، اللہ کو اس کا علم ہے اور وہ اس کی قدر کرنے والا ہے۔

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآنحالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی اُن پر لعنت بھیجتے ہیں۔[۱۶۰] البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں اور جو کچھ چھُپاتے تھے، اُسے بیان کرنے لگیں، اُن کو میں معاف کر دُوں گا اور مَیں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی رِوایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصَّفا والمَرْوَہ کے بارے میں کراہت موجود تھی، کیونکہ وہ مَناۃ کے معتقد تھے اور اِساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ اِنھی وُجوہ سے ضروری ہوا کہ مسجدِ حرام کو قبلہ مقرر کرنے کے موقع پر اُن غلط فہمیوں کو دُور کر دیا جائے جو صَفا و مَروَہ کے بارے میں پائی جاتی تھیں، اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ ان دونوں مَقامات کے درمیان سعی کرنا حج کے اصلی مَناسِک میں سے ہے، اور یہ کہ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے، نہ کہ اہلِ جاہلیّت کی من گھڑت۔

۱۵۹- یعنی بہتر تو یہ ہے کہ یہ کام دلی رغبت کے ساتھ کرو، ورنہ حکم بجالانے کے لیے تو کرنا ہی ہوگا۔

۱۶۰- علمائے یہود کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو رِبّیوں اور مذہبی پیشہ وروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا اور عامّۂ خلائق تو درکنار، خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ لگنے دیتے تھے۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیلیں، تو علما نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اُس ضلالت اور بدعت کو، جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے یا اپنے سُکوت سے اُلٹی سندِ جواز عطا کرنے لگے۔ اسی سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جارہی ہے۔ دُنیا کی

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ

جن لوگوں نے کفر کا رَوِیّہ[۱۶۱] اختیار کیا اور کفر کی حالت ہی میں جان دی، ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ اسی لعنت زدگی کی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا

ہدایت کا کام جس اُمت کے سپرد کیا جائے، اُس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ سے زیادہ پھیلائے، نہ یہ کہ بخیل کے مال کی طرح اسے چھپا رکھے۔

۱۶۱- ”کفر“ کے اصلی معنیٰ چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنیٰ ہیں: ماننا، قُبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنیٰ ہیں: نہ ماننا، رَدّ کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رُو سے کفر کے رَوِیّے کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبُود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک اور معبُود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اُس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اُصولاً اس بات کو بھی تسلیم کر لے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انھیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصُّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اَخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں، اُن کو، یا اُن میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریّے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے، مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے، اور دنیوی زندگی میں اپنے رَوِیّے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رَوِیّے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مَقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کُفرانِ نعمت کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شُکر کے معنیٰ یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اُس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے مُحسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں پھر کوئی دُوسری مُہلت دی جائے گی۔

تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، اُس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ ع (اِس حقیقت کو پہچاننے کے لیے اگر کوئی نشانی اور علامت درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں، اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دُوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اُوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اِسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔[۱۶۲]

عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اُس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اُس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۶۲- یعنی اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو، جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے، اور ضد یا تعصُّب سے آزاد ہو کر سوچے، تو یہ آثار جو اس کے مُشاہدے میں آ رہے ہیں، اس نتیجے پر پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مُطلَق حکیم کے زیرِ فرمان ہے، تمام اختیار و اقتدار بالکل اُسی ایک کے ہاتھ میں ہے، کسی دُوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا مشارکت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ
اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ

(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دُوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّ مقابل بناتے ہیں[۱۶۳] اور اُن کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے ــــ بان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں[۱۶۴] ــــ کاش! جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انھیں سُوجھنے والا ہے وہ

کے لیے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجایش نہیں، لہٰذا فی الحقیقت وہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالَم کا خدا ہے، اس کے سوا کوئی دُوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں کہ خدائی اور اُلوہیت میں اس کا کوئی حصّہ ہو۔

۱۶۳- یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حُقوق ہیں، وہ سب یا اُن میں سے بعض حقوق یہ لوگ اُن دُوسرے بناوٹی معبُودوں کو ادا کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلۂ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کُشائی، فریاد رسی، دُعائیں سننا اور غیب و شہادت کی ہر چیز سے واقف ہونا، یہ سب اللہ کی مخصُوص صفات ہیں۔ اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اُسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں، اُسی کے آگے اعترافِ بندگی میں سر جُھکائیں، اُسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رُجوع کریں، اُسی کو مدد کے لیے پکاریں، اُسی پر بھروسا کریں، اُسی سے اُمیدیں وابستہ کریں اور اُسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں۔ اِسی طرح مالک المُلک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیّت کے لیے حلال و حرام کے حُدُود مقرر کرے، ان کے فرائض و حقوق مُعیّن کرے، ان کو امر و نہی کے احکام دے، اور انھیں یہ بتائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے وسائل کو وہ کس طرح، کن کاموں میں، کن مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں، اس کے حکم کو منبعِ قانون مانیں، اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں، اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کُن قرار دیں، اور ہدایت و رہنمائی کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کریں۔ جو شخص خدا کی اِن صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اُس کے اِن حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دُوسرے کو دیتا ہے، وہ دراصل اُسے خدا کا مدِّ مقابل اور ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ اِن صفات میں سے کسی صِفت کا مدّعی ہو اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھی دراصل خدا کا مدِّ مقابل اور ہمسر بنتا ہے، خواہ زبان سے خدائی کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

۱۶۴- یعنی ایمان کا اِقتضا یہ ہے کہ آدمی کے لیے اللہ کی رضا ہر دُوسرے کی رضا پر مقدّم ہو اور کسی چیز کی

ظَلَمُوٓا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ
شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ
اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ
الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا
مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ ۲۰ ع ۴

آج ہی ان ظالموں کو سُوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔ جب وہ سزا دے گا اس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما، جن کی دُنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیرووں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، مگر سزا پا کر رہیں گے اور ان کے سارے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دُنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے، کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک موقع دیا جاتا تو جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیتے۔[۱۶۵] یُوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دُنیا میں کر رہے ہیں، ان کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے؏

محبّت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کرلے کہ وہ اللہ کی محبّت پر اسے قربان نہ کرسکتا ہو۔

۱۶۵- یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور اُن کے نادان پیرووں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہو کر پچھلی اُمّتیں بھٹک گئیں، اس سے مسلمان ہوشیار رہیں، اور رہبروں میں امتیاز کرنا سیکھیں، اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶۸) اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ
وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶۹) وَاِذَا قِيْلَ
لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۱۷۰)
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستوں پر نہ چلو۔[۱۶۶] وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، تمھیں بدی اور فُحش کا حکم دیتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلّق تمھیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔[۱۶۷]

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔[۱۶۸] اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے اِن کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا

۱۶۶- یعنی کھانے پینے کے معاملے میں اُن تمام پابندیوں کو توڑ ڈالو جو توہّمات اور جاہلانہ رسموں کی بنا پر لگی ہوئی ہیں۔

۱۶۷- یعنی ان وہمی رسموں اور پابندیوں کے متعلّق یہ خیال کہ یہ سب مذہبی اُمور ہیں جو خدا کی طرف سے تعلیم کیے گئے ہیں، دراصل شیطانی اِغوا کا کرشمہ ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔

۱۶۸- یعنی ان پابندیوں کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور کوئی حُجّت اس کے سوا نہیں ہے کہ باپ دادا سے

دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ (۱۷۱) یٰۤاَیُّہَا
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰکُمۡ وَ اشۡکُرُوۡا
لِلّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ (۱۷۲) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ

کچھ نہیں سُنتے۔[۱۶۹] یہ بہرے ہیں، گُونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں اُنھیں بے تکلّف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔[۱۷۰] اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو

یُوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ کسی طریقے کی پیروی کے لیے یہ حُجّت بالکل کافی ہے۔

۱۶۹– اس تمثیل کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت اُن بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلّے اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سمجھے بُوجھے ان کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں۔ اور دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے جو فقط آواز سُنتے ہیں، مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا اُن سے کیا کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال فرمائے ہیں کہ یہ دونوں پہلو ان کے تحت آجاتے ہیں۔

۱۷۰– یعنی اگر تم ایمان لا کر صرف خدائی قانون کے پیَرو بن چکے ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو پھر وہ ساری چُھوت چھات، اور زمانۂ جاہلیّت کی وہ ساری بندشیں اور پابندیاں توڑ ڈالو جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، ربّیوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے اور تمھارے باپ دادا نے قائم کی تھیں۔ جو کچھ خدا نے حرام کیا ہے اس سے تو ضرور بچو، مگر جن چیزوں کو خدا نے حلال کیا ہے، انھیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو۔ اسی مضمون کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الخ یعنی جس نے وہی نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اسی قبلے کی طرف رُخ کیا جس کی طرف ہم رُخ کرتے ہیں اور ہمارے ذبیحے کو کھایا، وہ مسلمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے اور قبلے کی طرف رُخ کرنے کے باوجود ایک شخص اس وقت تک اسلام میں پوری طرح جذب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ دے اور اُن توہُّمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جائے جو اہلِ جاہلیّت نے قائم کر رکھی تھیں۔ کیونکہ اُس کا اُن پابندیوں پر قائم رہنا اِس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک اُس کی رگ وپے میں جاہلیّت کا زہر موجود ہے۔

الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ
اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ
يَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ

وہ یہ ہے کہ مُردار نہ کھاؤ، خُون سے اور سُؤر کے گوشت سے پرہیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔[171] ہاں جو شخص مجبُوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[172]

حق یہ ہے کہ جو لوگ اُن احکام کو چُھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دُنیوی فائدوں پر انھیں بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں۔[173]

---

[171] اس کا اطلاق اُس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جسے خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور اُس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر بطور نذر کے پکایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور ہو یا غلّہ یا اور کوئی کھانے کی چیز، دراصل اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ ہی نے وہ چیز ہم کو عطا کی ہے۔ لہٰذا اعترافِ نعمت یا صدقہ، یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جاسکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے۔ اس کے سوا کسی دُوسرے کا نام لینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اس کو بھی مُنعِم سمجھتے ہیں۔

[172] اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کرنے کی اجازت تین شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے: ایک، یہ کہ واقعی مجبُوری کی حالت ہو۔ مثلاً بھوک یا پیاس سے جان پر بن گئی ہو، یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے، یہ کہ خدا کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے، یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے یا چند گھونٹ اگر جان بچا سکتے ہوں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے۔

[173] مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط توہُّمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی شریعتیں بن گئی ہیں، ان سب کی ذمہ داری ان علما پر ہے جن کے پاس کتابِ الٰہی کا علم تھا مگر انھوں نے عامۂ خلائق تک

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

قیامت کے روز اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا، نہ اُنھیں پاکیزہ ٹھیرائے گا[١٧٤]، اور اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مُول لے لیا۔ کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنّم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! یہ سب کچھ اس وجہ سے ہُوا کہ اللہ نے توٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی مگر جن لوگوں نے کتاب میں اختلافات نکالے وہ اپنے جھگڑوں میں حق سے بہت دُور نکل گئے۔ع نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف[١٧٥]، بلکہ نیکی یہ ہے

اِس علم کو نہ پہنچایا۔ پھر جب لوگوں میں جہالت کی وجہ سے غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ بلکہ ان میں سے بہتوں نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے۔

١٧٤- یہ دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور ان غلط فہمیوں کا رد ہے جو اُنھوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے ہیں کہ ان کی ہستیاں بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس ہیں، اور جو اُن کا دامن گرفتہ ہو جائے گا، اس کی سفارش کر کے وہ اللہ کے ہاں اُسے بخشوا لیں گے۔ جواب میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم انھیں ہرگز منہ نہ لگائیں گے اور نہ انھیں پاکیزہ قرار دیں گے۔

١٧٥- مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے کو تو محض بطورِ تمثیل بیان کیا گیا ہے، دراصل مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا
عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱۷۷) يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ

کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی مَحبّت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے قتل کے مقدّموں میں قِصاص[۱۷۶] کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کر دینا اور صرف ضابطے کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دینا اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کر دینا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے، جو اللہ کے ہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔

۱۷۶- قِصاص، یعنی خُون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے، جو اُس نے دُوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو، اُسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اُس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے، وہی اُس کے ساتھ کیا جائے۔

اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى ؕ فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ

آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اِس جُرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قِصاص[177] لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو،[178] تو معروف طریقے[179] کے مطابق خُوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خُوں بہا ادا کرے۔

۱۷۷- جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان، یا قبیلے، یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سیکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دُوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہو، تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے، یا اُس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول اُن کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص، اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزّت رکھنے والا شخص ہوتا، تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی۔ موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذّب سمجھا جاتا ہے، اُن کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہمارے کان سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اُڑائے گئے۔ ایک ”مہذّب“ قوم نے اسی بیسویں صدی میں اپنے ایک فرد (سرلی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دُوسری طرف ان نام نہاد مہذّب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم قوم سے ہو، تو ان کے جج قِصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں، جن کے سدِّباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے، قطعِ نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون۔

۱۷۸- ”بھائی“ کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سِفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور دُوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی۔ لہٰذا اگر اپنے ایک خطاکار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصّے کو پی جاؤ، تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے۔۔۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف

ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ
ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمۡ فِى الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ
يّٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ ۟الۡوَصِيَّةُ لِلۡوَالِدَيۡنِ

یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے،[۱۸۰] اس کے لیے دردناک سزا ہے ـــــ عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قِصاص میں زندگی ہے۔[۱۸۱] اُمّید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے

کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہو گا۔

۱۷۹ – ”مَعۡرُوۡف“ کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعُموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اُٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ عمل ہے۔ رواجِ عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ”عُرف“ اور ”معروف“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

۱۸۰ – مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

۱۸۱ – یہ ایک دُوسری جاہلیّت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہلِ جاہلیّت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دُوسرا گروہ عَفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دُنیا کے متعدِّد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہلِ عقل کو مُخاطَب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قِصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو

وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾ ۭ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ
بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٨١﴾ ۭ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا
فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٨٢﴾ ع

۲۲ ع ۶

وصیّت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔[۱۸۲] پھر جنھوں نے وصیّت سنی اور بعد میں اُسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ البتہ جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وصیّت کرنے والے نے نادانستہ یا قصداً حق تلفی کی ہے، اور پھر معاملے سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان وہ اصلاح کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

محترم ٹھیراتی ہے، وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

۱۸۲ – یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا، جب کہ وراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصّے بذریعہ وصیت مقرر کر جائے، تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیمِ وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا (جو آگے سورۂ نساء میں آنے والا ہے)، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ وصیّت اور احکامِ میراث کی توضیح میں حسبِ ذیل دو قاعدے بیان فرمائے:

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتے داروں کے حصّے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں، ان کے حصوں میں نہ تو وصیت کے ذریعے سے کوئی کمی یا بیشی کی جا سکتی ہے، نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصّے کے علاوہ کوئی چیز بذریعہ وصیت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصّے کی حد تک کی جا سکتی ہے۔

اِن دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے اُن غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے، جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ
عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا[183] ہو گی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دُوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے[184]، تو یہ اُسی کے لیے بہتر ہے۔

خاندان میں مدد کے مستحق ہوں، یا جنھیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیّت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا، یہاں تک کہ بالعموم وصیّت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآنِ مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے، جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے، تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں، جو میراث کے بارے میں لوگوں کو اُلجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً اُن پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔

[183] اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیّت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دُوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دُودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڑھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں اُن سے چھوٹ گئے ہیں۔

[184] یعنی ایک سے زیادہ آدمیوں کو کھانا کھلائے، یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ
كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

لیکن اگر تم سمجھو، تو تمھارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔[۱۸۵]

رمضان وہ مہینا ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے، اُس کو لازم ہے کہ اِس پُورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، تو وہ دُوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔[۱۸۶]

---

۱۸۵ – یہاں تک وہ ابتدائی حکم ہے، جو رمضان کے روزوں کے متعلق ۲ ہجری میں جنگِ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیات اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مناسبتِ مضمون کی وجہ سے اسی سلسلۂ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

۱۸۶ – سفر کی حالت میں روزہ رکھنا یا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہؓ سفر میں جایا کرتے تھے، اُن میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا، اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دُوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرتؐ نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا: روزے سے ہے۔ فرمایا: یہ نیکی نہیں ہے۔ جنگ کے موقع پر تو آپؐ حکماً روزے سے روک دیا کرتے تھے، تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی رِوایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے۔ پہلی مرتبہ جنگِ بدر میں اور آخری مرتبہ فتحِ مکہ کے موقع پر، اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیے۔ ابنِ عمرؓ کا بیان ہے کہ فتحِ مکہ کے موقع پر حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ انہ یوم قتال فافطروا۔ دُوسری رِوایات میں یہ الفاظ ہیں کہ انکم قد دنوتم من عدوکم فافطروا اقویٰ لکم۔ یعنی دشمن سے مقابلہ درپیش ہے، روزے چھوڑ دو، تاکہ تمھیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾

اللہ تمھارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تمھیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز کیا ہے، اُس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو[187] اور شکر گزار بنو۔

عام سفر کے معاملے میں یہ بات کہ کتنی مَسافت کے سفر پر روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، حضوؐر کے کسی ارشاد سے واضح نہیں ہوتی اور صحابۂ کرامؓ کا عمل اس باب میں مختلف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جس مَسافت پر عرفِ عام میں سفر کا اطلاق ہوتا ہے اور جس میں مسافرانہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے، وہ افطار کے لیے کافی ہے۔

یہ امر مُتّفَق عَلَیہ ہے کہ جس روز آدمی سفر کی ابتدا کر رہا ہو، اُس دن کا روزہ افطار کر لینے کا اُسے اختیار ہے۔ چاہے تو گھر سے کھانا کھا کر چلے، اور چاہے تو گھر سے نکلتے ہی کھالے۔ دونوں عمل صحابہؓ سے ثابت ہیں۔

یہ امر کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہو، تو کیا لوگ مقیم ہونے کے باوجود جہاد کی خاطر روزہ چھوڑ سکتے ہیں، علما کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علما اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مگر علامہ ابنِ تَیمِیَہؒ نے نہایت قوی دلائل کے ساتھ فتویٰ دیا تھا کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے۔

۱۸۷ – یعنی اللہ نے صرف رمضان ہی کے دنوں کو روزوں کے لیے مخصوص نہیں کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ رمضان میں کسی عذرِ شرعی کی بنا پر روزے نہ رکھ سکیں، اُن کے لیے دُوسرے دنوں میں اُس کی قضا کر لینے کا راستہ بھی کھول دیا ہے، تاکہ قرآن کی جو نعمت اس نے تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرنے کے قیمتی موقع سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ اُنھیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ٹھیرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اُس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکرگزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے، تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نُزولِ قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے، اور صرف اَخلاقی تربیت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اِس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکرگزاری ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ
الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ
يَرْشُدُوْنَ ۝١٨٦ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى
نِسَاۗىِٕكُمْ ۭ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ

اور اے نبیؐ! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو اُنھیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اُس کی پکار سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔[۱۸۸] یہ بات تم اُنھیں سُنا دو، شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔[۱۸۹]

تمھارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں، اور تم اُن کے لیے۔[۱۹۰] اللہ کو معلوم ہو گیا کہ

---

۱۸۸ - یعنی اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کر سکتے ہو، لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دُور ہوں۔ نہیں، میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے، مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے، حتّٰی کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے، میں اُسے بھی سُن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں، فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ اور رب قرار دے رکھا ہے، اُن کے پاس تو تمھیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمھاری شنوائی کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ مگر میں کائناتِ بے پایاں کا فرماں روائے مُطلَق، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے اور وسیلے اور سفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہٰذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ ایک ایک بے اختیار بناوٹی خدا کے دَر پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میں جو دعوت تمھیں دے رہا ہوں، اس پر لبیک کہہ کر میرا دامن پکڑ لو، میری طرف رُجوع کرو، مجھ پر بھروسا کرو اور میری بندگی و اطاعت میں آ جاؤ۔

۱۸۹ - یعنی تمھارے ذریعے سے یہ حقیقتِ حال معلوم کر کے اُن کی آنکھیں کُھل جائیں اور وہ اس صحیح رَوِیّے کی طرف آ جائیں، جس میں ان کی اپنی ہی بھلائی ہے۔

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ
بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى
يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ

تم لوگ چُپکے چُپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، مگر اُس نے تمھارا قُصُور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمھارے لیے جائز کر دیا ہے، اُسے حاصل کرو۔[۱۹۱] نیز راتوں کو کھاؤ پیو[۱۹۲] یہاں تک کہ تم کو سیاہیِ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آجائے۔[۱۹۳]

---

[۱۹۰] یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا، بلکہ دونوں کا باہمی تعلق و اِتّصال بالکل غیر مُنفک ہوتا ہے، اسی طرح تمھارا اور تمھاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔

[۱۹۱] ابتدا میں اگرچہ اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرے، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہ گارانہ ذہنیت اُن کے اندر پرورش پاتی رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمھارے لیے جائز ہے۔ لہٰذا اب اسے بُرا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو، بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قلب و ضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

[۱۹۲] اس بارے میں بھی لوگ ابتداءً غلط فہمی میں تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد سے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے، اور کوئی یہ سمجھتا تھا کہ رات کو جب تک آدمی جاگ رہا ہو، کھا پی سکتا ہے۔ جہاں سو گیا، پھر دوبارہ اُٹھ کر وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ یہ احکام لوگوں نے خود اپنے ذہن میں سمجھ رکھے تھے اور اس کی وجہ سے بسا اوقات بڑی تکلیفیں اُٹھاتے تھے۔ اِس آیت میں انھی غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ اس میں روزے کی حد طُلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک مقرر کر دی گئی اور غروبِ آفتاب سے طُلُوعِ فجر تک رات بھر کھانے پینے اور مباشرت کرنے کے لیے آزادی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کا قاعدہ مقرر فرما دیا، تاکہ طُلُوعِ فجر سے عین پہلے آدمی اچھی طرح کھا پی لے۔

[۱۹۳] اسلام نے اپنی عبادات کے لیے اوقات کا وہ معیار مقرر کیا ہے جس سے دُنیا میں ہر وقت ہر مرتبۂ تمدُّن کے لوگ ہر جگہ اوقات کی تعیین کر سکیں۔ وہ گھڑیوں کے لحاظ سے وقت مقرر کرنے کے بجائے اُن آثار کے لحاظ سے وقت

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ

تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔[۱۹۴] اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو، تو بیویوں

مقرر کرتا ہے جو آفاق میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر نادان لوگ اس طریقِ توقیت پر عموماً یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قطبین کے قریب، جہاں رات اور دن کئی کئی مہینوں کے ہوتے ہیں، اوقات کی یہ تعیین کیسے چل سکے گی۔ حالانکہ یہ اعتراض دراصل علمِ جغرافیہ کی سرسری واقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں نہ وہاں چھ مہینوں کی رات اُس معنٰی میں ہوتی ہے اور نہ چھ مہینوں کا دن، جس معنٰی میں ہم خطِ اِستوا کے آس پاس رہنے والے لوگ دن اور رات کے لفظ بولتے ہیں۔ خواہ رات کا دَور ہو یا دن کا، بہرحال صبح و شام کے آثار وہاں پوری باقاعدگی کے ساتھ اُفُق پر نمایاں ہوتے ہیں اور اُنھی کے لحاظ سے وہاں کے لوگ ہماری طرح اپنے سونے جاگنے اور کام کرنے اور تفریح کرنے کے اوقات مقرر کرتے ہیں۔ جب گھڑیوں کا رواج عام نہ تھا، تب بھی فن لینڈ، ناروے اور گرین لینڈ وغیرہ ملکوں کے لوگ اپنے اوقات معلوم کرتے ہی تھے اور اس کا ذریعہ یہی اُفُق کے آثار تھے۔ لہٰذا جس طرح دُوسرے تمام معاملات میں یہ آثار ان کے لیے تعیینِ اوقات کا کام دیتے ہیں، اسی طرح نماز اور سَحَر و افطار کے معاملے میں بھی دے سکتے ہیں۔

۱۹۴ – رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہوتی ہے، وہیں تمھارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا غروبِ آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ سَحَر اور افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصّے میں اُفُق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اُوپر بڑھنے لگے، تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اور جب دن کے آخری حصّے میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت آ جاتا ہے۔ آج کل لوگ سحری اور افطار، دونوں کے معاملے میں شدّتِ احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدّد برتنے لگے ہیں۔ مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ سَحَر میں سیاہیِ شب سے سپیدۂ سَحَر کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجایش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طُلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کُھلی ہو تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آ جائے تو فوراً چھوڑ نہ دے، بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔ اسی طرح افطار کے وقت میں بھی غروبِ آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار کرتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سورج ڈوبتے ہی بلال رضی اللہ عنہ کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔ بلال رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! ابھی تو دن چمک رہا ہے۔ آپؐ فرماتے کہ جب رات کی سیاہی مشرق سے اُٹھنے لگے، تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ وَلَا
تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

سے مباشرت نہ کرو۔[۱۹۵] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب نہ پھٹکنا۔[۱۹۶] اِس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط رویّے سے بچیں گے۔ اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے

---

۱۹۵ – معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی رمضان کے آخری دس دن مسجد میں رہے اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص کر دے۔ اس اعتکاف کی حالت میں آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے، مگر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو شہوانی لذتوں سے روکے رکھے۔

۱۹۶ – یہ نہیں فرمایا کہ ان حدوں سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے، عین اسی مقام کے آخری کناروں پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اس میں ہے کہ آدمی سرحد سے دُور ہی رہے، تاکہ بُھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اُس حدیث میں بیان ہوا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لِکل ملكٍ حِمًی وان حمی اللّٰہ محارمہ۔ فمن رتع حول الحمٰی یوشك ان یقع فیہ۔ عربی زبان میں حِمٰی اُس چراگاہ کو کہتے ہیں، جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ اس استعارے کو استعمال کرتے ہوئے حضورؐ فرماتے ہیں کہ ”ہر بادشاہ کی ایک حِمٰی ہوتی ہے اور اللہ کی حِمٰی اس کی وہ حدیں ہیں، جن سے اس نے حرام وحلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ جو جانور حِمٰی کے گرد ہی چرتا رہے گا، ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ حِمٰی کے اندر داخل ہو جائے۔“ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی رُوح سے ناواقف ہیں، ہمیشہ اجازت کی آخری حدوں تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علما و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انھیں بتایا کرتے ہیں، تاکہ وہ اُس باریک خطِ امتیاز ہی پر گھومتے رہیں، جہاں اطاعت اور معصیت کے درمیان محض بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بکثرت لوگ معصیت، اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہو رہے ہیں، کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور ان کے کنارے پہنچ کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ع ﴿۱۸۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ ۲۳ ع ۶ ۷
لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ

ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دُوسروں کے مال کا کوئی حصّہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔[۱۹۷] ع

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلّق پُوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔[۱۹۸] نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں

۱۹۷- اس آیت کا ایک مفہُوم تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور دُوسرا مفہُوم یہ ہے کہ جب تم خود جانتے ہو کہ مال دُوسرے شخص کا ہے، تو محض اس لیے کہ اس کے پاس اپنی مِلکیّت کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یا اس بنا پر کہ کسی اینچ پینچ سے تم اس کو کھا سکتے ہو، اس کا مُقدّمہ عدالت میں نہ لے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ حاکمِ عدالت رُودادِ مقدّمہ کے لحاظ سے وہ مال تم کو دِلوا دے۔ مگر حاکم کا ایسا فیصلہ دراصل غلط بنائی ہوئی رُوداد سے دھوکا کھا جانے کا نتیجہ ہوگا۔ اس لیے عدالت سے اس کی مِلکیت کا حق حاصل کر لینے کے باوجود حقیقت میں تم اس کے جائز مالک نہ بن جاؤ گے۔ عنداللہ وہ تُمھارے لیے حرام ہی رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما انا بشر وانتم تختصمون الی ولعل بعضکم یکون الحن بحجتہ من بعض، فاقضی لہ علی نحو ما اسمع منہ، فمن قضیت لہ بشیء من حق اخیہ، فانما اقضی لہ قطعۃ من النار۔ یعنی میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک مقدّمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کی بہ نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سُن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی، تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔

۱۹۸- چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے، جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اَوہام وتخیّلات اور رسوم دُنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس قسم کے اوہام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سَعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتدائے کار کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسعود خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع وغروب اور اس کی کمی وبیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب

ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۖ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔[۱۹۹]

اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں،[۲۰۰] مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی

باتیں دُوسری جاہل قوموں کی طرح اہلِ عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں مختلف توہُّم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ انھی چیزوں کی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی گئی۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمھارے لیے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک قدرتی جنتری ہے، جو آسمان پر نمودار ہو کر دُنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتی رہتی ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ عرب کی مذہبی، تمدّنی اور معَاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے چار مہینے حج اور عمرے سے وابستہ تھے۔ اِن مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ ہوتے اور امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے تھے۔

۱۹۹ – مِن جملہ ان توہُّم پرستانہ رسموں کے، جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوتے تھے، بلکہ پیچھے سے دیوار کُود کر یا دیوار میں کھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے۔ نیز سفر سے واپس آ کر بھی گھروں میں پیچھے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید کی گئی ہے، بلکہ تمام اَوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے۔ اُن بے معنیٰ رسموں کو نیکی سے کوئی واسطہ نہیں، جو محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت وشقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۰۰ – یعنی جو لوگ خدا کے کام میں تمھارا راستہ روکتے ہیں، اور اس بنا پر تمھارے دُشمن بن گئے ہیں کہ تم خدا کی ہدایت کے مطابق نظامِ زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہو، اور اس اصلاحی کام کی مزاحمت میں جبر وظلم کی طاقتیں استعمال کر رہے ہیں، ان سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے جب تک مسلمان کمزور اور منتشر تھے، ان کو صرف تبلیغ کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم وستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب مدینے میں ان کی چھوٹی سی شہری ریاست بن جانے کے بعد پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس دعوتِ اصلاح کی راہ میں مسلّح مزاحمت کرتے ہیں، ان کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے

الْمُعْتَدِيْنَ (١٩٠) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ
مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ
الْكٰفِرِيْنَ (١٩١) فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (١٩٢)

کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۲۰۱] ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا اُن سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لیے کہ قتل اگرچہ بُرا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔[۲۰۲] اور مسجدِ حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، تم بھی نہ لڑو، مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چُوکیں، تو تم بھی بے تکلّف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں، تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[۲۰۳]

بعد ہی جنگِ بدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۲۰۱ – یعنی تمھاری جنگ نہ تو اپنی مادّی اغراض کے لیے ہو، نہ اُن لوگوں پر ہاتھ اُٹھاؤ، جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے، اور نہ لڑائی میں جاہلیّت کے طریقے استعمال کرو۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی کرنا، دشمن کے مقتولوں کا مُثلہ کرنا، کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا اور دُوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال "حد سے گزرنے" کی تعریف میں آتے ہیں اور حدیث میں ان سب کی مُمانَعت وارد ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے، جہاں وہ ناگزیر ہو، اور اُسی حد تک کیا جائے، جتنی اس کی ضرورت ہو۔

۲۰۲ – یہاں فتنے کا لفظ اُسی معنٰی میں استعمال ہُوا ہے، جس میں انگریزی کا لفظ (persecution) استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات ونظریّات کی جگہ کچھ دُوسرے خیالات ونظریات کو حق پا کر قبول کر لیا ہے اور وہ تنقید وتبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ بلاشبہ انسانی خُون بہانا بہت بُرا فعل ہے، لیکن جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری اِستبداد دُوسروں پر مسلّط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بجبر روکے اور اصلاح وتغیُّر کی جائز ومعقول کوششوں کا مقابلہ دلائل سے کرنے کے بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے، تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت بُرائی

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔[۲۰۴]
پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔[۲۰۵]

کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے گروہ کو بزورِ شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے۔

۲۰۳ – یعنی تم جس خدا پر ایمان لائے ہو، اس کی صفت یہ ہے کہ بدتر سے بدتر مجرم اور گناہ گار کو بھی معاف کر دیتا ہے، جب کہ وہ اپنی باغیانہ روش سے باز آ جائے۔ یہی صفت تم اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ تخلّقوا باخلاق اللّٰہ۔ تمھاری لڑائی انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے نہ ہو بلکہ خدا کے دین کا راستہ صاف کرنے کے لیے ہو۔ جب تک کوئی گروہ راہِ خدا میں مزاحم رہے، بس اُسی وقت تک اس سے تمھاری لڑائی بھی رہے، اور جب وہ اپنا رویّہ چھوڑ دے، تو تمھارا ہاتھ بھی پھر اُس پر نہ اٹھے۔

۲۰۴ – یہاں فتنہ کا لفظ اُوپر کے معنٰی سے ذرا مختلف معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ”فتنے“ سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ”دین“ کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنٰی ”اطاعت“ کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اُس کے احکام و قوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی و فرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانونِ الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔

۲۰۵ – باز آ جانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آ جانا نہیں، بلکہ فتنے سے باز آ جانا ہے۔ کافر، مشرک، دہریے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے، رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے، یا کسی کی نہ کرے۔ اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمایش اور نصیحت کریں گے، مگر اس سے لڑیں گے نہیں۔ لیکن اُسے یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائے۔ اس فتنے کو دفع کرنے کے لیے حسبِ موقع اور حسبِ امکان، تبلیغ اور شمشیر، دونوں سے کام لیا جائے گا اور مومن اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا، جب تک کفار اپنے اس فتنے سے باز نہ آ جائیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اگر وہ باز آ جائیں، تو ”ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں“، تو اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ
فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى
عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حُرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ[۲۰۶] ہو گا۔ لہٰذا جو تم پر دست درازی کرے، تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ اللہ انھی لوگوں کے ساتھ ہے، جو اس کی حُدود توڑنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

کہ جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق قائم ہو جائے، تو عام لوگوں کو تو معاف کر دیا جائے گا، لیکن ایسے لوگوں کو سزا دینے میں اہلِ حق بالکل حق بجانب ہوں گے، جنھوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں نظامِ حق کا راستہ روکنے کے لیے ظلم وستم کی حد کر دی ہو، اگرچہ اس معاملے میں بھی مومنینِ صالحین کو زیب یہی دیتا ہے کہ عَفو و درگزر سے کام لیں اور فتح یاب ہو کر ظالموں سے انتقام نہ لیں۔ مگر جن کے جرائم کی فہرست بہت ہی زیادہ سیاہ ہو، اُن کو سزا دینا بالکل جائز ہے اور اس اجازت سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فائدہ اٹھایا ہے، جن سے بڑھ کر عَفو و درگزر کسی کے شایانِ شان نہ تھا۔ چنانچہ جنگِ بَدر کے قیدیوں میں سے عُقبَہ بن ابی مُعَیط اور نَضر بن حارث کا قتل اور فتحِ مکہ کے بعد آپؐ کا ۱۷ آدمیوں کو عَفوِ عام سے مُستثنٰی فرمانا اور پھر ان میں سے چار کو سزائے موت دینا اسی اجازت پر مبنی تھا۔

۲۰۶ – اہلِ عرب میں حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ ذی القَعدہ، ذی الحَجّہ اور مُحَرّم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینا عُمرے کے لیے خاص کیا گیا تھا، اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل وغارت گری ممنوع تھی، تاکہ زائرینِ کعبہ امن وامان کے ساتھ خدا کے گھر تک جائیں اور اپنے گھروں کو واپس ہو سکیں۔ اِس بنا پر اِن مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا، یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں، تو مسلمان بھی کریں اور اگر وہ اس حُرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کر گزریں، تو پھر مسلمان بھی ماہِ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔

اس اجازت کی ضرورت خاص طور پر اس وجہ سے پیش آ گئی تھی کہ اہلِ عرب نے جنگ وجدَل اور لُوٹ مار کی خاطر نَسی کا قاعدہ بنا رکھا تھا، جس کی رُو سے وہ اگر کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کرنے کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تھے، تو کسی حرام مہینے میں اُس پر چھاپا مار دیتے اور پھر اس مہینے کی جگہ کسی دُوسرے حلال مہینے کو حرام کر کے گویا اس حرمت کا بدلہ پورا کر دیتے تھے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کفار اپنے نَسی کے حیلے کو کام میں لا کر کسی حرام مہینے میں جنگی کارروائی کر بیٹھیں، تو اس صورت میں کیا کیا جائے۔ اسی سوال کا جواب اس

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ
وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ ع
وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔[۲۰۷] احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔[۲۰۸]

اللہ کی خوشنودی کے لیے جب حج اور عُمرے کی نیّت کرو، تو اُسے پُورا کرو، اور اگر کہیں گِھر جاؤ تو جو قربانی میسّر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو،[۲۰۹] اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔[۲۱۰]

آیت میں دیا گیا ہے۔

۲۰۷ – اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی و جُہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے دین کو سر بلند کرنے کے لیے اپنا مال خرچ نہ کرو گے اور اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے، تو یہ تمھارے لیے دنیا میں بھی موجبِ ہلاکت ہو گا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تم کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہو گے اور آخرت میں تم سے سخت باز پرس ہو گی۔

۲۰۸ – احسان کا لفظ حُسن سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سُپرد جو خدمت ہو، اُسے بس کر دے۔ اور دُوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے، اپنی پُوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صَرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے، جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے۔ اور دُوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے، جس کے لیے محبّت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

۲۰۹ – یعنی اگر راستے میں کوئی ایسا سبب پیش آجائے، جس کی وجہ سے آگے جانا غیر ممکن ہو اور مجبوراً رُک جانا پڑے، تو اُونٹ، گائے، بکری میں سے جو جانور بھی میسّر ہو، اللہ کے لیے قربان کر دو۔

۲۱۰ – اس امر میں اختلاف ہے کہ قربانی کے اپنی جگہ پہنچ جانے سے کیا مراد ہے۔ فقہائے حَنَفِیَّہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے، یعنی اگر آدمی راستے میں رُک جانے پر مجبُور ہو، تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے، تاکہ اس کی طرف سے حُدودِ حرم میں قربانی کی جائے۔ اور امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جہاں آدمی گِھر گیا ہو،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ
اَمِنْتُمْ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى
الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ
ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بِنا پر اپنا سر مُنڈوائے، تو اُسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔[۲۱۱] پھر اگر تمھیں امن نصیب ہو جائے[۲۱۲] (اور تم حج سے پہلے مکّے پہنچ جاؤ)، تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھائے، وہ حسبِ مقدور قربانی دے، اور اگر قربانی میسّر نہ ہو، تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر، اِس طرح پُورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے ہے، جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں۔[۲۱۳]

وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

سر مُونڈنے سے مراد حجامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک قربانی نہ کرلو، حجامت نہ کراؤ۔

۲۱۱ - حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت میں تین دن کے روزے رکھنے، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے، یا کم از کم ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۱۲ - یعنی وہ سبب دور ہو جائے، جس کی وجہ سے مجبوراً تمھیں راستے میں رُک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رُک جانے کی وجہ زیادہ تر دشمنِ اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُوپر کی آیت میں ''گِھر جانے'' اور اس کے بالمقابل یہاں ''امن نصیب ہو جانے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح ''گِھر جانے'' کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دُوسرے تمام موانع شامل ہیں، اسی طرح ''امن نصیب ہو جانے'' کا مفہوم بھی ہر مانع و مزاحم چیز کے دُور ہو جانے پر حاوی ہے۔

ع ۲۳ ۸ ۸

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۹۶ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ
مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَ
لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ
وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

وقف النبی ﷺ

اللہ کے اِن احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ع

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص اِن مقرر مہینوں میں حج کی نیّت کرے، اُسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دَوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل[۲۱۴]، کوئی بد عملی[۲۱۵]، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات[۲۱۶] سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے، وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ، اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوش مندو! میری نافرمانی سے[۲۱۷] پرہیز کرو۔

---

۲۱۳ – عربِ جاہلیت میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عُمرہ دونوں ادا کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عُمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اُڑا دیا اور باہر سے آنے والوں کے ساتھ یہ رعایت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں عُمرہ اور حج دونوں کر لیں۔ البتہ جو لوگ مکے کے آس پاس میقاتوں کی حُدود کے اندر رہتے ہوں، انھیں اس رعایت سے مُستثنیٰ کر دیا، کیونکہ ان کے لیے عُمرے کا سفر الگ اور حج کا سفر الگ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

حج کا زمانہ آنے تک عُمرے کا فائدہ اُٹھانے سے مُراد یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے اِحرام کھول لے اور اُن پابندیوں سے آزاد ہو جائے، جو احرام کی حالت میں لگائی گئی ہیں۔ پھر جب حج کے دن آئیں، تو از سرِ نو احرام باندھ لے۔

۲۱۴ – احرام کی حالت میں میاں اور بیوی کے درمیان نہ صرف تعلقِ زن و شو ممنوع ہے، بلکہ اُن کے درمیان کوئی ایسی گفتگو بھی نہ ہونی چاہیے، جو رغبتِ شہوانی پر مبنی ہو۔

۲۱۵ – تمام معصیت کے افعال اگرچہ بجائے خود ناجائز ہیں، لیکن احرام کی حالت میں ان کا گناہ بہت سخت ہے۔

۲۱۶ – حتّٰی کہ خادم کو ڈانٹنا تک جائز نہیں۔

۲۱۷ – جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دُنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔[۲۱۸] پھر جب عرفات سے چلو، تو مَشْعَرِ حرام (مُزدَلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو اور اُس طرح یاد کرو، جس کی ہدایت اس نے تمھیں دی ہے، ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔[۲۱۹] پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی

اُن کے اِس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انھیں بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اَخلاق دُرست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے، وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمایش کرتا ہے، تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا اور خلق، دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اُس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا، جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق دُرست ہوں، تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزّت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔

۲۱۸ — یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصوّر تھا کہ سفرِ حج کے دوران میں کسبِ مَعاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کے نزدیک کسبِ مَعاش ایک دُنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دَوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جِدّوجُہد کرتا ہے، تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے، اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔

۲۱۹ — یعنی جاہلیّت کے زمانے میں خدا کی عبادت کے ساتھ جن دُوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش ہوتی تھی، ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تمھیں بخشی ہے، اس کے مطابق خالصتاً اللہ تعالیٰ کی

النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾
فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا
وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ

پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو،[220] یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو، تو جس طرح پہلے اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے، اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو، بلکہ اس سے بھی[221] بڑھ کر۔ (مگر اللہ کو یاد کرنے والے لوگوں میں بھی بہت فرق ہے) اُن میں سے کوئی تو ایسا ہے، جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ

عبادت کرو۔

۲۲۰ – حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانے سے عرب کا معروف طریقۂ حج یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو مِنٰی سے عَرَفات جاتے تھے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مُزدَلِفَہ میں ٹھیرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی بَرَہمَنِیّت قائم ہوگئی، تو انھوں نے کہا: ہم اہلِ حرم ہیں، ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ عام اہلِ عرب کے ساتھ عَرَفات تک جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مُزدَلِفَہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنی خُزَاعَہ اور بنی کِنَانَہ اور اُن دُوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا، جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے، اُن کی شان بھی عام عربوں سے اُونچی ہوگئی اور انھوں نے بھی عَرَفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غُرور کا بُت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطابِ خاص قریش اور ان کے رشتے دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے اور خطابِ عام اُن سب کی طرف ہے، جو آیندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ اُن کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اَور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں، اُنھی کے ساتھ جاؤ، اُنھی کے ساتھ ٹھیرو، اُنھی کے ساتھ پلٹو، اور اب تک جاہلیّت کے فخر و غرور کی بنا پر سنّتِ ابراہیمی کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو، اس پر اللہ سے معافی مانگو۔

۲۲۱ – اہلِ عرب حج سے فارغ ہو کر مِنٰی میں جلسے کرتے تھے، جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ نصف
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ
تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ
لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اے ہمارے رب! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی کے مطابق (دونوں جگہ) حصّہ پائیں گے، اور اللہ کو حساب چُکاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ گنتی کے چند روز ہیں، جو تمھیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں، اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں[۲۲۲]۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں ـــــ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اس کے حضور میں تمھاری پیشی ہونے والی ہے۔

انسانوں میں کوئی تو ایسا ہے، جس کی باتیں دُنیا کی زندگی میں تمھیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں،

فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان جاہلانہ باتوں کو چھوڑو، پہلے جو وقت فضولیات میں صَرف کرتے تھے، اب اُسے اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں صَرف کرو۔ اِس ذکر سے مراد زمانۂ قیامِ منٰی کا ذکر ہے۔

۲۲۲ - یعنی ایامِ تشریق میں منٰی سے مکّے کی طرف واپسی خواہ ۱۲ ذی الحجہ کو ہو یا تیرھویں تاریخ کو، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔ اصل اہمیت اس کی نہیں کہ تم ٹھیرے کتنے دن، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، ان میں خدا کے ساتھ تمھارے تعلق کا کیا حال رہا۔ خدا کا ذکر کرتے رہے یا میلوں ٹھیلوں میں لگے رہے۔

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ
النَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ
اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي

اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے،[۲۲۳] مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔[۲۲۴] جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے،[۲۲۵] تو زمین میں اُس کی ساری دَوڑ دُھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے ــــ حالاں کہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ــــ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر، تو اپنے وقار کا خیال اُس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنّم ہی کافی ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ دُوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے، جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! تم پُورے کے پُورے اسلام میں

۲۲۳- یعنی کہتا ہے: خدا شاہد ہے کہ میں محض طالبِ خیر ہوں، اپنی ذاتی غرض کے لیے نہیں، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، یا لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہا ہوں۔

۲۲۴- ”اَلَدُّ الْخِصَامِ“ کے معنیٰ ہیں: ”وہ دشمن جو تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا ہو۔“ یعنی جو حق کی مُخالفَت میں ہر ممکن حربے سے کام لے۔ کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی اور کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال کو بھی استعمال کرنے میں تأمُّل نہ کرے۔

۲۲۵- ”اِذَا تَوَلّٰی“ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے، اور دوسرا مطلب

السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِيْنٌ (۲۰۸) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ
فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۰۹) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ
يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ

آ جاؤ[۲۲۶] اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ جو صاف صاف ہدایات تمھارے پاس آ چکی ہیں، اگر ان کو پا لینے کے بعد پھر تم نے لغزش کھائی، تو خُوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔[۲۲۷] (اِن ساری نصیحتوں اور ہدایتوں کے بعد بھی لوگ سیدھے نہ ہوں، تو) کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پَرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو اور فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟[۲۲۸] ——

یہ بھی نکلتا ہے کہ یہ مزے مزے کی دل لُبھانے والی باتیں بنا کر ”جب وہ پلٹتا ہے“، تو عملاً یہ کرتوت دکھاتا ہے۔

۲۲۶ – یعنی کسی اِستثنا اور تحفّظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمھارے خیالات، تمھارے نظریات، تمھارے عُلوم، تمھارے طور طریقے، تمھارے معاملات، اور تمھاری سعی و عمل کے راستے سب کے سب بالکل تابعِ اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے بعض حِصّوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حِصّوں کو اس کی پیروی سے مُستثنٰی کر لو۔

۲۲۷ – یعنی وہ زبردست طاقت بھی رکھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اپنے مجرموں کو سزا کس طرح دے۔

۲۲۸ – یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ان سے ایک اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمایش صرف اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں، اور ماننے کے بعد اتنی اَخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرماں برداری اختیار کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ کی بِعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں، حتّٰی کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اَخلاقی قوت کی آزمایش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ کیونکہ اس کے بعد تو آزمایش بالکل بے معنٰی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہُوم ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اُس وقت کا انتظار نہ کرو، جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آ جائیں گے، کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جُھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اُسی وقت تک ہے، جب تک حقیقت

ع ۲۵ ۱۴ ۹

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ
مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ

وقف لازم

آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ ہی کے حضور ہونے والے ہیں ع

بنی اسرائیل سے پُوچھو: کیسی کُھلی کُھلی نشانیاں ہم نے اُنھیں دِکھائی ہیں (اور پھر یہ بھی انھی سے پُوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اُسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔[۲۲۹]

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اُن کے لیے دنیا کی زندگی بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت کے روز

تمھارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانش مندی کا، اور محض فہمایش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اَخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آ جائے اور تم بچشمِ سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکّن ہے، اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے، اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ تمھاری ہستی اُس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہُوئی ہے، اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے، تو اس ایمان اور اطاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کوئی کٹّے سے کٹّا کافر اور بدتر سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مُہلت بس اُسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کُشائی کی وہ ساعت نہیں آتی۔ جب وہ ساعت آ گئی، تو پھر نہ مُہلت ہے نہ آزمایش، بلکہ وہ فیصلے کا وقت ہے۔

۲۲۹ - اس سوال کے لیے بنی اسرائیل کا انتخاب دو وُجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت ایک جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامان عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے، یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے، جس کو کتاب اور نبوت کی مشعل دے کر دُنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا، اور پھر اس نے دُنیا پرستی، نِفاق اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ اس قوم کے بعد

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ

پرہیز گار لوگ ہی اُن کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دُنیا کا رزق، تو اللہ کو اختیار ہے، جسے چاہے بے حساب دے۔

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رُونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج رَوی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور اُن کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رُونما ہو گئے تھے، اُن کا فیصلہ کرے ـــــ (اور ان اختلافات کے رُونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں،) اختلاف اُن لوگوں نے کیا، جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ اُنھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۳۰] ـــــ

امامت کے منصب پر مامور ہوا ہے، اس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے، تو وہ یہی قوم ہے۔

[۲۳۰] - ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بُنیاد پر ''مذہب'' کی تاریخ مرتب کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دُنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا، اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدّت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک اُمّت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ
وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ
حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ

پس جو لوگ انبیاؑ پر ایمان لے آئے، انھیں اللہ نے اپنے اِذن سے اُس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے، راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

پھر کیا[۲۳۱] تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنّت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتّٰی کہ وقت کا رسول اور اس کے

حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دُوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہش مند تھے۔ اسی خرابی کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاؑ اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بِنا ڈالے اور اپنی ایک نئی اُمّت بنا لے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انھیں پھر سے ایک اُمّت بنا دیں۔

۲۳۱ - اُوپر کی آیت اور اس آیت کے درمیان ایک پُوری داستان کی داستان ہے، جسے ذکر کیے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ یہ آیت خود اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور قرآن کی مکّی سورتوں میں (جو سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہوئی تھیں) یہ داستان تفصیل کے ساتھ بیان بھی ہو چکی ہے۔ انبیاؑ جب کبھی دُنیا میں آئے، انھیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انھوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلے میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جِدّ و جُہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ اٰمَنَّا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس ”اٰمَنَّا“ کا قدرتی تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے،

الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ
مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ
تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ
شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ ۲۶ ع ۱۰
الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ

ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ـــــ اُس وقت اُنھیں تسلّی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

لوگ پُوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

تمھیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے ـــــ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے؏

لوگ پُوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو: اِس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر

اسے قائم کرنے کی کوشش کرے، اور جو طاغوت اس کے راستے میں مزاحم ہو، اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے۔

صَدٌّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَكُفۡرٌۢ بِهٖ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِۗ وَاِخۡرَاجُ
اَهۡلِهٖ مِنۡهُ اَكۡبَرُ عِنۡدَ اللّٰهِۚ وَالۡفِتۡنَةُ اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِؕ وَ

راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔[۲۳۲]

۲۳۲- یہ بات ایک واقعے سے متعلق ہے۔ رجب ۲ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ نَخلہ کی طرف بھیجا تھا (جو مکّے اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) اور اس کو ہدایت فرما دی تھی کہ قریش کی نقل و حرکت اور اُن کے آیندہ ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ جنگ کی کوئی اجازت آپؐ نے نہیں دی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو راستے میں قریش کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ ملا اور اس پر انھوں نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو اُن کے مال سمیت گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی، جب کہ رجب ختم اور شعبان شروع ہو رہا تھا اور یہ امر مُشتبَہ تھا کہ آیا حملہ رجب (یعنی ماہِ حرام) ہی میں ہوا ہے یا نہیں، لیکن قریش نے، اور ان سے دَر پردہ ملے ہوئے یہودیوں اور منافقینِ مدینہ نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعے کو خوب شہرت دی اور سخت اعتراضات شروع کر دیے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر، اور حال یہ ہے کہ ماہِ حرام تک میں خوں ریزی سے نہیں چُوکتے۔ اِنھی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ ماہ حرام میں لڑنا بڑی بُری حرکت ہے، مگر اس پر اعتراض کرنا اُن لوگوں کے منہ کو تو زیب نہیں دیتا، جنھوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے سیکڑوں بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے تھے، پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گئے، پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا اور اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجدِ حرام تک جانے کا راستہ بھی بند کر دیا۔ حالانکہ مسجدِ حرام کسی کی مملوکہ جائداد نہیں ہے اور پچھلے دو ہزار برس میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو اُس کی زیارت سے روکا گیا ہو۔ اب جن ظالموں کا نامۂ اعمال اِن کرتُوتوں سے سیاہ ہے، ان کا کیا منہ ہے کہ ایک معمولی سی سرحدی جھڑپ پر اس قدر زور شور کے اعتراضات کریں، حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے، وہ نبی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اس مَقام پر یہ بات بھی معلوم رہنی چاہیے کہ جب یہ دستہ قیدی اور مالِ غنیمت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، تو آپؐ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں نے تم کو لڑنے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ نیز آپؐ نے ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت میں سے بیت المال کا حصّہ لینے سے بھی اِنکار فرما دیا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ ان کی یہ لُوٹ ناجائز ہے۔ عام مسلمانوں نے بھی اس فعل پر اپنے ان آدمیوں کو سخت ملامت کی تھی، اور مدینے میں کوئی ایسا نہ تھا، جس نے

لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ
اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ
فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (٢١٧) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ

وہ توتم سے لڑے ہی جائیں گے حتّٰی کہ اگر اُن کا بس چلے، تو تمھیں اِس دین سے پھیر لے جائیں۔ (اور یہ خُوب سمجھ لو) تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں[٢٣٣] گے۔ بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے[٢٣٤]، وہ

انھیں اس پر داد دی ہو۔

٢٣٣- مسلمانوں میں سے بعض سادہ لوح لوگ، جن کے ذہن پر نیکی اور صُلح پسندی کا ایک غلط تصوّر مسلّط تھا، کفّارِ مکّہ اور یہودیوں کے مذکورۂ بالا اعتراضات سے متاثّر ہو گئے تھے۔ اس آیت میں انھیں سمجھایا گیا ہے کہ تم اپنی ان باتوں سے یہ اُمید نہ رکھو کہ تمھارے اور ان کے درمیان صفائی ہو جائے گی۔ اُن کے اعتراضات صفائی کی غرض سے ہیں ہی نہیں۔ وہ تو دراصل کیچڑ اُچھالنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بات کَھل رہی ہے کہ تم اِس دین پر ایمان کیوں لائے ہو اور اس کی طرف دُنیا کو دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اَڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو، تمھارے اور ان کے درمیان صفائی کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اور ایسے دشمنوں کو تم معمولی دُشمن بھی نہ سمجھو۔ جو تم سے مال وزر یا زمین چھیننا چاہتا ہے، وہ کم تر درجے کا دشمن ہے۔ مگر جو تمھیں دینِ حق سے پھیرنا چاہتا ہے، وہ تمھارا بدترین دشمن ہے۔ کیونکہ پہلا تو صرف تمھاری دُنیا ہی خراب کرتا ہے، لیکن یہ دُوسرا تمھیں آخرت کے اَبدی عذاب میں دھکیل دینے پر تُلا ہوا ہے۔

٢٣٤- جہاد کے معنٰی ہیں: کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صَرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنٰی نہیں ہے۔ جنگ کے لیے تو قِتال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جِدّوجُہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے، جو ہر وقت اپنے مقصد کی دُھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے

يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۱۸) يَسْـَٔلُوْنَكَ
عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ
الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹) لا
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ

رحمتِ الٰہی کے جائز اُمّیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

پُوچھتے ہیں: شراب اور جُوے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ اُن کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔[۲۳۵]

پُوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دُنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

پُوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرزِ عمل میں ان کے لیے

تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دَوڑ دھوپ اور محنت کرے، اپنے تمام اِمکانی وسائل اُس کو فروغ دینے میں صَرف کر دے، اور ہر اُس مزاحمت کا پُوری قوّت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے، حتّٰی کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے ”جہاد“۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غَرَض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کَلِمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے۔ اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیشِ نظر نہ ہو۔

۲۳۵ – یہ شراب اور جُوئے کے متعلق پہلا حکم ہے، جس میں صرف اظہارِ ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے،

لَهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ
مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ
مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

بھلائی ہو، وہی اختیار کرنا بہتر ہے[۲۳۶]۔ اگر تم اپنا اور اُن کا خرچ اور رہنا سہنا مشترک رکھو، تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔ آخر وہ تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ بُرائی کرنے والے اور بھلائی کرنے والے، دونوں کا حال اللہ پر روشن ہے۔ اللہ چاہتا تو اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، مگر وہ صاحبِ اختیار ہونے کے ساتھ صاحبِ حکمت بھی ہے۔

تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے،

تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ پھر شراب اور جُوئے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو قطعی حرام کر دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ نساء، آیت ۴۳ و سورۂ مائدہ، آیت ۹۰)

۲۳۶- اس آیت کے نُزول سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حُقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آچکے تھے اور یہاں تک فرما دیا گیا تھا کہ ”یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو“ اور یہ کہ ”جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔“ ان شدید احکام کی بنا پر وہ لوگ، جن کی تَربیَت میں یتیم بچے تھے، اس قدر خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا تھا، اور اس احتیاط پر بھی انھیں ڈر تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصّہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ اسی لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان بچوں کے ساتھ ہمارے معاملے کی صحیح صورت کیا ہے۔

وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى
الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ
فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ

اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بُلاتے ہیں[۲۳۷] اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنّت اور مغفرت کی طرف بُلاتا ہے، اور وہ اپنے احکام واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ سبق لیں گے اور نصیحت قبول کریں گے۔ ع

پُوچھتے ہیں: حیض کا کیا حکم ہے؟ کہو: وہ ایک گندگی کی حالت[۲۳۸] ہے۔ اس میں عورتوں سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔[۲۳۹]

---

۲۳۷ – یہ ہے علّت و مَصلَحت اُس حکم کی جو مشرکین کے ساتھ شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اُوپر بیان ہوا تھا۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شَہوانی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ایک گہرا تمدّنی، اَخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی تعلق ہو، تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آیندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرزِ زندگی کا نقش ثبت ہوگا، وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن شوہر یا بیوی، بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثّر ہو جائے گی، اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے اِزدواج سے اسلام اور کفر و شرک کی ایک ایسی معجون مرکّب اُس گھر اور اس خاندان میں پرورش پائے گی، جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں، مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو، وہ محض اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ و مشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر و شرک سے متاثّر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں بھی مبتلا ہو جائے، تب بھی اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین و اَخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے۔

۲۳۸ – اصل میں اَذًی کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی گندگی کے بھی ہیں اور بیماری کے بھی۔ حیض صرف ایک گندگی ہی نہیں ہے، بلکہ طبّی حیثیت سے وہ ایک ایسی حالت ہے، جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ؗ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ اُس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔[۲۴۰] اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔ تمھیں اختیار ہے، جس طرح چاہو، اپنی کھیتی میں جاؤ،[۲۴۱] مگر اپنے مستقبل کی فکر کرو[۲۴۲] اور اللہ کی ناراضی سے بچو۔

ہوتی ہے۔

۲۳۹- قرآنِ مجید اس قسم کے معاملات کو استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ''الگ رہو'' اور ''قریب نہ جاؤ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے اور اسے بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود اور ہُنود اور بعض دُوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو توضیح فرما دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے، باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

۲۴۰- یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں ہے، بلکہ وہ فطری حکم مراد ہے، جو انسان اور حیوان سب کی جِبِلَّت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر مُتَنَفِّس بالطبع واقف ہے۔

۲۴۱- یعنی فطرت اللہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیر گاہ نہیں بنایا ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا، بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو، البتہ اس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں، اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے۔

۲۴۲- جامع الفاظ ہیں، جن سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک، یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو، تاکہ تمھارے دُنیا چھوڑنے سے پہلے تمھاری جگہ دُوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دُوسرے، یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو، اس کو دین، اَخلاق اور آدمیّت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی کوشش کرو۔ بعد کے فقرے میں اس بات پر بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ اگر ان دونوں فرائض کے ادا کرنے میں تم نے قصداً

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۲۳) وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ
عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۴) لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ
وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۲۵)
لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ

خُوب جان لو کہ تمھیں ایک دن اُس سے ملنا ہے۔ اور اے نبیؐ! جو تمھاری ہدایات کو مان لیں انھیں فلاح و سعادت کا مُژدہ سُنا دو۔

اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو، جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔[۲۲۳] اللہ تمھاری ساری باتیں سُن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو بے معنیٰ قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو، اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا،[۲۲۴] مگر جو قسمیں تم سچّے دل سے کھاتے ہو، اُن کی باز پُرس وہ ضرور کرے گا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، اُن کے لیے چار مہینے کی مُہلت ہے۔[۲۲۵]

کوتاہی کی، تو اللہ تم سے باز پُرس کرے گا۔

۲۲۳ - احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بات کی قسم کھائی ہو اور بعد میں اس پر واضح ہو جائے کہ اس قسم کے توڑ دینے ہی میں خیر اور بھلائی ہے، اسے قسم توڑ دینی چاہیے اور کفّارہ ادا کرنا چاہیے۔ قسم توڑنے کا کفّارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا، یا تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، آیت ۸۹)

۲۲۴ - یعنی بطور تکیۂ کلام کے بلا ارادہ جو قسمیں زبان سے نکل جاتی ہیں، ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے اور نہ ان پر مواخذہ ہوگا۔

۲۲۵ - اِصطلاحِ شرع میں اس کو اِیلا کہتے ہیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوش گوار تو نہیں رہ سکتے۔ بگاڑ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ایسے بگاڑ کو خدا کی شریعت پسند نہیں کرتی کہ دونوں ایک دُوسرے

فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (۲۲۶) وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (۲۲۷) وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ

اگر انھوں نے رُجوع کر لیا، تو اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔[۲۴۶] اور اگر اُنھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو[۲۴۷] تو جانے رہیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔[۲۴۸]

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ ایامِ ماہواری آنے تک اپنے آپ کو

کے ساتھ قانونی طور پر رشتۂ اِزدِواج میں تو بندھے رہیں، مگر عملاً ایک دُوسرے سے اس طرح الگ رہیں کہ گویا وہ میاں اور بیوی نہیں ہیں۔ ایسے بگاڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار مہینے کی مدّت مقرر کر دی کہ یا تو اس دَوران میں اپنے تعلّقات درست کر لو، ورنہ اِزدِواج کا رشتہ منقطع کر دو، تاکہ دونوں ایک دُوسرے سے آزاد ہو کر جس سے نباہ کر سکیں، اس کے ساتھ نکاح کر لیں۔

آیت میں چونکہ ”قَسم کھا لینے“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس لیے فُقہائے حَنَفِیّہ اور شافعیّہ نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ جہاں شوہر نے بیوی سے تعلقِ زن وشو نہ رکھنے کی قسم کھائی ہو، صرف وہیں اس حکم کا اطلاق ہوگا، باقی رہا قسم کھائے بغیر تعلق منقطع کر لینا، تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو، اس آیت کا حکم اُس صورت پر چسپاں نہ ہوگا۔ مگر فقہائے مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ خواہ قَسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو، دونوں صورتوں میں ترکِ تعلق کے لیے یہی چار مہینے کی مدّت ہے۔ ایک قول امام احمدؒ کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ (بِدایۃ المجتہد، جلد دوم، ص ۸۸، طبع مصر، ۱۳۳۹ھ)

حضرت علیؓ اور ابنِ عباسؓ اور حسن بصریؒ کی رائے میں یہ حکم صرف اُس ترکِ تعلق کے لیے ہے، جو بگاڑ کی وجہ سے ہو۔ رہا کسی مَصلَحت سے شوہر کا بیوی کے ساتھ جسمانی رابطہ منقطع کر دینا، جبکہ تعلّقات خوش گوار ہوں، تو اس پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے فقہا کی رائے میں ہر وہ حلف جو شوہر اور بیوی کے درمیان رابطۂ جسمانی کو منقطع کر دے، ایلا ہے اور اسے چار مہینے سے زیادہ قائم نہ رہنا چاہیے، خواہ ناراضی سے ہو یا رضامندی سے۔

۲۴۶ - بعض فقہا نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اگر وہ اس مدّت کے اندر اپنی قسم توڑ دیں اور پھر سے تعلقِ زن وشو قائم کر لیں تو ان پر قَسم توڑنے کا کَفّارہ نہیں ہے، اللہ ویسے ہی معاف کر دے گا۔ لیکن اکثر فقہا کی رائے یہ ہے کہ قَسم توڑنے کا کَفّارہ دینا ہوگا۔ غَفورٌ رحیم کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفارے سے تمھیں معاف کر دیا گیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمھارے کفارے کو قبول کر لے گا اور ترکِ تعلق کے دَوران میں جو زیادتی دونوں نے ایک دُوسرے پر کی ہو، اسے معاف کر دیا جائے گا۔

۲۴۷ - حضرات عثمانؓ، ابنِ مسعودؓ، زیدؓ بن ثابت وغیرہم کے نزدیک رُجوع کا موقع چار مہینے کے اندر ہی ہے۔ اس مدّت کا گزر جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، اس لیے مدّت گزرتے ہی طلاق خود بخود

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ
اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ
اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ
عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ

روکے رکھیں اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے رِحم میں جو کچھ خَلق فرمایا ہو، اُسے چھپائیں۔ اُنھیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے، اگر وہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔ اُن کے شوہر تعلّقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں، تو وہ اِس عدّت کے دوران میں انھیں پھر اپنی زوجیّت میں واپس لے لینے کے حق دار ہیں۔[۲۴۹]

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مَردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مَردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ

واقع ہو جائے گی اور وہ ایک طلاقِ بائن ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رُجوع کا حق نہ ہوگا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاہیں، تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرات عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ سے بھی ایک قول اسی معنٰی میں منقول ہے اور فقہائے حَنفِیّہ نے اسی رائے کو قبول کیا ہے۔

سعید بن مُسَیَّبؒ، مَکحُولؒ، زُہریؒ وغیرہ حضرات اس رائے سے یہاں تک تو متفق ہیں کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد خود بخود طلاق ہو جائے گی، مگر ان کے نزدیک وہ ایک طلاقِ رَجعی ہوگی، یعنی دَورانِ عدّت میں شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہوگا، اور رجوع نہ کرے تو عدّت گزر جانے کے بعد دونوں اگر چاہیں، تو نکاح کر سکیں گے۔

بخلاف اس کے حضرت عائشہؓ، ابوالدَّرداءؓ اور اکثر فقہائے مدینہ کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدّت گزرنے کے بعد معاملہ عدالت میں پیش ہوگا اور حاکمِ عدالت شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو اس عورت کی طرف رُجوع کرے یا اُسے طلاق دے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور ابنِ عمرؓ کا ایک قول اس کی تائید میں بھی ہے اور امام مالکؒ و شافعیؒ نے اسی کو قبول کیا ہے۔

۲۴۸- یعنی اگر تم نے بیوی کو ناروا بات پر چھوڑا ہے، تو اللہ سے بے خوف نہ رہو، وہ تمھاری زیادتی سے ناواقف نہیں ہے۔

۲۴۹- اس آیت کے حکم میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے، اس وقت تک طلاقِ بائن نہ ہوگی اور شوہر کو رُجوع کا حق باقی رہے گا۔ حضرات

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔ ع

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے۔[۲۵۰]

اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو اُس میں سے

ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشْعَریؓ، ابنِ مسعودؓ اور بڑے بڑے صحابہؓ کی یہی رائے ہے اور فقہائے حَنَفِیّہ نے اسی کو قبول کیا ہے۔ بخلاف اِس کے، دُوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی شوہر کا حقِ رُجوع ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہؓ، ابنِ عمرؓ اور زیدؓ بن ثابت کی ہے اور فقہائے شافعیۃ و مالکیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ حکم صرف اُس صورت سے متعلق ہے، جس میں شوہر نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ تین طلاقیں دینے کی صُورت میں شوہر کو حقِ رُجوع نہیں ہے۔

۲۵۰- اس مختصر سی آیت میں ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی کی، جو عربِ جاہلیّت میں رائج تھی، اصلاح کی گئی ہے۔ عرب میں قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حدّ و حساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا، اُس کو وہ بار بار طلاق دے کر رُجوع کرتا رہتا تھا، تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ بس ہی سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اَور سے نکاح ہی کر سکے۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت اسی ظلم کا دروازہ بند کرتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے ایک مرد ایک رشتۂ نکاح میں اپنی بیوی پر حد سے حد دو ہی مرتبہ طلاقِ رَجعی کا حق استعمال کر سکتا ہے۔ جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رُجوع کر چکا ہو، وہ اپنی عمر میں جب کبھی اس کو تیسری بار طلاق دے گا، عورت اس سے مستقل طور پر جدا ہو جائے گی۔

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طُہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا ہو، جب کہ عورت ایامِ ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں ہے، بلکہ ایام سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے، تو دوسرے طُہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دے دے، ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اِس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ عدّت گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کر لے، اور اگر عدّت گزر بھی جائے، تو دونوں کے لیے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طُہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اِس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں

شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ
اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ

کچھ واپس[۲۵۱] لے لو۔ البتّہ یہ صُورت مُستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حُدود پر قائم نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حُدودِ الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو اُن دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر[۲۵۲] لے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حُدود ہیں، اِن سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ حُدودِ الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں۔

پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لیے

دے ڈالی جائیں، جیسا کہ آج کل جُہلا کا عام طریقہ ہے، تو یہ شریعت کی رُو سے سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مَذمّت فرمائی ہے، اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا، آپ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ تاہم گناہ ہونے کے باوجود، ائمۂ اربعہ کے نزدیک تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور طلاقِ مُغلَّظ ہو جاتی ہے۔

۲۵۱ – یعنی مَہر اور وہ زیور اور کپڑے وغیرہ، جو شوہر اپنی بیوی کو دے چکا ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی واپس مانگنے کا اسے حق نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی اسلام کے اَخلاقی اصولوں کی ضد ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو، جسے وہ دوسرے شخص کو ہِبہ یا ہدیہ وتحفہ کے طور پر دے چکا ہو، واپس مانگے۔ اس ذلیل حرکت کو حدیث میں اُس کتّے کے فعل سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اپنی ہی قَے کو خود چاٹ لے۔ مگر خُصوصیّت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بہت ہی شرم ناک ہے کہ وہ طلاق دے کر رُخصت کرتے وقت اپنی بیوی سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہے جو اس نے کبھی اسے خود دیا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ اَخلاق سکھائے ہیں کہ آدمی جس عورت کو طلاق دے، اُسے رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر رُخصت کرے۔ جیسا کہ آگے آیت ۲۴۱ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۵۲ – شریعت کی اصطلاح میں اسے ”خُلَع“ کہتے ہیں، یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر کے گھر ہی میں کوئی معاملہ طے ہو جائے، تو جو کچھ طے ہوا ہو،

مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ ۖ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ

حلال نہ ہوگی، اِلّا یہ کہ اس کا نکاح کسی دُوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے[۲۵۳]۔ تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حُدودِ الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لیے ایک دُوسرے کی طرف رُجوع کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنھیں وہ اُن لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے، جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عِدّت پوری ہونے کو آجائے، تو یا بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ محض ستانے کی خاطر انھیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور

وہی نافذ ہوگا۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے، تو عدالت صرف اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اُس مرد سے اس حد تک مُتنفِّر ہو چکی ہے کہ اُس کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے، تجویز کرے، اور اس فدیے کو قبول کر کے شوہر کو اسے طلاق دینا ہوگا۔ بالعُموم فقہا نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ جو مال شوہر نے اس عورت کو دیا ہو، اس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ اسے دلوایا جائے۔

خُلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے، وہ رَجعی نہیں ہے، بلکہ بائنہ ہے۔ چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو گویا خریدا ہے، اس لیے شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اس طلاق سے رجوع کر سکے۔ البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر ایک دُوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں، تو ایسا کرنا ان کے لیے بالکل جائز ہے۔

جُمہور کے نزدیک خُلع کی عدّت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ مگر ابوداؤد، ترمذی اور ابنِ ماجہ وغیرہ میں متعدّد روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدّت ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ایک مُقدّمے کا فیصلہ کیا۔ (ابنِ کثیر، جلد اوّل، ص ۲۷۶)

۲۵۳- احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مُطلَّقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ
هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

۱۳ ع ۲۹ ۳ النصف

جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرے گا۔[۲۵۴] اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔ بھُول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمتِ عظمیٰ سے تمھیں سرفراز کیا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اُس نے تم پر نازل کی ہے، اس کا احترام ملحوظ رکھو۔[۲۵۵] اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے۔ ع

جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عِدّت پُوری کر لیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیرِ تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر

فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہو گا، بلکہ محض ایک بدکاری ہو گی اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے سابق شوہر کے لیے حلال نہ ہو گی۔ حضرت علی اور ابنِ مسعود اور ابو ہُریرہ اور عُقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی مُتّفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

۲۵۴- یعنی ایسا کرنا دُرست نہیں ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دے اور عدّت گزرنے سے پہلے محض اس لیے رُجوع کر لے کہ اسے پھر ستانے اور دِق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے کہ رُجوع کرتے ہو تو اس نیّت سے کرو کہ اب حُسنِ سلوک سے رہنا ہے۔ ورنہ بہتر یہ ہے کہ شریفانہ طریقے سے رُخصت کر دو۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ نمبر ۲۵۰)

۲۵۵- یعنی اس حقیقت کو فراموش نہ کر دو کہ اللہ نے تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے کر دُنیا کی رہنمائی کے عظیم الشان منصب پر مامور کیا ہے۔ تم "اُمّتِ وَسَط" بنائے گئے ہو۔ تمھیں نیکی اور راستی کا گواہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمھارا یہ کام نہیں ہے کہ حیلہ بازیوں سے آیاتِ الٰہی کا کھیل بناؤ، قانون کے الفاظ سے رُوحِ قانون کے خلاف ناجائز فائدے اُٹھاؤ اور دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے بجائے خود اپنے گھروں میں ظالم اور بدراہ بن کر رہو۔

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲ وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ

راضی ہوں۔[۲۵۶] تمھیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لانے والے ہو۔ تمھارے لیے شایستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پُوری مدّتِ رضاعت تک دودھ پیے، تو مائیں اپنے بچّوں کو کامل دو سال دُودھ پلائیں۔[۲۵۷] اِس صُورت میں بچّے کے باپ کو معروف طریقے سے انھیں کھانا کپڑا دینا ہو گا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اِس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچّہ اس کا ہے، اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے

۲۵۶- یعنی اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو اور زمانۂ عدّت کے اندر اس سے رُجوع نہ کیا ہو، پھر عدّت گزر جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو عورت کے رشتے داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت عدّت کے بعد اس سے آزاد ہو کر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو، تو اُس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے، اُسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے۔

۲۵۷- یہ اُس صورت کا حکم ہے، جب کہ زوجین ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہوں، خواہ طلاق کے

لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ
تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾
وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

تنگ کیا جائے کہ بچّہ اس کا ہے — دُودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچّے کے باپ پر ہے، ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے[۲۵۸] — لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دُودھ چھڑانا چاہیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اور اگر تمھارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دُودھ پلوانے کا ہو، تو اِس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

تم میں سے جو لوگ مر جائیں، اُن کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن روکے رکھیں۔[۲۵۹] پھر جب ان کی عِدّت پُوری ہو جائے، تو

ذریعے سے یا خُلع یا فسخ اور تفریق کے ذریعے سے، اور عورت کی گود میں دُودھ پیتا بچّہ ہو۔

[۲۵۸] یعنی اگر باپ مر جائے، تو جو اس کی جگہ بچّے کا ولی ہو، اُسے یہ حق ادا کرنا ہوگا۔

[۲۵۹] یہ عدّتِ وفات اُن عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خَلْوَتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مُستثنیٰ ہے۔ اس کی عِدّتِ وفات وضعِ حمل تک ہے، خواہ وضعِ حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہو جائے، یا اِس میں کئی مہینے صَرف ہوں۔

”اپنے آپ کو روکے رکھیں“ سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس مدت میں نکاح نہ کریں، بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ
اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ
بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ
تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

انھیں اختیار ہے، اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے جو چاہیں، کریں۔ تم پر اس کی کوئی ذمّے داری نہیں۔ اللہ تم سب کے اعمال سے باخبر ہے۔ زمانۂ عِدّت میں خواہ تم اُن بیوہ عورتوں کے ساتھ منگنی کا ارادہ اشارے کنایے میں ظاہر کر دو، خواہ دل میں چُھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں کوئی مضایقہ نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اُن کا خیال تو تمھارے دل میں آئے گا ہی۔ مگر دیکھو! خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ اگر کوئی بات کرنی ہے، تو معروف طریقے سے کرو۔ اور عقدِ نکاح باندھنے کا فیصلہ اُس وقت تک نہ کرو، جب تک کہ عدت پُوری نہ ہو جائے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تمھارے دلوں کا حال تک جانتا ہے۔

زینت سے بھی روکے رکھنا ہے۔ چنانچہ احادیث میں واضح طور پر یہ احکام ملتے ہیں کہ زمانۂ عِدّت میں عورت کو رنگین کپڑے اور زیور پہننے سے، مہندی اور سُرمہ اور خوشبو اور خضاب لگانے سے، اور بالوں کی آرایش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں۔ حضرات عمرؓ، عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، زیدؓ بن ثابت، ابنِ مسعودؓ، اُمّ سَلَمہؓ، سعید بن مُسَیّبؒ، ابراہیم نَخَعی، محمد بن سیرین اور ائمہؒ اربعہ رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ زمانۂ عدّت میں عورت کو اُسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہو۔ دن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جا سکتی ہے، مگر قیام اس کا اُسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اِس کے برعکس حضرت عائشہؓ، ابنِ عباسؓ، حضرت علیؓ، جابر بن عبداللہؓ، عطاء، طاؤس، حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہل الظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدّت کا زمانہ جہاں

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ع ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ ۸ ع ۳۰ ۱۳
عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا
لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ
وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ
يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَ اَنْ

لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بُردبار ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے درگزر فرماتا ہے۔ع

تم پر کچھ گناہ نہیں، اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مَہر مقرر ہو۔ اس صُورت میں اُنھیں کچھ نہ کچھ دینا ضرور چاہیے۔[۲۶۰] خوش حال آدمی اپنی مَقدِرَت کے مطابق اور غریب اپنی مَقدِرَت کے مطابق معروف طریقے سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو، لیکن مَہر مقرر کیا جا چکا ہو، تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا۔ یہ اَور بات ہے کہ عورت نرمی برتے (اور مَہر نہ لے) یا وہ مرد، جس کے اختیار میں عقدِ نکاح ہے، نرمی سے کام لے (اور پُورا مَہر دے دے)، اور تم (یعنی مرد)

چاہے گزار سکتی ہے اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے۔

۲۶۰- اس طرح رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے سے بہرحال عورت کو کچھ نہ کچھ نقصان تو پہنچتا ہی ہے، اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ حسبِ مَقدِرَت اس کی تلافی کرو۔

تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ
اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ
وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی ٭ وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ

نرمی سے کام لو، تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو۔[۲۶۱] تمھارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔

اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو،[۲۶۲] خصوصاً ایسی نماز کی جو محاسنِ صلوٰۃ کی جامع[۲۶۳] ہو۔ اللہ کے آگے اس طرح کھڑے ہو، جیسے فرماں بردار غلام کھڑے ہوتے ہیں۔ بدامنی کی حالت ہو تو

---

[۲۶۱] یعنی انسانی تعلّقات کی بہتری و خوش گواری کے لیے لوگوں کا باہم فیّاضانہ برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اگر ہر ایک شخص ٹھیک ٹھیک اپنے قانونی حق ہی پر اَڑا رہے، تو اجتماعی زندگی کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔

[۲۶۲] قوانینِ تمدّن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے اور اُسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخرِ کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہ نکلے۔

[۲۶۳] اصل میں لفظ ''صَلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی'' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد بعض مفسّرین نے صبح کی نماز لی ہے، بعض نے ظہر، بعض نے مغرب اور بعض نے عشا۔ لیکن ان میں سے کوئی قول بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف اہلِ تاویل کا اِستنباط ہے۔ سب سے زیادہ اقوال نمازِ عصر کے حق میں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی نماز کو صلوٰۃِ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن جس واقعے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین کے حملے نے اس درجہ مشغول رکھا کہ سورج ڈوبنے کو آگیا اور آپؐ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ اُس وقت آپؐ نے فرمایا کہ ''خدا ان لوگوں کی قبریں اور ان کے گھر آگ سے بھر دے، انھوں نے ہماری صلوٰۃِ وسطیٰ فوت کرا دی۔'' اِس سے یہ سمجھا گیا کہ آپؐ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطیٰ فرمایا ہے، حالانکہ اس کا یہ مطلب ہمارے نزدیک زیادہ قرینِ صواب ہے کہ اس مشغولیت نے اعلیٰ درجے کی نماز ہم سے فوت کرا دی، ناوقت پڑھنی پڑے گی، جلدی جلدی ادا کرنی ہوگی، خُشوع وخُضوع اور اطمینان و سکون کے ساتھ نہ پڑھ سکیں گے۔

وُسطیٰ کے معنیٰ بیچ والی چیز کے بھی ہیں اور ایسی چیز کے بھی جو اعلیٰ اور اشرف ہو۔ صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ
فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ

خواہ پیدل ہو، خواہ سوار، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھو۔ اور جب امن میسّر آ جائے، تو اللہ کو اُس طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھا دیا ہے، جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔

تم میں سے[۲۶۴] جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، اُن کو چاہیے کہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیّت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں، تو اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے وہ جو کچھ بھی کریں، اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اللہ سب پر غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اِسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، انھیں بھی مناسب طور پر کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متّقی لوگوں پر۔

اِس طرح اللہ اپنے احکام تمھیں صاف صاف بتاتا ہے۔

بھی ہو سکتی ہے اور ایسی نماز بھی جو صحیح وقت پر پورے خشوع اور توجہ الی اللہ کے ساتھ پڑھی جائے، اور جس میں نماز کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ بعد کا فقرہ کہ ”اللہ کے آگے فرماں بردار بندوں کی طرح کھڑے ہو“، خود اس کی تفسیر کر رہا ہے۔

[۲۶۴] - سلسلۂ تقریر اُوپر ختم ہو چکا تھا، یہ کلام اس کے تتمّے اور ضمیمے کے طور پر ہے۔

ع ۲۱ ۷ ۱۵

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ص فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا قف
ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا

اُمّید ہے کہ تم سمجھ بُوجھ کر کام کرو گے۔ ع

تم[۲۶۵] نے اُن لوگوں کے حال پر بھی کچھ غور کیا، جو موت کے ڈر سے اپنے گھر بار چھوڑ کر نکلے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ اللہ نے اُن سے فرمایا: مر جاؤ۔ پھر اُس نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی۔[۲۶۶] حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ـــــ مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ

۲۶۵- یہاں سے ایک دُوسرا سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے، جس میں مسلمانوں کو راہِ خدا میں جہاد اور مالی قربانیاں کرنے پر اُبھارا گیا ہے اور انھیں اُن کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جن کی وجہ سے آخر کار بنی اسرائیل زوال و انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اس مَقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت مکّے سے نکالے جا چکے تھے، سال ڈیڑھ سال سے مدینے میں پناہ گزیں تھے، اور کفّار کے مظالم سے تنگ آ کر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔ مگر جب انھیں لڑائی کا حکم دے دیا گیا، تو اب ان میں سے بعض لوگ کَسْمَسا رہے تھے، جیسا کہ چھبیسویں رُکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ اِس لیے یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کے دو اہم واقعات سے اُنھیں عبرت دلائی گئی ہے۔

۲۶۶- یہ اشارہ بنی اسرائیل کے واقعۂ خُروج کی طرف ہے۔ سورۂ مائدہ کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰؑ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کَنعانیوں کو ارضِ فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کر لو، تو انھوں نے بُزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انھیں چالیس سال تک زمین میں سرگرداں پھرنے کے لیے چھوڑ دیا، یہاں تک کہ ان کی ایک نسل ختم ہو گئی اور دُوسری نسل صحراؤں کی گود میں پَل کر اُٹھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کَنعانیوں پر غلبہ عطا کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی معاملے کو موت اور دوبارہ زندگی

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ
وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْۤ
اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا وقف لازم
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ

اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم میں کون ہے جو اللہ کو قرضِ حَسَن[۲۶۷] دے تاکہ اللہ اُسے کئی گُنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اُسی کی طرف تمھیں پلٹ کر جانا ہے۔

پھر تم نے اُس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰؑ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا؟ اُنھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔[۲۶۸] نبی نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا

کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

۲۶۷- ”قرضِ حَسَن“ کا لفظی ترجمہ ”اچھا قرض“ ہے، اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمّے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گُنا زیادہ دُوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرضِ حَسَن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر اُن کاموں میں صَرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

۲۶۸- یہ تقریباً ایک ہزار برس قبلِ مسیح کا واقعہ ہے۔ اُس وقت بنی اسرائیل پر عَمالِقَہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے، مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اس لیے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص اُن کا سربراہِ کار ہو، جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔ لیکن اُس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیّت آچکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثّر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق اُن کے

ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے درخواست جو کی، وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں، بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔
اس سلسلے میں بائبل کی کتاب سموئیل اوّل میں جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

> ”سموئیل زندگی بھر اسرائیلیوں کی عدالت کرتا رہا...... تب سب اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہنے لگے: دیکھ، تُو ضعیف ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تُو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دے، جو اور قوموں کی طرح ہماری عدالت کرے...... یہ بات سموئیل کو بُری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دُعا کی، اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، تو اس کو مان، کیوں کہ انھوں نے تیری نہیں، بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں اُن کا بادشاہ نہ رہوں...... اور سموئیل نے ان لوگوں کو، جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سُنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا، اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتّھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتّھوں کے آگے دَوڑیں گے، اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا، اور بعض سے ہل جُتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور رتّھوں کے ساز بنوائے گا، اور تمھاری بیٹیوں کو لے کر گُندھن اور باورچن اور نان پُز بنائے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو، جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا کرے گا، اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصّہ لے کر اپنے خواجوں اور خادموں کو دے گا، اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا، اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصّہ لے گا۔ سو، تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اُس دن اس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چُنا ہوگا، فریاد کرو گے، پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے: نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں، جو ہمارے اُوپر ہو، تاکہ ہم بھی اور قوموں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے...... خداوند نے سموئیل کو فرمایا: تو اُن کی بات مان اور اُن کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔“ (باب ۷، آیت ۱۵ تا باب ۸، آیت ۲۲)

> ”پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا...... جب تم نے دیکھا کہ بنی عَمّون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا، تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے، حالانکہ خداوند تمھارا خدا تمھارا بادشاہ تھا۔ سو اَب اس بادشاہ کو دیکھو، جسے تم نے چُن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی۔ دیکھو، خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اور اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی، جو تم پر سلطنت کرتا ہے، خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو، تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو، بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو، تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہوگا، جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا...... اور تم جان لو گے اور دیکھ بھی لو گے کہ تم نے خداوند کے حضور اپنے لیے بادشاہ مانگنے

عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (۲۴۶) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ

حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچّے ہم سے جُدا کر دیے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا، تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

اُن کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالُوت[۲۶۹] کو تمھارے لیے بادشاہ

سے کتنی بڑی شرارت کی...... اب رہا میں، سو خدا نہ کرے کہ تمھارے لیے دعا کرنے سے باز آ کر خداوند کا گناہ گار ٹھیروں، بلکہ میں وہی راہ، جو اچھی اور سیدھی ہے، تم کو بتاؤں گا۔" (باب ۱۲، آیت ۱۲ تا ۲۳)

کتابِ سموئیل کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادشاہت کے قیام کا یہ مطالبہ اللہ اور اس کے نبی کو پسند نہ تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ قرآنِ مجید میں اس مقام پر سردارانِ بنی اسرائیل کے اس مطالبے کی مَذمّت کیوں نہیں کی گئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قصّے کا ذکر جس غرض کے لیے کیا ہے، اس سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے کہ ان کا مطالبہ صحیح تھا یا نہ تھا۔ یہاں تو یہ بتانا مقصود ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر بُزدل ہو گئے تھے اور ان میں کس قدر نفسانیّت آ گئی تھی اور ان کے اندر اَخلاقی اِنضباط کی کتنی کمی تھی، جس کے سبب سے آخرِ کار وہ گر گئے۔ اور اس ذکر کی غرض یہ ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ کمزوریاں پرورش نہ کریں۔

۲۶۹ – بائبل میں اِس کا نام ساؤل لکھا ہے۔ یہ قبیلہ بِن یمین کا ایک ۳۰ سالہ نوجوان تھا۔ "بنی اسرائیل میں اُس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔" اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اُسے اپنے گھر لائے، تیل کی کُپّی لے کر اس کے سر پر اُنڈیلی اور اُسے چوما اور کہا کہ "خداوند نے تجھے مسح کیا، تا کہ تُو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔" اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماعِ عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ (۱-سموئیل، باب ۹ و ۱۰)

طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۷) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ

مقرّر کیا ہے۔ یہ سُن کر وہ بولے: ”ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اُس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے۔“ نبی نے جواب دیا: ”اللہ نے تمھارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا مُلک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اُس کے علم میں ہے۔“ اس کے ساتھ ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ”خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا، جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سُکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسٰی اور آلِ ہارُون کے چھوڑے ہوئے تبرّکات ہیں، اور جس کو اس وقت فرشتے

یہ بنی اسرائیل میں دُوسرا شخص تھا، جس کو خدا کے حکم سے ”مسح“ کر کے پیشوائی کے منصب پر مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے حضرت ہارونؑ سردار کاہن (chief priest) کی حیثیت سے مسح کیے گئے تھے، اِس کے بعد تیسرے ممسوح یا مسیح حضرت داؤد علیہ السلام ہوئے، اور چوتھے مسیح حضرت عیسٰی علیہ السلام۔ لیکن طالوت کے متعلق ایسی کوئی تصریح قرآن یا حدیث میں نہیں ہے کہ وہ نبوّت کے منصب پر بھی سرفراز ہوا تھا۔ محض بادشاہی کے لیے نامزد کیا جانا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اُسے نبی تسلیم کیا جائے۔

۳۲ ع ۹ ۱۶

الْمَلٰٓئِکَۃُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۲۴۸) ع

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ ۚ

فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ

سنبھالے ہوئے ہیں۔[۲۷۰] اگر تم مومن ہو، تو یہ تمھارے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ ع

پھر جب طالُوت لشکر لے کر چلا، تو اُس نے کہا: ”ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمھاری آزمایش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے

---

۲۷۰ – بائبل کا بیان اس باب میں قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ تاہم اُس سے اصل واقعے کی تفصیلات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صندوق، جسے بنی اسرائیل اصطلاحاً ”عہد کا صندوق“ کہتے تھے، ایک لڑائی کے موقع پر فلستی مشرکین نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا، وہاں وبائیں پھُوٹ پڑیں۔ آخرِ کار انھوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔ غالبًا اسی معاملے کی طرف قرآن اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ اُس وقت وہ صندوق فرشتوں کی حفاظت میں تھا، کیونکہ وہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان کے ہانک دی گئی تھی اور اللہ کے حکم سے یہ فرشتوں ہی کا کام تھا کہ وہ اُسے چلا کر بنی اسرائیل کی طرف لے آئے۔ رہا یہ ارشاد کہ ”اس صندوق میں تمھارے لیے سُکونِ قلب کا سامان ہے“، تو بائبل کے بیان سے اس کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، تو پوری قوم کی ہمت ٹوٹ گئی اور ہر اسرائیلی یہ خیال کرنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے بُرے دن آگئے ہیں۔ پس اُس صندوق کا واپس آنا اِس قوم کے لیے بڑی تقویتِ قلب کا موجب تھا اور یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمّتیں پھر بندھ سکتی تھیں۔

”آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات“ جو اس صندوق میں رکھے ہُوئے تھے، ان سے مراد پتھر کی وہ تختیاں ہیں، جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا، جسے حضرت موسیٰؑ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سُپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں مَنّ بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا، تاکہ آیندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اُس احسان کو یاد کریں، جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا۔ اور غالبًا حضرت موسیٰؑ کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا، جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا۔

فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ
اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ
قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ
یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَ لَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا

جو اس سے پیاس نہ بُجھائے، ہاں ایک آدھ چُلّو کوئی پی لے، تو پی لے۔" مگر ایک گروہِ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔[۲۷۱]

پھر جب طالُوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے، تو اُنھوں نے طالُوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالُوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔[۲۷۲] لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، انھوں نے کہا: "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔" اور جب وہ جالُوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے، تو انھوں نے دُعا کی: "اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا

۲۷۱- ممکن ہے اس سے مراد دریائے اُردُن ہو یا کوئی اور ندی یا نالا۔ طالوت بنی اسرائیل کے لشکر کو لے کر اس کے پار اُترنا چاہتا تھا، مگر چونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی قوم کے اندر اَخلاقی انضباط بہت کم رہ گیا ہے، اس لیے اس نے کارآمد اور ناکارہ لوگوں کو مُمیّز کرنے کے لیے یہ آزمائش تجویز کی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ تھوڑی دیر کے لیے اپنی پیاس تک ضبط نہ کر سکیں، اُن پر کیا بھروسا کیا جاسکتا ہے کہ اُس دشمن کے مقابلے میں پامردی دکھائیں گے، جس سے پہلے ہی وہ شکست کھا چکے ہیں۔

۲۷۲- غالبًا یہ کہنے والے وہی لوگ ہوں گے، جنھوں نے دریا پر پہلے ہی اپنی بے صبری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ ؕ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ
وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ
وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

فیضان کر، ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔" آخرکار اللہ کے اذن سے اُنھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے[۲۷۳] جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے سلطنت اور حکمت سے نوازا اور جن جن چیزوں کا چاہا، اس کو علم دیا —— اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا،[۲۷۴] لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اِس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

---

۲۷۳ – داؤد علیہ السّلام اس وقت ایک کم سِن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے، جب کہ فِلِستیوں کی فوج کا گراں ڈِیل پہلوان جالوت (جولیَت) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مُبارَزَت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤدؑ یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اس کو قتل کر دیا۔ اس واقعے نے اُنھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا، طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخرکار وہی اسرائیلیوں کے فرماں روا ہوئے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سموئیل اوّل، باب ۱۷ و ۱۸)

۲۷۴ – یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک حدِ خاص تک تو زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے، مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے، تو کسی دُوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک پارٹی ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ قائم رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی، تو یقیناً ملکِ خدا میں

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ ۳ الجزء وقف لازم
اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ قف وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع ۳۳ ع ۵

یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سُنا رہے ہیں اور تم یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو، جو رسُول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دُوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے، اور آخر میں عیسیٰؑ ابنِ مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور رُوحِ پاک سے اس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا، تو ممکن نہ تھا کہ اِن رسولوں کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے، وہ آپس میں لڑتے۔ مگر (اللہ کی مشیّت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے) انھوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں، اللہ چاہتا، تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۲۷۵] ع

فسادِ عظیم برپا ہو جاتا۔

۲۷۵ – مطلب یہ ہے کہ رسُولوں کے ذریعے سے علم حاصل ہو جانے کے بعد جو اختلافات لوگوں کے درمیان رُونما ہوئے اور اختلافات سے بڑھ کر لڑائیوں تک جو نوبتیں پہنچیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ معاذ اللہ! خدا بے بس تھا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ۬

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو[۲۷۶] قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں، جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔[۲۷۷] اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔[۲۷۸]

اور اس کے پاس ان اختلافات اور لڑائیوں کو روکنے کا زور نہ تھا۔ نہیں، اگر وہ چاہتا، تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاؑ کی دعوت سے سرتابی کر سکتا اور کُفر و بغاوت کی راہ چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا۔ مگر اس کی مَشِیَّت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لے اور انھیں ایک خاص رَوِش پر چلنے کے لیے مجبور کر دے۔ اس نے امتحان کی غرض سے انھیں زمین پر پیدا کیا تھا، اس لیے اس نے ان کو اعتقاد و عمل کی راہوں میں اِنتخاب کی آزادی عطا کی اور انبیاؑ کو لوگوں پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجا کہ زبردستی انھیں ایمان و اطاعت کی طرف کھینچ لائیں، بلکہ اس لیے بھیجا کہ دلائل اور بَیِّنات سے لوگوں کو راستی کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ پس جس قدر اختلافات اور لڑائیوں کے ہنگامے ہوئے، وہ سب اس وجہ سے ہوئے کہ اللہ نے لوگوں کو ارادے کی جو آزادی عطا کی تھی، اس سے کام لے کر لوگوں نے یہ مختلف راہیں اختیار کر لیں، نہ اس وجہ سے کہ اللہ ان کو راستی پر چلانا چاہتا تھا، مگر معاذ اللہ! اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

۲۷۶- مراد راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے، انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

۲۷۷- یہاں کفر کی روش اختیار کرنے والوں سے مُراد یا تو وہ لوگ ہیں، جو خدا کے حکم کی اطاعت سے انکار کریں اور اپنے مال کو اس کی خوشنودی سے عزیز تر رکھیں۔ یا وہ لوگ، جو اُس دن پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں، جس کے آنے کا خوف دلایا گیا ہے۔ یا پھر وہ لوگ جو اس خیالِ خام میں مُبتلا ہوں کہ آخرت میں انھیں کسی نہ کسی طرح نجات خرید لینے کا اور دوستی و سفارش سے کام نکال لے جانے کا موقع حاصل ہو ہی جائے گا۔

۲۷۸- یعنی نادان لوگوں نے اپنی جگہ چاہے کتنے ہی خدا اور معبُود بنا رکھے ہوں، مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ خدائی پوری کی پوری بلا شرکتِ غیرے اس غیر فانی ذات کی ہے، جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں، بلکہ آپ اپنی ہی حیات سے

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ
مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

وہ نہ سوتا ہے، اور نہ اُسے اُونگھ لگتی ہے۔[۲۷۹] زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے۔[۲۸۰] کون ہے جو اُس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟[۲۸۱] جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ اِدراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے۔[۲۸۲]

زندہ ہے اور جس کے بل بُوتے ہی پر کائنات کا یہ سارا انظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اُس کا شریک ہے، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ شریک ٹھیرا کر زمین یا آسمان میں جہاں بھی کسی اَور کو معبُود (الٰہ) بنایا جا رہا ہے، ایک جھوٹ گھڑا جا رہا ہے اور حقیقت کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔

۲۷۹ - یہ اُن لوگوں کے خیالات کی تردید ہے، جو خداوندِ عالَم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں، جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً بائبل کا یہ بیان کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ (کتابِ خُروج، باب ۲۰، آیت ۱۱)

۲۸۰ - یعنی وہ زمین و آسمان کا اور ہر اُس چیز کا مالک ہے، جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی مِلکیّت میں، اس کی تدبیر میں اور اُس کی پادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصّہ نہیں۔ اس کے بعد کائنات میں جس دُوسری ہستی کا بھی تم تصوّر کر سکتے ہو، وہ بہر حال اِس کائنات کی ایک فرد ہی ہوگی، اور جو اس کائنات کا فرد ہے، وہ اللہ کا مملوک اور غلام ہے، نہ کہ اُس کا شریک اور ہمسر۔

۲۸۱ - یہ اُن مشرکین کے خیالات کا اِبطال ہے، جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دُوسری ہستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر اَڑ بیٹھیں، وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا پیغمبر اور کوئی مقرّب ترین فرشتہ اُس پادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جُرأت نہیں رکھتا۔

۲۸۲ - اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ اُوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ
وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ

اُس کی حکومت[۲۸۳] آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔[۲۸۴]
دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں[۲۸۵] ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے

حاکمیّت اور اس کے مُطلَق اختیارات کا تصوّر پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دُوسری حیثیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے، جب کہ کسی دُوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظامِ کائنات اور اس کی مَصلَحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جِنّ یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جُز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالَم دَرہم بَرہم ہو جائے۔ نظامِ عالَم تو رہا درکنار، بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں، جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔

۲۸۳- اصل میں لفظ ’’کُرسی‘‘ استعمال ہوا ہے، جسے بالعُموم حکومت و اقتدار کے لیے اِستعارے کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں بھی اکثر کرسی کا لفظ بول کر حاکمانہ اختیارات مُراد لیتے ہیں۔

۲۸۴- یہ آیت ’’آیت الکرسی‘‘ کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمّل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اِسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔

اِس مَقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں خداوندِ عالَم کی ذات و صفات کا ذکر کس مناسبت سے آیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مرتبہ پھر اُس تقریر پر نگاہ ڈال لیجیے، جو رکوع ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر اُکسایا گیا ہے اور اُن کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر نہیں، بلکہ ایمان، صبر و ضبط اور پختگیِ عزم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت وابستہ ہے، اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دُنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ انسانوں کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع کرتا رہتا ہے، ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو غلبہ و اقتدار کا دائمی پٹا مل جاتا، تو دُوسروں کے لیے جینا دشوار ہو جاتا۔ پھر اس شُبہے کو دفع کیا گیا ہے، جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر کھٹکتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر اختلافات کو مٹانے اور نزاعات کا سدِّباب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی

الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ

الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت[٢٨٦] کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹُوٹنے والا نہیں، اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، اُن کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے

آمد کے باوجود نہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اُس نے اِن خرابیوں کو دُور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ اِس کے جواب میں بتا دیا گیا کہ اختلافات کو بجبر روک دینا اور نوعِ انسانی کو ایک خاص راستے پر بزور چلانا اللہ کی مَشِیّت ہی میں نہ تھا، ورنہ انسان کی کیا مجال تھی کہ اُس کی مَشِیّت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اُس اصل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا گیا جس سے تقریر کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور مَسالک و مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہرحال حقیقتِ نفسُ الامری، جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے، یہ ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو زبردستی مجبُور کیا جائے۔ جو اُسے مان لے گا، وہ خود ہی فائدے میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا، وہ آپ نقصان اُٹھائے گا۔

۲۸۵- یہاں "دین" سے مراد اللہ کے متعلّق وہ عقیدہ ہے جو اُوپر آیت الکرسی میں بیان ہوا ہے، اور وہ پورا نظامِ زندگی ہے جو اس عقیدے پر بنتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اسلام" کا یہ اعتقادی اور اخلاقی و عملی نظام کسی پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جو کسی کے سر جبراً منڈھی جا سکے۔

۲۸۶- "طاغوت" لُغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اِصطلاح میں طاغوت سے مُراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اُصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اِس کا نام فِسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اُصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اَور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے مُلک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے، اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ

ع ۳۴ ۲

روشنی میں نکال لاتا ہے۔[۲۸۷] اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے حامی و مددگار طاغوت[۲۸۸] ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ع

کیا[۲۸۹] تم نے اُس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟[۲۹۰]

طاغوت کا منکر نہ ہو۔

۲۸۷– تاریکیوں سے مُراد جَہالت کی تاریکیاں ہیں، جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح وسعادت کی راہ سے دُور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صَرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مُراد علمِ حق ہے، جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت ایک صحیح راہِ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

۲۸۸– ”طاغوت“ یہاں طَوَاغیت کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے، یعنی خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چُنگل میں نہیں پھنستا، بلکہ بہت سے طَوَاغیت اس پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے، جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے۔ دُوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے، جو اسے جذبات وخواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے لیے پھرتا ہے۔ اور بے شمار طاغوت باہر کی دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بیوی اور بچے، اَعِزّہ اور اقربا، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور رہنما، حکومت اور حکام، یہ سب اس کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکّر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

۲۸۹– اُوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اُسے تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے، اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے،

وقفِ لازم

رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ

جھگڑا اِس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔[۲۹۱] جب ابراہیمؑ نے کہا کہ ”میرا رب وہ ہے، جس کے اختیار میں زندگی اور

جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہو گیا۔ مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی، اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں، جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا، سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مُشاہَدہ کرا دیا۔

۲۹۰ – اس شخص سے مُراد نُمرود ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے وطن (عراق) کا بادشاہ تھا۔ جس واقعے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں نہیں ہے۔ مگر تَلْمُود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ نمرود کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دار (chief officer of the state) کا منصب رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کُھلّم کُھلّا شرک کی مُخالَفت اور توحید کی تبلیغ شروع کی اور بت خانے میں گُھس کر بُتوں کو توڑ ڈالا، تو اُن کے باپ نے خود ان کا مُقدّمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا اور پھر وہ گفتگو ہوئی، جو یہاں بیان کی گئی ہے۔

۲۹۱ – یعنی اس جھگڑنے میں جو بات مابِہ النِّزاع تھی، وہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ اپنا رب کس کو مانتے ہیں۔ اور یہ نِزاع اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ اُس جھگڑنے والے شخص، یعنی نمرود کو خدا نے حکومت عطا کر رکھی تھی۔ اِن دو فقروں میں جھگڑے کی نوعیت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل حقیقتوں پر نگاہ رہنی ضروری ہے:

(۱) قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے خدایگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اُسی کو رب اور تنہا اُسی کو خدا اور معبُود نہیں مانتے۔

(۲) خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری (supernatural) خدائی، جو سلسلۂ اسباب پر حکمراں ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رُجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جِنّوں اور سیّاروں اور دُوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھیراتے ہیں، ان سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجا لاتے ہیں، اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدُّنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت)، جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو، اور جسے دُنیوی معاملات میں فرماں روائی کے مُطلَق اختیارات حاصل ہوں۔ اِس دوسری قسم کی خدائی کو دُنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے، یا اس کے ساتھ، شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے

يُمِيۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ
بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ ؕ

موت ہے، تو اُس نے جواب دیا: ”زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔“ ابراہیمؑ نے کہا: ”اچھا، اللہ سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لا۔“ یہ سُن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا،[۲۹۲]

اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اِسی دُوسرے معنیٰ میں خدائی کے مدّعی ہوئے ہیں، اور اسے مستحکم کرنے کے لیے اُنھوں نے بالعُموم پہلے معنیٰ والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہے ہیں۔

(۳) نمرود کا دعوائے خدائی بھی اِسی دُوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبّر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسبابِ عالَم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اِس ملکِ عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مُطلَق مَیں ہوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دِہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدّار ہے، جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے، یا میرے سوا کسی اَور کو رب تسلیم کرے۔

(۴) ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبُود اور رب مانتا ہوں، اور اس کے سوا سب کی خدائی اور رُبوبیّت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہُوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبُودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو زَد پڑتی ہے، اُسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جُرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

۲۹۲ - اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دُوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نمرود اس کا جواب ڈِھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دُوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈِھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اُسی خدا کے زیرِ فرمان ہیں، جس کو ابراہیمؑ نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا؟ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی، اس کو تسلیم کر لینے کے معنیٰ اپنی مُطلَقُ العِنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے، جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لٰہذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست کُھل جاتی۔

تلمُود کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیے گئے۔ دس روز تک وہ

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى
قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ
بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ
لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ
مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

مگر اللہ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اُس شخص کو دیکھو، جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا، جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔[۲۹۳] اُس نے کہا: ”یہ آبادی، جو ہلاک ہو چکی ہے، اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟“[۲۹۴] اس پر اللہ نے اس کی رُوح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مُردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پُوچھا: ”بتاؤ، کتنی مدّت پڑے رہے ہو؟“ اُس نے کہا: ”ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔“ فرمایا: ”تم پر سو برس اِسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیّر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے

جیل میں رہے۔ پھر بادشاہ کی کونسل نے اُن کو زندہ جلانے کا فیصلہ کیا اور ان کے آگ میں پھینکے جانے کا وہ واقعہ پیش آیا، جو سورہ انبیاء، رکوع ۵، العنکبوت، رکوع ۲، ۳، اور الصّافّات، رکوع ۴ میں بیان ہوا ہے۔

۲۹۳ – یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدّعا، جس کے لیے یہاں یہ ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا، اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کی تعیین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ، نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

۲۹۴ – اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے یا انھیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاؑ کو کرایا جاتا رہا ہے۔

اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ
كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ
اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ
اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی
وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ
فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ
ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵ ع ۲

گدھے کو بھی دیکھو (کہ اِس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)۔ اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔[۲۹۵] پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اُٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔" اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی، تو اس نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ "میرے مالک! مجھے دکھا دے، تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔" فرمایا: "کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟" اُس نے عرض کیا: "ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اِطمینان درکار ہے۔"[۲۹۶] فرمایا: "اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جُز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔"[۲۹۷] ع

---

۲۹۵ – ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دُنیا سو برس پہلے مُردہ سمجھ چکی تھی، خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

۲۹۶ – یعنی وہ اطمینان، جو مشاہدۂ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ

جو لوگ[۲۹۸] اپنے مال اللہ کی راہ میں صَرف کرتے ہیں[۲۹۹]، اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے

۲۹۷ – اس واقعے اور اُوپر کے واقعے کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ لیکن انبیا علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے، اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے، تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہلِ ایمان کو اِس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے، اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے۔ لیکن انبیاؑ کو جو خدمت اللہ نے سُپرد کی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دُنیا کو دینی تھی۔ اُن کو دُنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ تو قیاسات دوڑاتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں۔ تمھارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں۔ اِسی لیے انبیاؑ کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان و زمین کے نظامِ حکومت (ملکوت) کا مُشاہَدہ کرایا گیا ہے، ان کو جنت اور دوزخ آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بَعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصبِ نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادت کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت اُنھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ نمبر ۳۳۰ و ۳۳۴)

۲۹۸ – اب پھر سلسلۂ کلام اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے، جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس تقریر کی ابتدا میں اہلِ ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو، اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر کوئی گروہ جب تک کہ اُس کا مَعاشی نقطۂ نظر بالکل ہی تبدیل نہ ہو جائے، اس بات پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض سے بالاتر ہو کر محض ایک اعلیٰ درجے کے اَخلاقی مقصد کی خاطر اپنا مال بے دریغ صَرف کرنے لگے۔ مادّہ پرست لوگ، جو پَیسا کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہوں اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع و نقصان کی میزان ہی پر جمی رہتی ہو، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصدِ عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اَخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں، تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادّی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اِس ذہنیّت کے ساتھ اُس دین کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دُنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کَلِمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دُوسری ہی قسم کے اَخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کُشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طَلَبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نَشو و نَما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رُکوعوں تک اسی ذہنیّت کی تخلیق کے لیے ہدایات

حَبَّةٍ اَنۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ
يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتۡبِعُوۡنَ مَآ اَنۡفَقُوۡا
مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ
وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ

ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اِسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔[300] جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔[301] ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس خیرات سے

دی گئی ہیں۔

۲۹۹ – مال کا خرچ خواہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو، یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے میں، یا اپنے اعزّہ و اقربا کی خبر گیری میں، یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہِ عام کے کاموں میں، یا اشاعتِ دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہر حال اگر وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو اور خالص خدا کی رضا کے لیے ہو تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

۳۰۰ – یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا، اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ جو خدا ایک دانے میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں، اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمھاری خیرات کو بھی اسی طرح نَشْوونَما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گُنا ہو کر تمھاری طرف پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں: ایک، یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمھارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو، وہ نہ دے سکے۔ دوسرے، یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبے سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمھارا اجر مارا جائے۔

۳۰۱ – یعنی نہ تو اُن کے لیے اس بات کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ
كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

بہتر ہے، جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بُردباری اُس کی صفت [۳۰۲] ہے۔ اَے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دِکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر [۳۰۳]۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی [۳۰۴]۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔

آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۳۰۲- اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ اللہ تمھاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے۔ دُوسرے، یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بُردبار ہے، اس لیے اُسے پسند بھی وہی لوگ ہیں، جو چھچھورے اور کم ظرف نہ ہوں، بلکہ فراخ حوصلہ اور بُردبار ہوں۔ جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمھارے قصوروں کے باوجود تمھیں بار بار بخشتا ہے، وہ ایسے لوگوں کو کیونکر پسند کر سکتا ہے، جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں، تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہم کلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا، جو اپنے عَطیّے پر احسان جتاتا ہو۔

۳۰۳- اس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اُس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

۳۰۴- اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اُس نیت اور اُس جذبے کی خرابی ہے، جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے، جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ

ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے[۳۰۵]۔ بخلاف اِس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی سطحِ مُرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اُس کے لیے کافی ہو جائے[۳۰۶]۔ تم جو کچھ کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو،

کھیتی نشو و نما پائے۔ لیکن جب رویدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اُوپر ہی اُوپر ہو، اور اس اُوپری تہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو، تو بارش مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مُضِر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشو و نما دینے کی قوت رکھتی ہے، مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے، اَور کچھ نہیں۔

۳۰۵- یہاں ”کافر“ کا لفظ ناشکرے اور منکرِ نعمت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے، تو اس کے ساتھ اذیّت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اُسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

۳۰۶- ”زور کی بارش“ سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجے کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔

مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُۙ لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ
الثَّمَرٰتِۙ وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ
اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ
الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ؏ ﴿۲۶۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ ۳۶ ع ۴
طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ وَلَا

نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہُوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آ کر جُھلس جائے، جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچّے ابھی کسی لائق نہ ہوں[۳۰۷]؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لیے نکالا ہے، اُس میں سے بہتر حصّہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں

اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے، جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدّت نہ ہو۔

۳۰۷ - یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے، جب کہ تم اُس سے فائدہ اُٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور ازسرِ نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ رہا ہو، تو یہ بات تم کیسے پسند کر رہے ہو کہ دُنیا میں مدت العمر کام کرنے کے بعد آخرت کی زندگی میں تم اِس طرح قدم رکھو کہ وہاں پہنچ کر یکایک تمھیں معلوم ہو کہ تمھارا پورا کارنامۂ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دُنیا کے لیے کمایا تھا، وہ دُنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اُس کے پھل کھا سکو۔ وہاں تمھیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ ازسرِ نو اب آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے، اِسی دُنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دُنیا ہی کی دُھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دُنیوی فائدے تلاش کرنے ہی میں کھپاتے رہے، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمھاری حالت بعینہٖ اُس بُڈھے کی طرح حسرت ناک ہو گی، جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالَمِ پیری میں اُس وقت جل گیا، جب کہ نہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے اور نہ اُس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ
اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (٢٦٧)
اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۖۙ (٢٦٨)
يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (٢٦٩)

دینے کے لیے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے، تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔[٣٠٨] شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرم ناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی اُمید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔ جس کو چاہتا ہے حِکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت ملی، اُسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔[٣٠٩] اِن باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں، جو دانش مند ہیں۔

٣٠٨- ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجے کی صفات سے مُتّصف ہو، وہ بُرے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اَخلاق لوگوں سے محبّت کرے۔

٣٠٩- حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوّتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی، وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا، بلکہ اُس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں یہ بڑی ہوشیاری اور عقل مندی ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے، اُن کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے۔ حکمت و دانائی اُن کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے، اُسے اپنی متوسّط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دُنیا کی اس چند روزہ

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ
فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ
وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اُس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔[۳۱۰] اگر اپنے صدقات عَلانِیَہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چُھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔[۳۱۱] تمھاری بہت سی بُرائیاں اِس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔[۳۱۲] اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو بہر حال اُس کی خبر ہے۔

زندگی میں دُوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو، لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پُوری زندگی نہیں، بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جُز ہے۔ اس چھوٹے سے جُز کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے، وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ عقل مند دراصل وہی ہے، جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر تھوڑے سرمایے ہی سے اُس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوش حالی کا بندوبست کرلیا۔

۳۱۰– خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں آدمی کی نیّت اور اس کے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر نذر مانی ہوگی، وہ اس کا اجر پائیں گے، اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دُوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی، اُن کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اُوپر لازم کرلے، جو اس کے ذمّے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا مُوجبِ عذاب ہے۔

۳۱۱– جو صدقہ فرض ہو، اس کو عَلانِیَہ دینا افضل ہے، اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو، اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اُصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا عَلانِیَہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اَولیٰ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا
تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٢﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ
مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمّے داری تم پر نہیں ہے۔ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پُورا پُورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ[٣١٣] ہو گی۔

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گِھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں کوئی دَوڑ دُھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر

٣١٢- یعنی چُھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس واَخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اَوصافِ حمیدہ خوب نَشْوونَما پاتے ہیں، اس کی بُری صفات رفتہ رفتہ مِٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اس کو اللہ کے ہاں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں، انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

٣١٣- ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہلِ حاجت کی مدد کرنے میں تأمُّل کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ

الربع ع ۳۷ ۵

اِلۡحَافًا ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ع ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيۡنَ
يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمۡ
اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾ وقف منزل
اَلَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَقُوۡمُ الَّذِىۡ

کچھ مانگیں۔ اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔[۳۱۴] ع

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سُود[۳۱۵] کھاتے ہیں، اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے،

غلط فہمی دُور کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اُتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سُبک دوش ہو چکے۔ اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دُنیوی مال و متاع سے اُن کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تأمّل نہ کرو کہ اُنھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے، اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

۳۱۴- اِس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صَرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی مَعاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جِدّو جُہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا، جو تاریخ میں اصحابِ صُفَّہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے، جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے۔ ہمہ وقت حضوؐر کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ حضوؐر جس مہم پر چاہتے، انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا، اس وقت یہ مدینے ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا اِنفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

۳۱۵- اصل میں لفظ ”رِبٰوا“ استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ عربی میں زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اِصطلاحاً اہلِ عرب اِس لفظ کو اُس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وُصول کرتا ہے۔ اِسی کو ہماری زبان میں سُود کہتے ہیں۔ نُزولِ قرآن کے وقت سُودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنھیں اہلِ عرب ”رِبٰوا“ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کے ہاتھ کوئی

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا
الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ وقف لازم

جسے شیطان نے چھُوکر باؤلا کر دیا ہو۔[٣١٦] اور اس حالت میں اُن کے مُبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”تجارت بھی تو آخر سُود ہی جیسی چیز ہے“،[٣١٧] حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔[٣١٨]

چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدّت مقرر کر دیتا۔ اگر وہ مدّت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی، تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دُوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدّت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدّت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدّت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی، تو مزید مُہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اِسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

٣١٦- اہلِ عرب دیوانے آدمی کو ”مجنُون“ (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے، تو یوں کہتے کہ اسے جنّ لگ گیا ہے۔ اسی محاورے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سُود خوار کو اُس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے، اسی طرح سُود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جُنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سُود خواری سے کس کس طرح انسانی محبّت، اخوّت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کُن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اِس دُنیا میں ہے۔ اور چونکہ آخرت میں انسان اُسی حالت میں اُٹھایا جائے گا جس حالت پر اُس نے دُنیا میں جان دی ہے، اِس لیے سُود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اُٹھے گا۔

٣١٧- یعنی ان کے نظریّے کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے، اس کی نوعیّت اور سُود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے، اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں اِستدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع جائز ہے، تو قرض پر دیے ہوئے روپے کا منافع کیوں ناجائز ہو۔ اِسی طرح کے دلائل موجودہ زمانے کے سُود خوار بھی سُود کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا، اسے وہ قرض پر دُوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی بہرحال اس سے فائدہ ہی اُٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اُٹھا رہا ہے، اس میں سے ایک حصّہ وہ قرض دینے والے کو نہ ادا کرے؟ مگر یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں، خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت و حرفت

کے یا زراعت کے، اور خواہ انھیں آدمی صرف اپنی محنت سے کرتا ہو، یا اپنے سرمایے اور محنت ہر دو سے، اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقرر منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دُنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار قرار پائے؟ غیر نفع بخش اغراض کے لیے قرض لینے والے کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجیے، اور شرح کی کمی بیشی کے مسئلے سے بھی قطعِ نظر کر لیجیے۔ معاملہ اُسی قرض کا سہی جو نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے لیا جائے، اور شرح بھی تھوڑی ہی سہی۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں، اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بار آور ہونا موقوف ہے، ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل انھی کے سر ہو، مگر جس نے صرف اپنا روپیا انھیں قرض دے دیا ہو، وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وُصول کرتا چلا جائے! یہ آخر کس عقل، کس مَنطِق، کس اُصولِ انصاف اور کس اُصولِ مَعاشیات کی رُو سے درست ہے؟ اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانے کو بیس سال کے لیے ایک رقم قرض دے اور آج ہی یہ طے کر لے کہ آیندہ ۲۰ سال تک وہ برابر ۵ فی صد سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہو گا، حالانکہ وہ کارخانہ جو مال تیار کرتا ہے اس کے متعلق کسی کو بھی نہیں معلوم کہ مارکیٹ میں اس کی قیمتوں کے اندر آیندہ بیس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہو گا؟ اور یہ کس طرح دُرست ہے کہ ایک قوم کے سارے ہی طبقے ایک لڑائی میں خطرات اور نقصانات اور قربانیاں برداشت کریں، مگر ساری قوم کے اندر سے صرف ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو جو اپنے دیے ہوئے جنگی قرض پر اپنی ہی قوم سے لڑائی کے ایک صدی بعد تک سُود وُصول کرتا رہے؟

۳۱۸- تجارت اور سُود کا اُصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی مَعاشی اور اَخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مُشتری کے درمیان منافع کا مُساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اُٹھاتا ہے جو اُس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اُجرت لیتا ہے، جس کو اس نے مُشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صَرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے، سُودی لین دین میں مَنافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سُود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے، جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلے میں سُود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے، جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے، تب تو ظاہر ہے کہ مُہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت، یا زراعت، یا صَنعت وحِرفَت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے، تب بھی مُہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے، اُسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دُوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعیّن فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مُشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ جو کچھ لیتا ہے، ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سُود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کا

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ
وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

لٰہذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آیندہ کے لیے وہ سُودخواری سے باز آجائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔[۳۱۹] اور جو اِس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ

منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اُٹھاتا ہے، اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائلِ معیشت، حتّٰی کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کرلے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مُشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صَرف نہیں ہوتی، بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ مالکِ جائداد کو واپس دے دی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایے کو صَرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صَرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صَرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سُودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلاکسی محنت ومشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریکِ غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اِصطلاحی ''شریک'' کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسُب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلالحاظِ نفع ونقصان اور بلالحاظِ تناسُبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

اِن وجوہ سے تجارت کی مَعاشی حیثیت اور سُود کی مَعاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدُّن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سُود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سُود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بُخل، خودغرضی، شقاوت، بے رحمی اور زرپرستی کی صفات پیدا کرتا ہے، اور ہمدردی وامدادِ باہمی کی رُوح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بِنا پر سُود مَعاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسانی کے لیے تباہ کُن ہے۔

۳۱۹ – یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کھا لیا، اسے اللہ معاف کر دے گا، بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جو کھا چکا سو کھا چکا'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا، اسے

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ

ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سُود کا مَٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نَشْوونَما دیتا ہے[۳۲۰]۔ اور اللہ

معاف کر دیا گیا، بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سُود پہلے کھایا جا چکا ہے، اسے واپس دینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدّمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ مگر اَخلاقی حیثیت سے اُس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سُودی کاروبار سے سمیٹا ہو۔ اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہو گا اور اس کا مَعاشی و اخلاقی نقطۂ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہو گا، تو وہ خود اپنی اس دولت کو، جو حرام ذرائع سے آئی تھی، اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حق داروں کا پتا چلایا جا سکتا ہے، جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا مال انھیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصّۂ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے، اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اُٹھاتا رہے، تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے۔

۳۲۰- اِس آیت میں ایک ایسی صداقت بیان کی گئی ہے، جو اَخلاقی و رُوحانی حیثیت سے بھی سراسر حق ہے اور مَعاشی و تمدُّنی حیثیت سے بھی۔ اگرچہ بظاہر سُود سے دولت بڑھتی نظر آتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سُود اخلاقی و رُوحانی اور مَعاشی و تمدُّنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزُّل کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس صدقات سے (جن میں قرضِ حَسَن بھی شامل ہے) اخلاق و رُوحانیت اور تمدُّن و معیشت، ہر چیز کو نَشْوونَما نصیب ہوتا ہے۔

اخلاقی و رُوحانی حیثیت سے دیکھیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سُود دراصل خود غَرضی، بُخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ اِنھی صفات کو انسان میں نَشْوونَما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات نتیجہ ہیں فیّاضی، ہمدردی، فراخ دِلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا، اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ کون ہے جو اخلاقی صفات کے ان دونوں مجموعوں میں سے پہلے مجموعے کو بدترین اور دُوسرے کو بہترین نہ مانتا ہو؟

تمدّنی حیثیت سے دیکھیے، تو بادنیٰ تأمُّل یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے گی کہ جس سوسائٹی میں افراد ایک دُوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مال دار طبقوں کا مفاد عامّۃ النّاس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی مَحبّت کے بجائے باہمی بُغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نَشْوونَما پائے گی۔ اس کے اجزا ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لیے مددگار ہو جائیں، تو ایسی سوسائٹی کے اجزا کا باہم متصادم

ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائٹی کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دُوسرے کے ساتھ فیّاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دُوسرے کی حاجت کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں باوسیلہ لوگ بے وسیلہ لوگوں سے ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسی سوسائٹی میں آپس کی محبّت، خیر خواہی اور دلچسپی نَشْو ونَما پائے گی۔ اس کے اجزا ایک دُوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پُشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع وتصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلی قسم کی سوسائٹی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

اب مَعاشی حیثیت سے دیکھیے۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سُودی قرض کی دو قسمیں ہیں: ایک، وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا، وہ قرض جو تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض کو تو ایک دُنیا جانتی ہے کہ اس پر سُود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کُن ہے۔ دُنیا کا کوئی مُلک ایسا نہیں ہے جس میں مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشتکاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون نہ چوس رہے ہوں۔ سُود کی وجہ سے اس قسم کا قرض ادا کرنا ان لوگوں کے لیے سخت مشکل، بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی کئی گنا سُود دے چکنے پر بھی اصل رقم جُوں کی تُوں باقی رہتی ہے۔ محنت پیشہ آدمی کی آمدنی کا بیشتر حصّہ مہاجن لے جاتا ہے اور اس غریب کی اپنی کمائی میں سے اس کے پاس اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کافی روپیا نہیں بچتا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ اپنے کام سے کارکنوں کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی محنت کا پھل دُوسرا لے اُڑے تو وہ کبھی دل لگا کر محنت نہیں کر سکتے۔ پھر سودی قرض کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ہر وقت کی فکر اور پریشانی اس قدر گُھلا دیتی ہے، اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے لیے صحیح غذا اور علاج اس قدر مشکل ہو جاتا ہے، کہ ان کی صحّتیں کبھی دُرست نہیں رہ سکتیں۔ اس طرح سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں آدمیوں کا خون چُوس چُوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم کی پیدائشِ دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے، اور مآلِ کار میں خود وہ خون چُوسنے والے افراد بھی اس کے نقصانات سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ ان کی اس خود غرضی سے غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں، ان کی بدولت مال دار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اُٹھتا اور گُھٹتا رہتا ہے، اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مال داروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا ہے۔

رہا دُوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے، تو اس پر ایک مقرر شرحِ سُود کے عائد ہونے سے جو بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں، ان میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

(ا) جو کام رائج الوقت شرحِ سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے مُلک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیا نہیں ملتا اور مُلک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے، جو

لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ

کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔[۳۲۱] ہاں، جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

بازار کی شرحِ سُود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں، چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔

(۲) جن کاموں کے لیے سُود پر سرمایہ ملتا ہے، خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع ایک مقرر میعاد، مثلاً پانچ، چھ یا دس فی صد تک یا اس سے اُوپر اُوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا۔ اِس کی ضمانت ہونا تو درکنار، کسی کاروبار میں سرے سے اِسی بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا، نقصان کبھی نہ ہوگا۔ لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایے کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقرر شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو، نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔

(۳) چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع اور وہ بھی ایک مقرر شرحِ منافع کی ضمانت پر روپیا دیتا ہے، اس وجہ سے کاروبار کی بھلائی اور بُرائی سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ انتہائی خودغرضی کے ساتھ صرف اپنے منافع پر نگاہ رکھتا ہے، اور جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کَساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے، تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیا کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اِس طرح کبھی تو محض اس کے خودغرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کَساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے، اور کبھی اگر دُوسرے اسباب سے کَساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خودغرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کُن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

سُود کے یہ تین نقصانات تو ایسے صریح ہیں کہ کوئی شخص جو علم المعیشت سے تھوڑا سا مَس بھی رکھتا ہو، ان کا انکار نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد یہ مانے بغیر کیا چارہ ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی رُو سے سود مَعاشی دولت کو بڑھاتا نہیں بلکہ گھٹاتا ہے۔

اب ایک نظر صدقات کے مَعاشی اثرات و نتائج کو بھی دیکھ لیجیے۔ اگر سوسائٹی کے خوشحال افراد کا طریق کار یہ ہو کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات خریدیں، پھر جو روپیا ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ بچے، اسے غریبوں میں بانٹ دیں، تاکہ وہ بھی اپنی ضروریات خرید سکیں، پھر اس پر بھی جو روپیا بچ جائے، اسے یا تو کاروباری لوگوں کو بلاسُود قرض دیں، یا شرکت کے اُصول پر ان کے ساتھ نفع و نقصان میں حصہ دار بن جائیں، یا حکومت کے پاس جمع کر دیں کہ وہ اجتماعی خدمات کے لیے ان کو استعمال کرے، تو ہر شخص تھوڑے سے غور و فکر ہی سے اندازہ کرسکتا ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تجارت اور صنعت اور زراعت، ہر چیز کو بے انتہا فروغ حاصل ہوگا۔ اُس کے عام افراد کی خوش حالی

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا
اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اُن کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔[۳۲۲]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سُود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ[۳۲۳] ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سُود چھوڑ دو) تو

کا معیار بلند ہوتا چلا جائے گا اور اس میں بحیثیتِ مجموعی دولت کی پیداوار اُس سوسائٹی کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہوگی جس کے اندر سُود کا رواج ہو۔

۳۲۱- ظاہر ہے کہ سُود پر روپیا وہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصّہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصّہ، جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے دراصل اللہ کا فضل ہے۔ اور اللہ کے فضل کا صحیح شکر یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے، اسی طرح بندہ بھی اللہ کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصّہ پا رہے ہیں، ان کے قلیل حصّے میں سے بھی وہ اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جُز اپنی طرف کھینچ لے، تو حقیقت میں وہ ناشُکرا بھی ہے اور ظالم، جفا کار اور بدعمل بھی۔

۳۲۲- اس رُکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے، جو خدا اور خَلق دونوں کے حُقوق سے بے پروا ہو کر روپیا گننے اور گِن گِن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں منہمک ہو۔ دُوسرا کردار ایک خدا پرست، فیّاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے، جو خدا اور خَلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوتِ بازو سے کما کر خود کھائے اور دُوسرے بندگانِ خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے۔ دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی، اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم واندوہ

فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ
كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى
اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع

۳۸ ع ۸ ۲

اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمھارا قرض دار تنگ دست ہو، تو ہاتھ کُھلنے تک اُسے مہلت دو، اور جو صدقہ کر دو، تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔[۳۲۴] اُس دن کی رُسوائی و مصیبت سے بچو، جب کہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے، وہاں ہر شخص کو اُس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہو گا۔ ع

کُلفت و مصیبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اللہ کو دُوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دُنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے۔

۳۲۳- یہ آیت فتحِ مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اِس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سُود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا، مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نُزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے، ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عُمّال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی، تو مُعاہدے میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے، تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمھارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابنِ عباسؓ، حسن بصریؒ، ابنِ سیرینؒ اور ربیع بن اَنَسؒ کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دار الاسلام میں سُود کھائے، اسے توبہ پر مجبُور کیا جائے، اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دُوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے۔ جب تک وہ سُود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے، اسے نہ چھوڑا جائے۔

۳۲۴- اسی آیت سے شریعت میں یہ حکم نکالا گیا ہے کہ جو شخص ادائے قرض سے عاجز ہو گیا ہو، اسلامی عدالت اس کے قرض خواہوں کو مجبُور کرے گی کہ اُسے مہلت دیں، اور بعض حالات میں وہ پورا قرض یا قرض کا ایک حصّہ معاف بھی کرانے کی مجاز ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے کاروبار میں گھاٹا آ گیا اور اس پر قرضوں کا بار بہت چڑھ گیا۔ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے اس بھائی کی مدد کرو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کو مالی امداد دی۔ مگر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین[۳۲۵] کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔[۳۲۶] فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا)، اور اُسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہُوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔

قرضے پھر بھی صاف نہ ہو سکے۔ تب آپؐ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو کچھ حاضر ہے، بس وہی لے کر اسے چھوڑ دو، اس سے زیادہ تمھیں نہیں دلوایا جا سکتا۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ ایک شخص کے رہنے کا مکان، کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور وہ آلات جن سے وہ اپنی روزی کماتا ہو، کسی حالت میں قُرق نہیں کیے جا سکتے۔

۳۲۵- اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملے میں مدت کی تعیین ہونی چاہیے۔

۳۲۶- عمُوماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قراردادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرا لینی چاہیے، تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں، جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں، مگر ان کی فریاد سُنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بد خُلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دُوسرا، وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ تیسرا، وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ
اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ
الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا
اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ
لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا

پھر اپنے مردوں میں سے[۳۲۷] دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے، تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں، جن کی گواہی تمھارے درمیان مقبول ہو۔[۳۲۸] گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے، تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو

دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

[۳۲۷] – یعنی مسلمان مردوں میں سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں گواہ بنانا اختیاری فعل ہو، وہاں مسلمان صرف مسلمانوں ہی کو اپنا گواہ بنائیں۔ البتہ ذمیوں کے گواہ ذمی بھی ہو سکتے ہیں۔

[۳۲۸] – مطلب یہ ہے کہ ہر کس و ناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو اپنے اَخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ

کوئی حرج نہیں،[۳۲۹] مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے۔[۳۳۰] ایسا کرو گے، تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریقِ عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے، تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو۔[۳۳۱]

۳۲۹۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روز مرّہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملۂ بیع کا تحریر میں آ جانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں ہے۔ اِسی طرح ہمسایہ تاجر ایک دوسرے سے رات دن جو لین دین کرتے رہتے ہیں، اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضایقہ نہیں۔

۳۳۰۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، اور یہ بھی کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

۳۳۱۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ رَہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے، اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملۂ رہن کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو، صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیا لے لے۔ لیکن قرآنِ مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلند اَخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اِس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ
اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ع ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ ۳۹ ع ۲ ۷
وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اگر تم میں سے کوئی شخص دُوسرے پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے، تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ، اپنے رب سے ڈرے۔ اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ[۳۳۲]۔ جو شہادت چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔ اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ ع

آسمانوں[۳۳۳] اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے[۳۳۴]۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کر دیا چھپاؤ

واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضے میں شے مَرہُونہ سے فائدہ اُٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے، تو دراصل سُود کھاتا ہے۔ قرض پر براہِ راست سُود لینے اور رَہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اُصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے، اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جا سکتی ہے، کیونکہ یہ دراصل اُس چارے کا معاوضہ ہے جو مُرتَہِن اس جانور کو کھلاتا ہے۔

۳۳۲- شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر ’’شہادت چھپانے‘‘ کا اطلاق ہوتا ہے۔

۳۳۳- یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس لیے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا، اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اُصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دینِ اسلام کی اساس قائم ہے۔ تقابُل کے لیے اس سورہ کے پہلے رکوع کو سامنے رکھ لیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔

۳۳۴- یہ دین کی اوّلین بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالکِ زمین و آسمان ہونا اور اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں، اللہ ہی کی مِلک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سرِ اطاعت جُھکا دے۔

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵

اللہ بہرحال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔[۳۳۵] پھر اُسے اختیار ہے، جسے چاہے، معاف کر دے اور جسے چاہے، سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۳۳۶]

رسولؐ اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اِس رسولؐ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ”ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سُنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔“[۳۳۷]

۳۳۵- اس فقرے میں مزید دو باتیں ارشاد ہوئیں: ایک، یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمّہ دار اور جواب دِہ ہے۔ دُوسرے، یہ کہ جس بادشاہِ زمین و آسمان کے سامنے انسان جواب دِہ ہے، وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے، حتّٰی کہ دلوں کے چھُپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۳۳۶- یہ اللہ کے اختیارِ مطلق کا بیان ہے۔ اُس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اُس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبُور ہو، بلکہ وہ مالکِ مختار ہے۔ سزا دینے اور معاف کرنے کے کُلّی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

۳۳۷- اس آیت میں تفصیلات سے قطعِ نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے: اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اور اس کی کتابوں کو ماننا۔ اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)۔ اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخرِ کار ہمیں اس کے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

اللہ کسی متنفّس پر اُس کی مَقدِرَت سے بڑھ کر ذمّہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔[۳۳۸] ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔[۳۳۹] (ایمان لانے والو! تم یوں دُعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے بُھول چُوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر

حضور میں حاضر ہونا ہے۔ یہ پانچ اُمور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اِن عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے، اسے وہ بسر و چشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حُسنِ عمل پر غَرّہ نہ کرے، بلکہ اللہ سے عَفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔

۳۳۸– یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مَقدِرَت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پُرس کرے کہ تو نے فُلاں کام کیوں نہ کیا۔ یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اس کی مَقدِرَت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مؤاخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مَقدِرَت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔

۳۳۹– یہ اللہ کے قانونِ مجازات کا دوسرا قاعدۂ کُلّیّہ ہے۔ ہر آدمی انعام اُسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دُوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بِنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامے میں لکھے جائیں۔ اور ایک دُوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالمِ اوّل کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا برا، جو کچھ بھی پھل ہوگا، اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا۔ بہر حال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس برائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو، اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے۔ مُکافاتِ عمل کوئی قابلِ انتقال چیز نہیں ہے۔

مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾ ع

ڈالے تھے۔[۳۴۰] پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔[۳۴۱] ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔[۳۴۲] ع

۳۴۰- یعنی ہمارے پیش روؤں کو تیری راہ میں جو آزمایشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں سے وہ گزرے، جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، اُن سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے، اُسے سخت آزمایشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور جب آزمایشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے۔ لیکن بہرحال مومن کو اللہ سے دُعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ اس کے لیے حق پرستی کی راہ کو آسان کردے۔

۳۴۱- یعنی مشکلات کا اتنا ہی بار ہم پر ڈال، جسے ہم سہار لے جائیں۔ آزمایشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پُورے اُتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوتِ برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہِ حق سے ڈگمگا جائیں۔

۳۴۲- اس دُعا کی پوری رُوح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں، جبکہ مکّے میں کفرو اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ سرزمینِ عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندۂ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے خدا کی سرزمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے، تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکینِ قلب کی موجب ہوئی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بہنے دیں، بلکہ انھیں اس دُعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک طرف اُن روح فرسا مظالم کو دیکھیے، جو محض حق پرستی کے جرم میں اُن لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں

دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف اُن جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے، جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دُوسری طرف اِس دُعا کو دیکھیے، جس میں کسی دُنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف اِن حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے، اور دُوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے، جن سے یہ دُعا لبریز ہے۔ اس تقابل ہی سے صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی اَخلاقی و رُوحانی تربیت دی جا رہی تھی۔

(بقیہ حاشیہ ۵۵)

آدم علیہ السّلام کی تخلیق کے وقت اللہ اور فرشتوں کی گفتگو کا ذکر تَلمُود میں بھی آیا ہے، مگر وہ بھی اس معنوی رُوح سے خالی ہے جو قرآن کے بیان کردہ قصّے میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ لطیفہ بھی پایا جاتا ہے کہ جب فرشتوں نے اللہ سے پوچھا: ’’انسانوں کو آخر کیوں پیدا کیا جا رہا ہے۔‘‘ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ’’تاکہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔‘‘ بدلوگوں کا ذکر اللہ نے نہیں کیا۔ ورنہ فرشتے انسان کی تخلیق کی منظوری نہ دیتے۔

Talmudic Miscellany, Paul Isaac Hershon - LONDON 1880, P 294-95

تفہیم القرآن

آلِ عمران

(۳)

آلِ عمران

نام اس سورت میں ایک مقام پر "آلِ عمران" کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اور اجزائے مضمون اِس میں چار تقریریں شامل ہیں:

پہلی تقریر آغازِ سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے، اور وہ غالباً جنگِ بَدر کے بعد قریبی زمانے ہی میں نازل ہوئی ہے۔

دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ ۹ ھ میں وفدِ نَجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی۔

تیسری تقریر ساتویں رُکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے، اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متّصل ہی معلوم ہوتا ہے۔

چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختمِ سورت تک جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی ہے۔

خطاب اور مَباحِث اِن مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے، وہ مقصد و مُدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانی ہے۔ سورت کا خطاب خُصُوصیّت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)۔ دُوسرے، وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

پہلے گروہ کو اُسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۂ بَقَرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ اُن کی اعتقادی گمراہیوں اور اَخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بُلا رہا ہے، جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاؑ دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرت اللہ کے مطابق ایک ہی دینِ حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستے سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں، وہ خود اُن کتابوں کی رُو سے بھی صحیح نہیں ہیں، جن کو تم کُتُبِ آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔

دُوسرے گروہ کو، جو اَب بہترین اُمّت ہونے کی حیثیت سے حق کا عَلَم بردار اور دُنیا کی اصلاح کا

ذمّہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بَقَرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلی اُمتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے سے بچیں۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہلِ کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر بھی متوجّہ کیا گیا ہے، جن کا ظہور جنگِ اُحُد کے سلسلے میں ہوا تھا۔

اس طرح یہ سورت نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزا میں مسلسل و مربوط ہے، بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمّہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مَقام بَقَرہ سے متّصل ہی ہے۔

شانِ نزول

سورت کا تاریخی پَس منظر یہ ہے:

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمایشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت مُتَنَبِّہ کر دیا گیا تھا، وہ پوری شدّت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں۔ جنگِ بَدر میں اگرچہ اہلِ ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی، لیکن یہ جنگ گویا بھِڑوں کے چھتّے میں پتھر مارنے کی ہم معنیٰ تھی۔ اس اوّلین مسلّح مقابلے نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا، جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینے کی یہ چھوٹی سی بستی، جس نے گرد و پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی ہے، صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینے کی مَعاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اوّل تو ایک چھوٹے سے قصبے میں، جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آ جانے ہی سے مَعاشی توازُن بگڑ چکا تھا۔ اس پر مزید مصیبت اس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہو گئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو مُعاہدے کیے تھے، ان لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بَدر کے موقع پر ان اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کُھلّم کُھلا قریش اور دُوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دِلا دِلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نَضِیر کے سردار کَعب بن اشرف نے تو اس سلسلے میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ ان یہودیوں کے ہمسایگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے تھے، اُن کا پاس ولحاظ بھی انھوں نے اُٹھا دیا۔ آخرِ کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بَدر کے چند مہینے بعد

بنی قَینُقاع پر، جو اِن یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شریر لوگ تھے، حملہ کر دیا اور اُنھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دُوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مدینے کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے، حتّٰی کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپؐ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرامؓ اس زمانے میں بالعُموم ہتھیار بند سوتے تھے۔ شب خون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تو صحابۂ کرامؓ گھبرا کر آپؐ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چِھڑکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکّے سے تین ہزار کا لشکرِ جرّار مدینے پر حملہ آور ہو گیا اور اُحُد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی، جو جنگِ اُحُد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینے سے نکلے تھے۔ مگر راستے میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینے کی طرف پلٹ گئے۔ اور جو سات سو آدمی آپؐ کے ساتھ رہ گئے تھے، ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی، جس نے دَورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دُشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحُد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصّہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصّہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قُدرَتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اَخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی، جس کی اَخلاقی تَربیَت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دُوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس جنگ کی پوری سرگُزَشت پر ایک مفصّل تبصرہ کیا جائے، اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں، ان میں سے ایک ایک کی نشان دِہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے، جو دُنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

۲۰۰
آیاتھا

سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ

۲۰
رکوعاتھا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ① ۙ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ② ؕ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③ ۙ

ا، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں[1] ہے۔

اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے[2]،

۱- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۷۸۔

۲- عام طور پر لوگ تورات سے مراد بائبل کے پُرانے عہد نامے کی ابتدائی پانچ کتابیں، اور انجیل سے مراد نئے عہد نامے کی چار مشہور انجیلیں لے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اُلجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں؟ اور کیا واقعی قرآن اُن سب باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو ان میں درج ہیں؟ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ تورات بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کے اندر مندرج ہے، اور انجیل نئے عہد نامہ کی اناجیلِ اربعہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے اندر پائی جاتی ہے۔

دراصل تورات سے مراد وہ احکام ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بِعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دَوران میں اُن پر نازل ہوئے۔ اُن میں سے دس احکام تو وہ تھے، جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی لوحوں پر کَندہ کر کے انھیں دیے تھے۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی تھیں، اور ایک نقل بنی لاوِی کے حوالے کی تھی، تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المَقدِس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک کاپی جو بنی لاوی کے حوالے کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت، عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی اور بنی اسرائیل اس کو "توریت" ہی کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن اس سے اُن کی غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکلِ سلیمانی کی مَرمّت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (یعنی ہیکل کے سجّادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خِلقیاہ کو ایک جگہ توریت رکھی ہوئی مل گئی اور اس نے ایک عُجوبے کی طرح اسے شاہی مُنشی کو دیا اور شاہی مُنشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا، جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہے۔

(ملاحظہ ہو: ۲-سلاطین، باب ۲۲، آیت ۸ تا ۱۳) یہی وجہ ہے کہ جب بُختِ نَصَّر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی، تو بنی اسرائیل نے تورات کے وہ اصل نسخے، جو اُن کے ہاں طاقِ نسیاں پر رکھے ہوئے تھے اور بہت تھوڑی تعداد میں تھے، ہمیشہ کے لیے گم کر دیے۔ پھر جب عَزرا کاہن (عُزَیرؑ) کے زمانے میں بنی اسرائیل کے بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المَقدِس تعمیر ہوا، تو عَزرا نے اپنی قوم کے چند دُوسرے بزرگوں کی مدد سے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مُرتّب کی، جو اَب بائبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے چار باب، یعنی خُروج، اَحبار، گنتی اور اِستِثنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں، اور اس سیرت ہی میں تاریخِ نُزول کی ترتیب کے مطابق تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دی گئی ہیں، جو عَزرا اور ان کے مددگار بزرگوں کو دستیاب ہوسکیں۔ پس دراصل اب تورات اُن منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرتِ موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں صرف اِس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اِس تاریخی بیان کے دَوران میں جہاں کہیں سیرتِ موسوی کا مصنف کہتا ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے یہ فرمایا، یا موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند تمھارا خدا یہ کہتا ہے، وہاں سے تورات کا ایک جُز شروع ہوتا ہے، اور جہاں پھر سیرت کی تقریر شروع ہو جاتی ہے، وہاں وہ جُز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز بائبل کے مصنف نے تفسیر وتشریح کے طور پر بڑھا دی ہے، وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے، یا شرح وتفسیر۔ تاہم جو لوگ کُتُبِ آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں، وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ان اجزا میں کہاں کہاں تفسیری وتشریحی اضافے ملحق کر دیے گئے ہیں۔

قرآن اِنھی منتشر اجزا کو ’’تورات‘‘ کہتا ہے، اور اِنھی کی وہ تصدیق کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض بعض مَقامات پر جُزوی احکام میں اختلاف ہے، اُصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرِمُو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کرسکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح انجیل دراصل نام ہے اُن الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیتِ نبی ارشاد فرمائے۔ وہ کلماتِ طیّبات آپ کی زندگی میں لکھے اور مرتّب کیے گئے تھے یا نہیں، اس کے متعلق اب ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے انھیں نوٹ کر لیا ہو، اور ممکن ہے کہ سننے والے معتقدین نے ان کو زبانی یاد کر رکھا ہو۔ بہر حال ایک مدّت کے بعد جب آنجناب کی سیرتِ پاک پر مختلف رسالے لکھے گئے، تو ان میں تاریخی بیان کے ساتھ ساتھ وہ خطبات اور ارشادات بھی جگہ جگہ حسبِ موقع درج کر دیے گئے، جو ان رسالوں کے مصنفین تک زبانی روایات اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ آج مَتّی، مَرقُس، لُوقا اور یُوحنّا کی جن کتابوں کو اناجیل کہا جاتا ہے، دراصل انجیل وہ نہیں ہیں، بلکہ انجیل حضرت مسیحؑ کے وہ ارشادات ہیں، جو ان کے اندر درج ہیں۔ ہمارے پاس ان کو پہچاننے اور مصنفینِ سیرت کے اپنے کلام سے ان کو مُمیّز کرنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جہاں سیرت کا مصنف کہتا ہے کہ مسیحؑ نے یہ فرمایا یا لوگوں کو یہ تعلیم دی، صرف وہی مَقامات اصل انجیل کے اجزا ہیں۔ قرآن انھی اجزا کے مجموعے کو

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ؕ ⑤ هُوَ
الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے (جو حق اور باطل کا فرق دکھانے والی ہے)۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں، ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[۳]۔ وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے[۴]۔ اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔

''انجیل'' کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتّب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے، تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا، اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہوگا، وہ بھی غیر متعصّبانہ غور و تأمُّل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔

[۳] یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو، وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اسی کتاب میں انسان کو میسر آ سکتا ہے، جو اُس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

[۴] اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک، یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے، نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے، نہ تم خود جان سکتے ہو۔ لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جس نے تمھارے اِستقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دُنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا، حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو، تو وہ یہی ہے۔

مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ

اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بُنیاد ہیں[5] اور دوسری متشابہات۔[6]

۵- مُحکَم پکّی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ ”آیاتِ مُحکَمات“ سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجایش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنٰی ومدّعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات ”کتاب کی اصل بنیاد ہیں“، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے، اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ اُنھی میں اسلام کی طرف دُنیا کو دعوت دی گئی ہے، اُنھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، اُنھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ اُنھی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، اُنھی میں عقائد، عبادات، اَخلاق، فرائض اور امر ونہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رُجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بُجھانے کے لیے آیاتِ مُحکَمات ہی اصل مَرجَع ہیں، اور فطرتاً اُنھی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر اُنھی سے فائدہ اُٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۶- متشابہات، یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجایش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جاسکتا، جب تک کائنات کی حقیقت، اور اس کے آغاز وانجام، اور اس میں انسان کی حیثیت، اور ایسے ہی دُوسرے بنیادی اُمور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماورا ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں، نہ آسکتی ہیں، جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا، نہ چھُوا، نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو اُنھی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں، جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں، جو اصل حقیقت سے قریب تر مُشابہَت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے، اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں، جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

لیکن اِس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے، یا اس کا ایک دُھندلا سا تصوّر پیدا کر دے۔ ایسی آیات کے مفہُوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی، اتنے ہی زیادہ اشتباہات واحتمالات سے سابقہ پیش آئے گا، حتّٰی کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دُور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالبِ حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے، وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ
ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ وقف منزل وقف لازم
عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦ رَبَّنَا لَا تُزِغْ
قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ”ہمارا اُن پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔[۷]“ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ ”پروردگار! جب تُو ہمیں سیدھے رستے پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مُبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے

دُھندلے تصوّر پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ مُحکَمات پر صَرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بُوالفضول یا فتنہ جُو ہوتے ہیں، اُن کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

۷ – یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہُوم جانتے ہی نہیں، تو ان پر ایمان کیسے لے آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معقول آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیاتِ محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے، تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادھا مفہُوم اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے، اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے، وہاں کھوج لگانے اور مُوشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مُجمَل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

۱ ع ۹

لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ۝۹ ع اِنَّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ
وَاُولٰٓـئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ۙ ۝۱۰ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ
قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ
شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝۱۱ قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ
اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ۝۱۲ قَدۡ كَانَ لَـكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ
الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوۡنَهُمۡ

آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ تُو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔'' ع

جن لوگوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا ہے[۸]، انھیں اللہ کے مقابلے میں نہ اُن کا مال کچھ کام دے گا، نہ اولاد۔ وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا، جیسا فرعون کے ساتھیوں اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس اے محمدؐ! جن لوگوں نے تمھاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، اُن سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت، جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمھارے لیے اُن دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دُوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشمِ سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ

---

[۸] تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورہ بقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔

مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳ زُيِّنَ لِلنَّاسِ
حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ
الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ

مومن گروہ سے دوچند ہے[۹]۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے، مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے[۱۰]۔

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس —— عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے،

۹- اگرچہ حقیقی فرق سہ چند تھا، لیکن سرسری نگاہ سے دیکھنے والا بھی یہ محسوس کیے بغیر تو نہیں رہ سکتا تھا کہ کفار کا لشکر مسلمانوں سے دوگنا ہے۔

۱۰- جنگِ بدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانے ہی میں پیش آچکا تھا، اس لیے اس کے مُشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے، اس سے دونوں کا اَخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیز گاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجے کا اخلاقی اِنضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں کی جا رہی تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کفار کی کثیر التعداد اور بہتر اسلحہ رکھنے والی فوج کے مقابلے میں جس طرح کامیاب ہوئے، اس سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ اِن کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سروسامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پُھولے ہوئے تھے، ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلّاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینے کے کاشتکاروں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کے ذریعے سے قریش جیسے قبیلے کو شکست دلوا سکتا ہے، جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ
عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ
لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ

مویشی اور زرعی زمینیں ـــــ بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے، وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں[۱۱] گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رَوِیّے پر گہری نظر رکھتا ہے[۱۲]۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ”مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔“ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں[۱۳]،

۱۱- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۷۔

۱۲- یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے اور نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اُس کے انعام کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

۱۳- یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں۔ کسی نقصان یا مصیبت سے ہمّت نہیں ہارتے، کسی ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں، جبکہ بظاہر اُس کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۶۰)

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ ﴿۱۸﴾ نصف
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ

راست باز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے[۱۴]، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہلِ علم نے بھی دی ہے[۱۵]۔ وہ انصاف پہ قائم ہے۔ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام[۱۶] ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے، جنھیں کتاب

۱۴- یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ـــــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ـــــ کہ پورے عالمِ وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے، جو خدائی کی صفات سے متّصِف ہو، خدائی کے اقتدار کی مالک ہو، اور خدائی کے حُقوق کی مستحق ہو۔

۱۵- اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے، کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلِ کار ہیں اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے، جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رُجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے، ان سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ مُتّفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مُدبِّر ہے۔

۱۶- یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و دُرست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبُود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سُپرد کردے اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے، بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو ہدایت

اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ
حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ
لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

دی گئی تھی، اُن کے اِس طرزِ عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں ایک دُوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا[۱۷] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو ان سے کہو: ”میں نے اور میرے پیرووں نے تو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔“ پھر اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب دونوں سے پوچھو: ”کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟“[۱۸] اگر کی

بھیجی ہے، ہر کمی و بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ”اسلام“ ہے، اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیّت کے لیے اِس اسلام کے سوا کسی دُوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریّت سے لے کر شرک و بُت پرستی تک ہر نظریّے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حق دار سمجھ سکتا ہے، مگر فرماں روائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نِری بغاوت ہے۔

۱۷ – مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دُنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانے میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا، اور جو کتاب بھی دُنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے۔ اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوعِ انسانی میں رائج کیے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حُقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اُصول اور احکام میں ردّوبدل کر ڈالا۔

۱۸ – دُوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ ”مَیں اور میرے پَیرو تو اس ٹھیٹ اسلام کے قائل ہو چکے ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ کیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو۔“

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ؑ ⑳ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ㉑ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ㉒ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ

تو وہ راہِ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔ ع

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلقِ خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اُٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوش خبری سُنا دو۔[۱۹] یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے،[۲۰] اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔[۲۱]

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ ملا ہے، اُن کا حال کیا ہے؟

---

۱۹ – یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں، انھیں بتا دو کہ تمھارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔

۲۰ – یعنی انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صَرف کی ہیں جس کا نتیجہ دُنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔

۲۱ – یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو ان کی اس غلط سعی و عمل کو پُھل بنا سکے، یا کم از کم بد انجامی ہی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسا رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی، ان میں سے

يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ
مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ قف
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بُلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[۲۲]، تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلوتہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ”آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز[۲۳]۔“ اُن کے خود ساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دے دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

۲۲ – یعنی ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اس کی رُو سے حق ثابت ہو، اسے حق، اور جو اس کی رُو سے باطل ثابت ہو، اسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد تورات و انجیل ہے اور ”کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ پانے والوں“ سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

۲۳ – یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہرحال جنت ہماری ہے۔ ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فُلاں کی اولاد اور فلاں کی اُمّت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے۔ اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنّت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (٢٦) تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ
وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (٢٧) لَا
يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

کہو! خدایا! مُلک کے مالک! تُو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے۔ جسے چاہے، عزّت بخشے اور جس کو چاہے، ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جان دار کو۔ اور جسے چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔[۲۴]

مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔

قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بد ترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کُھلّم کُھلّا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

[۲۴] – جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتُوت دیکھتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں، دوسری طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور پھر ان کو اُس فقر و فاقہ اور اُن مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے، جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ ۳ھ اور اس کے لگ بھگ زمانے میں مُبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز اِستفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی اِستفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایے میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا
مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ
الْمَصِيْرُ (۲۸) قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ
اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۹) يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔[۲۵] مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔[۲۶] اے نبیؐ! لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہرحال اسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے، جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر

---

۲۵ - یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اسے ان کے ظلم و ستم کا خوف ہو، تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا اُنھی میں کا ایک آدمی ہے۔ یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویّے کا اظہار کر سکتا ہے، حتّٰی کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

۲۶ - یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمھاری دُنیا بگاڑ سکتے ہیں، مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیّہ کرنا پڑے، تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو۔ لیکن خبردار! کفر اور کفار کی کوئی ایسی خدمت تمھارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفار کے غالب آ جانے کا امکان ہو۔ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو، یا اہلِ ایمان کی جماعت کو، یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی، تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہرحال اسی کے پاس ہے۔

مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ معانقة ۴
اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ
بِالْعِبَادِ ع ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۳ ع ۱۰ ۱۱
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

پائے گا خواہ اُس نے بھلائی کی ہو یا بُرائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دُور ہوتا! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔[۲۷] ع

اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ ”اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبّت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“ اُن سے کہو کہ ”اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرلو“ پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبّت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔[۲۸]

۲۷- یعنی یہ اس کی انتہائی خیر خواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر مُتنبِّہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

۲۸- یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خُصوصاً جنگِ بَدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے، اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نُزول کا زمانہ جنگِ بَدر کے بعد اور جنگِ اُحد سے پہلے کا ہے، یعنی ۳ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی رِوایت سے عُموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفدِ نَجران کی آمد کے موقع پر ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن اوّل تو اس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی، دُوسرے مُقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نَجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحیٰؑ اور حضرت عیسٰی علیہما السّلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ۙ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ ۚ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا

اللہ[۲۹] نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمرانؑ[۳۰] کو تمام دُنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے، جو ایک دُوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۳۱]۔ (وہ اُس وقت سُن رہا تھا) جب عمران کی عورت[۳۲] کہہ رہی تھی کہ ”میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر

تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

۲۹ – یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے نزول کا زمانہ ۹ ہجری ہے، جب کہ نَجران کی عیسائی جُمہوریّت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نَجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ اُس وقت اس علاقے میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں، اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی۔ ایک عاقب کہلاتا تھا، جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی۔ دوسرا سیّد کہلاتا تھا، جو ان کے تمدُّنی و سیاسی اُمور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور تیسرا اُسقُف (بِشَپ) تھا، جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپؐ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اِسی سلسلے میں نَجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہر حال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذِمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا، تاکہ اس کے ذریعے سے وفدِ نَجران کو اسلام کی طرف دعوت دی جائے۔

۳۰ – عمران حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کے والد کا نام تھا، جسے بائبل میں ”عَمرام“ لکھا ہے۔

۳۱ – مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور اُلوہیّت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غَلَطی رفع ہو جائے، تو اسلامِ صحیح و خالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جائے۔ اسی لیے اس خطبے کی تمہید یوں اُٹھائی گئی ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دُوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی بھی خدا نہ تھا، ان کی خُصُوصیّت

فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٥﴾
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ
وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ

کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما۔ تو سُننے اور جاننے والا ہے۔[۳۳]" پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے ـــــ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی ـــــ اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔[۳۴] خیر، میں نے اس کا نام مریمؑ رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آیندہ نسل کو شیطانِ مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔" آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا، اُسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اُٹھایا۔ اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

بس یہ تھی کہ خدا نے اپنے دین کی تبلیغ اور دُنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

۳۲- اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اُوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریمؑ کے والد تھے، جن کا نام شاید عمران ہوگا۔ (مسیحی رِوایات میں حضرت مریمؑ کے والد کا نام یوآخیم Ioachim لکھا ہے) اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے، جس سے ہم قطعی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکیں، کیونکہ تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد کون تھے اور ان کی والدہ کس قبیلے کی تھیں۔ البتہ اگر یہ رِوایت صحیح مانی جائے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ اور حضرت مریمؑ کی والدہ آپس میں رشتے کی بہنیں تھیں تو پھر "عمران کی عورت" کے معنی قبیلۂ عمران کی عورت ہی دُرست ہوں گے، کیونکہ انجیلِ لُوقا میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی والدہ حضرت ہارُونؑ کی اولاد سے تھیں۔ (لوقا ۱:۵)

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ
مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ
رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (۳۸)

زکریاؑ[۳۵] جب کبھی اس کے پاس محراب[۳۶] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پُوچھتا: مریمؑ! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی: اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریاؑ نے اپنے رب کو پکارا: ”پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تُو ہی دُعا سننے والا ہے۔“[۳۷]

۳۳- یعنی تُو اپنے بندوں کی دُعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

۳۴- یعنی لڑکا اُن بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدّنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں، لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

۳۵- اب اس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریمؑ سِنِ رُشد کو پہنچ گئیں اور بیت المَقدِس کی عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔ حضرت زَکریاؑ، جن کی تربِیت میں وہ دی گئی تھیں، غالبًا رشتے میں ان کے خالو تھے اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔ یہ وہ زکریاہ نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے پُرانے عہد نامے میں آیا ہے۔

۳۶- لفظِ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعُموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صَوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متّصل سطحِ زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدّام اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں، انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریمؑ معتکف رہتی تھیں۔

۳۷- حضرت زَکریاؑ اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرتًا ان کے دل میں یہ تمنّا پیدا ہوئی کہ کاش! اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت سے

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا
وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ
بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا
يَشَآءُ ۝۴۰ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ

جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰؑ[۳۸] کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[۳۹] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہو گی۔ کمال درجے کا ضابط ہو گا۔ نبوّت سے سرفراز ہو گا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔ زکریاؑ نے کہا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہو گا، میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔" جواب ملا: "ایسا ہی[۴۰] ہو گا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" عرض کیا: "مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے[۴۱]۔" کہا: "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارے

اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے، انھیں یہ اُمید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی ان کو اولاد دے سکتا ہے۔

[۳۸] بائبل میں ان کا نام "یُوحنّا بپتسمہ دینے والا" (John the Baptist) لکھا ہے۔ ان کے حالات کے لیے مُلاحظہ ہو: متّی باب ۳ و ۱۱ و ۱۴۔ مَرقُس باب ۱ و ۶۔ لُوقا باب ۱ و ۳۔

[۳۹] اللہ کے "فرمان" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدایش اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی، اس لیے ان کو قرآنِ مجید میں "كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔

[۴۰] یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

[۴۱] یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیرِ فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اِطّلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ
اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ
اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اِس دَوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا[۴۲]" ع

پھر وہ وقت آیا جب مریمؑ سے فرشتوں نے آکر کہا: "اے مریمؑ! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چُن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابعِ فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حُضور جھکنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو بھی جُھک جا۔"

اے محمدؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعے سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے[۴۳] تھے، اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے

۴۲- اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اِس عقیدے کی غَلَطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ تمہید میں حضرت یحیٰی علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طریقے سے ہوئی تھی، اُسی طرح اُن سے چھ ہی مہینے پہلے اُسی خاندان میں حضرت یحیٰیؑ کی پیدائش بھی ایک دُوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔ اِس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحیٰیؑ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیحؑ محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ (۴۴) اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ
بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی
الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (۴۵) وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی
الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۴۶) قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى یَكُوْنُ
لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ

جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ”اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ ہوگا، دُنیا اور آخرت میں معزّز ہوگا، اللہ کے مقرّب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔“ یہ سُن کر[۴۴] مریم بولی: ”پروردگار! میرے ہاں بچّہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔“ جواب ملا: ”ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے

۴۳- یعنی قُرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اس قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان کو خدا کے کام کے لیے ہیکل کی نذر کر دیا تھا۔ اور وہ چونکہ لڑکی تھیں اس لیے یہ ایک نازُک مسئلہ بن گیا تھا کہ ہیکل کے مجاوروں میں سے کس کی سرپرستی میں وہ رہیں۔

۴۴- یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچّہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ كَذٰلِكَ (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریّاؑ کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہُوم وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اِسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو صِنفی مُواصلت کے بغیر بچّہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اِسی صورت سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں اُسی معروف فطری طریقے سے بچّہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش فی الواقع اُسی طرح ہوئی ہوتی، تو یہ سارا بیان قطعی مُہمَل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رُکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے، اور وہ تمام بیانات بھی بے معنیٰ قرار پاتے ہیں جو ولادتِ مسیحؑ کے باب میں قرآن کے دُوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ ان کی پیدایش غیر فطری طور پر

مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۴۷﴾
وَيُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰٮةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ۚ ﴿۴۸﴾
وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ
رَّبِّكُمۡ ۙ اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـــَٔةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ
فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ

پیدا کرتا ہے۔ وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔“ (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا:) ”اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، توراۃ اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرّر کرے گا۔“

(اور جب وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا:) ”میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسّمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھّا کرتا ہوں

بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ سب کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اس کے ہاں بچّہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فُلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نُطفے سے عیسٰیؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصری دوٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فُلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی، جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اِتّصال سے ہوئی تھی، وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہارِ مافی الضمیر اور بیانِ مدّعا کی اُتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا
تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾ ۚ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ

اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔[۴۵] اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے۔[۴۶]

---

۴۵ - یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے۔ بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

۴۶ - یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدّعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بِنا ڈالتا اور اپنے اِن کمالات کے زور پر تمھیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام اور دُوسرے انبیاؑ نے پیش کیا تھا، رائج الوقت اَناجیل میں بھی واضح طور پر ہمیں ملتی ہے۔ مثلاً مَتّی کی رِوایت کے مطابق پہاڑی کے وعظ میں مسیح علیہ السلام صاف فرماتے ہیں:

> ”یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔“ (۱۷:۵)

ایک یہودی عالم نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا کہ احکامِ دین میں اوّلین حکم کون سا ہے؟ جواب میں آپؑ نے فرمایا:

> ”خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے مَحبّت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کے مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر مَحبّت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاؑ کے صحیفوں کا مدار ہے۔“ (مَتّی ۲۲: ۳۷-۴۰)

پھر حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں:

> ”فقیہ اور فریسی موسیٰؑ کی گدّی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔“ (مَتّی ۲۳: ۲-۳)

وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ
بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ قف فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ (۵۰) اِنَّ اللّٰهَ
رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۵۱)

اور اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے لیے بعض اُن چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔[۴۷] دیکھو، میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔[۴۸]"

---

۴۷ - یعنی تمھارے جُہلا کے توہُّمات، تمھارے فقیہوں کی قانونی مُوشگافیوں، تمھارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشدُّدات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ وتسلُّط کی بدولت تمھارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قُیود کا اضافہ ہو گیا ہے، مَیں ان کو منسوخ کروں گا اور تمھارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں گا جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

۴۸ - اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیا علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کے بھی بنیادی نِکات یہی تین تھے:

ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ، جس کے مقابلے میں بندگی کا رَوِیّہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کی اطاعت پر اَخلاق و تمدُّن کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ اُس مُقتدرِ اعلیٰ کے نمایندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حِلّت وحُرمت اور جواز وعَدَم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون وضابطہ صرف اللہ کا ہو، دُوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔

پس درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے انبیاؑ کے مِشن میں یک سَرِ مُو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مِشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد ونوعیّت کے اعتبار سے فرق کیا ہے اُنھوں نے سخت غَلَطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیّت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے، اور شرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دُوسروں کو مالک الملک کے ساتھ

شریک ٹھیرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے، اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

افسوس ہے کہ موجودہ اناجیل میں مسیح علیہ السلام کے مشن کو اس وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا جس طرح اُوپر قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں وہ تینوں بنیادی نکات ہمیں ان کے اندر ملتے ہیں جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ مسیحؑ صرف اللہ کی بندگی کے قائل تھے، ان کے اِس ارشاد سے صاف ظاہر ہوتی ہے:

”تُو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر۔“ (مَتّی ۴:۱۰)

اور صرف یہی نہیں کہ وہ اس کے قائل تھے بلکہ ان کی ساری کوششوں کا مقصود یہ تھا کہ زمین پر خدا کے امرِ شرعی کی اُسی طرح اطاعت ہو جس طرح آسمان پر اس کے امرِ تکوینی کی اطاعت ہو رہی ہے:

”تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔“ (مَتّی ۶:۱۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو نبی اور آسمانی بادشاہت کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اور اسی حیثیت سے لوگوں کو اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کے متعدِد اقوال سے معلوم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کے اپنے ہی بھائی بند اور اہلِ شہر ان کی مخالَفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس پر مَتّی، مَرقُس اور لُوقا تینوں کی مُتّفقہ روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا۔“ اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انھوں نے جواب دیا: ”ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔“ (لُوقا ۱۳: ۳۳) آخری مرتبہ جب وہ یروشلم میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے شاگردوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: ”مبارک ہے وہ بادشاہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔“ اس پر یہودی علما ناراض ہوئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ سے کہا کہ آپ اپنے شاگردوں کو چُپ کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا: ”اگر یہ چُپ رہیں گے تو پتھر چِلّا اُٹھیں گے۔“ (لُوقا ۱۹: ۳۸-۴۰) ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

”اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تم کو آرام دوں گا۔

میرا جُوا اپنے اوپر اُٹھا لو...... میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔“ (مَتّی ۱۱: ۲۸-۳۰)

پھر یہ بات کہ مسیح علیہ السلام انسانی ساخت کے قوانین کے بجائے خدائی قانون کی اطاعت کرانا چاہتے تھے، مَتّی اور مَرقُس کی اُس روایت سے صاف طور پر مُترشّح ہوتی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودی علما نے اعتراض کیا کہ آپ کے شاگرد بزرگوں کی روایات کے خلاف ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کیوں کھا لیتے ہیں؟ اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا: تم ریاکاروں کی حالت وہی ہے جس پر یَسعیاہ نبیؑ کی زبان سے یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ ”یہ اُمّت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر اِن کے دل مجھ سے دُور ہیں...... کیونکہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں۔“ تم لوگ خدا کے حکم کو تو باطل کرتے ہو اور اپنے گھڑے ہوئے قوانین کو برقرار رکھتے ہو۔ خدا نے تورات میں حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی عزّت کرو اور جو کوئی ماں باپ کو برا کہے، وہ جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو شخص اپنی ماں یا باپ سے یہ کہہ دے کہ میری جو خدمات تمھارے

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ

جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا: ”کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟“ حواریوں[۴۹] نے جواب دیا: ”ہم اللہ کے مددگار[۵۰] ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔ مالک! جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی،

کام آسکتی تھیں، انھیں میں خدا کی نذر کر چکا ہوں، اس کے لیے بالکل جائز ہے کہ پھر ماں یا باپ کی کوئی خدمت نہ کرے۔ (متّی ۱۵: ۳-۹۔ مَرقُس ۷: ۵-۱۳)

۴۹ - ”حواری“ کا لفظ قریب قریب وہی معنیٰ رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ”انصار“ کا مفہوم ہے۔ بائبل میں بالعُموم حواریوں کے بجائے ”شاگردوں“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعض مَقامات پر انھیں رسول بھی کہا گیا ہے۔ مگر رسول اِس معنیٰ میں کہ مسیح علیہ السّلام ان کو تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے، نہ اِس معنیٰ میں کہ خدا نے ان کو رُسول مقرر کیا تھا۔

۵۰ - دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآنِ مجید میں اکثر مَقامات پر ”اللہ کی مدد کرنے“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے۔ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبُور نہیں کرتا۔ اس کے بجائے وہ دلیل اور نصیحت سے انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اُس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمایش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے۔ اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں، اُن کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے۔ اور یہ وہ بلند سے بلند مَقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہوسکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے۔ مگر تبلیغِ دین اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شَرَف حاصل ہوتا ہے، جو اس دنیا میں رُوحانی ارتقا کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ع اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ

ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔"

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ جواب میں اللہ نے بھی اپنی خُفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ع (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اُس نے کہا کہ "اے عیسیٰؑ! اب میں تجھے واپس لے لوں[51] گا اور

---

۵۱ - اصل میں لفظ "مُتَوَفِّیْکَ" استعمال ہُوا ہے۔ تَوَفّی کے اصل معنیٰ لینے اور وُصول کرنے کے ہیں۔ "رُوح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے، نہ کہ اصل لُغوی معنیٰ۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (to recall) کے معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے، یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بُلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمایشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جارہی تھی، پے در پے کئی انبیاؑ کو قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حُجت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السّلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا، جن کے ساتھ مامور مِنَ اللہ ہونے کی ایسی کُھلی کُھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجے کا عِناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلے میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا، اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رَدّ کر دی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰؑ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقّاصہ کی فرمائش پر قلم کرا دیا، اور ان کے علما و فقہا نے سازش کر کے حضرت عیسیٰؑ کو رُومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمایش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بُلا لیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلّت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیح کی تردید و اصلاح کے لیے ہے۔ اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے:

(۱) حضرت مسیحؑ کی اعجازی ولادت

(۲) ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات۔

رَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ
الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ

تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے اُن سے (یعنی اُن کی معیّت سے اور اُن کے گندے ماحول میں اُن کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دُوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے۔[۵۲]

---

(۳) اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا، جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیحؑ کا بے باپ پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریقِ پیدایش ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیح خدا تھا یا خدائی میں کچھ بھی حصہ رکھتا تھا۔

دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود مسیحؑ کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے، مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اُس نے اللہ کے اِذن سے کیے تھے، باختیارِ خود کچھ بھی نہیں کیا، اس لیے ان میں سے بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے تم یہ نتیجہ نکالنے میں کچھ بھی حق بجانب ہو کہ مسیحؑ کا خدائی میں کوئی حصہ تھا۔

اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی رِوایت سرے سے بالکل ہی غلط ہوتی، تب تو ان کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم الٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو، وہ مر کر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فُلاں مَقام پر جا کر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا، اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیحؑ سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں "ایلی ایلی لما شبقتنی" کہا تھا، اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو، وہ مسیحؑ نہ تھا، مسیحؑ کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا۔

اس کے بعد جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیحؑ کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سُلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

۵۲ – انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں، جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے اُسے رد کر دیا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاَحۡكُمُ بَیۡنَكُمۡ فِیۡمَا كُنۡتُمۡ فِیۡهِ
تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا فَاُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا
شَدِیۡدًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾
وَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ ؕ
وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَیۡكَ مِنَ
الۡاٰیٰتِ وَالذِّكۡرِ الۡحَكِیۡمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ
كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ﴿۵۹﴾

پھر تم سب کو آخرکار میرے پاس آنا ہے، اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمھارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رَوِیّہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دے دیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبّت نہیں کرتا۔"

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سُنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسٰیؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ[۵۳] ہو گیا۔

---

۵۳ - یعنی اگر محض اعجازی پیدائش ہی کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا بنانے کے لیے کافی دلیل ہو، تب تو پھر تمھیں آدمؑ کے متعلق بدرجۂ اَولیٰ ایسا عقیدہ تجویز کرنا چاہیے تھا، کیونکہ مسیحؑ تو صرف بے باپ ہی کے پیدا ہوئے تھے، مگر آدمؑ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ
حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔[۵۴]

یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے محمدؐ! اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچّوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دُعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو۔"[۵۵]

---

۵۴ – یہاں تک کی تقریر میں جو بُنیادی نِکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، اُن کا خلاصہ علی الترتیب حسبِ ذیل ہے:

پہلا امر جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ ہے کہ مسیحؑ کی اُلُوہیت کا اعتقاد تمھارے اندر جن وُجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھالے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا مِلکیت میں اس کا شریک تھا۔

دُوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے، وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیحؑ کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیحؑ کے حواری کرتے تھے۔

۵۵ – فیصلے کی یہ صُورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصُود تھا کہ وفدِ نَجران جان بُوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اُوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ ۗ وَإِنَّ
اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ
بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾ ع قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ

ع ٦ ١٣

یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خداوند نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اِس شرط پر مقابلے میں آنے سے) منہ موڑیں تو (اُن کا مفسد ہونا صاف کُھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔ ع

کہو:[٥٦] ''اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان

مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کُتُبِ مقدّسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپؐ کی تعلیم اور آپؐ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپؐ کی نبوّت کے قائل بھی ہو گئے تھے، یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اُس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کُھل گئی کہ نجرانی مسیحیّت کے پیشوا اور پادری، جن کے تقدُّس کا سکّہ دُور دُور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

٥٦ - یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ بَدر اور جنگِ اُحُد کے درمیانی دَور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سُورت سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربطِ کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسّرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفدِ نجران والی تقریر ہی کے سلسلے کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے، اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مُخاطَب یہُودی ہیں۔

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ
تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْ
بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ
عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

یکساں ہے۔[۵۷] یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے“ — اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے[۵۸] — تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے،

۵۷- یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کرلو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمھارے اپنے انبیاؑ سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمھاری اپنی کُتُبِ مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

۵۸- یعنی تمھاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال تورات اور انجیل کے نُزُول کے بعد پیدا ہوئی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے، وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا۔ پھر اگر حضرت

وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (٦٦) مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (٦٧) اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (٦٨) وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (٦٩) يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (٧٠)

تم نہیں جانتے۔ ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مُسلِم[٥٩] یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔“ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو اُن لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبیؐ اور اس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ صرف اُنھی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شُعور نہیں ہے۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے[٦٠] ہو؟

ابراہیمؑ راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے، تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۳۵ و ۱۴۱)

٥٩ - اصل میں لفظ حَنیف استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر ایک خاص راستے پر چلے۔ اسی مفہوم کو ہم نے ”مسلم یک سُو“ سے ادا کیا ہے۔

٦٠ - دوسرا ترجمہ اس فقرے کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ”تم خود گواہی دیتے ہو۔“ دونوں صُورتوں میں نفسِ معنٰی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ
وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾ ۚ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ
تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ
مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مُشتبَہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بُوجھتے حق کو چُھپاتے ہو؟ ع

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبیؐ کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔[61] نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ ”اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دے دیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دُوسروں کو تمھارے رب کے حُضور پیش کرنے کے لیے تمھارے خلاف قوی حجت مل جائے۔“ اے نبیؐ! ان سے کہو کہ

اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاؑ کے احوال اور کُتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو، اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) یہ جان چکے تھے کہ حضورؐ وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیائے سابقین نے کیا تھا، حتّٰی کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپؐ کی صداقت اور آپؐ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو، ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚۖ ﴿۷۳﴾
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾
وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ
وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا
دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي

"فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر[۶۲] ہے اور سب کچھ جانتا ہے،[۶۳] اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔"

اہلِ کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا، اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسا کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "اُمّیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں

---

۶۱ – یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا، تاکہ پہلے عَلانِیَہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں، پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں، تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے۔

۶۲ – اصل میں لفظ "وَاسِعٌ" استعمال ہوا ہے، جو بالعُموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقع جہاں انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دُوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بُخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیُّل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۱۶)

الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ (75) بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ (76) اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ص

ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔[۶۴]" اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے باز پُرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پُورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قَسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا،[۶۵]

---

۶۳ – یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

۶۴ – یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا، بلکہ اُن کے ہاں کی مذہبی تعلیم بھی یہی کچھ تھی، اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام ایسے ہی تھے۔ بائبل قرض اور سُود کے احکام میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان صاف تفریق کرتی ہے۔ (اِستثنا ۱۵: ۱ – ۳، ۲۳: ۲۰) تَلمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں، مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز ملے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ رِبّی اشمٰعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدّمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جِتوا سکتا ہو تو اُس کے مطابق جِتوائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر اُمّیوں کے قانون کے تحت جِتوا سکتا ہو تو اس کے تحت جِتوائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو، کرے۔ رِبّی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غَلَطی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ (تالمودِک مسّلینی، پال آئزک ہرشوں، لندن ۱۸۸۰ء، صفحات ۳۷-۲۱۰-۲۲۱)

۶۵ – سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اَخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٧﴾ وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ
بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٨﴾ مَا كَانَ
لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا

بلکہ اُن کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی[٦٦]، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بُوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے

کے روز بس یہی اللہ کے مقرّب بندے ہوں گے، انھی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا مَیل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے، وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائے گا، حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

٦٦ - اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہلِ کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں۔ مثلاً بعض لوگ جو نبیؐ کی بَشَریّت کے منکر ہیں، آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَآ کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ”اے نبیؐ! کہہ دو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا۔“

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾ۙ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿٨٠﴾ ع وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ ٨ ع ٩ ١٧
مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا

رَبّانی[٦٧] بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمھیں کفر کا حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟[٦٨] ع

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ”آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہُوا آئے جو

---

٦٧ – یہودیوں کے ہاں جو علما مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی اُمور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکامِ دین کا اجرا کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ رَبّانی استعمال کیا جاتا تھا، جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ ؕ (ان کے ربّانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے)۔ اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (divine) بھی ”رَبّانی“ کا ہی ہم معنیٰ ہے۔

٦٨ – یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دُنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رُو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبُود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدۂ کُلِّیَہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کُن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۱) فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۸۲) اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ

پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔[۶۹]“

یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پُوچھا: ”کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمّہ داری اُٹھاتے ہو؟“ اُنھوں نے کہا: ”ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔“ اللہ نے فرمایا: ”اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔[۷۰]“

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دینُ اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟

---

۶۹ – مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ـــــ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو، وہ لامحالہ اس کے پیرووں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ـــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہو گا۔ اُس کے ساتھ تعصّب نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مُخالَفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اُٹھایا جائے، اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی اُمّت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتا نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو، یا آپؐ نے اپنی اُمّت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

۷۰ – اس ارشاد سے مقصود اہلِ کتاب کو مُتنبِّہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اُس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاءؑ سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّاِلَيۡهِ
يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى
اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ
مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَالنَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ
مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ
دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں[۷۱] اور اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبیؐ! کہو کہ ”ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اُن تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں، اور اُن ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دُوسرے پیغمبروں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے[۷۲] اور ہم اللہ کے تابعِ فرمان (مُسلِم) ہیں۔“ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

---

[۷۱] – یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کون سا طریقۂ زندگی تلاش کر رہے ہو؟

[۷۲] – یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، کسی کو جھوٹا کہیں اور کسی کو سچّا۔ ہم تعصّب اور حمیّتِ جاہلیّہ سے پاک ہیں۔ دُنیا میں جہاں، جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسُول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آ چکی ہیں[۷۳]۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھِٹکار ہے، اِسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہو گی اور نہ انھیں مُہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اِس کے بعد توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے[۷۴] ان کی توبہ بھی

---

۷۳ – یہاں پھر اُسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علما جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپؐ نبیِ برحق ہیں، اور جو تعلیم آپؐ لائے ہیں، وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاؑ لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا، وہ محض تعصّب، ضد اور دُشمنیِ حق کی اُس پُرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آ رہے تھے۔

۷۴ – یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی، بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستے سے روکنے کی کوشش

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا
وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ
افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع

ع ۹ ۱۱ ۱۷

الجزء ۴

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ

قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکّے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو، جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی اُن میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے رُوئے زمین بھر کر بھی سونا فدیے میں دے تو اُسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ ع

تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو،[۷۵]

میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور بدترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں، تاکہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔

۷۵ – اس سے مقصود اُن کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو وہ ”نیکی“ کے بارے میں رکھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں نیکی کا بلند سے بلند تصوُّر بس یہ تھا کہ صدیوں کے توارُث سے ”تَشَرُّع“ کی جو ایک خاص ظاہری شکل ان کے ہاں بن گئی تھی، اس کا پورا چربہ آدمی اپنی زندگی میں اُتار لے، اور ان کے علما کی قانونی مُوشگافیوں سے جو ایک لمبا چوڑا فقہی نظام بن گیا تھا، اس کے مطابق رات دن زندگی کے چھوٹے چھوٹے ضمنی وفُروعی معاملات کی ناپ تول کرتا رہے۔ اس تَشَرُّع کی اُوپری سطح کے نیچے بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے ”دین دار“ لوگ تنگ دلی، حرص، بُخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عُیُوب چھُپائے ہوئے تھے اور رائے عام ان کو نیک سمجھتی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اُنھیں بتایا جا رہا ہے کہ ”نیک انسان“ ہونے کا مقام اُن چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدارِ خیر وصلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل رُوح خدا کی مَحبّت ہے، ایسی مَحبّت کہ رضائے الٰہی کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو۔ جس چیز کی مَحبّت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے خدا کی مَحبّت پر قربان نہ کر سکتا ہو، بس وہی بُت ہے، اور جب تک اُس بُت کو آدمی توڑ نہ دے، نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں۔ اس رُوح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تَشَرُّع کی حیثیت محض اُس چمک دار روغن کی سی ہے جو گھُن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو۔ انسان ایسے روغنوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، مگر خدا نہیں کھا سکتا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ
حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ
مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ
بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ قف

مانعا عندالمتقدمین

اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدیؐ میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں[۷۶]، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل[۷۷] نے خود اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو: اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچّے ہو تو لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت ـــــ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔ کہو: اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے،

---

۷۶ – قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر جب علمائے یہود کوئی اُصولی اعتراض نہ کر سکے (کیونکہ اساسِ دین جن اُمور پر ہے، اُن میں انبیائے سابقین کی تعلیمات اور نبیِ عَرَبیؐ کی تعلیم میں یک سرِ مُو فرق نہ تھا) تو انھوں نے فقہی اعتراضات شروع کیے۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ آپؐ نے کھانے پینے کی بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاؑ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی ہیں۔ اسی اعتراض کا یہاں جواب دیا جا رہا ہے۔

۷۷ – ”اسرائیل“ سے مراد اگر بنی اسرائیل لیے جائیں تو مطلب یہ ہو گا کہ نُزولِ تورات سے قبل بعض چیزیں بنی اسرائیل نے محض رسماً حرام قرار دے لی تھیں۔ اور اگر اس سے مراد حضرت یعقوبؑ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آنجناب نے بعض چیزوں سے طبعی کراہت کی بنا پر یا کسی مرض کی بنا پر احتراز فرمایا تھا اور ان کی اولاد نے بعد میں انھیں ممنوع سمجھ لیا۔ یہی مؤخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔ اور بعد والی آیت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اُونٹ اور خرگوش وغیرہ کی حُرمت کا جو حکم بائبل میں لکھا ہے، وہ اصل تورات کا حکم نہیں ہے بلکہ یہودی علما نے بعد میں اسے داخلِ کتاب کر دیا ہے۔ (مفصل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۱۲۲)

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٥﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٦﴾ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۥ ۚ وَمَنْ

تم کو یکسُو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرنی چاہیے، اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔[۷۸]

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ میں واقع ہے۔[۷۹] اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کُھلی ہُوئی نشانیاں ہیں،[۸۰] ابراہیمؑ کا مقامِ عبادت ہے، اور اس کا حال یہ ہے کہ جو

---

۷۸ – مطلب یہ ہے کہ اِن فقہی جزئیات میں کہاں جا پھنسے ہو۔ دین کی جڑ تو اللہ واحد کی بندگی ہے جسے تم نے چھوڑ دیا اور شرک کی آلایشوں میں مُبتلا ہو گئے۔ اب بحث کرتے ہو فقہی مسائل میں، حالانکہ یہ وہ مسائل ہیں جو اصل ملّتِ ابراہیمی سے ہٹ جانے کے بعد انحطاط کی طویل صدیوں میں تمہارے علما کی مُوشگافیوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۷۹ – یہودیوں کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم نے بیت المَقدِس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ کیوں بنایا، حالانکہ پچھلے انبیاؑ کا قبلہ بیت المَقدِس ہی تھا۔ اس کا جواب سورۂ بقرہ میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن یہودی اس کے بعد بھی اپنے اعتراض پر مُصِر رہے۔ لہٰذا یہاں پھر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بیت المَقدِس کے متعلق خود بائبل ہی کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمانؑ نے اس کو تعمیر کیا۔ (۱-سلاطین، باب ۶، آیت ۱) اور حضرت سلیمانؑ ہی کے زمانے میں وہ قبلۂ اہلِ توحید قرار دیا گیا۔ (کتابِ مذکور، باب ۸، آیت ۲۹-۳۰) برعکس اس کے یہ تمام عرب کی متواتر اور مُتّفق عَلَیہ روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا، اور وہ حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا کعبہ کی اوّلیت ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجایش نہیں۔

۸۰ – یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرما لیا ہے۔ لق و دق بیابان میں بنایا گیا اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام کر دیا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیّت کے سبب سے سارا ملکِ عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا، مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطرافِ کعبہ ہی کا ایک خِطّہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا۔ بلکہ اسی کعبہ کی یہ برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسّر آ جاتا تھا۔ پھر ابھی نصف صدی پہلے ہی

دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ
اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ
وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا
وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اِس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔[۸۱] لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

کہو: اے اہلِ کتاب! تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! یہ تمھاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اُسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود (اس کے راہِ راست ہونے پر) گواہ ہو۔ تمھاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔

سب دیکھ چکے تھے کہ اَبْرَہہ نے جب کعبہ کی تخریب کے لیے مکّہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہرِ الٰہی کی شکار ہوئی۔ اس واقعے سے اُس وقت عرب کا بچّہ بچّہ واقف تھا اور اس کے چشم دید شاہد اِن آیات کے نُزول کے وقت موجود تھے۔

[۸۱] – جاہلیت کے تاریک دَور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دُشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے اور ایک کو دوسرے پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ
وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ
بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ ۱۰ ع ۱۱ ۱
اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم نے اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمھیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمھارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سُنائی جا رہی ہیں اور تمھارے درمیان اس کا رسولؐ موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہِ راست پالے گا۔ؑ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔[82] سب مل کر اللہ کی رسّی[83] کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

---

۸۲ – یعنی مرتے دَم تک اللہ کی فرماں برداری اور وفاداری پر قائم رہو۔

۸۳ – اللہ کی رسّی سے مراد اس کا دین ہے، اور اس کو رسّی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے، اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسّی کو "مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیّت "دین" کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جُزئیات و فُروع کی طرف منعطف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرِقہ و اختلاف رُونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیا علیہم السّلام کی اُمتوں کو ان کے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ
النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ

اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دُوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔[۸۴] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ اِن علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔[۸۵]

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہییں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا

اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

۸۴ – یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں، اور شب و روز کے کُشت و خون، جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انھیں بچایا تو وہ یہی نعمتِ اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئی ہیں، اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینے کے لوگ مسلمان ہوئے تھے، اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اَوس اور خَزرج کے وہ قبیلے، جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے، اور یہ دونوں قبیلے مکے سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبّت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے۔

۸۵ – یعنی اگر تم آنکھیں رکھتے ہو تو ان علامتوں کو دیکھ کر خود اندازہ کر سکتے ہو کہ آیا تمھاری فلاح اِس دین کو مضبوط تھامنے میں ہے، یا اسے چھوڑ کر پھر اُسی حالت کی طرف پلٹ جانے میں جس کے اندر تم پہلے مبتلا تھے؟ آیا تمھارا اصلی خیر خواہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہے، یا وہ یہودی اور مشرک اور منافق لوگ جو تم کو حالتِ سابقہ کی طرف پلٹا لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴
وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ۝۱۰۵ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ
تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۱۰۶ وَ اَمَّا
الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝۱۰۷ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ

حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کُھلی کُھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے[۸۶]۔ جنھوں نے یہ روش اختیار کی وہ اُس روز سخت سزا پائیں گے جب کہ کچھ لوگ سُرخ رُو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا، جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) نعمتِ ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رَوِیّہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اِس کفرانِ نعمت کے صلے میں عذاب کا مزا چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سُنا رہے ہیں

۸۶- یہ اشارہ اُن اُمتوں کی طرف ہے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں سے دینِ حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدّت گزر جانے کے بعد اساسِ دین کو چھوڑ دیا اور غیر متعلق ضمنی و فُروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کر دیے، پھر فضول و لایعنی باتوں پر جھگڑنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انھیں اُس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے ان کے سُپرد کیا تھا، اور نہ عقیدہ و اَخلاق کے اُن بنیادی اُصولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا مدار ہے۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ

ع ۱۱ ۸ ۲

کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا[87]۔ زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ ع

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے[88]۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب[89] ایمان لاتے تو انھی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ

۸۷- یعنی چونکہ اللہ دُنیا والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ ان کو سیدھا راستہ بھی بتا رہا ہے اور اِس بات سے بھی انھیں قبل از وقت آگاہ کیے دیتا ہے کہ آخرِکار وہ کن اُمور پر اُن سے باز پرس کرنے والا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ کج روی اختیار کریں اور اپنے غلط طرزِ عمل سے باز نہ آئیں، وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کریں گے۔

۸۸- یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ بقرہ کے سترھویں رُکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ نبیِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نا اہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں، اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اَخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب یہ کام تمھارے سُپرد کیا گیا ہے اور تمھیں لازم ہے کہ اپنی ذمّہ داریوں کو سمجھو اور اُن غَلطیوں سے بچو جو تمھارے پیش رَو کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۲۳ و ۱۴۴)

۸۹- یہاں اہلِ کتاب سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔

الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ
وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱۱۱
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا
يَعْتَدُوْنَ ۝۱۱۲ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ

ایمان دار بھی پائے جاتے ہیں، مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے اِن پر ذلّت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اَور بات[۹۰] ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گِھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

مگر سارے اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں۔

---

[۹۰] – یعنی دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب بھی ہوا ہے تو وہ ان کے اپنے بل بُوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی حمایت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی، اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے اپنے طور پر انھیں اپنی حمایت میں لے لیا۔ اسی طرح بسا اوقات انھیں دُنیا میں کہیں زور پکڑنے کا موقع بھی مل گیا ہے، لیکن وہ بھی اپنے زورِ بازو سے نہیں بلکہ محض ”بپائے مردی ہمسایہ“۔

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا
يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَـيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا
يُنْفِقُوْنَ فِيْ ھٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ
حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ

راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، بُرائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دُنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اُس کی مثال اُس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔[91] اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا،

---

[91] – اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہوا سے مراد وہ اُوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ میں دولت صَرف کرتے ہیں۔ اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطۂ خداوندی کی پیروی کا فُقدان ہے، جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ

وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا

درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دُوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے میں نہیں چُوکتے[92]۔ تمھیں جس چیز سے

اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہَوا کھیتیوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہَوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے، اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کے مَزرَعۂ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے، مگر جب اس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے، اور اُس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرّف کر رہا ہے، اور یہ مملکت بھی اللہ ہی کی ہے جس کے اندر رہ کر انسان کام کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا، یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے، اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرّف کرتے ہوئے اس کے قانون وضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا، تو اس کے یہ تمام تصرُّفات از سرتاپا جُرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا، وہ تو اس کا مستحق ہے کہ اِن تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدّمہ قائم کیا جائے۔ اُس کی خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نوکر اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اس کا خزانہ کھولے اور جہاں جہاں اپنی دانست میں مناسب سمجھے، خرچ کر ڈالے۔

۹۲- مدینے کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے، ان کے ساتھ اَوس اور خَزرَج کے لوگوں کی قدیم زمانے سے دوستی چلی آتی تھی۔ انفرادی طور پر بھی اِن قبیلوں کے افراد اُن کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اَوس اور خَزرَج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پُرانے تعلقات نباہتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبّت وخلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبیِ عَرَبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے مشن سے جو عداوت ہوگئی تھی، اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبّت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہوگیا ہو۔ انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آتے تھے، مگر دل میں وہ اب ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے، اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ وفساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک

مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِیْ
صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا یُحِبُّوْنَكُمْ
وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ
وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ؗ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا
بِهَا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا ؕ

نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمھیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلّق رکھنے میں احتیاط برتو گے)۔ تم ان سے محبّت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبّت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کُتبِ آسمانی کو مانتے ہو[۹۳]۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمھارے رسول اور تمھاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جُدا ہوتے ہیں تو تمھارے خلاف ان کے غیظ وغضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں ـــــ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چُھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ـــــ تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔

پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اسی منافقانہ روِش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

۹۳- یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اِس کے کہ تمھیں اُن سے ہوتی، اُن کو تم سے ہے۔ تم تو

ع ۱۲ ۲

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ
اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس پر حاوی ہے۔ ع

(اے[۹۴] پیغمبرؐ! مسلمانوں کے سامنے اُس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (اُحُد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بجا مامور کر رہے تھے۔

قرآن کے ساتھ توراۃ کو بھی مانتے ہو، اس لیے اُن کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ شکایت اگر ہو سکتی تھی تو تمھیں اُن سے ہو سکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے۔

۹۴- یہاں سے چوتھا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوا ہے اور اس میں جنگِ اُحُد پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُوپر کے خطبے کو ختم کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوا تھا کہ ’’ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔‘‘ اب چونکہ اُحُد کے میدان میں مسلمانوں کی شکست کا سبب ہی یہ ہوا کہ ان کے اندر صبر کی بھی کمی تھی اور ان کے افراد سے بعض ایسی غَلَطیاں بھی سرزد ہوئی تھیں جو خدا ترسی کے خلاف تھیں، اس لیے یہ خطبہ جس میں اُنھیں ان کمزوریوں پر مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے، مندرجہ بالا فقرے کے بعد ہی متصلاً درج کیا گیا۔

اس خطبے کا اندازِ بیان یہ ہے کہ جنگِ اُحُد کے سلسلے میں جتنے اہم واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کو لے کر اس پر چند جچے تُلے فقروں میں نہایت سبق آموز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس کے واقعاتی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

شوّال ۳ھ کی ابتدا میں کفارِ قریش تقریباً ۳ ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر حملہ آور ہوئے۔ تعداد کی کثرت کے علاوہ ان کے پاس ساز و سامان بھی مسلمانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا، اور پھر وہ جنگِ بَدر کے انتقام کا شدید جوش بھی رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تجَربہ کار صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مدینے میں محصور ہو کر مُدَافَعَت کی جائے۔ مگر چند نوجوانوں نے، جو شہادت کے شوق سے بے تاب تھے اور جنھیں بَدر کی جنگ میں شریک ہونے کا موقع نہ ملا تھا، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آخرِ کار اُن کے اصرار سے مجبور ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکلنے ہی کا فیصلہ فرما لیا۔ ایک ہزار آدمی آپؐ کے ساتھ نکلے، مگر مقامِ شَوط پر پہنچ کر عبد اللہ بنِ اُبَیّ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عین وقت پر اس کی اس حرکت سے مسلمانوں کے لشکر میں اچھا خاصا اضطراب پھیل گیا، حتّٰی کہ بنو سَلَمہ اور بنو حارِثہ کے لوگ تو ایسے دل شکستہ ہوئے کہ انھوں نے بھی پلٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر اُولُوا العزم صحابہؓ کی کوششوں سے یہ اضطراب رفع ہو گیا۔ اِن باقی ماندہ سات سو آدمیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اُحُد کی پہاڑی کے دامن میں (مدینہ سے تقریباً چار میل کے

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ لا اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا لا

اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔

یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بُزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے [۹۵] تھے، حالانکہ

فاصلے پر) اپنی فوج کو اس طرح صف آرا کیا کہ پہاڑ پشت پر تھا اور قریش کا لشکر سامنے۔ پہلو میں صرف ایک دَرّہ ایسا تھا جس سے اچانک حملے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہاں آپؐ نے عبداللہؓ بن جُبَیر کے زیرِ قیادت پچاس تیر انداز بٹھا دیے اور ان کو تاکید کر دی کہ ”کسی کو ہمارے قریب نہ پھٹکنے دینا، کسی حال میں یہاں سے نہ ہلنا، اگر تم دیکھو کہ ہماری بوٹیاں پرندے نوچ لیے جاتے ہیں تب بھی تم اس جگہ سے نہ ٹلنا۔“ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ ابتداءً مسلمانوں کا پلّا بھاری رہا، یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ لیکن اس ابتدائی کامیابی کو کامل فتح کی حد تک پہنچانے کے بجائے مسلمان مالِ غنیمت کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کو لُوٹنا شروع کر دیا۔ اُدھر جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جو دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے اور غنیمت لُٹ رہی ہے، تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر غنیمت کی طرف لپکے۔ حضرت عبداللہؓ بن جُبَیر نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم یاد دلا کر بہتیرا روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا کوئی نہ ٹھیرا۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے، جو اس وقت لشکرِ کفار کے رسالے کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اُٹھایا اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر پہلو کے دَرّے سے حملہ کر دیا۔ عبداللہؓ بن جُبَیر نے، جن کے ساتھ صرف چند ہی آدمی رہ گئے تھے، اس حملے کو روکنا چاہا مگر مُدافَعت نہ کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ دُوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی کا پانسا ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصّہ پراگندہ ہو کر بھاگ نکلا۔ تاہم چند بہادر سپاہی ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپؐ خود زخمی ہو چکے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ لیکن عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس موقع پر یہ ایک مُعَمّا ہے جو حل نہیں ہو سکا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے کفارِ مکہ کو خود بخود واپس پھیر دیا۔ مسلمان اس قدر پراگندہ ہو چکے تھے کہ ان کا پھر مجتمع ہو کر باقاعدہ جنگ کرنا مشکل تھا۔ اگر کفار اپنی فتح کو کمال تک پہنچانے پر اصرار کرتے تو ان کی کامیابی بعید نہ تھی۔ مگر نہ معلوم کس طرح وہ آپ ہی آپ میدان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ
نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ؕ بَلٰٓى ۙ اِنْ
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا نصف
بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگِ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، اُمید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: ”کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اُتار کر تمھاری مدد کرے؟“ ــــ بے شک،[۹۶] اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اُسی آن تمھارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمھیں اس لیے بتا دی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے

---

۹۵ – یہ اشارہ ہے بنوسَلَمہ اور بنوحارثہ کی طرف، جن کی ہمّتیں عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے ساتھیوں کی واپسی کے بعد پست ہو گئی تھیں۔

۹۶ – مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہو گئے ہیں، تو ان کے دل ٹوٹنے لگے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ
يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

۳ ع ۴

جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔ (اور یہ مدد وہ تمھیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبرؐ!) فیصلے کے اختیارات میں تمھارا کوئی حصّہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔[97] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سُود کھانا چھوڑ دو[98] اور اللہ سے ڈرو،

۹۷- نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو آپؐ کے منہ سے کفار کے حق میں بدُعا نکل گئی اور آپؐ نے فرمایا کہ ”وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔“ یہ آیات اسی کے جواب میں ارشاد ہوئی ہیں۔

۹۸- اُحد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لُوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیم مُطلَق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سُود خواری سے باز آؤ، جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے، اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ﴿۱۳۱﴾
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِی
السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ
النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا

اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے مہیّا کی گئی ہے اور اللہ اور رسُول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ دَوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اُس جنّت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیّا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دُوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ـــ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں[۹۹] ـــ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فُحش کام

چلی جاتی ہے۔

۹۹ - سُود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے، اس کے اندر سُود خواری کی وجہ سے دو قسم کے اَخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں: سُود لینے والوں میں حرص و طمع، بُخل اور خود غرضی۔ اور سُود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بُغض و حسد۔ اُحُد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سُود خواری سے فریقین میں جو اَخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں، ان کے بالکل برعکس اِنفاق فی سبیل اللہ سے یہ دُوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں، اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دُوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے، نہ کہ پہلی قسم کے اوصاف سے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۳۲۰)

فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا
لِذُنُوْبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۗ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا
فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ
الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي
الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ
لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ

ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اُوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ــــ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ــــ اور وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ تم سے پہلے بہت سے دَور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات) کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت۔

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اِس وقت اگر

يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَ تِلۡكَ
الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ
يَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ۙ (۱۴۰)
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَيَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ (۱۴۱) اَمۡ حَسِبۡتُمۡ
اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ
يَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ (۱۴۲) وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ

تمھیں[۱۰۰] چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچّے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں[۱۰۱] ـــــ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ـــــ اور وہ اِس آزمائش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُونہی جنّت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنّائیں کر رہے تھے! مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب

---

[۱۰۰] اشارہ ہے جنگِ بَدر کی طرف۔ اور کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اُس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمّت نہ ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمّت ہارو۔

[۱۰۱] اصل الفاظ ہیں: وَيَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ – اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا، یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزّت بخشنا چاہتا تھا۔ اور دُوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور منافقین کے اُس مخلوط گروہ میں سے، جس پر تم اِس وقت مشتمل ہو، اُن لوگوں کو الگ چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہیں، یعنی اُس منصبِ جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمّتِ مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔

أَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۴۳﴾ ع وَمَا مُحَمَّدٌ
إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ
قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۗ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ
فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا
كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ

موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمھارے سامنے آگئی اور تم نے اُسے آنکھوں دیکھ لیا۔[۱۰۲] ع

محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟[۱۰۳] یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

کوئی ذی رُوح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔[۱۰۴]

۱۰۲- اشارہ ہے شہادت کے اُن تمنائیوں کی طرف جن کے اصرار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔

۱۰۳- جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر صحابہؓ کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ اس حالت میں منافقین نے (جو مسلمانوں کے ساتھ ہی لگے ہوئے تھے) کہنا شروع کیا کہ چلو عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس چلیں، تاکہ وہ ہمارے لیے ابوسُفیان سے امان لے دے۔ اور بعض نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر محمدؐ خدا کے رسول ہوتے تو قتل کیسے ہوتے، چلو اب دینِ آبائی کی طرف لوٹ چلیں۔ انھی باتوں کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمھاری "حق پرستی" محض محمدؐ کی شخصیت سے وابستہ ہے اور تمھارا اسلام ایسا سُست بنیاد ہے کہ محمدؐ کے دُنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اسی کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے، تو اللہ کے دین کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔

۱۰۴- اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمھارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ
الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۱۴۵ وَكَاَيِّنْ مِّنْ
نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ

جو شخص ثوابِ دُنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت[۱۰۵] کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے[۱۰۶] والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اِس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مِل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں ان سے وہ

لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مُہلت بھی تمھیں حاصل ہے، اس میں تمھاری سعی و جُہد کا مقصود کیا ہے، دنیا یا آخرت؟

۱۰۵- ثواب کے معنیٰ ہیں نتیجۂ عمل۔ ثوابِ دُنیا سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو انسان کو اُس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اِسی دُنیا کی زندگی میں حاصل ہوں۔ اور ثوابِ آخرت سے مراد وہ فوائد و مَنافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اَخلاق کے معاملے میں فیصلہ کُن سوال یہی ہے کہ کارزارِ حیات میں آدمی جو دَوڑ دھوپ کر رہا ہے، اس میں آیا وہ دُنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اُخروی نتائج پر۔

۱۰۶- ”شکر کرنے والوں“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اِس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اُس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انھیں دُنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع، ایک ناپیدا کنار عالَم کی خبر دی، اور انھیں اس حقیقت سے آگاہی بخشی کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دنیا کی چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دُوسرے عالَم تک ان کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔ یہ وسعتِ نظر اور یہ دُور بینی و عاقبت اندیشی حاصل ہو جانے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اِس دُنیوی زندگی کے ابتدائی مرحلے میں بار آور ہوتے نہ دیکھے، یا ان کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے، اور اس کے باوجود اللہ کے بھروسے پر وہ کام کرتا چلا جائے جس کے متعلق اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ بہر حال آخرت میں اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا، وہ شکر گزار بندہ ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مُبتلا رہیں، جن کا حال یہ ہو کہ دنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے نظر آئیں، ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں، اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی اُمید نہ ہو، یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اُن میں آخرت کے نتائجِ خیر کی اُمید پر اپنا وقت، اپنے مال اور اپنی قوتیں

سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ ﴿١٤٦﴾
وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا
وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِينَ ﴿١٤٧﴾ فَآتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤٨﴾ ع يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا ۱۵ ع ۶
الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خٰسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔[۱۰۷] ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دُعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“ آخر کار اللہ نے ان کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اُن لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو اُلٹا پھیر لے جائیں گے[۱۰۸] اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔

صَرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں، وہ ناشکرے ہیں اور اُس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔

۱۰۷ – یعنی اپنی قلّتِ تعداد اور بے سروسامانی، اور کفار کی کثرت اور زور آوری دیکھ کر انھوں نے باطل پرستوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔

۱۰۸ – یعنی جس کفر کی حالت سے تم نکل کر آئے ہو، اُسی میں یہ تمھیں پھر واپس لے جائیں گے۔ منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ محمدؐ اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں۔ ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے۔ آج فتح ہے تو کل

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓي
اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ
اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا

(اُن کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمھارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رُعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کے ساتھ اُن کو خدائی میں شریک ٹھیرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہے اور بہت ہی بُری ہے وہ قیام گاہ جو اُن ظالموں کو نصیب ہوگی۔

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اُس کے حکم سے تم ہی اُن کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبّت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے ــــ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے ــــ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی

شکست۔ خدا کی جس حمایت و نصرت کا انھوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے، وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا
تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا
بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً

تمھیں معاف ہی کر دیا[109] کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا، اور رسولؐ تمھارے پیچھے تم کو پکار[110] رہا تھا۔ اُس وقت تمھاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمھیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے[111] تاکہ آیندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی

---

[109] – یعنی تم نے غَلَطی تو ایسی کی تھی کہ اگر اللہ تمھیں معاف نہ کر دیتا تو اس وقت تمھارا اِستیصال ہو جاتا۔ یہ اللہ کا فضل تھا اور اس کی تائید وحمایت تھی جس کی بدولت تمھارے دشمن تم پر قابو پالینے کے بعد ہوش گم کر بیٹھے اور بلاوجہ خود پسپا ہو کر چلے گئے۔

[110] – جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے بیک وقت حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی، تو کچھ لوگ مدینے کی طرف بھاگ نکلے اور کچھ اُحُد پر چڑھ گئے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دُشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا، دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی، مگر اللہ کا رسُول اس نازک موقع پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا: اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، اللہ کے بندو! میری طرف آؤ۔

[111] – رنج ہزیمت کا، رنج اس خبر کا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، رنج اپنے کثیر التعداد مقتولوں اور مجروحوں کا، رنج اس بات کا کہ اب گھروں کی بھی خیر نہیں، تین ہزار دشمن، جن کی تعداد مدینے کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ
يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ
شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ

کہ وہ اُونگھنے لگے[۱۱۲]۔ مگر ایک دوسرا گروہ، جس کے لیے ساری اہمیّت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلافِ حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ”اِس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصّہ ہے“؟ ان سے کہو: ”(کسی کا کوئی حصّہ نہیں) اِس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھُپائے ہوئے ہیں اُسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ ”اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصّہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔“ ان سے کہہ دو کہ ”اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہُوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نِکل آتے۔“ اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ

ہے، شکست خوردہ فوج کو روندتے ہوئے قصبے میں آگھسیں گے اور سب کو تباہ کر دیں گے۔

[۱۱۲] یہ ایک عجیب تجرِبہ تھا جو اس وقت لشکرِ اسلام کے بعض لوگوں کو پیش آیا۔ حضرت ابو طلحہؓ جو اس جنگ میں شریک تھے، خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اُونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھُوٹی پڑتی تھیں۔

صُدُوۡرِكُمۡ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ۙ
اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّيۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا كَسَبُوۡا ۚ وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ
عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ع ﴿۱۵۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا ع ۱۶ ۷
تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَقَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِى
الۡاَرۡضِ اَوۡ كَانُوۡا غُزًّى لَّوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَمَا
قُتِلُوۡا ۚ لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ يُحۡىٖ وَ

اُسے آزما لے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اُسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثے سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[۱۱۳]، ورنہ دراصل مارنے اور جِلانے والا تو

---

۱۱۳ – یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قضائے الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ اپنی تدبیروں ہی پر موقوف سمجھتے ہیں، ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش! یوں ہوتا تو یہ ہو جاتا۔

يُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ
مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ
فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ
يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ

اللہ ہی ہے اور تمھاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمھارے حصے میں آئے گی وہ اُن ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنھیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خُو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ اِن کے قُصور معاف کردو، اِن کے حق میں دُعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد

فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ
بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ

کون ہے جو تمھاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچّے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے[114] ـــــ اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر مُتَنَفِّس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا ـــــ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اُس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گِھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانا جہنّم ہو جو بد ترین ٹھکانا ہے؟ اللہ کے نزدیک

---

[114] ۱۱۴ – جن تیر اندازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عَقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر لُوٹا جا رہا ہے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انھی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لُوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقع پر محروم رہ جائیں۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اُن لوگوں کو بُلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عُذرات پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ہل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم۔ ’’اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصّہ نہیں دیں گے۔‘‘ اس آیت کا اشارہ اسی معاملے کی طرف ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب تمھاری فوج کا کمانڈر خود اللہ کا نبی تھا اور سارے معاملات اس کے ہاتھوں میں تھے، تو تمھارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کیسے ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں تمھارا مفاد محفوظ نہ ہو گا۔ کیا خدا کے پیغمبر سے یہ توقع رکھتے ہو کہ جو مال اس کی نگرانی میں ہو، وہ دیانت، امانت اور انصاف کے سوا

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّآ النصف
اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ

دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔

درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اس کی آیات انھیں سُناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اور یہ تمھارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟[۱۱۵] حالانکہ (جنگِ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں (فریقِ مخالف پر) پڑچکی ہے۔[۱۱۶]

کسی اور طریقے سے بھی تقسیم ہوسکتا ہے؟

۱۱۵ – اکابر صحابہؓ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوسکتے تھے، مگر عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ جب اللہ کا رسولؐ ہمارے درمیان موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے، تو کسی حال میں کفار ہم پر فتح پا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب اُحد میں ان کو شکست ہوئی تو ان کی توقعات کو سخت صدمہ پہنچا اور انھوں نے حیران ہوکر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کیا ہوا؟ ہم اللہ کے دین کی خاطر لڑنے گئے، اس کا وعدۂ نصرت ہمارے ساتھ تھا، اُس کا رسول خود میدانِ جنگ میں موجود تھا، اور پھر بھی ہم شکست کھا گئے؟ اور شکست بھی اُن سے جو اللہ کے دین کو مٹانے آئے تھے؟ یہ آیات اِسی حیرانی کو دُور کرنے کے لیے ارشاد ہوئی ہیں۔

۱۱۶ – جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے ۷۰ آدمی شہید ہوئے۔ بخلاف اس کے جنگِ بدر میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ۷۰ آدمی گرفتار ہوکر آئے تھے۔

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾
وَمَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیَعْلَمَ
الْمُؤْمِنِیْنَ ۙ﴿۱۶۶﴾ وَلِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا ۖۚ وَقِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَىٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ ۚ
یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

اے نبیؐ! اِن سے کہو: یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے[۱۱۷]، اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱۱۸]۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمھیں پہنچا وہ اللہ کے اِذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔ وہ منافق کہ جب اُن سے کہا گیا، آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے[۱۱۹]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اُس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے

۱۱۷- یعنی یہ تمھاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا، بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کی طمع میں مبتلا ہوئے، آپس میں نزاع و اختلاف کیا، پھر کیوں پُوچھتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی؟

۱۱۸- یعنی اللہ اگر تمھیں فتح دینے کی قدرت رکھتا ہے تو شکست دلوانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

۱۱۹- عبداللہ بن اُبَیّ جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستے سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم جا رہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔

بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ ج اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ
اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ ۙ
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
وقف لازم عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ ۘ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ج ع

ع

خُوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو: اگر تم اپنے اس قول میں سچّے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے اُسے ٹال کر دکھا دینا۔

[۱۲۰] جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہُوئے ہیں انھیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُس پر خوش و خُرّم ہیں،[۱۲۱] اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ ع

---

۱۲۰ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۵۵۔

۱۲۱ – مُسندِ احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مروی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ جو شخص نیک عمل لے کر

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ ع
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ
وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسُول کی پُکار پر لبّیک کہا[۱۲۲] اُن میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ اور وہ جن[۱۲۳] سے لوگوں نے کہا کہ ”تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، اُن سے ڈرو“، تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخرکار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا

دُنیا سے جاتا ہے، اُسے اللہ کے ہاں اس قدر پُرلُطف اور پُرکیف زندگی میسّر آتی ہے جس کے بعد وہ کبھی دنیا میں واپس آنے کی تمنا نہیں کرتا۔ مگر شہید اس سے مُستثنیٰ ہے۔ وہ تمنا کرتا ہے کہ پھر دنیا میں بھیجا جائے اور پھر اُس لذت، اُس سُرور اور اُس نشے سے لُطف اندوز ہو جو راہِ خدا میں جان دیتے وقت حاصل ہوتا ہے۔

۱۲۲ – جنگِ اُحُد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دُور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اُسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھیر کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینے پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمّت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگِ اُحُد کے دوسرے ہی دن آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا، مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جان نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے، جو مدینے سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انھی فدا کاروں کی طرف ہے۔

۱۲۳ – یہ چند آیات جنگِ اُحُد کے ایک سال بعد نازل ہوئی تھیں، مگر چونکہ ان کا تعلق اُحُد ہی کے سلسلہ

لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَظِيْمٍ (۱۷۴) اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ
وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۷۵) وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ
يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ

ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شَرَف بھی انھیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آیندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان[۱۲۴] ہو۔

(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دَوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ

واقعات سے تھا، اس لیے ان کو بھی اس خطبے میں شامل کر دیا گیا۔

[۱۲۴] اُحُد سے پلٹتے ہوئے ابوسُفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آیندہ سال بَدر میں ہمارا تمھارا پھر مقابلہ ہوگا۔ مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمّت نے جواب دے دیا، کیونکہ اُس سال مکّے میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلے پر نہ آنے کی ذمّہ داری انھی پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بَدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخرکار اللہ کے رسولؐ نے بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵ سو فدا کار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپؐ انھی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ اُدھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیّت لے کر چلا مگر دو روز کی مُسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، آیندہ سال آئیں گے۔ چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی واپس ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے اور اس دَوران میں آپؐ کے ساتھیوں نے

أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ج وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾
إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ج
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا
نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ط إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ج
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٧٨﴾ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ
عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ط وَمَا
كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن

اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں، وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، اُن کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں، اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر اُن کے لیے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔[۱۲۵] وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مُطّلع کر دے۔[۱۲۶] غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسُولوں میں سے جس کو چاہتا ہے

ایک تجارتی قافلے سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اُٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہوگئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

۱۲۵ – یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہلِ ایمان اور منافق، سب خلط ملط رہیں۔

۱۲۶ – یعنی مومن و منافق کی تمیز نمایاں کرنے کے لیے اللہ یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کرتا کہ غیب سے مسلمانوں کو

رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ
تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع لَقَدْ ع ۱۸
سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ وقف لازم

منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (اُمورِ غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں، وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے[۱۲۷] اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ ع

اللہ نے اُن لوگوں کا قول سُنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[۱۲۸]۔ ان کی

دلوں کا حال بتا دے کہ فلاں مومن ہے اور فلاں منافق، بلکہ اس کے حکم سے ایسے امتحان کے مواقع پیش آئیں گے جن میں تجربے سے مومن اور منافق کا حال کُھل جائے گا۔

[۱۲۷] یعنی زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے، وہ دراصل اللہ کی مِلک ہے اور اس پر مخلوق کا قبضہ و تصرّف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہر حال بے دخل ہونا ہے اور آخرکار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانے والا ہے۔ لہٰذا عقل مند ہے وہ جو اس عارضی قبضے کے دَوران میں اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے۔ اور سخت بے وقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ
ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ
اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ
النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے، اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلے کا وقت آئے گا اُس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذابِ جہنّم کا مزا چکھو، یہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں: ”اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آ کر) آگ کھا لے“، اُن سے کہو: ”تمھارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے[129] کے لیے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو اُن رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟“

۱۲۸– یہ یہودیوں کا قول تھا۔ قرآنِ مجید میں جب یہ آیت آئی کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا، ”کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے“، تو اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے یہودیوں نے کہنا شروع کیا کہ جی ہاں، اللہ میاں مفلس ہو گئے ہیں، اب وہ بندوں سے قرض مانگ رہے ہیں۔

۱۲۹– بائبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی۔ (قُضاۃ ۶: ۲۰–۲۱ و ۱۳: ۱۹–۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائبل میں آتا ہے

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا
تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ
الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾
لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ قف وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ

اب اے محمدؐ! اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھُلی کھُلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔ آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پُورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنّت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دُنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔[۱۳۰]

مسلمانو! تمھیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آ کر رہیں گی، اور تم اہلِ کتاب

کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آ کر اُسے کھا لیتی تھی۔ (احبار ۹: ۲۴۔ ۲۔ تواریخ ۷: ۱-۲) لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی کوئی ضروری علامت ہے، یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو، وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کر لیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیائے بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے آتشیں قربانی کا یہ معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاسؑ (ایلیاہ تشبی) کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے بَعل کے پُجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمعِ عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو اور ایک کی قربانی میں کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھا لے وہی حق پر ہے۔ چنانچہ ایک خلقِ کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاسؑ کی قربانی کھائی۔ لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بَعل پرست ملکہ حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی، اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر اُن کے قتل کے درپے ہوا اور ان کو مجبوراً مُلک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ (۱-سلاطین، باب ۱۸ و ۱۹)

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَاِذْ
اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ

اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سُنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو[131] تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اِن اہلِ کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہو گا، انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں[132] ہو گا۔ مگر انھوں نے کتاب کو پسِ پُشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر

اسی بنا پر ارشاد ہُوا ہے کہ حق کے دشمنو! تم کس مُنہ سے آتشیں قربانی کا معجزہ مانگتے ہو؟ جن پیغمبروں نے یہ معجزہ دکھایا تھا، انھی کے قتل سے تم کب باز رہے۔

۱۳۰ – یعنی اس دنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں، انھی کو اگر کوئی شخص اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور اُنھی پر حق و باطل اور فلاح و خُسران کے فیصلے کا مدار رکھے تو درحقیقت وہ سخت دھوکے میں مُبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر بھی ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قُبولیّت بھی حاصل ہے۔ اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردود بارگاہِ الٰہی ہے۔ اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلے کے نتائج اُن آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ اَبدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں۔ اور اصل اعتبار اُنھی نتائج کا ہے۔

۱۳۱ – یعنی اُن کے طعن و تشنیع، اُن کے الزامات، اُن کے بے ہُودہ طرزِ کلام اور اُن کی جھوٹی نشر و اشاعت کے مقابلے میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اُتر آؤ جو صداقت و انصاف، وقار و تہذیب اور اَخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں۔

۱۳۲ – یعنی انھیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی، مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کے سُپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمتِ عُظمیٰ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔

یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائبل میں آتا ہے۔ خُصوصاً کتابِ اِستثنا میں حضرت موسیٰؑ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے، اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں، اُنھیں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (۱۸۷) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸۸) وَ
لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ (۱۸۹) ع
اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

ع ۱۹ ۱۰

اُسے بیچ ڈالا۔ کتنا بُرا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف اُنھیں حاصل ہو جو فی الواقع انھوں نے نہیں کیے ہیں[۱۳۳]۔ حقیقت میں ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ زمین اور آسمان کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ ع

زمین[۱۳۴] اور آسمانوں کی پیدایش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں

اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آیندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے، ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا۔ (۶: ۴-۹) پھر اپنی آخری وصیت میں انھوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہِ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام ان پر کَندہ کر دینا۔ (۲۷: ۲-۴) نیز بنی لاوِی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عیدِ خیام کے موقع پر قوم کے مَردوں، عورتوں، بچّوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پُوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰؑ کے سات سو برس بعد ہیکلِ سلیمانی کے سجادہ نشین، اور یروشلم کے یہودی فرماں رواتک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲-سلاطین ۲۲: ۸-۱۳)

۱۳۳ – مثلاً وہ اپنی تعریف میں یہ سُننا چاہتے ہیں کہ حضرت بڑے متقی ہیں، دین دار اور پارسا ہیں، خادمِ دین ہیں، حامیِ شرعِ متین ہیں، مُصلح و مُزکّی ہیں، حالانکہ حضرت کچھ بھی نہیں۔ یا اپنے حق میں یہ ڈھنڈورا پٹوانا چاہتے ہیں کہ فُلاں صاحب بڑے ایثار پیشہ اور مخلص اور دیانت دار رہنما ہیں اور انھوں نے ملّت کی بڑی خدمت کی ہے، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

۱۳۴ – یہ خاتمۂ کلام ہے۔ اس کا ربط اُوپر کی قریبی آیات میں نہیں بلکہ پوری سورت میں تلاش کرنا چاہیے۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا
وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾
رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ
اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ

اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں[۱۳۵]۔ (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں:) ”پروردگار! یہ سب کچھ تُو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تُو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے[۱۳۶]۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، تُو نے جسے دوزخ میں ڈالا، اسے درحقیقت بڑی ذلّت و رُسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ مالک! ہم نے ایک پُکارنے والے کو سُنا جو ایمان کی طرف بُلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی[۱۳۷]، پس اے ہمارے آقا! جو قصُور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو بُرائیاں

اس کو سمجھنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ سُورت کی تمہید کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۳۵ – یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو، اور آثارِ کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے۔

۱۳۶ – جب وہ نظامِ کائنات کا بغور مُشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کُھل جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حِس پیدا کی ہو، جسے تصرُّف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو، اُس سے اُس کی حیاتِ دنیا کے اعمال پر باز پُرس نہ ہو، اور اسے نیکی

عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

ہم میں ہیں انھیں دُور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا! جو وعدے تُو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کیے ہیں، اُن کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رُسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔[۱۳۸]“

جواب میں ان کے رب نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دُوسرے کے ہم جنس ہو۔[۱۳۹] لٰہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے، اُن کے سب قصور میں

پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظامِ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اُنھیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

۱۳۷۔ اِسی طرح یہی مشاہدہ اُن کو اس بات پر بھی مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں، وہ سراسر حق ہے۔

۱۳۸۔ یعنی انھیں اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردُّد اس امر میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا مصداق ہمیں بنا دے اور ہمارے ساتھ انھیں پورا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پر ایمان لا کر کُفّار کی تضحیک اور طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں، قیامت میں بھی اِن کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو اور وہ ہم پر پھبتی کسیں کہ ایمان لا کر بھی اِن کا بھلا نہ ہوا۔

عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ
الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِى
الۡبِلَادِؕ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ قف ثُمَّ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُؕ وَبِئۡسَ
الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰـكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ
تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ
اللّٰهِؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ ع
الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَمَاۤ

معاف کردوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اُن کی جزا ہے اللہ کے ہاں، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔[۱۴۰]“

اے نبیؐ! دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چندروزہ زندگی کا تھوڑا سا لُطف ہے، پھر یہ سب جہنّم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے ان کے لیے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف بھیجی گئی ہے اور

۱۳۹– یعنی تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے ہاں یہ دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اُونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اُصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔

۱۴۰– روایت ہے کہ بعض غیر مسلم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰؑ عصا اور یدِ بیضا لائے

أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹۹ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا
وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰ ع

اُس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جُھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چُکانے میں دیر نہیں لگاتا۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ[۱۴۱]، حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ ع

تھے۔ عیسیٰؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے۔ دوسرے پیغمبر بھی کچھ نہ کچھ معجزے لائے تھے۔ آپؐ فرمائیں کہ آپؐ کیا لائے ہیں؟ اس پر آپؐ نے اس رُکوع کے آغاز سے یہاں تک کی آیات تلاوت فرمائیں اور ان سے کہا: میں تو یہ لایا ہوں۔

۱۴۱ – اصل عربی متن میں صَابِرُوْا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، یہ کہ کفار اپنے کفر پر جو مضبوطی دکھا رہے ہیں اور اس کو سربلند رکھنے کے لیے جو زحمتیں اُٹھا رہے ہیں، تم ان کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔ دُوسرے، یہ کہ ان کے مقابلے میں ایک دُوسرے سے بڑھ کر پامردی دکھاؤ۔

تفہیم القرآن

النِّسَآء

(۴)

النِّسَآء

زمانۂ نُزُول اور اجزائے مضمون یہ سُورہ متعدد خُطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ہجری کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعیّن کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔

مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حُقوق کے متعلق ہدایات جنگِ اُحُد کے بعد نازل ہوئی تھیں جب کہ مسلمانوں کے ستّر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینے کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شُہَدا کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انھوں نے چھوڑے ہیں، اُن کے مفاد کا تحفّظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں گی۔

روایات میں صلوٰۃِ خوف (عین حالتِ جنگ میں نماز پڑھنے) کا ذکر ہمیں غزوۂ ذات الرّقاع میں ملتا ہے جو ۴ ہجری میں ہوا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے لگ بھگ زمانے میں وہ خطبہ نازل ہوا ہو گا جس میں اس نماز کی ترکیب بیان کی گئی ہے۔ (رکوع ۱۵)

مدینہ سے بنی نَضِیر کا اخراج رَبیع الاوّل ۴ ہجری میں ہوا، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ وہ خطبہ اس سے پہلے قریبی زمانے ہی میں نازل ہوا ہو گا جس میں یہودیوں کو آخری تنبیہ کی گئی ہے کہ ”ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں۔“

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کی اجازت غزوۂ بنی المُصْطَلِق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ خطبہ جس میں تیمّم کا ذکر ہے اسی سے متّصل عہد کا سمجھنا چاہیے۔ (رکوع ۷)

شانِ نُزُول اور مَباحِث اِس طرح بحیثیتِ مجموعی سورت کا زمانۂ نزول معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں اس زمانے کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے، تاکہ سُورہ کے مضامین سمجھنے میں اس سے مدد

لی جا سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو کام تھا، اُسے تین بڑے بڑے شعبوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک اُس نئی مُنظّم اسلامی سوسائٹی کا نشوونما جس کی بِنا ہجرت کے ساتھ ہی مدینۂ طیّبہ اور اس کے اطراف و جوانب میں پڑ چکی تھی اور جس میں جاہلیت کے پرانے طریقوں کو مٹا کر اَخلاق، تمدّن، معاشرت، معیشت اور تدبیرِ مملکت کے نئے اُصول رائج کیے جا رہے تھے۔ دوسرے، اُس کش مکش کا مقابلہ جو مشرکینِ عرب، یہودی قبائل اور منافقین کی مخالفِ اصلاح طاقتوں کے ساتھ پوری شدّت سے جاری تھی۔ تیسرے، اسلام کی دعوت کو اِن مزاحم طاقتوں کے عَلَی الرَّغم پھیلانا اور مزید دلوں اور دماغوں کو مسخّر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس موقع پر جتنے خطبے نازل کیے گئے وہ سب انھی تین شعبوں سے متعلّق ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے اِن خُطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح دُرست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اُصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلّقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حُقوق معیّن کیے گئے۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ مَعاشی معاملات کی دُرستی کے متعلّق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بِنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرزِ عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم وضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلّق ہدایات دی گئیں۔ اہلِ کتاب کے اَخلاقی و مذہبی رَویّے پر تبصرہ کرکے مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا گیا کہ اپنی اِن پیش رَو اُمّتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرزِ عمل پر تنقید کرکے سچی ایمان داری کے مقتضیات واضح کیے گئے، اور ایمان و نِفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کرکے رکھ دیا گیا۔

مخالفِ اصلاح طاقتوں سے جو کش مکش برپا تھی اُس نے جنگِ اُحُد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ اُحُد کی شکست نے اطراف ونواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمّتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گِھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُرجوش خطبوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے اُبھارا، اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انھیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینے میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے، اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کر لیں، اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سَرِیّوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو، دونوں کے بجائے تیمم کر لیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو، وہاں صلوٰۃِ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے، ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کُن تھا۔ اِس مسئلے میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور دوسری طرف اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا، تاکہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دار الاسلام میں آجائیں۔

یہودیوں میں سے بنی نَضِیر کا رَوِیّہ خُصُوصیّت کے ساتھ نہایت مُعانِدانہ ہو گیا تھا اور وہ مُعاہَدات کی صریح خلاف ورزی کر کے کُھلّم کُھلّا دشمنانِ اسلام کا ساتھ دے رہے تھے اور خود مدینے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی جماعت کے خلاف سازشوں کے جال بچھا رہے تھے۔ ان کی اس رَوِش پر سخت گرفت کی گئی اور انھیں صاف الفاظ میں آخری تنبیہ کر دی گئی۔ اس کے بعد ہی مدینے سے اُن کا اخراج عمل میں آیا۔

منافقین کے مختلف گروہ مختلف طرزِ عمل رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس قسم کے منافقوں سے کیا معاملہ کریں۔ ان سب کو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر کے ہر طبقے کے منافقوں کے متعلق بتا دیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ہونا چاہیے۔

غیر جانب دار معاہد قبائل کے ساتھ جو رَوِیّہ مسلمانوں کا ہونا چاہیے تھا، اس کو بھی واضح کیا گیا۔

سب سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ مسلمان کا اپنا کریکٹر بے داغ ہو، کیونکہ اس کش مکش میں یہ مٹھی بھر جماعت اگر جیت سکتی تھی تو اپنے اخلاقِ فاضلہ ہی کے زور سے جیت سکتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو بلند ترین اخلاقیات کی تعلیم دی گئی اور جو کمزوری بھی ان کی جماعت میں ظاہر ہوئی اس پر سخت گرفت کی گئی۔

دعوت و تبلیغ کا پہلو بھی اس سُورہ میں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ جاہلیت کے مقابلے میں اسلام جس اَخلاقی و تمدّنی اصلاح کی طرف دنیا کو بُلا رہا تھا، اس کی توضیح کرنے کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین، تینوں گروہوں کے غلط مذہبی تصوّرات اور غلط اخلاق و اعمال پر اس سُورہ میں تنقید کر کے ان کو دینِ حق کی طرف دعوت دی گئی ہے۔

آیاتها ۱۷۶

رکوعاتها ۲۴

سُورَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ
وَّخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِہٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ
رَقِیۡبًا ① وَاٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دُنیا میں پھیلا دیے[1]۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دُوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ و قرابت کے تعلّقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔

یتیموں کے مال اُن کو واپس دو[2]، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو[3]،

۱۔ چونکہ آگے چل کر انسانوں کے باہمی حُقوق بیان کرنے ہیں اور خُصوصیّت کے ساتھ خاندانی نظام کی بہتری و استواری کے لیے ضروری قوانین ارشاد فرمائے جانے والے ہیں، اس لیے تمہید اس طرح اُٹھائی گئی کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی تاکید کی، اور دُوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی کہ تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت پوست ہیں۔

”تم کو ایک جان سے پیدا کیا“، یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے کی۔ دوسری جگہ قرآن خود اس کی تشریح کرتا ہے کہ وہ پہلا انسان آدمؑ تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی۔

”اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا“، اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جو بات اہلِ تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمؑ کی پسلی سے حوّا کو پیدا کیا گیا (تَلمُود میں اَور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوّا کو حضرت آدم علیہ السّلام کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا)۔ لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اس کی تائید میں پیش کی جاتی ہے، اس کا مفہُوم وہ نہیں ہے جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مُجمل رہنے دیا

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ②
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ
النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا

اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو[۴] لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ اُن کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو

جائے جس طرح اللہ نے اسے مُجمَل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعیّن کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔

۲- یعنی جب تک وہ بچے ہیں، اُن کے مال اُنھی کے مفاد پر خرچ کرو، اور جب بڑے ہو جائیں تو جو اُن کا حق ہے وہ انھیں واپس کر دو۔

۳- جامع فقرہ ہے، جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کے بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل لو۔

۴- اس کے تین مفہوم اہلِ تفسیر نے بیان کیے ہیں:

(۱) حضرت عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں، اُن کے مال اور اُن کے حسن و جمال کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر اُن پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمھیں پسند آئیں، اُن کے ساتھ نکاح کر لو۔ اسی سورت میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

(۲) ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگرد عِکرِمہؒ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ اور جب اس کثرتِ اِزْدواج سے مَصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حُقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جُبیر اور قَتادہ اور بعض دوسرے مفسّرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے، اہلِ جاہلیّت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں اُن کے ذہن عدل و انصاف کے

فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳ۭ

پھر ایک ہی بیوی کرو،[5] یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمھارے قبضے میں آئی ہیں،[6] بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

تصوُّر سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر اُن کے ساتھ ظلم و جَور سے پیش آتے تھے۔ اِس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اوّل تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو، اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے مُتحمِل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو اُن عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں۔

۵- اس بات پر فقہائے اُمّت کا اجماع ہے کہ اس آیت کی رُو سے تعدُّدِ ازواج کو محدود کیا گیا ہے اور بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔ روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ طائف کا رئیس غَیلان جب اسلام لایا تو اس کی نو۹ بیویاں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ چار بیویاں رکھ لے اور باقی کو چھوڑ دے۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص (نَوفَل بن معاویہ) کی پانچ بیویاں تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ان میں سے ایک کو چھوڑ دے۔

نیز یہ آیت تعدُّدِ ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پُوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ اللہ کے ساتھ دغابازی کرتا ہے۔ حکومتِ اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو اُن کی داد رسی کریں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیّت زدہ رائے سے مغلوب و مَرعُوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد تعدُّدِ ازواج کے طریقے کو (جو مغربی نقطۂ نظر سے فی الاصل بُرا طریقہ ہے) مٹا دینا تھا، مگر چونکہ یہ طریقہ بہت زیادہ رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعدُّدِ ازواج کا فی نفسہٖ ایک برائی ہونا بجائے خود ناقابلِ تسلیم ہے، کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدُّنی اور اَخلاقی ضرورت بن جاتی ہے۔ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے، حِصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں، جس کے نقصانات تمدّن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعدُّدِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اِسی لیے قرآن نے اُن لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں۔ تاہم جن لوگوں کے نزدیک تعدُّدِ ازواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے، اُن کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مذمّت کریں اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ حق انھیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗئًا مَّرِيْۗئًا ④ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤

اور عورتوں کے مَہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو، البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مَہر کا کوئی حصّہ تمھیں معاف کر دیں تو اُسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔[۷]

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔[۸]

کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کو جائز ٹھیرایا ہے اور اشارتاً و کنایتاً بھی اس کی مذمّت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو میری کتاب ”سُنّت کی آئینی حیثیت“، ص ۳۰۷ تا ۳۱۶)

۶ – لونڈیاں مراد ہیں، یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بار بھی برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو، جیسا کہ رکوع ۴ میں آگے آتا ہے۔ یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمھیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان عدل رکھنا تمھارے لیے مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رُجوع کرو، کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمّہ داریوں کا بار نسبتاً کم پڑے گا۔ (آگے حاشیہ ۴۴ میں لونڈیوں کے متعلّق احکام کی مزید تفصیل ملے گی)۔

۷ – حضرت عمرؓ اور قاضی شُریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پُورا مَہر یا اس کا کوئی حصّہ معاف کر دیا ہو اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کے ادا کرنے پر مجبُور کیا جائے گا، کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے مَہر یا اس کا کوئی حصّہ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: ”حُقوق الزّوجین“ عنوان ”مہر“)

۸ – یہ آیت وسیع معنیٰ کی حامل ہے۔ اس میں اُمّت کو یہ جامع ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مال جو ذریعۂ قیامِ زندگی ہے، بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرُّف میں نہ رہنا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدُّن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حُقوقِ مِلکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں، اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور ان کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کیے جا سکیں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلّق ہے، وہ تو ضرور پوری ہونی چاہییں، لیکن جہاں تک حقوقِ مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلّق ہے، اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ

اور یتیموں کی آزمایش کرتے رہو، یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔[9] پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیّت پاؤ تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو۔[10] ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِّ انصاف سے تجاوُز کر کے اِس خوف سے اُن کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو، وہ پرہیزگاری سے کام لے

استعمال اخلاق وتمدُّن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مُضِر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے، وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرُّف کے اہل نہ ہوں، یا جو لوگ اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں، ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے لے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے۔

[9] یعنی جب وہ سِنِ بُلوغ کے قریب پہنچ رہے ہوں تو دیکھتے رہو کہ ان کا عقلی نَشْوونَما کیسا ہے اور ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمّہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہو رہی ہے۔

[10] مال ان کے حوالے کرنے کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں: ایک بلوغ، دوسرے رُشد، یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیّت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے اُمّت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سِنِ بُلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رُشد نہ پایا جائے تو ولیِ یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رُشد پایا جائے یا نہ پایا جائے، اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابو یُوسُف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالے کیے جانے کے لیے بہرحال رُشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ غالباً مؤخَّر الذکر حضرات کی رائے کے مطابق یہ بات زیادہ قرینِ صواب ہوگی کہ اس معاملے میں قاضیِ شرع کی طرف رُجوع کیا جائے اور اگر قاضی پر ثابت ہو جائے کہ اس میں رُشد نہیں پایا جاتا تو وہ اس کے معاملات کی نگرانی کے لیے خود کوئی مناسب انتظام کر دے۔

وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ
اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿٦﴾
لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ
لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ
مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿٧﴾ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ
اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ

اور جو غریب ہو، وہ معروف طریقے سے کھائے[۱۱]۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنالو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

مَردوں کے لیے اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اُس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت[۱۲]، اور یہ حصّہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو

---

۱۱ – یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانب دار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے۔ نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے، چوری چُھپے نہ لے، بلکہ علانیہ متعیّن کر کے لے اور اس کا حساب رکھے۔

۱۲ – اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک، یہ کہ میراث صرف مَردوں ہی کا حصّہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے، یہ کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے، خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتّٰی کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصّوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اَور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصّہ خرید لے۔ تیسرے، اس آیت سے یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال و املاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی، یا کسی اور صنفِ مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ مرا ہو۔ پانچویں، اِس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ
خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ص فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا
قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا
اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ط وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ ع ۱ ۱۰ ۱۲
يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ق لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ج

اور اُن کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو[۱۳]۔

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچّوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں[۱۴] گے۔ ع

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ:

مرد کا حصّہ دو عورتوں کے برابر ہے[۱۵]۔

---

[۱۳] – خطاب میّت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبے کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں، ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں ازرُوئے شرع اُن کا حصّہ نہیں ہے تو نہ سہی، وُسعتِ قلب سے کام لے کر ترکے میں سے اُن کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعُموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔

[۱۴] – حدیث میں آیا ہے کہ جنگِ اُحُد کے بعد حضرت سعدؓ بن ربیع کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ "یارسولؐ اللہ! یہ سعد کی بچّیاں ہیں جو آپؐ کے ساتھ اُحُد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا ہے۔

فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ
وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ
مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ
اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ

اگر (میّت کی وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔[16]

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصّہ ملنا چاہیے۔[17]

اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصّہ دیا جائے۔[18]

اور اگر میّت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصّے کی حق دار ہوگی۔[19]

اب بھلا ان بچّیوں سے کون نکاح کرے گا۔'' اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

۱۵ – میراث کے معاملے میں یہ اوّلین اُصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصّہ عورت سے دوگُنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمّہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بارے سبکدوش رکھا ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصّہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

۱۶ – یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کُل ترکے کا $\frac{2}{3}$ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا، اور باقی $\frac{1}{3}$ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میّت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کُل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اُسے ملے گا۔

۱۷ – یعنی میت کے صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں بہرحال میت کے والدین میں سے ہر ایک $\frac{1}{6}$ کا

مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ
اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا

یہ سب حصّے اُس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیّت جو میّت نے کی ہو پُوری کر دی جائے اور قرض جو اُس پر ہو ادا کر دیا جائے۔[۲۰] تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصّے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف

حق دار ہوگا۔ خواہ میّت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی۔ رہے باقی $\frac{2}{3}$، تو ان میں دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۸ – ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی $\frac{2}{3}$ باپ کو ملے گا۔ ورنہ $\frac{2}{3}$ میں باپ اور دُوسرے وارث شریک ہوں گے۔

۱۹ – بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ کے بجائے $\frac{1}{6}$ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے حصّے میں سے جو $\frac{1}{6}$ لیا گیا ہے، وہ باپ کے حصّے میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس صُورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میّت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصّہ نہیں پہنچتا۔

۲۰ – وصیّت کا ذکر قرض پر مقدّم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیّت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ یعنی اگر میّت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میّت کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیّت پوری کی جائے گی، اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وصیّت کے متعلق سُورۂ بقرہ حاشیہ نمبر ۱۸۲ میں ہم بتا چکے ہیں کہ آدمی اپنے کُل مال کے $\frac{1}{3}$ حصّے کی حد تک وصیّت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیّت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو، اس کے لیے اپنے اختیارِ تمیزی سے حصّہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیّت کے ذریعے سے حصّہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صَرف کرنے کے لیے وصیّت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کُل ملکیّت میں سے $\frac{2}{3}$ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے، جس میں سے شریعت کے

حَكِيۡمًا ﴿۱۱﴾ وَلَكُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ اَزۡوَاجُكُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ
لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡنَ مِنۡۢ
بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا
تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ

اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے[۲۱]۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصّہ تمھیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صُورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصّہ تمھارا ہے جب کہ وصیّت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحبِ اولاد ہونے کی صُورت میں اُن کا حصّہ آٹھواں[۲۲] ہو گا، بعد اس کے کہ جو وصیّت تم نے کی ہو وہ پُوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

نامزد کردہ وارثوں کو مقرّرہ حصّہ ملے گا۔ اور $\frac{۱}{۳}$ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملے میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے، تقسیم کرنے کی وصیّت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے، یا بالفاظِ دیگر، اپنے اختیارِ تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حُقوق متاثّر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارۂ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضا مندی سے اس کی اصلاح کر لیں، یا قاضیِ شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیّت کو دُرست کر دے۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو میرا رسالہ ”یتیم پوتے کی وراثت“)

۲۱ – یہ جواب ہے اُن سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

۲۲ – یعنی خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ $\frac{۱}{۸}$ کی، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں $\frac{۱}{۴}$ کی حصّہ دار ہوں گی، اور یہ $\frac{۱}{۴}$ یا $\frac{۱}{۸}$ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو، تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کُل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں[۲۳] گے، جب کہ وصیّت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میّت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو[۲۴]۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا

---

۲۳ - باقی ۵/۶ یا ۲/۳ جو بچتے ہیں، ان میں اگر کوئی اور وارث موجود ہو تو اس کو حصّہ ملے گا، ورنہ اس پُوری باقی ماندہ مِلکیّت کے متعلّق اس شخص کو وصیت کرنے کا حق ہوگا۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مُراد اَخیافی بھائی اور بہن ہیں، یعنی جو میّت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میّت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں، تو ان کا حکم اِسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہُوا ہے۔

۲۴ - وصیّت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حُقوق تلف ہوتے ہوں۔ اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حق داروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اُوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضِرار کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہلِ جنّت کے سے کام کرتا رہتا ہے، مگر مرتے وقت وصیّت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتابِ زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اُسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ یہ ضِرار اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کَلالہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں، اس میں عُموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور

حَلِيْمٌ ؕ ⑫ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑬ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ
حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ع ⑭ ۲ ع۴ ۱۳

اور نرم خُو ہے۔[۲۵]

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اُسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسُولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اُسے اللہ آگ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رُسوا کُن سزا ہے۔[۲۵ الف] ع

نسبتاً دُور کے رشتہ داروں کو حصّہ پانے سے محروم کر دے۔

۲۵ – یہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک، یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا۔ دوسرے، یہ کہ اللہ نے جو حصّے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں، کیونکہ بندوں کی مَصلَحت جس چیز میں ہے، اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفتِ حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے، بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے، تاکہ وہ مَشقّت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

۲۵، الف – یہ ایک بڑی خوف ناک آیت ہے جس میں اُن لوگوں کو ہیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں، یا اُن دُوسری قانونی حدوں کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے معاملے میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں، وہ خدا کے خلاف کُھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا۔ کہیں

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ
حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾
وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں، اُن پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں، اُن دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۲۶]۔

صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیرایا گیا۔ کہیں سرے سے تقسیم میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ’’مشترک خاندانی جائداد‘‘ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مردوں کا حصّہ برابر کر دیا گیا۔ اور اب ان پُرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہلِ مغرب کی تقلید میں ’’وفات ٹیکس‘‘ (death duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ میّت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصّہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے! حالانکہ اسلامی اُصول پر اگر میّت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیائے متروکہ (unclaimed properties) کی طرح داخلِ بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصّہ پا سکتی ہے جب کہ مرنے والا اپنی وصیت میں اس کے لیے کوئی حصہ مقرر کر جائے۔

[۲۶] – ان دونوں آیتوں میں زِنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلّق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تاحکمِ ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیّت دی جائے، یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سُست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ
السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قُبولیّت کا حق انھی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجّہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی۔

متعلّق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سُورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہلِ عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانونِ تعزیرات بنا کر دفعتاً ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خُوگر بنانے کے لیے پہلے زِنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زِنا، قَذف اور سَرقہ کی حدیں مقرر کیں، اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصّل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

مفسر سُدِّی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لیے ہے اور دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں۔ اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور مرد کے ناجائز تعلّق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون و اَخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور اُنھی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلامِ شاہانہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے۔

وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ۝١٨ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْھُنَّ

اور اسی طرح توبہ اُن کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔[۲۷]

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔[۲۸] اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اُس مَہر کا کچھ حصّہ اُڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلق پر کیا سزا دی جائے تو صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سُورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔

۲۷ – توبہ کے معنٰی پلٹنے اور رُجوع کرنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنٰی رکھتا ہے کہ ایک غلام، جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا، اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ آیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنٰی رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظرِ عنایت جو پھر گئی تھی، وہ ازسرِ نَو اس کی طرف مُنعطف ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ میرے ہاں معافی صرف اُن بندوں کے لیے ہے جو قصداً نہیں بلکہ نادانی کی بنا پر قصور کرتے ہیں، اور جب آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ایسے بندے جب بھی اپنی غلطی پر نادم ہو کر اپنے آقا کی طرف پلٹیں گے، اس کا دروازہ کُھلا پائیں گے کہ ؎

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

مگر توبہ اُن کے لیے نہیں ہے جو اپنے خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ کیے چلے جائیں اور پھر عین اُس وقت جب کہ موت کا فرشتہ سامنے کھڑا ہو، معافی مانگنے لگیں۔ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ ان اللّٰہ یقبل توبۃ العبد ما لم یُغرغِر۔ ” اللہ بندے کی توبہ بس اُسی وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ آثارِ موت شروع نہ ہوں۔“ کیونکہ امتحان کی مہلت جب پُوری ہو گئی اور کتابِ زندگی ختم ہو چکی تو اب پلٹنے کا کون سا موقع ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کفر کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جائے اور دُوسری زندگی کی

إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲ وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ

ہاں اگر وہ کسی صریح بد چلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے[۲۹])۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اُسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو[۳۰]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دُوسری بیوی لے آنے کا ارادہ

سرحد میں داخل ہو کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ معاملہ اُس کے برعکس ہے جو وہ دنیا میں سمجھتا رہا تو اس وقت معافی مانگنے کا کوئی موقع نہیں۔

۲۸ – اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میّت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ عورت کا شوہر جب مر گیا تو وہ آزاد ہے۔ عدّت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

۲۹ – مال اڑانے کے لیے نہیں بلکہ بد چلنی کی سزا دینے کے لیے۔

۳۰ – یعنی اگر عورت خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور ایسا نَقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے، تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتّی الامکان اسے صبر و تحمُّل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوب صورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اِزْدِواجی زندگی میں حُسنِ صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اُسے اپنی اُن خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اِزْدِواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے، تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی بُرائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اِزْدِواجی تعلّق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق، یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے، مگر تمام جائز کاموں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ

زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ
اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ
اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾
وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ

ہی کر لو تو خواہ تم نے اُسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔ کیا تم اُسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے؟ اور آخر تم اُسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لُطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں؟[۳۱]

اور جن عورتوں سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں اُن سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔[۳۲]

آپؐ نے فرمایا: تزوجوا ولا تطلقوا فان اللّٰہ لا یحب الذواقین والذواقات، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ ایسے مَردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔

۳۱- پختہ عہد سے مراد نکاح ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیانِ وفا ہے، جس کے استحکام پر بھروسا کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اسے وہ معاوضہ واپس لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۵۱)

۳۲- تمدّنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے بالعُموم قرآنِ مجید میں یہ بات ضرور فرمائی جاتی ہے کہ ”جو ہو چکا سو ہو چکا“۔ اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ بے علمی اور نادانی کے زمانے میں جو غَلَطیاں تم لوگ کرتے رہے ہو، ان پر گرفت نہیں کی جائے گی، بشرطیکہ اب حکم آ جانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو اور جو غلط کام ہیں انھیں چھوڑ دو۔ دوسرے، یہ کہ زمانہ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام ٹھیرایا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم و رواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعَدم، اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز، اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو آج حرام کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے، ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حقِ وراثت ساقط کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح اگر لین دین کے کسی طریقے کو

۲ ع۸ ۱۳ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ع حُرِّمَتْ
عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ

درحقیقت یہ ایک بے حیائی کا فعل ہے، ناپسندیدہ ہے اور بُرا چلن ہے[۳۳] ع

تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں[۳۴]، بیٹیاں[۳۵]، بہنیں[۳۶]، پھوپھیاں، خالائیں،

حرام کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے جتنے معاملات اس طریقے پر ہوئے ہیں، انھیں بھی کالعدم ٹھیرا دیا گیا ہے اور اب وہ سب دولت جو اس طریقے سے کسی نے کمائی ہو اس سے واپس لی جائے گی یا مالِ حرام ٹھیرائی جائے گی۔

۳۳- اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جُرم ہے اور قابلِ دست اندازیِ پولیس ہے۔ ابوداؤد، نَسائی اور مُسندِ احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو موت اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی ہے۔ اور ابنِ ماجہ نے ابنِ عباسؓ سے جو روایت نقل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ قاعدۂ کُلّیہ ارشاد فرمایا تھا کہ من وقع علی ذات محرم فاقتلوہ۔ ”جو شخص مُحرّمات میں سے کسی کے ساتھ زِنا کرے اُسے قتل کر دو۔“ فقہا کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے مُحرّمات میں سے کسی کے ساتھ زِنا کیا ہو تو اس پر حدِّ زنا جاری ہوگی، اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔

۳۴- ماں کا اطلاق سگی اور سوتیلی، دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اس لیے دونوں حرام ہیں۔ نیز اسی حکم میں باپ کی ماں اور ماں کی ماں بھی شامل ہے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سَلَف میں سے بعض اس کی حُرمت کے قائل نہیں ہیں، اور بعض اسے بھی حرام قرار دیتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک جس عورت کو باپ نے شہوَت سے ہاتھ لگایا ہو، وہ بھی بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح سَلَف میں اس امر پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو، وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں۔ اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق رہا ہو یا بعد میں ہو جائے، اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ اس باب میں فقیہانہ بحثیں بہت طویل ہیں، مگر یہ بات بادنیٰ تأمُّل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی عورت کا ہونا جس پر اس کا باپ یا اس کا بیٹا بھی نظر رکھتا ہو، یا جس کی ماں یا بیٹی پر بھی اس کی نگاہ ہو، ایک صالح معاشرت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ شریعتِ الٰہی کا مزاج اس معاملے میں اُن قانونی مُوشگافیوں کو قبول نہیں کرتا جن کی بنا پر نکاح اور غیرِ نکاح اور قبلِ نکاح اور بعدِ نکاح اور لمس اور نظر وغیرہ میں فرق کیا جاتا ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ خاندانی

وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ
وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ

بھتیجیاں، بھانجیاں[۳۷]، اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دُودھ پلایا ہو، اور تمھاری دُودھ شریک بہنیں[۳۸]، اور تمھاری بیویوں کی مائیں[۳۹]، اور تمھاری بیویوں کی لڑکیاں جنھوں نے

زندگی میں ایک ہی عورت کے ساتھ باپ اور بیٹے کے، یا ایک ہی مرد کے ساتھ ماں اور بیٹی کے شہوانی جذبات کا وابستہ ہونا سخت مفاسد کا موجب ہے اور شریعت اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من نظر الی فرج امرأۃ حرمت علیه امها و ابنتها۔ ”جس شخص نے کسی عورت کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالی ہو، اُس کی ماں اور بیٹی دونوں اُس پر حرام ہیں۔“ اور لا ینظر اللّٰہ الی رجل نظر الی فرج امرأۃ وابنتها۔ ”خدا اس شخص کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا جو بیک وقت ماں اور بیٹی دونوں کے اعضائے صنفی پر نظر ڈالے۔“ ان روایات سے شریعت کا منشا صاف واضح ہو جاتا ہے۔

۳۵- بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلّقات کے نتیجے میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حَنبل رحمہم اللہ کے نزدیک وہ بھی جائز بیٹی کی طرف مُحرّمات میں سے ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ محرّمات میں سے نہیں ہے۔ مگر درحقیقت یہ تصوّر بھی ذوقِ سلیم پر بار ہے کہ جس لڑکی کے متعلّق آدمی یہ جانتا ہو کہ وہ اسی کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے، اس کے ساتھ نکاح کرنا اس کے لیے جائز ہو۔

۳۶- سگی بہن اور ماں شریک بہن اور باپ شریک بہن، تینوں اس حکم میں یکساں ہیں۔

۳۷- اِن سب رشتوں میں بھی سگے اور سوتیلے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ باپ اور ماں کی بہن، خواہ سگی ہو خواہ سوتیلی، یا باپ شریک، بہرحال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن، خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک، ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔

۳۸- اس امر پر اُمّت میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دُودھ پیا ہو، اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے، اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، رضائی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ اس حکم کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حُرمتِ رضاعت کس قدر دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے

فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ

تمھاری گودوں میں پرورش پائی ہے[۴۰] ـــــ اُن بیویوں کی لڑکیاں جن سے تمھارا تعلّقِ زن وشو ہو چکا ہو۔ ورنہ اگر (صرف نکاح ہُوا ہو اور) تعلّقِ زن وشو نہ ہُوا ہو تو (انھیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے ـــــ اور تمھارے اُن بیٹوں کی بیویاں

اتنی ہی مقدار میں اگر بچّہ کسی کا دودھ پی لے تو حُرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر امام احمدؒ کے نزدیک تین مرتبہ پینے سے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ دفعہ پینے سے یہ حُرمت ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس باب میں فقہا کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اعتبار صرف اُس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جب کہ بچے کا دودھ چُھڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خواری ہی پر اس کے تغذِیے کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چُھٹائی کے بعد اگر کسی بچّے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اُس نے پانی پی لیا۔ یہ رائے اُمِّ سَلَمہؓ اور ابنِ عباسؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اس معنی میں آئی ہے۔ زُہری، حَسَن بصری، قَتَادہ، عِکْرِمہ اور اَوزاعی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

(۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دُودھ پیا گیا ہو، صرف اسی سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہو گی۔ یہ حضرت عمرؓ، ابنِ مسعودؓ، ابو ہریرہؓ اور ابنِ عمرؓ کا قول ہے اور فقہا میں سے امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد، اور سُفیان ثَوری رحمہم اللہ نے اسے قبول کیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی حد کے قائل ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ دو سال سے اگر مہینا دو مہینا زائد عمر بھی ہو تو اس میں دُودھ پینے کا وہی حکم ہے۔

(۳) امام ابو حنیفہؒ اور امام زُفَرؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر پینے سے حُرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے۔

(۴) خواہ کسی عمر میں دُودھ پیے، حُرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اس معاملے میں اصل اعتبار دُودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو اس کا وہی حکم ہے جو شیر خوار بچے کا ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عائشہؓ کی۔ اور حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر رِوایت اسی کی تائید میں منقول ہے۔ اور فقہا میں سے عُروہ بن زُبیر، عطا، لَیث بن سعد اور ابنِ حَزم رحمہم اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

۳۹- اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہُوا ہو، اس کی ماں حرام ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، مالک، احمد اور شافعی رحمہم اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ

الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا
قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ﴿۲۳﴾

الجزء ۵ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

جو تمھاری صُلب سے ہوں[۴۱]۔ اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا ہے کہ ایک نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرو،[۴۲] مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے[۴۳]۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دُوسرے کے نکاح میں ہوں (مُحصنات)۔ البتہ ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو (جنگ میں) تمھارے ہاتھ آئیں[۴۴]۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔ اِن کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمھارے لیے

جب تک کسی عورت سے خَلوَت نہ ہوئی ہو، اس کی ماں حرام نہیں ہوتی۔

۴۰ - ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے محض اس رشتے کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے استعمال فرمائے ہیں۔ فقہائے اُمّت کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہر حال حرام ہے، خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو۔

۴۱ - یہ قید اس غَرض کے لیے بڑھائی گئی ہے کہ جسے آدمی نے بیٹا بنا لیا ہو، اس کی بیوہ یا مُطلّقہ آدمی پر حرام نہیں ہے۔ حرام صرف اُس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صُلب سے ہو۔ اور بیٹے ہی کی طرح پوتے اور نواسے کی بیوی بھی دادا اور نانا پر حرام ہے۔

۴۲ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ اس معاملے میں یہ اُصول سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی دو عورتوں کو جمع کرنا بہر حال حرام ہے جن میں سے کوئی ایک اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح دوسری سے حرام ہوتا۔

۴۳ - یعنی جاہلیت کے زمانے میں جو ظلم تم لوگ کرتے رہے ہو کہ دو دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کر لیتے تھے، اس پر باز پُرس نہ ہو گی، بشرطیکہ اب اس سے باز رہو۔ (مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۳۲) اسی بنا پر یہ حکم ہے کہ جس شخص نے حالتِ کفر میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر رکھا ہو، اُسے اسلام لانے کے بعد ایک کو رکھنا اور ایک کو چھوڑنا ہو گا۔

۴۴ - یعنی جو عورتیں جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں اور ان کے کافر شوہر دار الحرب میں موجود ہوں، وہ حرام نہیں ہیں، کیونکہ دار الحرب سے دار الاسلام میں آنے کے بعد ان کے نکاح ٹوٹ گئے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کیا جا سکتا ہے اور جس کی مِلکِ یمین میں وہ ہوں وہ ان سے تمتُّع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ فقہا کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا کیا حکم ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ ان کا نکاح باقی رہے گا، اور امام مالکؒ و شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ ان کا نکاح بھی باقی نہ رہے گا۔

لونڈیوں سے تمتُّع کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، لہٰذا حسبِ ذیل مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے:

(۱) جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں، ان کو پکڑتے ہی ہر سپاہی ان کے ساتھ مباشرت کر لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے، چاہے ان سے فِدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ اُن مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں، اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اُس عورت ہی سے تمتُّع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے با قاعدہ اس کی مِلک میں دی گئی ہو۔

(۲) جو عورت اس طرح کسی کی مِلک میں دی جائے، اس کے ساتھ بھی اس وقت تک مباشرت نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایامِ ماہواری نہ آ جائیں اور یہ اطمینان نہ ہو لے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے۔ اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضعِ حمل سے پہلے بھی مباشرت ناجائز ہے۔

(۳) جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتُّع کے معاملے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو، بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصّے میں وہ آئیں، وہ ان سے تمتُّع کر سکتے ہیں۔

(۴) جو عورت جس شخص کے حصّے میں دی گئی ہو صرف وہی اس کے ساتھ تمتُّع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اسی شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی مِلک میں وہ عورت ہے۔ اُس اولاد کے قانونی حُقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صُلبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحبِ اولاد ہو جانے کے بعد وہ عورت فروخت نہ کی جا سکے گی اور مالک کے مرتے ہی وہ آپ سے آپ آزاد ہو جائے گی۔

(۵) جو عورت اس طرح کسی شخص کی مِلک میں آئی ہو، اسے اگر اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دوسری تمام خدمات لینے کا حق تو رہتا ہے لیکن شہوانی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۶) جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے، اس طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مال دار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنا لیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملے میں عدمِ تعیُّن کی وجہ جنگی حالات کا عدمِ تعیُّن ہے۔

(۷) مِلکیّت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابلِ انتقال ہیں جو کسی شخص کو ازرُوئے قانون

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ
الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ حصارِ نکاح میں اُن کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔ پھر جو اِزدواجی زندگی کا لُطف تم ان سے اُٹھاؤ، اس کے بدلے اُن کے مَہر بطور فرض کے ادا کرو، البتہ مَہر کی قرارداد ہو جانے کے بعد آپس کی رضامندی سے تمھارے درمیان اگر کوئی سمجھوتا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اللہ علیم اور دانا ہے۔ اور جو شخص تم میں سے اتنی مقدِرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (مُحْصَنات) سے نکاح کر سکے، اسے چاہیے کہ تمھاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمھارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں۔ اللہ تمھارے ایمانوں کا حال خُوب جانتا ہے، تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ[۴۵] ہو،

کسی اسیرِ جنگ پر حکومت نے عطا کیے ہوں۔

(۸) حکومت کی طرف سے حقوق مِلکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ لہٰذا کوئی معقول وجہ نہیں کہ جو شخص نکاح میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا، وہ خواہ مخواہ لونڈی سے تمتُّع میں کراہت محسوس کرے۔

(۹) اسیرانِ جنگ میں سے کسی عورت کو کسی شخص کی ملکیّت میں دے دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی کے نکاح میں دے چکنے کے بعد پھر واپس لینے کا حق دار نہیں رہتا۔

(۱۰) اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے شہوانی پیاس بجھا لینے کی اجازت دے دے اور محض کچھ وقت کے لیے انھیں فوج میں تقسیم کرے تو یہ اسلامی قانون کی رُو سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زِنا میں کوئی فرق نہیں ہے، اور زِنا اسلامی قانون میں جُرم ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو ہماری کتاب ''تفہیمات'' حصّۂ دوم، اور ''رسائل و مسائل'' حصّۂ اوّل)

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ
فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ

لہٰذا اُن کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقے سے اُن کے مہر ادا کردو، تاکہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ (مُحْصَنات) ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں۔ پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (مُحْصَنات) کے لیے مقرر[۴۶] ہے۔ یہ سہولت[۴۷] تم میں سے اُن لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بندِ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر

---

۴۵ – یعنی معاشرت میں لوگوں کے درمیان جو فرقِ مَراتب ہے وہ محض ایک اعتباری چیز ہے، ورنہ دراصل سب مسلمان یکساں ہیں، اور اگر کوئی حقیقی وجہِ امتیاز ان کے درمیان ہے تو وہ ایمان ہے جو محض اُونچے گھرانوں ہی کا حصّہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان واَخلاق میں ایک خاندانی عورت سے بہتر ہو۔

۴۶ – سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور اُن دُوسرے لوگوں نے فائدہ اُٹھایا ہے جو رَجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رَجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہوسکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیلِ قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔“ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰت (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ”شادی شدہ عورتیں“ جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے ”خاندانی عورتیں“ جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیتِ زیرِ بحث میں مُحْصَنٰت کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنیٰ میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے مُحْصَنٰت کا لفظ پہلے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو

ع

تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۵﴾ ع يُرِيۡدُ اللّٰهُ
لِيُبَيِّنَ لَكُمۡ وَيَهۡدِيَكُمۡ سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ
وَيَتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيۡدُ اَنۡ

تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اُن طریقوں کو واضح کرے اور اُنھی طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحا کرتے تھے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ تمھاری طرف متوجہ ہونے کا ارادہ رکھتا ہے، اور وہ علیم بھی ہے اور دانا بھی۔[۴۸] ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ

مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں: ایک، خاندان کی حفاظت، جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی مُحْصَنہ ہوتی ہے۔ دوسری، شوہر کی حفاظت، جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے، مُحْصَنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اَدھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہُوا کرتا ہے۔ لٰہذا اسے جو سزا دی جائے گی، وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی، نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے، وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے، جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ مُحْصَنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں، کیونکہ وہ دُہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقے سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہنِ رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

۴۷- یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت لے کر نکاح کر لینے کی سہولت۔

۴۸- سورہ کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں، اور اس سورۃ کے نُزول سے پہلے سورۂ بقرہ میں مسائلِ تمدّن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں، ان سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ قف وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا
عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

توجّہ کرنا چاہتا ہے، مگر جو لوگ خود اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کر رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے ہٹ کر دُور نِکل[۴۹] جاؤ۔ اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے، کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جا رہا ہے کہ یہ معاشرت، اخلاق اور تمدّن کے وہ قوانین ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے ہر دَور کے انبیاؑ اور اُن کے صالح پَیرو عمل کرتے چلے آئے ہیں، اور یہ اللہ کی عنایت و مہربانی ہے کہ وہ تم کو جاہلیّت کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہے۔

۴۹ – یہ اشارہ ہے منافقین اور قدامت پرست جُہلا اور نواحِیِ مدینہ کے یہودیوں کی طرف۔ منافقین اور قدامت پرستوں کو تو وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدّن و معاشرت میں صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصُّبات اور رسم و رواج کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ میراث میں لڑکیوں کا حصّہ۔ بیوہ عورت کا سُسرال کی بندشوں سے رہائی پانا اور عدّت کے بعد اس کا ہر شخص سے نکاح کے لیے آزاد ہو جانا۔ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا۔ دو بہنوں کے ایک ساتھ نکاح میں جمع کیے جانے کو ناجائز قرار دینا۔ مُتَبنّیٰ کو وراثت سے محروم کرنا اور منہ بولے باپ کے لیے مُتَبنّیٰ کی بیوہ اور مُطلّقہ کا حلال ہونا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری اصلاحات میں سے ایک ایک چیز ایسی تھی جس پر بڑے بوڑھے اور آبائی رُسُوم کے پرستار چیخ چیخ اُٹھتے تھے۔ مدّتوں اِن احکام پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ شرارت پسند لوگ ان باتوں کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوتِ اصلاح کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے پھرتے تھے۔ مثلاً جو شخص کسی ایسے نکاح سے پیدا ہوا تھا جسے اب اسلامی شریعت حرام قرار دے رہی تھی، اس کو یہ کہہ کر اشتعال دلایا جاتا تھا کہ لیجیے، آج جو نئے احکام وہاں آئے ہیں اُن کی رُو سے آپ کی ماں اور آپ کے باپ کا تعلق ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نادان لوگ اُس اصلاح کے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے تھے جو اُس وقت احکامِ الٰہی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف یہودی تھے جنھوں نے صدیوں کی مُوشگافیوں سے اصل خدائی شریعت پر اپنے خود ساختہ احکام و قوانین کا ایک بھاری خول چڑھا رکھا تھا۔ بے شمار پابندیاں اور باریکیاں اور سختیاں تھیں جو انھوں نے شریعت میں بڑھا لی تھیں۔ بکثرت حلال چیزیں ایسی تھیں جنھیں وہ حرام کر بیٹھے تھے۔ بہت سے اَوہام تھے جن کو انھوں نے قانونِ خداوندی میں داخل کر لیا تھا۔ اب یہ بات ان کے علما اور عوام، دونوں کی ذہنیت اور مذاق کے بالکل خلاف تھی کہ وہ اس سیدھی سادھی شریعت کی قدر پہچان سکتے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔ وہ قرآن کے احکام کو سُن کر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔ ایک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ قف وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دُوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے[50]۔ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو[51]۔

ایک چیز پر سو سو اعتراضات کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو قرآن ان کے فقہا کے تمام اجتہادات اور ان کے اسلاف کے سارے اَوہام وخُرافات کو شریعتِ الٰہی قرار دے، ورنہ یہ ہرگز کتابِ الٰہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے ہاں دستور تھا کہ ایّامِ ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہُوا کھانا کھاتے، نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چُھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ یہی رواج یہودیوں کے اثر سے مدینے کے انصار میں بھی چل پڑا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا۔ جواب میں وہ آیت آئی جو سورۂ بقرہ، رکوع ۲۸ کے آغاز میں درج ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی رُو سے حکم دیا کہ ایّامِ ماہواری میں صرف مباشرت ناجائز ہے۔ باقی تمام تعلقات عورتوں کے ساتھ اسی طرح رکھے جائیں جس طرح دوسرے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس پر یہودیوں میں شور مچ گیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو قسم کھا کر بیٹھا ہے کہ جو جو کچھ ہمارے ہاں حرام ہے، اسے حلال کر کے رہے گا اور جس جس چیز کو ہم ناپاک کہتے ہیں، اسے پاک قرار دے گا۔

۵۰- ”باطل طریقوں“ سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلافِ حق ہوں اور شرعاً و اَخلاقاً ناجائز ہوں۔ ”لین دین“ سے مراد یہ ہے کہ آپس میں مفاد ومنافع کا تبادلہ ہونا چاہیے، جس طرح تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ میں ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ ”آپس کی رضامندی“ سے مراد یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب ودغا سے۔ رشوت اور سُود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر فی الواقع وہ رضامندی مجبورانہ ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جُوے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر درحقیقت جُوے میں حصّہ لینے والا ہر شخص اس غلط اُمید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی۔ ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا۔ جَعَل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے، مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جَعَل وفریب نہیں ہے۔ اگر فریقِ ثانی کو معلوم ہو کہ تم اس سے جَعَل یا فریب کر رہے ہو تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔

۵۱- یہ فقرہ پچھلے فقرے کا تتمّہ بھی ہو سکتا ہے اور خود ایک مستقل فقرہ بھی۔ اگر پچھلے فقرے کا تتمّہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ دنیا میں اس سے نظامِ تمدّن

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا (۲۹) وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا
فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا (۳۰) إِن تَجْتَنِبُوا
كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم

یقین مانو کہ اللہ تمھارے اُوپر مہربان[۵۲] ہے۔ جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا، اُس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے، تو تمھاری چھوٹی موٹی بُرائیوں کو ہم تمھارے حساب سے ساقط کر دیں[۵۳] گے اور تم کو عزّت

خراب ہوتا ہے اور اس کے بُرے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی بدولت آدمی سخت سزا کا مُستوجِب بن جاتا ہے۔ اور اگر اسے مستقل فقرہ سمجھا جائے تو اس کے دو معنیٰ ہیں: ایک، یہ کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ دوسرے، یہ کہ خودکُشی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے الفاظ ایسے جامع استعمال کیے ہیں اور ترتیبِ کلام ایسی رکھی ہے کہ اس سے یہ تینوں مفہوم نکلتے ہیں اور تینوں حق ہیں۔

۵۲- یعنی اللہ تعالیٰ تمھارا خیر خواہ ہے، تمھاری بھلائی چاہتا ہے، اور یہ اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ تم کو ایسے کاموں سے منع کر رہا ہے جن میں تمھاری اپنی بربادی ہے۔

۵۳- یعنی ہم تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پکڑ کر اپنے بندوں کو سزا دیں۔ اگر تمھارا نامۂ اعمال بڑے جرائم سے خالی ہو تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور تم پر فردِ جرم لگائی ہی نہ جائے گی۔ البتہ اگر بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو پھر جو مُقدّمہ تم پر قائم کیا جائے گا، اس میں چھوٹی خطائیں بھی گرفت میں آ جائیں گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ میں اُصولی فرق کیا ہے۔ جہاں تک میں نے قرآن اور سنّت میں غور کیا ہے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم بالصّواب) کہ تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں:

(۱) کسی کی حق تلفی، خواہ وہ خدا ہو جس کا حق تلف کیا گیا ہے، یا والدین ہوں، یا دوسرے انسان، یا خود اپنا نفس۔ پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اسی بنا پر گناہ کو ”ظلم“ بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر شرک کو قرآن میں ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔

(۲) اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں اِستکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے قصداً وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے، اور عمداً اُن کاموں کو نہ کرے جن کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ

مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

کی جگہ داخل کریں گے۔

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دُوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنّا نہ کرو۔ جو کچھ مَردوں نے کمایا ہے اُس کے مطابق ان کا حِصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق اُن کا حصّہ۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔[۵۴]

نافرمانی جس قدر زیادہ ڈِھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیّت اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی، اسی قدر گناہ بھی شدید ہوگا۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فِسق'' اور ''معصیت'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

(۳) اُن روابط کو توڑنا اور اُن تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل واستحکام اور دُرستی پر انسانی زندگی کا امن منحصر ہے، خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں، یا بندے اور بندے کے درمیان۔ پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملے میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کو توڑنے اور کاٹنے اور خراب کرنے کا گناہ زیادہ بڑا ہے۔ مثلاً زِنا اور اس کے مختلف مدارج پر غور کیجیے۔ یہ فعل فی نفسہٖ نظامِ تمدّن کو خراب کرنے والا ہے، اس لیے بجائے خود ایک بڑا گناہ ہے، مگر اس کی مختلف صورتیں ایک دوسرے سے گناہ میں شدید تر ہیں۔ شادی شدہ آدمی کا زنا کرنا بن بیاہے کی بہ نسبت زیادہ سخت گناہ ہے۔ منکوحہ عورت سے زنا کرنا غیر منکوحہ سے کرنے کی بہ نسبت قبیح تر ہے۔ ہمسایہ کے گھر والوں سے زنا کرنا غیر ہمسایہ سے کرنے کی بہ نسبت زیادہ بُرا ہے۔ مُحَرّمات مثلاً بہن یا بیٹی یا ماں سے زنا کرنا غیر عورت سے کرنے کی بہ نسبت اَشْنَع ہے۔ مسجد میں زنا کرنا کسی اور جگہ کرنے سے اَشدّ ہے۔ ان مثالوں میں ایک ہی فعل کی مختلف صُورتوں کے درمیان گناہ ہونے کی حیثیت سے مدارج کا فرق انھی وُجوہ سے ہے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں مامونیت کی توقع جس قدر زیادہ ہے، جہاں انسانی رابطہ جتنا زیادہ مستحقِ احترام ہے، اور جہاں اس رابطے کو قطع کرنا جس قدر زیادہ موجبِ فساد ہے، وہاں زنا کا ارتکاب اسی قدر زیادہ شدید گناہ ہے۔ اسی معنٰی کے لحاظ سے گناہ کے لیے ''فُجور'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

۵۴- اس آیت میں ایک بڑی اہم اَخلاقی ہدایت دی گئی ہے، جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو اجتماعی زندگی میں

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ
اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع

۵ ع ۸ ۲

اور ہم نے ہر اُس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، تو ان کا حصّہ انھیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگراں[۵۵] ہے۔ ع

انسان کو بڑا امن نصیب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے فرق رکھے ہیں۔ کوئی خوب صورت ہے اور کوئی بدصُورت۔ کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز۔ کوئی طاقت ور ہے اور کوئی کمزور۔ کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نُقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدّن کی ساری گوناگونی قائم ہے اور یہ عین مُقتضائے حکمت ہے۔ جہاں اس فرق کو اس کے فطری حُدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک نوعیّت کا فساد رُونما ہوتا ہے، اور جہاں سرے سے اس فرق ہی کو مٹا دینے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں ایک دوسری نوعیّت کا فساد برپا ہوتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلے میں بڑھا ہوا دیکھے، بے چَین ہو جائے، یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جَڑ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اُسے جائز طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا، اسے پھر وہ ناجائز تدبیروں سے حاصل کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔ اس کے ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہو اس کی تمنّا نہ کرو، البتہ اللہ سے فضل کی دُعا کرو، وہ جس فضل کو اپنے علم و حکمت سے تمھارے لیے مناسب سمجھے گا، عطا فرما دے گا۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”مَردوں نے جو کچھ کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصّہ“، اس کا مطلب جہاں تک مَیں سمجھ سکا ہوں، یہ ہے کہ مَردوں اور عورتوں میں سے جس کو جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس کو استعمال کر کے جو جتنی اور جیسی بُرائی یا بھلائی کمائے گا، اسی کے مطابق، یا بالفاظِ دیگر، اسی کی جنس سے اللہ کے ہاں حصہ پائے گا۔

۵۵- اہلِ عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کی میراث کے حق دار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے بیٹا بنا لیا جاتا تھا، وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔ اس آیت میں جاہلیت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اسی قاعدے کے مطابق

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ

مرد عورتوں پر قوّام[۵۶] ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت[۵۷] دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شِعار ہوتی ہیں اور مَردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت ونگرانی میں اُن کے حُقوق کی حفاظت کرتی ہیں[۵۸]۔ اور جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو[۵۹] اور مارو،

رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمھارے عہد و پیمان ہوں، اُن کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

۵۶ - قوّام یا قیّم اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد، یا ادارے، یا نظام کے معاملات کو دُرست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت ونگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔

۵۷ - یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے، جیسا کہ ایک عام اُردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا، بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنٰی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعًا بعض ایسی خُصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیّت رکھتا ہے، اور عورت فطرتًا ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت وخبر گیری کے تحت رہنا چاہیے۔

۵۸ - حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اُسے دیکھو تو تمھارا جی خوش ہو جائے، جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے، اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمھارے پیچھے تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔‘‘ یہ حدیث اس آیت کی بہترین تفسیر کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عورت پر اپنے شوہر کی اطاعت سے اہم اور اَقدم اپنے خالق کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شوہر خدا کی مَعصیت کا حکم دے، یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے، تو اس کی اطاعت سے انکار کر دینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اس کی اطاعت کرے گی تو گناہ گار ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر شوہر اپنی بیوی کو نفل نماز یا نفل روزہ ترک کرنے کے لیے کہے تو لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔ اس صُورت میں اگر وہ نوافل ادا کرے گی تو مقبول نہ ہوں گے۔

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا
حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ﴿۳۵﴾

پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اُوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے۔ اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلّقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں[٦٠] اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان مُوافقت کی صورت نکال دے گا، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔[٦١]

---

۵۹ – یہ مطلب نہیں ہے کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نُشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عمل درآمد، تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے، اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہو، وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے، بادلِ ناخواستہ دی ہے، اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے۔ تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر دُرست ہی نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے، بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے۔

٦٠ – دونوں سے مراد ثالث بھی ہیں اور زوجین بھی۔ ہر جھگڑے میں صلح ہونے کا امکان ہے، بشرطیکہ فریقین بھی صلح پسند ہوں اور بیچ والے بھی چاہتے ہوں کہ فریقین میں کسی طرح صفائی ہو جائے۔

٦١ – اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں نامُوافقت ہو جائے، وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیے کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے، تاکہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایے سے، پہلو کے ساتھی[۶۲] اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو

ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں، اور اگر مُقدّمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہا میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، البتہ تصفیے کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو، اس کے لیے سفارش کر سکتے ہیں، ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خُلع یا کسی اور امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حَنَفی اور شافعی علما کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو مُوافَقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، مگر علیحدگی کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ حَسَن بصریؒ اور قَتَادَہؒ اور بعض دوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبیر، ابراہیم نَخَعیؒ، شَعْبیؒ، محمد بن سِیرِینؒ، اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے اختیار کی ہے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے عدالت کی طرف سے ان کو حاکمانہ اختیارات دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عَقیلؓ بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنتِ عُتبہ بن ربیعہ کا مقدّمہ جب حضرت عثمانؓ کی عدالت میں پیش ہوا تو انھوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابنِ عباسؓ کو، اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کو پنچ مقرر کیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدّمے میں حضرت علیؓ نے حَکَم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جُدا کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پنچ بطورِ خود تو عدالتی اختیارات نہیں رکھتے۔ البتہ اگر عدالت ان کو مقرر کرتے وقت انھیں اختیارات دے دے تو پھر ان کا فیصلہ ایک عدالتی فیصلے کی طرح نافذ ہوگا۔

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا
فَخُوْرَاۙ ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ
وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ

تمھارے قبضے میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پِندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں اور دُوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں[63]۔ ایسے کافرِ نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رُسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔ اور وہ لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے

---

[62] متن میں ''اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ'' فرمایا گیا ہے، جس سے مراد ہم نشین دوست بھی ہے اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو، یا کسی دکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو، یا سفر کے دَوران میں کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسایگی بھی ہر مہذّب اور شریف انسان پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتّی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے۔

[63] اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا کہ اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے۔ مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گِر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرے، نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصّہ لے۔ لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انّ اللہ اذا انعم نعمۃ علی عبد احبّ ان یظھر اثرھا علیہ، اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو۔ یعنی اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور مسکن، اور اس کی داد و دہش، ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا رہے۔

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً
يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ؕ يَوْمَئِذٍ
يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ

خرچ کرتے ہیں اور درحقیقت نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخر پر۔ سچ یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہُوا اُسے بہت ہی بُری رفاقت میسّر آئی۔ آخر اِن لوگوں پر کیا آفت آجاتی اگر یہ اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے۔ اگر یہ ایسا کرتے تو اللہ سے ان کی نیکی کا حال چھُپا نہ رہ جاتا۔ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اُسے دوچند کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمھیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔[۶۴] اُس وقت وہ سب لوگ جنھوں نے رسُول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

---

۶۴ – یعنی ہر دَور کا پیغمبر اپنے دَور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق، جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی، اُسے میں نے اِن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر یہی شہادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دَور کے لوگوں پر دیں گے، اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دور آپؐ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔ (آلِ عمران، حاشیہ ۶۹)

وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ﴿۴۲﴾ ع یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیۡ سَبِیۡلٍ حَتّٰی تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ

وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے ؏

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب[۶۵] نہ جاؤ۔ نماز اُس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے[۶۶] ہو۔ اور اسی طرح جنابت[۶۷] کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ غسل نہ کر لو، اِلّا یہ کہ راستے سے گزر[۶۸] تے ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم

---

۶۵ – یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ پہلا حکم وہ تھا جو سورۂ بقرہ (آیت ۲۱۹) میں گزرا۔ اُس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا۔ مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہتے تھے، حتّٰی کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ غالباً ۴ ہجری کی ابتدا میں یہ دُوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی مُمانعَت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ کہیں نشہ ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آ جائے۔ اس کے کچھ مدّت بعد شراب کی قطعی حرمت کا وہ حکم آیا جو سورۂ مائدہ، آیت ۹۰، ۹۱ میں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سُکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا۔ اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیا کا استعمال بجائے خود حرام ہے، لیکن نشے کی حالت میں نماز پڑھنا دُہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

۶۶ – اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اُونگھ جاتا ہو تو اُسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ اِستِدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عَرَبی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدُّد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن میں حتّٰی تفقھوا یا حتّٰی تفھموا ما تقولون نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ فرمایا ہے۔ یعنی نماز میں آدمی کو اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا تو ہو نماز پڑھنے، اور شروع کر دے کوئی غزل۔

مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا
بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا (۴۳)

بیمار ہو، یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں سے لَمس کیا ہو،[۶۹] اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو،[۷۰] بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔

۶۷- جنابت کے اصل معنٰی دُوری اور بے گانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں جنابت سے مراد وہ نجاست ہے جو قضائے شہوت سے یا خواب میں مادّہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔

۶۸- فقہا اور مفسّرین میں سے ایک گروہ نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے، اِلّا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو۔ اسی رائے کو عبداللہؓ بن مسعود، اَنَسؓ بن مالک، حَسَن بصریؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ وغیرہ حضرات نے اختیار کیا ہے۔ دوسرا گروہ اس سے سفر مراد لیتا ہے۔ یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ رہا مسجد کا معاملہ، تو اِس گروہ کی رائے میں جُنُبی کے لیے وضو کر کے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے۔ یہ رائے حضرت علیؓ، ابنِ عباسؓ، سعید بن جُبَیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار فرمائی ہے۔ اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ اِس مسئلے کو حدیث سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس رِوایت کی بنیاد قرآن کی مندرجہ بالا آیت پر رکھتا ہے۔

۶۹- اس امر میں اختلاف ہے کہ لَمس یعنی چُھونے سے کیا مراد ہے۔ حضرات علیؓ، ابنِ عباسؓ، ابوموسیٰ اَشعَریؓ، اُبَیؓ ابنِ کعب، سعید بن جُبَیرؒ، حسن بصریؒ اور متعدِّد ائمہ کی رائے ہے کہ اس سے مراد مباشرت ہے، اور اسی رائے کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام سُفیان ثَوریؒ نے اختیار کیا ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہ ابنِ عمرؓ کی رائے ہے اور بعض رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ابنِ خطّاب کی بھی یہی رائے ہے کہ اس سے مراد چھونا یا ہاتھ لگانا ہے، اور اسی رائے کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے۔ بعض ائمہ نے بیچ کا مسلک بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً امام مالکؒ کی رائے ہے کہ اگر عورت یا مرد ایک دوسرے کو جذباتِ شہوانی کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو ان کا وضو ساقط ہو جائے گا اور نماز کے لیے انھیں نیا وضو کرنا ہو گا، لیکن اگر جذباتِ شہوانی کے بغیر ایک کا جسم دوسرے سے مَس ہو جائے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ؕ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جنھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے[۷۱]؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمھارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے

---

۷۰ – حکم کی تفصیلی صورت یہ ہے کہ اگر آدمی بے وضو ہے یا اُسے غسل کی حاجت ہے اور پانی نہیں ملتا تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر مریض ہے اور غسل یا وضو کرنے سے اس کو نقصان کا اندیشہ ہے، تو پانی موجود ہونے کے باوجود تیمُّم کی اجازت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

تیمُّم کے معنیٰ قصد کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب پانی نہ ملے، یا پانی ہو اور اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

تیمّم کے طریقے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیر لیا جائے، پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر کہنیوں تک ہاتھوں پر پھیر لیا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر فقہا کا یہی مذہب ہے، اور صحابہؓ و تابعینؒ میں سے حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حَسَن بصریؒ، شَعبیؒ اور سالم بن عبداللہؒ وغیرہم اس کے قائل تھے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر بھی پھیر لیا جائے اور اسی کو کلائی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے۔ کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عطاء اور مَکحُول اور اَوزاعی اور احمد ابنِ حنبل رحمہم اللہ کا مذہب ہے، اور عُموماً حضرات اہلِ حدیث اسی کے قائل ہیں۔

تیمّم کے لیے ضروری نہیں کہ زمین ہی پر ہاتھ مارا جائے۔ اس غرض کے لیے ہر گرد آلود چیز اور ہر وہ چیز جو خشک اجزائے ارضی پر مشتمل ہو، کافی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح مٹی پر ہاتھ مار کر مُنہ اور ہاتھوں پر پھیر لینے سے آخر طہارت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ آدمی میں طہارت کی حِس اور نماز کا احترام قائم رکھنے کے لیے ایک اہم نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنی ہی مدّت تک پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو، بہرحال اس کے اندر طہارت کا احساس برقرار رہے گا، پاکیزگی کے جو قوانین شریعت میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کی پابندی وہ برابر کرتا رہے گا، اور اس کے ذہن سے قابلِ نماز ہونے کی حالت اور قابلِ نماز نہ ہونے کی حالت کا فرق و امتیاز کبھی محو نہ ہو سکے گا۔

۷۱ – علمائے اہلِ کتاب کے متعلق قرآن نے اکثر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ”انھیں کتاب کے علم کا کچھ حصّہ دیا گیا ہے“۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو انھوں نے کتاب الٰہی کا ایک حصّہ گم کر دیا تھا۔ پھر جو کچھ کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس موجود

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ
هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ
عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي
الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا

اور تمھاری حمایت و مددگاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ جو لوگ یہودی بن گئے ہیں[۷۲] اُن میں کچھ لوگ ہیں جو الفاظ کو اُن کے محل سے پھیر دیتے ہیں[۷۳]، اور دینِ حق کے خلاف نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر کہتے ہیں: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا[۷۴] اور اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ[۷۵] اور رَاعِنَا[۷۶]۔ حالانکہ اگر وہ کہتے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، اور اِسْمَعْ اور اُنْظُرْنَا تو یہ

تھا، اس کی رُوح اور اس کے مقصد و مدعا سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان کی تمام دلچسپیاں لفظی بحثوں اور احکام کے جُزئیات اور عقائد کی فلسفیانہ پیچیدگیوں تک محدود تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دین کی حقیقت سے ناآشنا اور دین داری کے جوہر سے خالی تھے، اگرچہ علمائے دین اور پیشوایانِ مِلّت کہے جاتے تھے۔

۷۲ – یہ نہیں فرمایا کہ ”یہودی ہیں“ بلکہ یہ فرمایا کہ ”یہودی بن گئے ہیں“، کیونکہ ابتداءً تو وہ بھی مسلمان ہی تھے، جس طرح ہر نبی کی اُمّت اصل میں مسلمان ہوتی ہے، مگر بعد میں وہ صرف یہودی بن کر رہ گئے۔

۷۳ – اس کے تین مطلب ہیں: ایک، یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردّ و بدل کرتے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ اپنی تاویلات سے آیاتِ کتاب کے معنیٰ کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ تیسرے، یہ کہ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے پیرووں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سُنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے رِوایت کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اسے اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں، تاکہ انھیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلّق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔

۷۴ – یعنی جب انھیں خدا کے احکام سُنائے جاتے ہیں تو زور سے کہتے ہیں: سَمِعْنَا (ہم نے سُن لیا) اور آہستہ کہتے ہیں: عَصَيْنَا (ہم نے قبول نہیں کیا)۔ یا اَطَعْنَا (ہم نے قبول کیا) کا تلفُّظ اس انداز سے زبان کو لچکا دے کر کرتے ہیں کہ عَصَيْنَا بن جاتا ہے۔

۷۵ – یعنی دَورانِ گفتگو میں جب وہ کوئی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: اِسْمَعْ (سُنیے)

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا
نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا
فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ
وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ
يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ

انھی کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔ مگر ان پر تو ان کی باطل پرستی کی بدولت اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے، اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔

اے وہ لوگو جنھیں کتاب دی گئی تھی! مان لو اُس کتاب کو جو ہم نے اب نازل کی ہے اور جو اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی۔[۷۷] اس پر ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ ہم چہرے بگاڑ کر پیچھے پھیر دیں، یا ان کو اسی طرح لعنت زدہ کر دیں جس طرح سبت والوں کے ساتھ ہم نے کیا تھا،[۷۸] اور یاد رکھو کہ اللہ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے۔ اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا،[۷۹] اس کے ماسوا دُوسرے جس قدر گناہ ہیں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔[۸۰] اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا، اُس نے تو

اور پھر ساتھ ہی غَیْرَ مُسْمَعٍ بھی کہتے ہیں جو ذُومعنیٰ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جاسکتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کوئی کچھ سُنائے۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ۔

۷۶۔ اس کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۰۸۔

۷۷۔ تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: آلِ عمران، حاشیہ ۲۔

۷۸۔ ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

افۡتَرٰۤى اِثۡمًا عَظِيۡمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ
بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۴۹﴾ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ
يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثۡمًا مُّبِيۡنًا ﴿۵۰﴾ ع اَلَمۡ تَرَ
اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ

ع ۸ ۴

بہت ہی بڑا جھُوٹ تصنیف کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جو بہت اپنی پاکیزگیِ نفس کا دم بھرتے ہیں؟ حالانکہ پاکیزگی تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور (انھیں جو پاکیزگی نہیں ملتی تو درحقیقت) ان پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو تو سہی، یہ اللہ پر بھی جھُوٹے افترا گھڑنے سے نہیں چُوکتے اور ان کے صریحاً گناہ گار ہونے کے لیے یہی ایک گناہ کافی ہے ع

کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصّہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جِبت[81]

۷۹- یہ اس لیے فرمایا کہ اہلِ کتاب اگرچہ انبیا اور کُتُبِ آسمانی کی پیروی کے مدّعی تھے، مگر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۸۰- اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے، باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے۔ بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک، جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، حتّٰی کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ علمائے یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا وقت اُن جُزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انھیں کوئی مضایقہ نظر آتا تھا۔

۸۱- جِبت کے اصل معنٰی بے حقیقت، بے اصل اور بے فائدہ چیز کے ہیں۔ اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور مہورت اور تمام دوسری وہمی و خیالی باتوں کو ”جِبت“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: النیاقة والطرق والطیر من الجبت۔ یعنی جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے

وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ
الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا (٥١) اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ
يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيرًا ؕ (٥٢) اَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ
الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۙ (٥٣) اَمْ يَحْسُدُونَ
النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ

اور طاغوت[٨٢] کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلّق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں[٨٣]۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ کیا حکومت میں اُن کا کوئی حصّہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ دُوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی تک نہ دیتے[٨٤]۔ پھر کیا یہ دُوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے نواز دیا[٨٥]؟ اگر یہ بات ہے تو انھیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیمؑ

نشاناتِ قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب ”جِبت“ کے قبیل سے ہیں۔ پس ”جِبت“ کا مفہوم وہی ہے جسے ہم اُردو زبان میں اوہام کہتے ہیں اور جس کے لیے انگریزی میں superstitions کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

٨٢ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ٢٨٦ و ٢٨٨۔

٨٣ – علمائے یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان کو وہ مشرکینِ عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہِ راست پر ہیں، حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں، اور دوسری طرف صریح بُت پرستی ہے جس کی مذمّت سے ساری بائبل بھری پڑی ہے۔

٨٤ – یعنی کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصّہ ان کے قبضے میں ہے کہ یہ فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کون برسرِ ہدایت ہے اور کون نہیں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھُوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی، کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصّہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انھیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ بُخل سے کام لے رہے ہیں۔

اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾
فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ
نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا
لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ الربع
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ

کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور مُلکِ عظیم بخش دیا[۸۶]، مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا[۸۷]، اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنّم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے اُن کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے

---

۸۵ – یعنی یہ اپنی نااہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی آس خود لگائے بیٹھے تھے، اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمّیوں میں ایک عظیم الشان نبیؐ کے ظہور سے وہ روحانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سربلندی ہے، تو اب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں۔

۸۶ – "مُلکِ عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوامِ عالم پر قائدانہ اقتدار ہے جو کتاب اللہ کا علم پانے اور اس علم و حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

۸۷ – یاد رہے کہ یہاں جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ آخر جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیمؑ کی اولاد ہو اور یہ بنی اسماعیل بھی ابراہیمؑ ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیمؑ سے دُنیا

تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ
لَہُمۡ فِیۡہَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ ۫ وَّ نُدۡخِلُہُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾
اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا
حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
نِعِمَّا یَعِظُکُمۡ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سُپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو،[۸۸] اللہ تم کو نہایت عُمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے۔

کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا، وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف اُن لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمھارے پاس بھیجی تھی، مگر تمھاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسماعیل کو دی ہے اور یہ اُن کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

۸۸- یعنی تم اُن بُرائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غَلَطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے (positions of trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بداَخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سُپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اُٹھانے کی صلاحیت ہو۔ بنی اسرائیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی رُوح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ شخصی اور قومی اغراض کے لیے بے تکلّف ایمان نگل جاتے تھے۔ صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے۔ انصاف کے گلے پر چُھری پھیرنے میں انھیں ذرا تأمُّل نہ ہوتا تھا۔ ان کی بے انصافی کا تلخ ترین تجرِبہ اُس زمانے میں خود مسلمانوں کو ہو رہا تھا۔ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي
الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رُسولؐ کی طرف[89] پھیر دو

صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بُتوں کو پُوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبے کے گرد مادرزاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے۔ یہ نام نہاد اہلِ کتاب ان میں سے دوسرے گروہ کو پہلے گروہ پر ترجیح دیتے تھے اور ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلے میں یہ دوسرا گروہ زیادہ صحیح راستے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد اب مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو، انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو، عدل کے ساتھ کرو۔

۸۹۔ یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اوّلین دفعہ ہے۔ اس میں حسبِ ذیل اُصول مستقل طور پر قائم کر دیے گئے ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مُطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندۂ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے، اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محوَر، خدا کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قُبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی مدِ مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ ”خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔“

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسولؐ کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذّات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اس لیے مُطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اِسی طریقے سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعتِ خدا رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں ہے، اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصَی اللّٰہ۔ ”جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔“ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

(۳) مذکورۂ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے، وہ اُن ”اُولی الامر“ کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ ”اُولی الامر“ کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہِ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علما ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا مُلکی انتظام کرنے والے حُکّام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی اُمور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلّوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار۔ غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا دُرست نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو، اور خدا و رسولؐ کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی شرطیں ہیں، اور یہ نہ صرف آیتِ مذکورۂ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل احادیث مُلاحظہ ہوں:

السمع والطاعة علی المرء المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔ (بخاری و مسلم)	مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اُولی الامر کی بات سنے اور مانے، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سُننا چاہیے نہ ماننا چاہیے۔
لا طاعة فی معصیة، انما الطاعة فی المعروف۔ (بخاری و مسلم)	خدا اور رسولؐ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے ”معروف“ میں ہے۔
یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کرہ فقد سلم ولٰکن من رضی وتابع فقالوا افلا نقاتلہم؟ قال لا ما صلّوا۔ (مسلم)	حضورؐ نے فرمایا: تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو مُنکَر۔ تو جس نے ان کے مُنکَرات پر اظہارِ ناراضی کیا، وہ بَری الذّمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا، وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہو گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: پھر جب ایسے حکّام کا دَور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہو گی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا و رسول سے باہر ہو گئے ہیں، اور پھر ان کے خلاف جِدّوجُہد کرنا دُرست ہو گا۔

شِرَار ائمّتکم الّذین تبغضونہم ویبغضونکم وتلعنونہم ویلعنونکم قلنا یا رسول اللّٰہ افلا ننابذہم عند ذٰلک؟ قال لا ما اقاموا	حضورؐ نے فرمایا: تمھارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمھارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے لیے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم اُن کے مقابلے پر نہ اُٹھیں؟ فرمایا: نہیں، جب تک وہ

فیکم الصّلٰوۃ، لا ما اقاموا فیکم
الصّلٰوۃ۔ (مسلم)

تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں، جب تک وہ
تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

اس حدیث میں اُوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اُوپر کی حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے۔ یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابندِ نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظامِ حکومت چل رہا ہو، وہ کم از کم اِقامتِ صلٰوۃ کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اُصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے اُلٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی۔ اسی بات کو ایک اور رِوایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مِن جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحًا عندکم من اللہ فیہ برھان، یعنی یہ کہ ”ہم اپنے سرداروں اور حُکّام سے نزاع نہ کریں گے، اِلّا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کُھلا کُھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حُضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔“ (بخاری ومسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیتِ زیرِ بحث میں ایک مستقل اور قطعی اُصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے، یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلے میں بھی نزاع واقع ہوگی، اس میں فیصلے کے لیے قرآن اور سنّت کی طرف رُجوع کیا جائے گا، اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ وسنّت رسولؐ اللہ کو سند اور مَرجِع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیّت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے مُمیّز کرتی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے، وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ تمام مسائلِ زندگی کے فیصلے کے لیے کتاب اللہ وسنتِ رسولؐ اللہ کی طرف کیسے رجوع کیا جا سکتا ہے، جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک خانہ کے قواعد وضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اُصولِ دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیّز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ کافر مُطلق آزادی کا مدّعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اُس دائرے میں آزادی سے متمتّع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اُصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملے میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اِسی صورت میں آزادیِ عمل برتتا ہے، اور اُس کی یہ آزادیِ عمل اس حجّت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملے میں شارع کا کوئی حکم نہ دینا اس کی

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ؑ۵۹ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا

ع ۸ ۹ ۵

اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔[90] ع

اے نبیؐ! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انھیں طاغوت سے

طرف سے آزادیِ عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

۹۰- قرآنِ مجید چونکہ محض کتابِ آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتابِ تعلیم و تلقین اور صحیفہ وعظ و ارشاد بھی ہے، اس لیے پہلے فقرے میں جو قانونی اُصول بیان کیے گئے تھے، اب اس دوسرے فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک، یہ کہ مذکورۂ بالا چاروں اُصولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ اور ان اُصولوں سے انحراف، یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے، یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری بھی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی دُرست ہو سکتی ہے۔ یہ نصیحت ٹھیک اُس تقریر کے خاتمے پر ارشاد ہوئی ہے جس میں یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک نہایت لطیف طریقے سے مسلمانوں کو مُتنبّہ کیا گیا ہے کہ تمھاری پیش رَو اُمّت دین کے اِن بنیادی اُصولوں سے منحرف ہو کر جس پستی میں گر چکی ہے اس سے عبرت حاصل کرو۔ جب کوئی گروہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے، اور ایسے سرداروں اور رہنماؤں کے پیچھے لگ جاتا ہے جو خدا و رسول کے مطیعِ فرمان نہ ہوں، اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی حاکموں سے کتاب و سنت کی سند پوچھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے، تو وہ اُن خرابیوں میں مبتلا ہونے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔

بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝٦٠ وَاِذَا قِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝٦١ۚ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَاۗءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ڰ

کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا[91]۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسُولؐ کی طرف، تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں[92]۔ پھر اُس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمھارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں[93]

---

۹۱ – یہاں صریح طور پر ”طاغوت“ سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت ”طاغوت“ کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات فیصلے کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔

۹۲ – اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مُقدّمے میں انھیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آتے تھے، مگر جس مُقدّمے میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپؐ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر، ورنہ ہر اس قانون، ہر اس رسم و رواج اور ہر اُس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انھیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

۹۳ – غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ جب اُن کی اِس منافقانہ حرکت کا مسلمانوں کو علم ہو جاتا ہے اور انھیں خوف ہوتا ہے کہ اب باز پُرس ہوگی اور سزا ملے گی، اُس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے لگتے ہیں۔

بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ق فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا
رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیّت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح مُوافقت ہو جائے ـــــ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔ (انھیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے[۹۴]۔ اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمھارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں، اے محمدؐ! تمھارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی

۹۴- یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انھی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ
وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ
تَثْبِيْتًا ۙ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿٦٧﴾
وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں[95]۔ اگر ہم نے انھیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کردو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے[96]۔ حالانکہ جو نصیحت انھیں کی جاتی ہے، اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب[97] ہوتا، اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انھیں سیدھا راستہ دکھادیتے[98]۔ جو اللہ اور رسُولؐ کی اطاعت

---

۹۵ - اس آیت کا حکم صرف حضوؐر کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقے پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپؐ نے عمل کیا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کُن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہٖ۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقے کی تابع نہ ہوجائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔

۹۶ - یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی یہ برداشت نہیں کرسکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کے بجائے کفر و نافرمانی کی راہ لیں گے۔

۹۷ - یعنی اگر یہ لوگ شک اور تذبذب اور تردُّد چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ رسول کی اطاعت و پیروی پر قائم ہوجاتے اور ڈانواں ڈول نہ رہتے تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہوجاتی۔ ان کے خیالات، اَخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائدار بنیاد پر قائم ہوجاتے اور یہ اُن برکات سے بہرہ ور ہوتے جو ایک شاہراہِ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے ہی حاصل ہُوا کرتی ہیں۔ جو شخص تذبذب اور تردُّد کی حالت میں مبتلا ہو، کبھی اِس راستے پر

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ
رَفِيْقًا ؕ ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع

۹ ع ۱۱ ۷

کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاؑ اور صدّیقین اور شہدا اور صالحین[99]۔ کیسے اچھّے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسّر آئیں[100]۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔ ع

چلے اور کبھی اُس راستے پر، اور اطمینان کسی راستے کے بھی صحیح ہونے پر اسے حاصل نہ ہو، اس کی ساری زندگی نقش برآب کی طرح بسر ہوتی ہے اور سعیِ لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

۹۸- یعنی جب وہ شک چھوڑ کر ایمان ویقین کے ساتھ رسول کی اطاعت کا فیصلہ کر لیتے تو اللہ کے فضل سے ان کے سامنے سعی وعمل کا سیدھا راستہ بالکل روشن ہو جاتا اور انھیں صاف نظر آ جاتا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف اٹھے۔

۹۹- صدّیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راست باز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجے پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچّے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے، اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی سُتھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر، کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

شہید کے اصل معنٰی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرزِ عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا، اسے واقعی سچّے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راست باز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں، اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تأمُّل تسلیم کر لیا جائے۔

صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رَوِیّہ رکھتا ہو۔

۱۰۰- یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لیے میسّر آئیں اور جس کا انجام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا خُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ فَانۡفِرُوۡا ثُبَاتٍ اَوِ
انۡفِرُوۡا جَمِيۡعًا (۷۱) وَاِنَّ مِنۡكُمۡ لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡكُمۡ
مُّصِيۡبَةٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَىَّ اِذۡ لَمۡ اَكُنۡ مَّعَهُمۡ شَهِيۡدًا (۷۲)
وَلَئِنۡ اَصَابَكُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوۡلَنَّ كَاَنۡ لَّمۡ تَكُنۡۢ بَيۡنَكُمۡ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو،[۱۰۱] پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں، تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جی چُراتا ہے،[۱۰۲] اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں اِن لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے ــــــ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمھارے اور اس کے درمیان محبّت کا

آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مُردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے، ورنہ درحقیقت بدسیرت اور بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دُنیا ہی میں ایک عذابِ الیم ہے، کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انھی کے ساتھ اُس انجام سے دوچار ہو جو اُن کے لیے مقدّر ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں۔

۱۰۱ – واضح رہے کہ یہ خطبہ اُس زمانے میں نازل ہوا تھا جب اُحُد کی شکست کی وجہ سے اطراف و نواح کے قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گِھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ فُلاں قبیلے کے تیور بگڑ رہے ہیں، فُلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فُلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ پے در پے غداریاں کی جا رہی تھیں۔ ان کے مبلّغین کو فریب سے دعوت دی جاتی تھی اور قتل کر دیا جاتا تھا۔ مدینے کے حُدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے ایک زبردست سعی و جُہد اور سخت جاں فشانی کی ضرورت تھی، تا کہ ان خطرات کے ہجوم سے اسلام کی یہ تحریک مِٹ نہ جائے۔

۱۰۲ – ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ خود تو جی چُراتا ہی ہے، دوسروں کی بھی ہمتیں پست کرتا ہے اور ان کو جہاد سے روکنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ بھی اُسی کی طرح بیٹھ رہیں۔

وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾
فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ
لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ ؕ

تو کوئی تعلّق تھا ہی نہیں ـــــ کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ (ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دُنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں،[۱۰۳] پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا، اُسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مَردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔[۱۰۴]

۱۰۳- یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا دُنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیشِ نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو، جو اللہ اور آخرت پر کامل اعتماد رکھتے ہوں، اور دنیا میں اپنی کامیابی و خوش حالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دُنیوی مفاد اس اُمید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دُنیوی مفاد ہی کی ہو، تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔

۱۰۴- اشارہ ہے اُن مظلوم بچّوں، عورتوں اور مَردوں کی طرف جو مکّے میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے۔ یہ غریب طرح طرح سے

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا ﴿۷۶﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ

۱۰ ع ۶

جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔[۱۰۵] پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔[۱۰۶] ع

تم نے اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔[۱۰۷] کہتے ہیں: خدایا! یہ ہم پر لڑائی

تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے تھے اور دُعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انھیں اس ظلم سے بچائے۔

۱۰۵- یہ اللہ کا دوٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو، یہ اہلِ ایمان کا کام ہے، اور جو واقعی مومن ہے، وہ اس کام سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو، یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔

۱۰۶- یعنی بظاہر شیطان اور اس کے ساتھی بڑی تیاریوں سے اُٹھتے ہیں اور بڑی زبردست چالیں چلتے ہیں، لیکن اہلِ ایمان کو نہ اُن کی تیاریوں سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور نہ ان کی چالوں سے۔ آخرِ کار ان کا انجام ناکامی ہے۔

۱۰۷- اس آیت کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ
الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَلَا تُظْلَمُوْنَ
فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ

کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اَور مُہلت دی؟ ان سے کہو: دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے، اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمّہ برابر بھی نہ کیا جائے گا[۱۰۸]۔ رہی موت، تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمھیں آ کر رہے گی، خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔

اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ

ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے۔ بار بار کہتے تھے کہ صاحب! ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے، ہمیں ستایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں، آخر ہم کب تک صبر کریں، ہمیں مقابلے کی اجازت دی جائے۔ اُس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو اور نماز و زکوٰۃ سے ابھی اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہو، تو یہ صبر و برداشت کا حکم ان پر شاق گزرتا تھا۔ مگر اب جو لڑائی کا حکم دے دیا گیا تو انھی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور جنگ کے خطرات دیکھ دیکھ کر سہما جا رہا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تک مطالبہ نماز اور زکوٰۃ اور ایسے ہی بے خطر کاموں کا تھا اور جانیں لڑانے کا کوئی سوال درمیان میں نہ آیا تھا، یہ لوگ پکّے دین دار تھے۔ مگر اب جو حق کی خاطر جان جوکھوں کا کام شروع ہوا تو ان پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لُوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت نیام سے نکلی پڑتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اُس وقت انھیں خوں ریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز و زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اب جو خدا کے لیے تلوار اُٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے،

مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝٧٨ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ
لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝٧٩ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ
فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝٨٠ ۭ

تمھاری بدولت ہے[١٠٩]۔ کہو: سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اے محمدؐ! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسُول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔ اور جو منہ موڑ گیا، تو بہرحال ہم نے تمھیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[١١٠]۔

خدا کی خاطر لڑنے میں بُزدل بنے جاتے ہیں۔ وہ دستِ شمشیرزن جو نفس اور شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا، اب خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

یہ تینوں مفہوم مختلف قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں اور آیت کے الفاظ ایسے جامع ہیں کہ تینوں پر یکساں دلالت کرتے ہیں۔

١٠٨- یعنی اگر تم خدا کے دین کی خدمت بجا لاؤ اور اس کی راہ میں جانفشانی دکھاؤ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ہاں تمھارا اجر ضائع ہو جائے۔

١٠٩- یعنی جب فتح و ظفر اور کامیابی و سُرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر یہ فضل نبیؐ ہی کے ذریعے سے فرمایا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے پڑنے لگتے ہیں، تو سارا الزام نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بری الذّمہ

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ز فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ
غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ
الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا
كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ
وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

وہ مُنہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیعِ فرمان ہیں۔ مگر جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمھاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسا رکھو، وہی بھروسے کے لیے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اَور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی[۱۱۱]۔

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خوف ناک خبر سُن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اُسے رسُولؐ اور اپنی جماعت کے ذمّہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجائے جو

ہونا چاہتے ہیں۔

۱۱۰- یعنی اپنے عمل کے یہ خود ذمّہ دار ہیں۔ ان کے اعمال کی باز پُرس تم سے نہ ہوگی۔ تمھارے سُپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام و ہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ تمھارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انھیں زبردستی راہِ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اُس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمھارے ذریعے سے پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔

۱۱۱- منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی جس روش پر اُوپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے اس کی بڑی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ انھیں قرآن کے منجانبِ اللہ ہونے میں شک تھا۔ انھیں یقین نہ آتا تھا کہ رسولؐ پر واقعی وحی اُترتی ہے اور

يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا
تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ
بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾
مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ

اِن کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں[112]۔ تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمھاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

پس اے نبیؐ! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اَور کے لیے ذمّہ دار نہیں ہو۔ البتہ اہلِ ایمان کو لڑنے کے لیے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ جو بھلائی کی سِفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ

یہ جو کچھ ہدایات آ رہی ہیں، براہِ راست خدا ہی کے پاس سے آ رہی ہیں۔ اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر، مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اوّل سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جُز دوسرے جُز سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلیِ رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، جس میں متکلّم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں، اور جس پر کبھی نظرِ ثانی تک کی ضرورت نہ پیش آئے۔

[112] وہ چونکہ ہنگامے کا موقع تھا، اس لیے ہر طرف افواہیں اُڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد مبالغہ آمیز اطلاعیں آتیں اور ان سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کو چھپانے کے لیے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انھیں سُن کر غفلت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے، جن کے لیے اسلام اور جاہلیّت کا یہ معرکہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا، جنھیں کچھ

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا
بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ
النصف حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ
ع ۱۱ ۸ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع

پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصّہ پائے گا[۱۱۳]، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمھیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقے کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اُسی طرح[۱۱۴]، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ تم سب کو اُس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچّی بات اور کس کی ہو سکتی ہے[۱۱۵]۔ ع

خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمّہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کوئی بھنک پڑ جاتی، اسے لے کر جگہ جگہ پھونکتے پھرتے تھے۔ انھی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے اور انھیں سختی کے ساتھ مُتنبِّہ فرمایا گیا ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو اُن کو پہنچے، اسے ذمّہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

۱۱۳- یعنی یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے کے لیے لوگوں کو اُبھارے اور اس کا اجر پائے، اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور انھیں اِعلائے کلمۃُ اللہ کی سعی و جُہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صَرف کرے، اور اس کی سزا کا مستحق بنے۔

۱۱۴- اُس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خُلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انھیں ہدایت کی گئی کہ جو تمھارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے، اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے، بلکہ تمھارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے، جو دنیا کو راہِ راست پر لانے اور مسلکِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھا ہو، دُرُشت مزاجی، تُرش رُوئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اُس مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اُٹھا ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ

پھر یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں،[116] حالانکہ جو بُرائیاں اُنھوں نے کمائی ہیں، اُن کی بدولت اللہ انھیں اُلٹا پھیر چکا ہے۔[117]

---

۱۱۵ - یعنی کافر اور مشرک اور مُلحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اُس کا خدائے واحد اور خدائے مُطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدل نہیں سکتی۔ پھر ایک دن وہ سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھا دے گا۔ اس کی قدرت کے احاطے سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالتا پھرے اور کج خُلقی و تُرش کلامی کو زخمِ دل کا مرہم بنائے۔

یہ تو اس آیت کا تعلق اُوپر کی آیت سے ہے۔ لیکن یہی آیت اس پورے سلسلۂ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلتا رہے اور جس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صَرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے، آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

۱۱۶ - یہاں ان منافق مسلمانوں کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصّوں میں اسلام تو قبول کر چکے تھے، مگر ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے بدستور اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے بستے تھے، اور کم و بیش ان تمام کارروائیوں میں عملاً حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ سخت پیچیدہ تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، آخر یہ ہیں تو مسلمان ہی۔ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں اسی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس موقع پر ایک بات کو واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ نہ صرف اس مقام کو، بلکہ قرآنِ مجید کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے میں آدمی ٹھوکر کھائے گا جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافقین میں شمار کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیّبہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ایک چھوٹا سا خطہ عرب کی سرزمین میں ایسا بہم پہنچ گیا جہاں ایک مومن کے لیے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن تھا، تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں، جس جس علاقے اور جس جس قبیلے میں اہلِ ایمان کفار سے دبے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے، وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ کے دارالاسلام میں آ جائیں۔ اُس وقت جو لوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لیے اُٹھ کر نہ آئے کہ انھیں اپنے گھر بار، اعزّہ و اقربا اور اپنے مفادات اسلام کی بہ نسبت عزیز تر تھے، وہ سب منافق قرار دیے گئے۔ اور

أَتُرِيدُونَ أَن تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ط وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن
تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ
سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ
اللَّهِ ط فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ ص
وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۸۹﴾ لا إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ

کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخش دو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستے سے ہٹا دیا اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں، اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو[۱۱۸] اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے

جو لوگ حقیقت میں بالکل مجبور تھے، ان کو ”مُستضعفین“ میں شمار کیا گیا، جیسا کہ آگے رُکوع ۱۴ میں آ رہا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ دار الکُفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب کہ دار الاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوتِ عام ہو، یا کم از کم اس نے ان کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہوں۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کر رہے ہوں، اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں۔ لیکن اگر دار الاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو اور نہ اس نے اپنے دروازے ہی مہاجرین کے لیے کھلے رکھے ہوں، تو اس صورت میں صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنا دے گا، بلکہ وہ منافق صرف اُس وقت کہلائے گا جب کہ فی الواقع کوئی منافقانہ کام کرے۔

۱۱۷ – یعنی جس دورنگی اور مَصلَحت پرستی اور ترجیح دنیا بر آخرت کا اکتساب انھوں نے کیا ہے، اس کی بدولت اللہ نے انھیں اسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انھوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی کی تو ضرور تھی، مگر اس سرحد میں آنے اور ٹھیرنے کے لیے یکسو ہو جانے کی ضرورت تھی، ہر اُس مفاد کو قربان کر دینے کی ضرورت تھی جو اسلام و ایمان کے مفاد سے ٹکراتا ہو، اور آخرت پر ایسے یقین کی ضرورت تھی جس کی بنا پر آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی دُنیا کو قربان کر سکتا ہو۔ یہ ان کو گوارا نہ ہُوا،

اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ
صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ
شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ
يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ
سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ
وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ
فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ

جا ملیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے[119]۔ اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلّط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمھیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنے کا موقع پائیں گے اس میں کُود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمھارے مقابلے سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمھارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں، تو جہاں وہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو، ان پر

اس لیے جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں اُدھر ہی واپس چلے گئے۔ اب ان کے معاملے میں اختلاف کا کون سا موقع باقی ہے؟

۱۱۸- یہ حکم اُن منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف مُعاندانہ کارروائیوں میں عملاً حصہ لیں۔

۱۱۹- یہ اِستثنا اِس حکم سے نہیں ہے کہ "انھیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے"، بلکہ اس حکم سے ہے کہ "انھیں

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾ ع وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ
يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ
كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ

ہاتھ اُٹھانے کے لیے ہم نے تمھیں کُھلی حُجّت دے دی ہے ؏

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دُوسرے مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ اُس سے چُوک ہو جائے۔[۱۲۰] اور جو شخص کسی مومن کو غَلَطی سے قتل کردے تو اس کا کفّارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے[۱۲۱] اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے،[۱۲۲] اِلّا یہ کہ وہ خوں بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفّارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

پکڑا اور مارا جائے"۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے حُدود میں جا پناہ لیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہو، تو اس کے علاقے میں ان کا تعاقب نہیں کیا جائے گا اور نہ یہی جائز ہوگا کہ دار الاسلام کا کوئی مسلمان غیر جانب دار ملک میں کسی واجب القتل منافق کو پائے اور اسے مار ڈالے۔ احترام دراصل منافق کے خون کا نہیں بلکہ معاہدے کا ہے۔

۱۲۰ – یہاں اُن منافق مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کے قتل کی اوپر اجازت دی گئی ہے، بلکہ اُن مسلمانوں کا ذکر ہے جو یا تو دار الاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر دار الحرب یا دار الکفر میں بھی ہوں تو دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں میں اُن کی شرکت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اُس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حقیقی مجبُوریوں کی بنا پر دشمنِ اسلام قبیلوں کے درمیان ٹھیرے ہوئے تھے۔ اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آجاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلے پر حملہ کرتے اور وہاں نادانستگی میں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا ہے جب کہ غَلَطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔

۱۲۱ – چونکہ مقتول مومن تھا اس لیے اس کے قتل کا کفارہ ایک مومن غلام کی آزادی قرار دیا گیا۔

۱۲۲ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوں بہا کی مقدار سو اُونٹ، یا دو سو گائیں، یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خوں بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انھی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے معیّن کی جائے گی۔ مثلاً نبیؐ کے زمانے میں نقد خوں بہا دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا ۸ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے

وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ
أَهْلِهِۦ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ
مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾

اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمھارا مُعاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔[۱۲۳] پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔[۱۲۴] یہ اِس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ[۱۲۵] ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔

فرمایا کہ اُونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے، لہٰذا اب سونے کے سکّے میں ایک ہزار دینار، یا چاندی کے سکّے میں ۱۲ ہزار درہم خوں بہا دلوایا جائے گا۔ مگر واضح رہے کہ خوں بہا کی یہ مقدار جو مقرر کی گئی ہے، قتلِ عمد کی صورت کے لیے نہیں ہے بلکہ قتلِ خطا کی صورت کے لیے ہے۔

۱۲۳ – اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دار الاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو خوں بہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔

اگر وہ دار الحرب کا باشندہ ہو تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا خوں بہا کچھ نہیں ہے۔

اگر وہ کسی ایسے دار الکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ خوں بہا بھی دینا ہوگا، لیکن خوں بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اُس مُعاہَد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں از رُوئے مُعاہدہ دی جانی چاہیے۔

۱۲۴ – یعنی روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو ازسرِ نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

۱۲۵ – یعنی یہ ”جُرمانہ“ نہیں بلکہ ”توبہ“ اور ”کفّارہ“ ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی، بلکہ عُموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبُوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حُقوق کے ذریعے سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے، اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے، تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آیندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادے سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لُغوی معنیٰ ہیں: ”چھپانے والی چیز“۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا ”کفّارہ“ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ
غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا
لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بُوجھ کر قتل کرے تو اُس کی جزا جہنّم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔

اَے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمھاری طرف سلام سے تقدیم کرے، اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تُو مومن نہیں ہے[۱۲۶]۔ اگر تم دُنیوی فائدہ

نیکی اُس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

۱۲۶ – ابتدائے اسلام میں ”السّلام علیکم“ کا لفظ مسلمانوں کے لیے شِعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنٰی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شِعار (password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غَرَض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوجِ مخالف کے آدمیوں سے مُمَیَّز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شِعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ خُصوصیّت کے ساتھ اُس زمانے میں اس شعار کی اہمیّت اس وجہ سے اَور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آ جاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے ”السّلام علیکم“ یا ”لا الٰہ الا اللہ“ پکارتا تھا، مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لُوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، اس کے متعلّق تمھیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ
قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي
الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ
دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمھارے لیے بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا،[۱۲۷] لٰہذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ

حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمھارے ہاتھ سے مارا جائے۔ اور بہر حال تمھارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غَلَطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غَلَطی کرو۔

[۱۲۷] – یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے، اور تمھارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا

الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے[۱۲۸]، اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے[۱۲۹] ان کی رُوحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبُور تھے۔

بلند کرنے اُٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں، ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

۱۲۸- یہاں اُن بیٹھنے والوں کا ذکر نہیں ہے جن کو جہاد پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ بہانے کر کے بیٹھ رہیں، یا نَفِیرِ عام ہو اور جہاد فرضِ عین ہو جائے پھر بھی وہ جنگ پر جانے سے جی چُرائیں۔ بلکہ یہاں ذکر اُن بیٹھنے والوں کا ہے جو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صورت میں میدانِ جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں۔ پہلی دو صورتوں میں جہاد کے لیے نہ نکلنے والا صرف منافق ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی بھلائی کا وعدہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ وہ کسی حقیقی معذوری کا شکار ہو۔ بخلاف اس کے یہ آخری صورت ایسی ہے جس میں اسلامی جماعت کو پوری فوجی طاقت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ محض اس کا ایک حصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر امام کی طرف سے اپیل کی جائے کہ کون سرباز ہیں جو فُلاں مہم کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، تو جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ افضل ہیں بہ نسبت اُن کے جو دوسرے کاموں میں لگے رہیں، خواہ وہ دوسرے کام بھی بجائے خود مفید ہی ہوں۔

۱۲۹- مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبُوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے، درآں حالے کہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا، کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلے میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا، وہ کوئی واقعی مجبُوری نہ تھی، بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفاد کی محبّت تھی جسے انھوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۱۱۶)

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ
مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۹۷ۙ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا
يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۹۸ۙ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۹۹ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ
بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۰۰ۧ ع ۱۳ ۱۱

فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟[۱۳۰] یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجایش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستے ہی میں اسے موت آ جائے، اُس کا اجر اللہ کے ذمّے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔[۱۳۱] ع

---

۱۳۰ — یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانونِ شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

۱۳۱ — یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو، اس کے لیے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے: ایک، یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جِدّوجُہد کرتا رہے، جس طرح انبیا علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ

اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو[۱۳۲] (خُصُوصاً)

کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکامِ کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ **لا ھجرۃ بعد الفتح**، یعنی فتحِ مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اس وقت کے حالات میں اہلِ عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا۔ جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر و دارالحرب تھا اور صرف مدینہ و اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے، مسلمانوں کے لیے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتحِ مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

۱۳۲ - زمانۂ امن کے سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نماز میں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ اور حالتِ جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو، ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رُخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رخ ہو۔ سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رُکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارے ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو خون لگا ہوا ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر ایسی پر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً مؤخر کی جائے جیسے جنگِ خندق کے موقع پر ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا تو التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے، سنتیں پڑھنے کا التزام آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نفل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے، حتّٰی کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علما ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حَنَفِیَہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب راستہ طے کر رہا ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب کسی مقام پر منزل کرے اور اطمینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

جس سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ۔ ابنِ عمرؓ، ابنِ مسعودؓ اور عطاؒ کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے، اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حَنَفِیَّہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے، رہی سفر کی نوعیّت، تو وہ بجائے خود ثواب یا عتاب کی مستحق ہو سکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض ائمہ نے ”مضایقہ نہیں“ (فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ) کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے۔ آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اُٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعیؒ نے اختیار کی ہے، اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترکِ قصر کو ترکِ اَولیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمدؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک رِوایت میں امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپؐ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے قصر نہ کیا ہو۔ اسی کی تائید میں ابنِ عباسؓ اور دوسرے متعدِّد صحابہؓ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جب حج کے موقع پر مِنٰی میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہؓ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمانؓ نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکّے میں شادی کر لی ہے، اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں مُتأہّل ہُوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں دُرست ہیں، لیکن یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے علاوہ خود حضرت عائشہؓ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت بین السفر و الحضر بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرودگاہ پر حسبِ موقع کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جا سکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہؓ نے اسی حالت کے متعلّق فرمایا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی۔ رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ ”مضایقہ نہیں اگر قصر کرو“ تو ان کی نظیر سورۂ بَقَرہ رکوع ۱۹ میں گزر چکی ہے جہاں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسکِ حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصود لوگوں کے اِس اندیشے کو دُور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا، یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

مقدارِ سفر جس میں قصر کیا جا سکتا ہے، ظاہریّہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالکؒ کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔ ابنِ عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعیؒ سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت اَنَسؓ ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام اَوزاعیؒ اور امام زُہریؒ حضرت عمرؓ کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حَسَن بصری دو دن،

إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ
كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾ وَإِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ

جب کہ تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں ستائیں گے[۱۳۳]، کیونکہ وہ کھلّم کھلّا تمھاری دشمنی پر تُلے ہوئے ہیں۔
اور اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے

اور امام ابو یوسفؒ دو دن سے زیادہ کی مسافت میں قصر جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اُونٹ کی سواری سے تین دن صَرف ہوں (یعنی تقریباً ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل) اس میں قصر کیا جاسکتا ہے۔ یہی رائے ابنِ عمرؓ، ابنِ مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی ہے۔

اثنائے سفر میں دَورانِ قیام جس میں قصر کیا جاسکتا ہے، مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جہاں آدمی نے چار دن ٹھیرنے کا ارادہ کرلیا ہو، وہاں پوری نماز پڑھنی ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جہاں چار دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ہو، وہاں قصر جائز نہیں۔ امام اَوزاعیؒ ۱۳ دن اور امام ابوحنیفہؒ ۱۵ دن یا اس سے زیادہ کی نیتِ قیام پر پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ آدمی مجبوراً رُکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال ہو کہ مجبوری دُور ہوتے ہی وطن واپس ہو جائے گا تو تمام علما کا اتفاق ہے کہ ایسی جگہ بلاتعیُّنِ مدّتِ قصر کیا جاتا رہے گا۔ صحابۂ کرامؓ سے بکثرت مثالیں ایسی منقول ہیں کہ انھوں نے ایسے حالات میں دو دو سال مسلسل قصر کیا ہے۔ امام احمد ابنِ حنبلؒ اسی پر قیاس کر کے قیدی کو بھی اس کے پُورے زمانۂ قید میں قصر کی اجازت دیتے ہیں۔

۱۳۳ - ظاہریّوں اور خارجیوں نے اس فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ قصر صرف حالتِ جنگ کے لیے ہے اور حالت امن کے سفر میں قصر کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن حدیث میں مستند رِوایَت سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہی شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو حضورؐ نے فرمایا: صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته۔ ”یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمھیں بخشا ہے، لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو۔“ یہ بات قریب قریب تواتُر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں کے سفر میں قصر فرمایا ہے۔ ابنِ عباسؓ تصریح کرتے ہیں کہ ان النبی صلی الله عليه وسلم خرج من المدينة الى مكة لا يخاف الا ربّ العٰلمين فصلى ركعتين۔ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت ربّ العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، مگر آپؐ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔“ اسی بنا پر میں نے ترجمے میں خُصوصاً کا لفظ قوسین میں بڑھا دیا ہے۔

الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۣ قف
فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى
لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ
وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ

کھڑے[۱۳۴] ہو تو چاہیے کہ ان[۱۳۵] میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے، آ کر تمھارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنّا رہے اور اپنے اسلحہ لیے رہے[۱۳۶]، کیوں کہ کفّار اِس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو

---

۱۳۴ – امام ابو یوسفؒ اور حسن بن زیادؒ نے ان الفاظ سے یہ گمان کیا ہے کہ صلوٰۃِ خوف صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے لیے مخصوص تھی۔ لیکن قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مُخاطَب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے صلوٰۃِ خوف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بکثرت جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے کہ انھوں نے حضورؐ کے بعد بھی صلوٰۃِ خوف پڑھی ہے اور اس باب میں کسی صحابی کا اختلاف مروی نہیں ہے۔

۱۳۵ – صلوٰۃِ خوف کا یہ حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ دشمن کے حملے کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکۂ قتال گرم نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ عملاً جنگ ہو رہی ہو تو اس صورت میں حَنَفِیَہ کے نزدیک نماز مؤخر کر دی جائے گی۔ امام مالکؒ اور امام ثَوریؒ کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی سی زد و خورد بھی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقع پر چار نمازیں نہیں پڑھیں اور پھر موقع پا کر علی الترتیب انھیں ادا کیا، حالانکہ غزوۂ خندق سے پہلے صلوٰۃِ خوف کا حکم آ چکا تھا۔

۱۳۶ – صلوٰۃِ خوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک جنگی حالات پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے اور امامِ وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقے کی اجازت جنگی صورتِ حال دے اسی کو اختیار کرے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصّہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصّہ دشمن کے مقابلے پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصّہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصّہ آ کر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔ اس طرح

فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ
كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا
اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا (۱۰۲) فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا

وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضایقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کُن عذاب مہیّا کر رکھا ہے[۱۳۷]۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے

امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک ایک رکعت۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصّہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے، پھر دُوسرا حصہ آ کر ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھے، پھر دونوں حصے باری باری سے آ کر اپنی چھُوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطورِ خود ادا کر لیں۔ اس طرح دونوں حصّوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہو گی، اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تَشَہُّد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے۔ پھر دوسرا حصّہ تیسری رکعت میں آ کر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطورِ خود ایک رکعت مع تَشَہُّد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرا حصّہ آ کر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اُٹھ کر پڑھ لیں۔ اس صورت میں امام کو دوسری رکعت میں طویل قیام کرنا ہو گا۔

پہلی صورت کو ابنِ عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ اور مجاہدؒ نے رِوایَت کیا ہے۔ دوسرے طریقے کو عبداللہؓ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور حَنَفِیّہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقے کو حسن بصریؒ نے ابوبکرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور چوتھے طریقے کو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اور اس کا ماخذ سہل بن ابی حَثْمہ کی روایت ہے۔

اِن کے علاوہ صلوٰۃِ خوف کے اور بھی طریقے ہیں جن کی تفصیل مبسُوطات میں مل سکتی ہے۔

۱۳۷ – یعنی یہ احتیاط جس کا حکم تمھیں دیا جا رہا ہے، محض دُنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے، ورنہ دراصل فتح و شکست کا مدار تمھاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے۔ اس لیے ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کرتے ہوئے تمھیں اس امر کا یقین رکھنا

وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ
الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِي
ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا
تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿١٠٤﴾ ع اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ ع ١٥ ١٢

اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

اس گروہ[١٣٨] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور تم اللہ سے اُس چیز کے اُمّیدوار ہو جس کے وہ اُمّیدوار نہیں ہیں۔[١٣٩] اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ ع

[١٤٠] اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے، تاکہ جو راہِ راست اللہ نے

چاہیے کہ جو لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بُجھانے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ انھیں رسوا کرے گا۔

۱۳۸ – یعنی گروہ کفّار جو اُس وقت اسلام کی دعوت اور نظامِ اسلامی کے قیام کی راہ میں مانع و مزاحم بن کر کھڑا ہوا تھا۔

۱۳۹ – یعنی تعجب کا مقام ہے اگر اہلِ ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں جتنی کفار باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں، حالانکہ اُن کے سامنے صرف دنیا اور اس کے ناپائیدار فائدے ہیں اور اس کے برعکس اہلِ ایمان رب السماوات والارض کی خوشنودی و تقرُّب اور اس کے اَبَدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

۱۴۰ – اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملے سے بحث کی گئی ہے جو اُسی زمانے میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طَعمہ یا بشیر بن اُبیرِق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زِرہ چُرا لی۔ اور جب اس کا تجسس شروع ہوا تو مالِ مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زِرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِستغاثہ کیا اور طَعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔ مگر طَعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اُس یہودی پر الزام تھوپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی بَراءت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طَعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۱۰۵)ۙ
وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۰۶)ۚ وَلَا
تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا (۱۰۷)ۚۙ يَّسْتَخْفُوْنَ

تمھیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو، اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں[۱۴۱]، تم اُن کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات

رہے اور کہا کہ یہ یہودی خبیث، جو حق کا انکار اور اللہ کے رسولؐ سے کفر کرنے والا ہے، اِس کی بات کا کیا اعتبار، بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے، کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدّمے کی ظاہری رُوداد سے متاثّر ہو کر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مُستغیث کو بھی بنی اُبَیرِق پر الزام عائد کرنے پر تنبیہ فرماتے۔ اتنے میں وحی آئی اور معاملے کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپؐ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا۔ اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی ہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط رُوداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن اُس وقت، جب کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کش مکش برپا تھی، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رُودادِ مقدّمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے، تو اسلام کے مخالفوں کو آپؐ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت اور خود دعوتِ اسلامی کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے، یہاں تو وہی جتھا بندی اور عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدّمے میں مداخلت فرمائی۔

اِن رکوعوں میں ایک طرف اُن مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنھوں نے محض خاندان اور قبیلے کی عصبیّت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملے میں کسی تعصّب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسرِ باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسرِ حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

۱۴۱ – جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے، وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطورِ امانت ہیں ان پر بے جا تصرف کر کے وہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا

مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ
مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ قف
فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ
وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ
اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا
فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾
وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ

چھُپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھُپا سکتے۔ وہ تو اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھُپ کر اُس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ اِن کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے اِن مجرموں کی طرف سے دُنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا، مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون اِن کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے، تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو بُرائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اُسی کے لیے وبال ہوگی، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا، اُس نے تو

ساتھ دیں۔ اور اپنے ضمیر کو، جسے اللہ نے اس کے اَخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِّ راہ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست بُرد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے، تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

ع ٨ ١٦ ١٣

احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝١١٢ ع وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ
وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا
يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ
الثلثة اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝١١٣ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ
نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ
بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝١١٤ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ

بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ ع

اے نبیؐ! اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمھارے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالاں کہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمھارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل[١٤٢] کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمھیں معلوم نہ تھا، اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے، اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور

---

[١٤٢] یعنی اگر وہ غلط رُوداد پیش کر کے تمھیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انھی کا تھا، تمھارا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ ۱۷ ع ۲ ۱۴
لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ ﴿۱۱۷﴾

اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالے کہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا[۱۴۳] اور اسے جہنّم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ ع

اللہ کے ہاں[۱۴۴] بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے، اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا، وہ تو گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں۔ وہ اُس باغی شیطان کو معبُود بناتے ہیں[۱۴۵]

جو شخص حاکم کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے، وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا، حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ حاکم کے فیصلے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۹۷)

۱۴۳- جب مذکورہ بالا مقدّمے میں وحیِ الٰہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خائن مسلمان کے خلاف، اور اُس بے گناہ یہودی کے حق میں، فیصلہ صادر فرما دیا تو اس منافق پر جاہلیّت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کُھلّم کُھلّا مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۴- اس رکوع میں اُوپر کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی جاہلیّت کے طیش میں آ کر یہ شخص جس راہ کی طرف گیا ہے وہ کیسی راہ ہے، اور صالحین کے گروہ سے الگ ہو کر جن لوگوں کا ساتھ اس نے اختیار کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

۱۴۵- شیطان کو اس معنی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسمِ پرستش ادا کرتا ہو اور اس کو

وقف لازم لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ لا
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ ؕ يَعِدُهُمْ

جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے۔ (وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں) جس نے اللہ سے کہا تھا کہ "میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصّہ لے کر رہوں گا،[۱۴۶] میں انھیں بہکاؤں گا، میں انھیں آرزوؤں میں اُلجھاؤں گا، میں انھیں حکم دُوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے،[۱۴۷] اور میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردّوبدل کریں گے۔"[۱۴۸] اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنالیا، وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ اِن لوگوں سے وعدے کرتا ہے

الوہیّت کا درجہ دیتا ہو۔ البتہ اُسے معبُود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور جدھر جدھر وہ چلاتا ہے اُدھر چلتا ہے، گویا کہ یہ اُس کا بندہ ہے اور وہ اِس کا خدا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چُون وچرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی "عبادت" ہے، اور جو شخص اس طرح کی اطاعت کرتا ہے، وہ دراصل اس کی عبادت بجالاتا ہے۔

۱۴۶ - یعنی اُن کے اوقات میں، ان کی محنتوں اور کوششوں میں، ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں، ان کے مال اور ان کی اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور ان کو فریب دے کر ایسا پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک مُعتدبِہٖ حصہ میری راہ میں صَرف کریں گے۔

۱۴۷ - اہلِ عرب کے تَوہُمّات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اُونٹنی پانچ یا دس بچے جَن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اُونٹ کے نُطفے سے دس بچّے ہو جاتے، اُسے بھی دیوتا کے نام پر پُن کر دیا جاتا تھا اور کان چیرنا اس بات کی علامت تھا کہ یہ پُن کیا ہوا جانور ہے۔

۱۴۸ - خدائی ساخت میں ردّوبدل کرنے کا مطلب اشیا کی پیدائشی بناوٹ میں ردّوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے کہ تہذیب تو نام ہی ان تصرُّفات

وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا

اور انھیں اُمیدیں دلاتا ہے،[۱۴۹] مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنّم ہے، جس سے خلاصی کی کوئی صُورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، تو انھیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچّا ہوگا۔

انجامِ کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی بُرائی کرے گا

کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے۔ دراصل اس جگہ جس ردّوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اُسے پیدا نہیں کیا ہے، اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیا کی فطرت کے خلاف کرتا ہے، اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے، اس آیت کی رو سے شیطان کی گمراہ کُن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عملِ قومِ لوط، ضبطِ ولادت، رَہبانیت، برہمچرج، مَردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مَردوں کو خواجہ سَرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سُپرد کی ہیں اور انھیں تمدُّن کے اُن شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں، دراصل یہ معنٰی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالقِ کائنات کے ٹھیرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔

۱۴۹ - شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور اُمیدوں کے بل پر چلتا ہے۔ وہ انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جب کسی غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو اس کے آگے ایک سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لُطف و لذّت اور کامیابیوں کی اُمید، کسی کو قومی سربلندیوں کی توقع، کسی کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک

يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٢٣﴾
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾ وَمَنْ
اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿١٢٥﴾ وَلِلّٰهِ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
مُّحِيْطًا ﴿١٢٦﴾ ع وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ ع ١٨ ١١ ١٥

اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ اس شخص سے بہتر اور کس کا طریقِ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رَوِیّہ نیک رکھا اور یکسُو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اُس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے[۱۵۰] اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے۔[۱۵۱] ع

لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔[۱۵۲] کہو، اللہ تمھیں اُن کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے،

پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسا کہ نہ خدا ہے نہ آخرت، بس مر کر مٹی ہو جانا ہے، کسی کو یہ تسلّی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فُلاں کے طفیل اور فُلاں کے صدقے میں بچ نکلو گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے، اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

۱۵۰- یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور خود سَری و خود مختاری سے باز آ جانا اِس لیے بہترین طریقہ ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔ جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رَوِیّہ یہی ہے کہ اس کی بندگی و اطاعت پر راضی ہو جائے اور سرکشی چھوڑ دے۔

وَمَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فِى الۡكِتٰبِ فِىۡ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِىۡ لَا تُؤۡتُوۡنَهُنَّ مَا
كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرۡغَبُوۡنَ اَنۡ تَنۡكِحُوۡهُنَّ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ
الۡوِلۡدَانِ ۙ وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ

اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سُنائے جارہے[۱۵۳] ہیں۔ یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلّق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے[۱۵۴] اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو[۱۵۵])، اور وہ احکام جو اُن بچّوں کے متعلّق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے[۱۵۶]۔ اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے

۱۵۱- یعنی اگر انسان اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا، اللہ کی قدرت اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

۱۵۲- اس کی تصریح نہیں فرمائی گئی کہ عورتوں کے معاملے میں لوگ کیا پُوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے، اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

۱۵۳- یہ اصل اِستِفتا کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اِسی سورت کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچّوں کے متعلق بالعُموم ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفّظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی تھی۔ مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطورِ خود چھیڑ دیا گیا۔

۱۵۴- اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ”اگر یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں......“ (سورۂ نساء، آیت ۳)

۱۵۵- تَرۡغَبُوۡنَ اَنۡ تَنۡكِحُوۡهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو“ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”تم ان سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے“۔ حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی، وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مال دار ہونے کے ساتھ خوب صورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر وہ بدصُورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے، تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا
نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ
وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا

وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

جب[۱۵۷] کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضایقہ نہیں اگر میاں اور بیوی (کچھ حُقوق کی کمی بیشی پر) آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔[۱۵۸] نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں[۱۵۹]، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو

کرنے والا ہو۔

۱۵۶- اشارہ ہے اُن احکام کی طرف جو اِسی سُورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں یتیموں کے حقوق کے متعلق ارشاد ہوئے ہیں۔

۱۵۷- یہاں سے اصل اِستفتا کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہو گئیں: ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مُساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلّقِ زن و شو کے قابل نہیں رہی ہے، اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبّت رکھے؟ جسمانی تعلّق میں بھی یکسانی برتے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے، وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کر لے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا؟ یہ سوالات ہیں جن کا جواب اِن آیات میں دیا گیا ہے۔

۱۵۸- یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مُصالحت کر کے ایک عورت اُسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصّہ گزار چکی ہے۔

۱۵۹- عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ
تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ
فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ ‌ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

یقین رکھو کہ اللہ تمھارے اس طرزِ عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔[۱۶۰] بیویوں کے درمیان پُورا پُورا عدل کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو اِس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا (قانونِ الٰہی کا منشا پُورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ) ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو اَدھر لٹکتا چھوڑ دو۔[۱۶۱] اگر تم اپنا طرزِ عمل دُرست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ

جو عورت دل سے اُتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو، اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حُقوق ناقابلِ برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۱۶۰- یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبۂ فیّاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعُموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اس کی رفیقِ زندگی رہی ہے، اور اس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظرِ التفات اس سے پھیر لے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اُتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

۱۶۱- مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مُساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوب صورت ہے اور دوسری بدصورت، ایک جوان ہے اور دُوسری سِنّ رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوُت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبّت و رغبت اور جسمانی تعلّق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مُساوات رکھی جائے۔ بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اُس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو، تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلّق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے، لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلّق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدُّدِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ ”تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے“ تو

غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الۡاَرۡضِ ؕ وَلَقَدۡ وَصَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ
اِيَّاكُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيۡدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ اَيُّهَا
النَّاسُ وَيَاۡتِ بِاٰخَرِيۡنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنۡ

چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۱۶۲]۔ لیکن اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دُوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کارسازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمھاری جگہ دُوسروں کو لے آئے، اور وہ اِس کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو شخص

یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ "لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو"، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

۱۶۲- یعنی اگر حتّی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملے میں صادر ہوں گی، انھیں اللہ معاف فرما دے گا۔

كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا ع ۱۹ ۸ ۱۶
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

محض ثوابِ دُنیا کا طالب ہو، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دُنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔[۱۶۳] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے عَلَم بردار[۱۶۴] اور خدا واسطے کے گواہ بنو،[۱۶۵] اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر

۱۶۳- بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد، اور بالخصوص تمدّن و معاشرت کے اُن پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اِس قسم کے چند پُر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو اُن احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اُوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حُسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے، لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں:

ایک یہ کہ تم کبھی اِس بھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمھارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمھاری اور اس کی، سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالکِ زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمھیں اور تمھاری طرح پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمّتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمھاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی تمام اُمّتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمھاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کر دے گا اور تمھارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمھارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس سے کس قسم کے

وَالْأَقْرَبِيْنَ ۚ إِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا ۖ قف
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى أَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَإِنْ تَلْوٗٓا أَوْ تُعْرِضُوْا
فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچّائی سے پہلو بچایا، تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، [۱۶۶]ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل

فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دُنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر اَبَدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو، تو خدا ابھی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمھارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمھاری کھیتی کو اَبد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے، مگر یہ تمھارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلے کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دُنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمھارے حصے میں آئیں۔

آخر میں فرمایا اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی شاہِ بے خبر کی طرح اندھا دُھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پُوری باخبری کے ساتھ اپنی اِس کائنات پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صَرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے ان بخششوں کی اُمید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

۱۶۴ – یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے عَلَم بردار بنو۔ تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

۱۶۵ – یعنی تمھاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رُو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (۱۳۶)
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا
كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا (۱۳۷) ۭ

کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا[۱۶۷] وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دُور نکل گیا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے،[۱۶۸] تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی اُن کو راہِ راست دکھائے گا۔

خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے مدِّ نظر نہ ہو۔

۱۶۶- ایمان لانے والوں سے کہنا کہ "ایمان لاؤ" بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہاں لفظ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اُسے سچے دل سے مانے۔ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جُہد کے مَصرَف کو بالکل اُس عقیدے کے مطابق بنا لے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب اُن تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنٰی کے لحاظ سے "ماننے والوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

۱۶۷- کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے۔ دوسرے یہ کہ زبان سے تو مانے مگر دل سے نہ مانے، یا اپنے رویّے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعوٰی کر رہا ہے، فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنٰی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر مُتنبّہ کرنا ہے کہ اسلام کے اِن اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی اِن دونوں اقسام میں سے جس قسم کا برتاؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دُوری اور باطل کی راہوں میں سرگشتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

۱۶۸- اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیُّلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھی، مسلمان ہو گئے اور

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾ الَّذِیْنَ
یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ
اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ
نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا
وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ
حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ

اور جو منافق اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مُژدہ سُنا دو کہ اُن کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزّت کی طلب میں اُن کے پاس جاتے ہیں؟[۱۶۹] حالانکہ عزّت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اِس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دُوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انھی کی طرح ہو۔[۱۷۰] یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور

جب دُوسری لہر اُٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پُوجا کرنے کے لیے بے تکلّف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ "پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے، اور اپنی قوت اس سعی و جُہد میں صَرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلے میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے، جس کا وبال بھی مجرّد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

۱۶۹ – "عزّت" کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزّت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنیٰ میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزّت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزّت "ناقابلِ ہتک حرمت" کا ہم معنیٰ ہے۔

وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ
كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ
لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ؑ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا

کافروں کو جہنّم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمھارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں (کہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے)۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمھاری ہوئی تو آ کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پلّا بھاری رہا تو اُن سے کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا؟[۱۷۱] بس اللہ ہی تمھارے اور ان کے معاملے کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور (اس فیصلے میں) اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ع

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اُٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی

---

۱۷۰ – یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسولؐ کا مذاق اُڑاتے ہوئے سنتا ہے، تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ (جس حکم کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، وہ سورۂ انعام آیت ۶۸ میں بیان ہوا ہے)۔

۱۷۱ – ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں، اُن کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۂ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر

قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾

یاد کرتے ہیں[۱۷۲]۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پُورے اِس طرف ہیں نہ پُورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو، اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے[۱۷۳]۔

ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں، ان کی خاطر یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقے سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی ”متعصّب مسلمان“ نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمھارے ساتھ ہیں، فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی مُوافقت تمھارے ساتھ ہے، اور کفر و اسلام کی کش مکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمھارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔

۱۷۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عُذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدمِ دلچسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں، اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نمازِ باجماعت سے غیر حاضر رہنا اُس زمانے میں اِس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جا سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہلِ ایمان سے ممیّز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھیرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔ بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اُٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آ نہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

۱۷۳- یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسولؐ کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اُسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملے کو رزق کی مثال سے سمجھیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے، اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا
مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجّت دے دو؟ یقین جانو کہ منافق جہنّم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جو اُن میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں

مگر اللہ ہر شخص کو رزق اُس راستے سے دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستے سے طلب کرے اور اُسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے، اُسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تُلا ہُوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے، اس کو خدا کے اِذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے، اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزقِ حلال لکھ دے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا۔ رہی یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، تو اس کا انحصار سراسر آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، سچّائی کا طالب ہے اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے، تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صَرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا، اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ
بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں[۱۷۴]، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو[۱۷۵] اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قدر دان ہے[۱۷۶] اور سب کے حال سے واقف ہے۔

۱۷۴- اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبّتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اُسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

۱۷۵- شُکر کے اصل معنیٰ اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی اور نمک حرامی کا رویہ اختیار نہ کرو، بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمھیں سزا دے۔

ایک محسن کے مقابلے میں صحیح احسان مندانہ رَوِیّہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے۔ انھی تین چیزوں کے مجموعے کا نام شکر ہے۔ اور اس شُکر کا اقتضا یہ ہے کہ اوّلاً آدمی احسان کو اُسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکریہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصّہ دار نہ بنائے۔ ثانیاً، آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبّت اور وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو اور اُس کے مخالفوں سے محبّت و اخلاص اور وفاداری کا ذرّہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ ثالثاً، وہ اپنے محسن کا مطیع و فرماں بردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشا کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۱۷۶- اصل میں لفظ ”شاکر“ استعمال ہوا ہے، جس کا ترجمہ ہم نے ”قدر دان“ کیا ہے۔ شکر جب اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہو تو اس کے معنیٰ ”اعترافِ خدمت“ یا قدردانی کے ہوں گے، اور جب بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہو تو اس کو اعترافِ نعمت یا احسان مندی کے معنیٰ میں لیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکریہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ناقدر شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں بجا لائیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (۱۴۸) اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۱۴۹) اِنَّ الَّذِيْنَ
يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ (مظلوم ہونے کی صُورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔[۱۷۷]

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوںؑ سے کفر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسُولوںؑ کے

کسی کی خدمات صِلہ و انعام سے محروم نہیں رہتیں، بلکہ وہ نہایت فیّاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتا ہے۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں، اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر محاسبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے، اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

۱۷۷- اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجے کی اَخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور بُت پرست، سب کے سب اُس وقت ہر ممکن طریقے سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اِس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصّے کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اُٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو، اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اُسے حق پہنچتا ہے۔ لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا عَلانیہ، ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور بُرائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اَخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو، اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بُردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصُوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر

وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ
حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱ ع ۱۱ ۱

درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پکّے کافر ہیں[۱۷۸] اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیّا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل وخوار کر دینے والی ہو گی ـــــ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں، اور اُن کے درمیان تفریق نہ کریں، اُن کو ہم ضرور اُن کے اجر عطا کریں گے[۱۷۹]، اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے[۱۸۰] ع

ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظّرف بنو۔

۱۷۸- یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوںؑ کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوںؑ کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے، سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرّہ برابر شک کی گنجایش نہیں۔

۱۷۹- یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبود اور مالک تسلیم کر لیں، اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوںؑ کی پیروی قبول کریں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجے کا عملِ صالح کریں گے اسی درجے کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے خدا کی لاشریک الٰہیّت و رُبوبیّت ہی تسلیم نہ کی، یا جنھوں نے خدا کے نمایندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو ردّ کرنے کا باغیانہ طرزِ عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

۱۸۰- یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، ان کا حساب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا، بلکہ ان کے ساتھ بہت نرمی اور درگزر سے کام لے گا۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ
سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى

یہ اہلِ کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر اُن پر نازل کراؤ[۱۸۱] تو اِس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰؑ سے کر چکے ہیں۔ اُس سے تو اِنھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اِسی سرکشی کی وجہ سے یکایک اِن پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی۔[۱۸۲] پھر انھوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔[۱۸۳] اس پر بھی ہم نے اِن سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰؑ کو

---

[۱۸۱] مدینے کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپؐ کی رسالت اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو، یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اُوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آ جائے کہ یہ محمدؐ ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔

[۱۸۲] یہاں کسی واقعے کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے، اِس لیے اُن کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ سورۂ بقرہ، آیت ۵۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۷۱)

[۱۸۳] کھلی کھلی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مُشاہدے میں آ چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سلطنتِ مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا، وہ کوئی گائے کا بچّہ نہ تھا بلکہ اللہ ربّ العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جُھکی تو اپنے مُحسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مُورت ہی کے آگے جُھکی۔

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا
لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ
وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ
وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ

صریح فرمان عطا کیا اور اِن لوگوں پر طُور کو اُٹھا کر اِن سے (اُس فرمان کی اطاعت کا) عہد[۱۸۴] لیا۔ ہم نے اِن کو حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہوں[۱۸۵]۔ ہم نے اِن سے کہا کہ سَبْت کا قانون نہ توڑو اور اس پر اِن سے پختہ عہد[۱۸۶] لیا۔ آخر کار اِن کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جُھٹلایا، اور متعدّد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، اور یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں[۱۸۷] ـــ[۱۸۸] حالانکہ در حقیقت اِن کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے اِن کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان

۱۸۴- صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے۔ سورۂ اَعراف، رُکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہِ طور کے دامن میں بنی اسرائیل کے نمایندوں سے لیا گیا تھا۔ سورۂ بَقرہ، آیت ۶۳ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف، آیت ۱۷۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

۱۸۵- بَقرہ، آیت ۵۸، ۵۹ و حاشیہ ۷۵۔

۱۸۶- بَقرہ، آیت ۶۵ و حاشیہ ۸۲ و ۸۳۔

۱۸۷- یہودیوں کے اس قول کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۸۸ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جُہلا کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تعصبات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پائے ہیں، ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پُختہ ہے کہ کسی طرح ہم اُن سے نہیں ہٹائے جا سکتے۔ جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے آکر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے اُن کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمھاری کسی

إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥٥﴾ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿١٥٦﴾

لاتے ہیں ——— پھر[189] اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریمؑ پر سخت بہتان لگایا،[190]

بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں، وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۹۴)۔

۱۸۸ – یہ جملۂ معترضہ ہے۔

۱۸۹ – یہ فقرہ اصل سلسلۂ تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۹۰ – حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرہ برابر بھی مُشتبہ نہ تھا، بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے، اُسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی اَخلاقی جُرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی، اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آگئے، تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمھیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا۔ ”میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے“ (سورۂ مریم، رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس شبہے کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادتِ مسیحؑ کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سِنِّ شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریمؑ پر زِنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰؑ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی، اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، اُن کے علما و فقہا کو ان کی ریاکاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اُس اَخلاقی زوال پر مُتنبّہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پُرخطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ! زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم وَلَدُ الزِّنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی شبہے کا نتیجہ نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بُوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے کفر قرار دیا ہے، کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

اور خود کہا کہ ہم نے مسیح، عیسٰی ابنِ مریمؑ، رسُول اللہ کو قتل کر دیا ہے[۱۹۱]——[۱۹۲]حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ معاملہ ان کے لیے مُشتَبَہ کر دیا گیا۔[۱۹۳] اور جن لوگوں نے

راستہ روکنا تھا، نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

۱۹۱ – یعنی جُرأتِ مُجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کے قتل کا اقدام کیا اور فخریہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اُوپر ہم نے گہوارے کے واقعے کا جو حوالہ دیا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السّلام کی نبوّت میں شک کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرتِ موصوف سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورۂ آلِ عمران رکوع ۵ میں گزر چکا ہے)، ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مُشتَبَہ ہو چکا تھا کہ آنجناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اِس جرم کا ارتکاب اُس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی شخص کو نبی جانتے اور مانتے ہوئے اُسے قتل کر دے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بگڑی ہوئی قوموں کے انداز و اطوار ہوتے ہی کچھ عجیب ہیں۔ وہ اپنے درمیان کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں جو اُن کی بُرائیوں پر انھیں ٹوکے اور ناجائز کاموں سے ان کو روکے۔ ایسے لوگ چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ بدکردار قوموں میں قید اور قتل کی سزائیں پاتے ہی رہے ہیں۔ تَلْمُود میں لکھا ہے کہ بُخْتِ نَصَّر نے جب بیت المَقْدِس فتح کیا تو وہ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوا اور اس کی سیر کرنے لگا۔ عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا۔ اس نے یہُودیوں سے پوچھا: ”یہ کیسا نشان ہے؟“ انھوں نے جواب دیا: ”یہاں زَکَریاہ نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری بُرائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامتوں سے تنگ آ گئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔“ بائبل میں یَرمیاہ نبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل کی بداخلاقیاں حد سے گزر گئیں اور حضرت یَرمیاہؑ نے ان کو مُتَنَبِّہ کیا کہ ان اعمال کی پاداش میں خدا تم کو دوسری قوموں سے پامال کرا دے گا، تو ان پر الزام لگایا گیا کہ یہ شخص کسدیوں (کِلدانیوں) سے ملا ہوا ہے اور قوم کا غدار ہے۔ اس الزام میں ان کو جیل بھیج دیا گیا۔ خود حضرت مسیحؑ کے واقعۂ صلیب سے دو ڈھائی سال پہلے ہی حضرت یحیٰؑ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ یہودی بالعموم ان کو نبی جانتے تھے اور کم از کم یہ تو مانتے ہی تھے کہ وہ ان کی قوم کے صالح ترین لوگوں میں سے ہیں۔ مگر جب انھوں نے ہیرودیس (والیِ ریاستِ یہودیہ) کے دربار کی برائیوں پر تنقید کی تو

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًاۢ ۙ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ

اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے[۱۹۴]۔ انھوں نے مسیحؑ کو یقین کے ساتھ قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف

اسے برداشت نہ کیا گیا۔ پہلے جیل بھیجے گئے، اور پھر والیِ ریاست کی معشوقہ کے مطالبے پر ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہودیوں کے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زعم میں مسیحؑ کو سُولی پر چڑھانے کے بعد سینے پر ہاتھ مار کر کہا ہو: ”ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے“۔

۱۹۲– یہ پھر جملۂ معترضہ ہے۔

۱۹۳– یہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اُٹھا لیے گئے تھے اور یہ کہ مسیحیوں اور یہودیوں، دونوں کا یہ خیال کہ مسیحؑ نے صلیب پر جان دی، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن اور بائبل کے بیانات کا متقابل مطالعہ کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً پِیلاطُس کی عدالت میں تو پیشی آپ ہی کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سُنا چکا اور جب یہودیوں نے مسیحؑ جیسے پاک نفس انسان کے مقابلے میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیرا کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری مُہر بھی لگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اُٹھا لیا۔ بعد میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا، وہ آپ کی ذاتِ مقدس نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا، جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسٰی ابنِ مریمؑ سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جُرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلّت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا، اس کو وہ عیسٰی ابنِ مریمؑ ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طرح ان کے لیے مُشتبہ ہو گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعۂ معلومات نہیں ہے، اس لیے مجرّد قیاس وگمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس شبہے کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسٰی ابنِ مریمؑ کو صلیب دی ہے، درآں حالے کہ عیسٰی ابنِ مریمؑ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

۱۹۴– اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں۔ ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک مُتّفَق عَلَیہ قول نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں، جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مُشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلّت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیحؑ ہی کو گیا تھا مگر اُن کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اُتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے

اِلَیۡہِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۱۵۸﴾ وَاِنۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اِلَّا

اُٹھالیا[۱۹۵]، اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا

صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اُٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیحؑ کے جسمِ انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر اُلوہیت کی رُوح جو اس میں تھی وہ اُٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اُٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

۱۹۵ - یہ اس معاملے کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جَزم اور صراحت کے ساتھ جو چیز بتائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُٹھالینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ اُن کو جسم و رُوح کے ساتھ کُرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی رُوح اٹھائی گئی۔ اس لیے قرآن کی بُنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے اندازِ بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اُٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خواہ کچھ بھی ہو، بہر حال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے:

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کے جسم و رُوح سمیت اُٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور اُن اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ اُلوہیتِ مسیحؑ کا قائل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ وہی ”رفع“ (ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اِس واقعے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتابِ مبین کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السّلام کا اُٹھایا جانا ویسا ہی اُٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دُنیا سے اُٹھایا جاتا ہے، یا اگر اس رفع سے مراد محض دَرجات و مراتِب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریسؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وَّرَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب الفاظ یہ ہوسکتے تھے کہ ”یقیناً انھوں نے مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچالیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔“

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ ﴿۱۵۹﴾

جو اُس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے[۱۹۶] گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دے[۱۹۷] گا،

اللہ نے اُٹھا لیا، تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ "اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔ یہ تو صرف کسی ایسے واقعے کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّیْکَ کا لفظ استعمال کیا ہے (آیت ۵۵)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ ۵۱ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنیٰ میں صریح نہیں ہے بلکہ قبضِ رُوح، اور قبضِ رُوح و جسم، دونوں پر دلالت کر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ اُن قرائن کو ساقط کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیحؑ کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ تَوَفّی کا لفظ قبضِ روح و جسم پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبضِ رُوح و جسم کا واقعہ تمام نوعِ انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنیٰ پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پُوچھنا محض ایک بے معنیٰ بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لُغت میں اس استعمال کی گنجایش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفعِ جسمانی کے عقیدے کی صاف تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے اُن قرائن میں ایک اور قرینے کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدے کو اُلٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے صریح لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل المعنیین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفعِ جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد، یعنی اُلوہیتِ مسیحؑ کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ پھر رفعِ جسمانی کے اس عقیدے کو مزید تقویت اُن کثیر التعداد احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السّلام کے دوبارہ دُنیا میں آنے اور دجّال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سُورۂ اَحزاب کے ضمیمے میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ ان کا مرنے کے بعد دوبارہ اس دُنیا میں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، یا زندہ کہیں خدا کی کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا؟

۱۹۶- اِس فقرے کے دو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنیٰ وہ جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ "اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیحؑ پر ایمان نہ لے آئے"۔ اہلِ کتاب سے مراد یہودی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ مسیحؑ کی طبعی موت جب واقع ہو گی، اس وقت جتنے اہلِ کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ تمام اہلِ کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیحؑ کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیحؑ پر ایمان لے آتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنیٰ

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ

غرض[198] اِن یہودی بن جانے والوں کے اِسی ظالمانہ روِیّے کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں[199]، اور سُود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا[200]، اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں، ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں[201]،

متعدِّد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسّرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

۱۹۷ – یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اور اُس پیغام کے ساتھ، جو آپ لائے تھے، جو معاملہ کیا ہے اس پر آپ خداوند تعالیٰ کی عدالت میں گواہی دیں گے۔ اس گواہی کی کچھ تفصیل آگے سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں آنے والی ہے۔

۱۹۸ – جملۂ معترضہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہوتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۱۹۹ – یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ دُنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک بھی اُٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہِ حق کی طرف بُلانے کے لیے جو تحریک بھی شروع ہوتی ہے، اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سب سے بڑھ کر مزاحم بنتے ہیں، درآں حالے کہ یہ کم بخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاؑ کے وارث ہیں۔ ان کا تازہ ترین جرم یہ اشتراکی تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ اِن نام نہاد اہلِ کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے صریح انکار پر، خدا سے کُھلّم کُھلّا دشمنی پر، خدا پرستی کو مٹا دینے کے علی الاعلان عزم و ارادہ پر تعمیر کیا گیا، اس کے مُوجد مُختَرِع اور بانی و سربراہِ کار موسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا ہوں۔ اشتراکیت کے بعد زمانہ جدید میں گمراہی کا دوسرا بڑا استون فرائڈ کا فلسفہ ہے، اور لُطف یہ ہے کہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرد ہے۔

۲۰۰ – تورات میں بالفاظِ صریح یہ حکم موجود ہے کہ:

> ”اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو، جو تیرے پاس رہتا ہو، قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اُس سے سود لینا۔ اگر تُو کسی وقت اپنے ہمسایے کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سُورج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا، کیونکہ فقط وہی ایک اُس کا اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے،

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ

اور جو لوگ اِن میں سے کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۰۲]۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اُس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی[۲۰۳]۔ اِس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی

پھر وہ کیا اوڑھ کر سوئے گا؟ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اُس کی سنوں گا، کیونکہ میں مہربان ہوں۔'' (خُروج، باب ۲۲: ۲۵-۲۷)

اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر تورات میں سُود کی حُرمت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سُود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۲۰۱ - غالباً یہ اُسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جو آگے سورۂ اَنعام آیت ۱۴۶ میں آنے والا ہے۔ یعنی یہ کہ بنی اسرائیل پر تمام وہ جانور حرام کر دیے گئے جن کے ناخن ہوتے ہیں، اور ان پر گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی گئی۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اشارہ اُن دُوسری پابندیوں اور سختیوں کی طرف بھی ہو جو یہودی فقہ میں پائی جاتی ہیں۔ کسی گروہ کے لیے دائرۂ زندگی کو تنگ کر دیا جانا فی الواقع اس کے حق میں ایک طرح کی سزا ہی ہے۔ (مفصّل بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَنعام، حاشیہ ۱۲۲)

۲۰۲ - یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم ہیں، ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرت ناک سزا ان کو ملی اور مل رہی ہے وہ کبھی کسی دُوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزّت کا ٹھکانا میسّر نہیں۔ دنیا میں تتّر بتّر کر دیے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دَور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خِطّے میں ذلّت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں، اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں، مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دُنیا میں لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کی سزا دی گئی ہے، تاکہ قیامت تک دُنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلے میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت، تو اِن شاء اللہ وہاں کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا۔ (اس موقع پر جو شبہ فلسطین کی اسرائیلی ریاست کے قیام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسے رفع کرنے

الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ
اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ
وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ ۚ

ع ۲۲

پابندی کرنے والے اور اللہ اور روزِ آخر پر سچّا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ ؏

اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔[۲۰۴] ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسٰیؑ، ایّوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سُلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔[۲۰۵]

کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۱۲)۔

۲۰۳ - یعنی ان میں سے جو لوگ کُتُبِ آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اُس امرِ حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے، ان کی روش کافر و ظالم یہودیوں کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ جس دین کی تعلیم پچھلے انبیاؑ نے دی تھی، اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے، اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲۰۴ - اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعوٰی نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل اُن کو بھی اسی ایک منبعِ علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاؑ کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

وحی کے معنٰی ہیں: اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

۲۰۵ - موجودہ بائبل میں زَبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے، وہ ساری کی ساری زبورِ داؤدؑ نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنّفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ
نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا
مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ

ہم نے اُن رسُولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اِس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اُن رسُولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسٰیؑ سے اِس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے[۲۰۶]۔ یہ سارے رسُول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے،[۲۰۷] تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی

تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں، ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ اِسی طرح بائبل میں امثالِ سلیمانؑ کے نام سے جو کتاب موجود ہے، اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں، مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصّہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوبؑ کے نام سے بھی بائبل میں درج ہے، لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اپنے اندر رکھنے کے باوجود، اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوبؑ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب کی ابتدا میں حضرت ایوبؑ کے جس صبرِ عظیم کی تعریف کی گئی ہے، اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوبؑ اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے خلاف سراپا شکایت بنے ہوئے تھے، حتّٰی کہ ان کے ہم نشین انھیں اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے، مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائبل میں انبیائے بنی اسرائیل کے ۱۷ صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصّہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی کی رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اَخلاقی تعلیم، ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں پُرزور اِستدلال، اور ان کی بنی اسرائیل کے اَخلاقی زوال پر سخت تنقیدیں پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیحؑ کی تقریریں اور قرآنِ مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلی ہوئی سوتیں ہیں۔

۲۰۶ – دُوسرے انبیا علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آرہی ہے یا فرشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سُن رہے ہیں۔ لیکن موسٰی علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ برتا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اُس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورۂ طٰہٰ میں نقل کی گئی

الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ
اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ
يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۙ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

حجّت نہ رہے[۲۰۸] اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اُس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے، اور اِس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں، اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اِس کو ماننے سے خود انکار کرتے ہیں اور دُوسروں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں، وہ یقیناً گمراہی میں حق سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔ اِس طرح جن لوگوں نے کفر و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اُتر آئے، اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کوئی راستہ بجز جہنّم کے راستے کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ہے۔ بائبل میں بھی حضرت موسیٰ کی اِس خصوصیت کا ذکر اِسی طرح کیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ”اور جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے بات کرتا ہے، ویسے ہی خداوند رُوبرو ہو کر موسیٰ سے باتیں کرتا تھا“ (خروج ۳۳:۱۱)

۲۰۷ – یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویے کو اس کے مطابق دُرست کر لیں، انھیں فلاح و سعادت کی خوش خبری سُنا دیں، اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں، ان کو اِس غلط روی کے بُرے انجام سے آگاہ کر دیں۔

۲۰۸ – یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اِتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا، تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اُس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا
خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ

لوگو! یہ رسول تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے، ایمان لے آؤ، تمھارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے[۲۰۹] اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی[۲۱۰]۔

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو[۲۱۱] اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسٰی ابنِ مریمؑ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان[۲۱۲] تھا جو اللہ نے مریمؑ کی طرف بھیجا

آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے، جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انھوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں بتلا دیکھا تو انھیں آگاہ نہ کیا۔

۲۰۹ – یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، نقصان جو کچھ ہو گا تمھارا اپنا ہو گا۔

۲۱۰ – یعنی تمھارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

۲۱۱ – یہاں اہلِ کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غُلُو کے معنٰی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے گزر جانا۔ یہودیوں کا جرم یہ تھا کہ وہ مسیحؑ کے انکار اور مخالفت میں حد سے گزر گئے، اور عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کی عقیدت اور محبّت میں

وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ ۡ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۗ قف وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا

اور ایک رُوح تھی اللہ کی طرف سے[۲۱۳] (جس نے مریمؑ کے رِحم میں بچّے کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان[۲۱۴] لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں[۲۱۵]۔ باز آجاؤ،

حد سے گزر گئے۔

۲۱۲ – اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے۔ مریمؑ کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت مریم علیہا السّلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نُطفے سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائشِ بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انھوں نے یُونانی فلسفے سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نُطق" (logos) کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر اس کلام و نُطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفتِ کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السّلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السّلام کی اُلوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصوُّر نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی اَزَلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیحؑ کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

۲۱۳ – یہاں خود مسیحؑ کو رُوۡحٌ مِّنۡهُ (خدا کی طرف سے ایک رُوح) کہا گیا ہے، اور سُورۂ بَقَرہ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ (ہم نے پاک روح سے مسیحؑ کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی۔ سراسر حقانیت اور راست بازی تھی، اور از سرتاپا فضیلتِ اخلاق تھی۔ یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی۔ مگر انھوں نے اس میں بھی غُلُو کیا، رُوۡحٌ مِّنَ اللّٰهِ کو عین روح اللہ قرار دے لیا، اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوحِ مقدس تھی جو مسیحؑ کے اندر حلول کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور مسیحؑ کے ساتھ ایک تیسرا خدا رُوح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غُلُو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیلِ متّی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ "فرشتے نے اسے (یعنی یوسف نجّار کو) خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اے یوسف ابنِ داؤد! اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے ہے۔" (باب ۱، آیت ۲۰)

۲۱۴ – یعنی اللہ کو واحد الٰہ مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو، جن میں سے ایک رسول مسیحؑ بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امرِ حق ہے جسے ایک سچے پیروِ مسیحؑ کو ماننا چاہیے۔

۲۱۵ – یعنی تین الٰہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو، خواہ وہ کسی شکل میں تمہارے اندر پایا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں، ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ تسلیم

خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ وقف لازم
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٧١﴾ ع ٢٣ ع ٩ ٢

یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔[٢١٦] زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی مِلک ہیں،[٢١٧] اور ان کی کفالت وخبر گیری کے لیے بس وہی کافی ہے۔[٢١٨] ع

کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ توحید اصلِ دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیحؑ کی شکل میں ظُہُور کیا اور رُوح اللہ نے اس میں حُلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کو بھی خداوند عالم کی اُلوہیّت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کرلیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک نا قابلِ حل چیستان بن گیا کہ عقیدۂ توحید کے باوجود عقیدۂ تثلیث کو، اور عقیدۂ تثلیث کے باوجود عقیدۂ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ١٨ سو برس سے مسیحی علما اِسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سرکھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں۔ اِسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے۔ اسی پر ان کے سارے علمِ کلام کا زور صَرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیحؑ نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غُلُوّ نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غُلُوّ سے باز آجائیں، مسیحؑ اور روح القدس کی اُلوہیّت کا تخیُّل چھوڑ دیں، صرف اللہ کو الٰہِ واحد تسلیم کرلیں، اور مسیحؑ کو صرف اس کا پیغمبر قرار دیں، نہ کہ کسی طور پر شریک فی الالوہیّت۔

٢١٦- یہ عیسائیوں کے چوتھے غُلُوّ کی تردید ہے۔ بائبل کے عہدِ جدید کی رِوایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلّق کو باپ اور اولاد کے تعلّق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ تنہا مسیحؑ ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانے سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پُرانے عہدنامہ میں موجود ہیں۔ مسیحؑ نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا تھا اور وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیحؑ کو خدا کا اِکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب وغریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیحؑ خدا کا مظہر ہے، اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جَسَدی ظُہور ہے، اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اِکلوتے کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ انسانوں کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسان کے گناہ کا کفّارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ
الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ
فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡتَنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَيُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا
اَلِيۡمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيۡرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمۡ بُرۡهَانٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ

مسیحؑ نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اِس کو اپنے لیے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبّر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ اُس وقت وہ لوگ جنھوں نے ایمان لا کر نیک طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اپنے اجر پُورے پُورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے اُن کو اللہ دردناک سزا دے گا، اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسا رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آ گئی ہے

کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیّلات کا آفریدہ ہے اور اُس غُلُو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس سوال کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے کہ جب مسیحؑ خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کی تردید

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ
وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ
اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ

اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے، ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

لوگ تم سے[۲۱۹] کلالہ[۲۲۰] کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی ایک بہن[۲۲۱] ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو

کردی جائے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔

۲۱۷ - یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلّق باپ اور بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور مملوک کا تعلّق ہے۔

۲۱۸ - یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

۲۱۹ - یہ آیت اِس سورہ کے نُزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض رِوایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی، اور سُورۂ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سُورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو اُن آیات کے سلسلے میں شامل نہیں کیا گیا جو احکامِ میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے ضمیمے کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

۲۲۰ - کلالہ کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو لا ولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لا وَلَد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ آخر وقت تک اس معاملے میں متردّد رہے۔ لیکن عامۂ فقہا نے حضرت ابو بکرؓ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی

لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَ
إِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۴ ع ۵ ۴

بھائی اس کا وارث ہوگا۔[۲۲۲] اگر میّت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی،[۲۲۳] اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دُہرا حصّہ ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے، تا کہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہاں کَلالہ کی بہن کو نصف ترکے کا وارث قرار دیا گیا ہے، حالانکہ اگر کَلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصّہ پہنچتا ہی نہیں۔

۲۲۱- یہاں اُن بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میّت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں، یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبے میں اس معنٰی کی تصریح کی تھی اور صحابہؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مُجمع علیہ مسئلہ ہے۔

۲۲۲- یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحبِ فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحبِ فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصّہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

۲۲۳- یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔

تفہیم القرآن

المائدہ

(۵)

المائدہ

نام اِس سورہ کا نام پندرھویں رُکوع کی آیت هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کے لفظ ''مائدہ'' سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی بیشتر سورتوں کے ناموں کی طرح اس نام کو بھی سورت کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ محض دوسری سورتوں سے ممیّز کرنے کے لیے اسے علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورت کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلحِ حُدَیبِیہ کے بعد ٦ ہجری کے اواخر یا ٧ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ ٦ ہجری کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکّہ تشریف لے گئے۔ مگر کفّارِ قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپؐ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی رَدّ و کَد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آیندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارتِ کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں، تاکہ آیندہ سال عُمرے کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے، اور دوسری طرف انھیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عُمرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں، اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبُوضات سے گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انھیں زیارتِ کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ یہی تقریب ہے اُس تمہیدی تقریر کی جس سے اس سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلے کو چھیڑا گیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودھویں رُکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مضامین اس سورہ میں ہم کو ملتے ہیں، وہ بھی سب کے سب اسی دَور کے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی خطبے پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہُوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اِس سُورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

شانِ نزُول سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نزُول سے اِس سورہ کے نزُول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیُّر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ اُحُد کے صدمے نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُرخطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آ گیا کہ عرب میں اسلام ایک نا قابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دوسری طرف حُدودِ شام تک، تیسری طرف ساحلِ بحرِ احمر تک، اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اُحُد میں جو زخم مسلمانوں نے کھایا تھا وہ ان کی ہمتیں توڑنے کے بجائے ان کے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر کر اُٹھے اور تین سال کی مدّت میں انھوں نے نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان کی مسلسل جِدّ و جُہد اور سرفروشیوں کا ثمرہ یہ تھا کہ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔ مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت مُنڈلاتا رہتا تھا، اس کا ہمیشہ کے لیے اِستیصال ہو گیا اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی یہ تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حُدُود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرۂ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اُصُول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اَخلاق، معاشرت، تمدُّن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیّز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نمازِ باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانینِ دیوانی و فوج داری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پُرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام، اور زِنا و قَذْف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نِشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دُنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدُّن بن چکا ہے، پھر کبھی ان میں آ ملیں گے۔

صُلحِ حُدَیبیَہ سے پہلے تک مسلمانوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ کفارِ قریش کے ساتھ

ایک مسلسل کشمکش میں اُلجھے ہوئے تھے اور انھیں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کی مُہلت نہ ملتی تھی۔ اس رکاوٹ کو حُدَیبِیَہ کی ظاہری شکست اور حقیقی فتح نے دُور کر دیا۔ اس سے ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی ریاست کے حُدُود میں امن میسر آ گیا، بلکہ اتنی مُہلت بھی مل گئی کہ گردوپیش کے علاقوں میں اسلام کی دعوت کو لے کر پھیل جائیں۔ چنانچہ اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، رُوم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے پھیل گئے۔

مَباحِث یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ حسبِ ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدّنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اِس سلسلے میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے گئے، شعائر اللہ کے احترام اور زائرینِ کعبہ سے عدمِ تعرّض کا حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کے قطعی حُدُود قائم کیے گئے اور دَورِ جاہلیت کی خود ساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمّم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معیّن کی گئیں، شراب اور جُوئے کو قطعی حرام کر دیا گیا، قسم توڑنے کا کفّارہ مقرر کیا گیا، اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت۔ اب چونکہ مسلمان ایک حکمراں گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی، جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دَور خاتمے پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمایش کے دَور میں وہ قدم رکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رَو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انھوں نے کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو توڑ کر اُس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کے پابند رہیں، اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئی تھیں۔ اس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رَویّے پر مُتنبِّہ کیا گیا ہے اور انھیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز چونکہ صُلحِ حُدَیبِیَہ کی وجہ سے عرب اور متصل مَمالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا، اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غَلَطیاں بتائی گئی ہیں اور انھیں نبی عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمسایہ مَمالک میں سے جو قومیں بُت پرست اور مجوسی تھیں، ان کو براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ اُن کی ہدایت کے لیے وہ خطبات کافی تھے جو اُن کے ہم مسلک مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے مکہ میں نازل ہو چکے تھے۔

١٢۰
اٰیاتھا

١٦
رکوعاتھا

سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

المنزل ۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۥ ط اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو[1]۔ تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے[2] سوائے اُن کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کرلو،[3]

١- یعنی اُن حُدود اور قُیود کی پابندی کرو جو اس سُورہ میں تم پر عائد کی جا رہی ہیں، اور جو بالعُموم خدا کی شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔ اس مختصر سے تمہیدی جملے کے بعد ہی اُن بندشوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے جن کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

۲- ”اَنعام“ (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اُونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ اور ”بہیمہ“ کا اِطلاق ہر چَرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ اَنعام تمھارے لیے حلال کیے گئے، تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنھیں عَربی میں ”انعام“ کہتے ہیں۔ لیکن حکم اِن الفاظ میں دیا گیا ہے کہ ”مویشی کی قسم کے چرندہ چوپایے تم پر حلال کیے گئے۔“ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آجاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں۔ یعنی جو کُچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں، اور دُوسری حیوانی خُصوصیّات میں اَنعامِ عرب سے مُماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارتاً یہ بات بھی مُترشّح ہوتی ہے کہ وہ چوپایے جو مویشیوں کے برعکس کُچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے اُن پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں اور جو دوسرے جانوروں کا شکار کر کے کھاتے ہیں یا مُردار خور ہوتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر۔ دوسرے متعدِّد صحابہؓ سے بھی اس کی تائید میں رِوایات منقول ہیں۔

۳- ”احرام“ اُس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں، جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اُتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد ہوتا ہے اور ایک چادر جو اُوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں، مثلاً حجامت، خوشبو کا

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ

بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے[۴]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حُرمت نہ کرو[۵] ـــــ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کرلو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹّے پڑے ہوئے ہوں،

استعمال، ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضائے شہوت وغیرہ۔ انھی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جان دار کو ہلاک نہ کیا جائے، نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتا دیا جائے۔

۴- یعنی اللہ حاکمِ مُطلَق ہے، اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بندوں کو اُس کے احکام میں چُون وچَرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مَصلَحت پر مبنی ہیں، لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مَصلَحت سمجھتا ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کردی ہے وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے، اور اسی طرح جو اس نے حلال کردی ہے وہ بھی کسی دُوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے، وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اُصول قائم کرتا ہے کہ اشیا کی حُرمت وحِلّت کے لیے مالک کی اجازت وعَدَمِ اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔

۵- ہر وہ چیز جو کسی مسلک، یا عقیدے، یا طرزِ فکر و عمل، یا کسی نظام کی نمایندگی کرتی ہو وہ اس کا ”شِعار“ کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکّے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیّت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زنّار اور مندر برہمنیّت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیّت کا شعار ہے۔ سواستیکا آریا نسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے اِن شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شِعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلّق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنیٰ ہے۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ

نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں[٦]۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو[٧]۔۔۔۔۔ اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصہ

”شعائر اللہ“ سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمایندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں، مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیّل کی آلودگی سے انھیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جُز رکھتا ہے، تو اس جُز کی حد تک مسلمان اس سے مُوافقَت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پُورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دُوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اُس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکینِ عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکّے پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصّے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبے کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انھیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں اُن پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصّہ باقی ہے، وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

[٦] – ”شعائر اللہ“ کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا، کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

[٧] – احرام بھی من جُملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلے میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شِعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

وقف لازم قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا ۘ وَتَعَاوَنُوۡا
عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۖ وَاتَّقُوا
الربع اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ② حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ
وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ
وَالۡمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيۡحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ ۗ قف

تمھیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔[۸] نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں، ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مُردار،[۹] خُون، سُور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو،[۱۰] وہ جو گلا گُھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو — سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا[۱۱] —

---

۸ – چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبے کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانۂ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں اِس ارادے سے باز رکھا۔

۹ – یعنی وہ جانور جو طبعی موت مر گیا ہو۔

۱۰ – یعنی جس کو ذبح کرتے وقت خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، یا جس کو ذبح کرنے سے پہلے یہ نیت کی گئی ہو کہ یہ فُلاں بزرگ یا فُلاں دیوی یا دیوتا کی نذر ہے۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۱)

۱۱ – یعنی جو جانور مذکورۂ بالا حوادث میں سے کسی حادثے کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثارِ زندگی اس میں پائے جاتے ہوں، اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو اُسے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ”ذبح“ اور ”ذکاۃ“ اسلام کے اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصّہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ

اور وہ جو کسی آستانے[12] پر ذبح کیا گیا ہو۔[13] نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔[14]

گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خُون کا بیشتر حصّہ جسم کے اندر ہی رک کر رہ جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ برعکس اِس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلّق دیر تک باقی رہتا ہے، جس کی وجہ سے رگ رگ کا خُون کھنچ کر باہر آجاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خُون کے متعلّق ابھی اوپر ہی یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے، لہٰذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جُدا ہو جائے۔

۱۲ – اصل میں لفظ ”نُصُب“ استعمال ہُوا ہے۔ اس سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مُورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنٰی لفظ آستانہ یا اِستھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے، یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

۱۳ – اِس مَقام پر یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کی جو قُیود شریعت کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں، اُن کی اصل بنیاد اُن اشیا کے طبّی فوائد یا نقصانات نہیں ہوتے، بلکہ اُن کے اَخلاقی فوائد و نقصانات ہوتے ہیں۔ جہاں تک طبیعی اُمور کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادّی اشیا میں سے کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالح بہم پہنچانے والی ہیں اور کیا چیزیں تغذیے کے لیے غیر مفید یا نقصان دِہ ہیں۔ شریعت اِن اُمور میں اس کی رہنمائی کی ذمّہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمّے لیا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا کو حرام کیا ہوتا۔ لیکن آپ دیکھتے ہی ہیں کہ قرآن و حدیث میں اُس کا، یا اُن دوسرے مُفرَدات و مُرکّبات کا، جو انسان کے لیے سخت مہلک ہیں، سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملے میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے، وہ دراصل اُس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے، اور کون سی غذائیں طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں، اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتقادی و نظری حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے، اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسّر ہی نہیں ہیں، اور اسی بنا پر انسان نے اکثر اِن اُمور میں غَلَطیاں کی ہیں، اس لیے شریعت صرف اِنھی اُمور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے، انھیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا بُرا اثر پڑتا ہے، یا وہ طہارت کے خلاف ہیں، یا ان کا تعلّق کسی فاسد عقیدے سے ہے۔ برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کی حِلّت کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِن بُرائیوں میں سے کوئی بُرائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیا کی حُرمت کے وجوہ کیوں نہ سمجھائے، تاکہ ہمیں بصیرت حاصل ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے وجوہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات کہ خُون، یا سُور کے گوشت، یا مُردار کے کھانے سے

ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رُونما ہوتی ہیں، کس قدر اور کس طرح ہوتی ہیں، اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے، کیونکہ اَخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض اُن کے بُرے اثرات کو بیان کر بھی دیا جاتا تو شبہ کرنے والا تقریباً اُسی مَقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کی صحت وعَدَمِ صحّت کو آخر کس چیز سے جانچتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حرام وحلال کے حُدُود کی پابندی کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے۔ جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب، اللہ کی کتاب ہے اور رسول، اللہ کا رسول ہے، اور اللہ علیم وحکیم ہے، وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کی پابندی کرے گا، خواہ ان کی مَصلَحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطے میں آ گئی ہیں، صرف اُنھی سے پرہیز کرے، اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہو سکا ہے، ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنا رہے۔

۱۴۔ اس آیت میں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے، اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے:

(۱) مشرکانہ فال گیری، جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پُوچھا جاتا ہے، یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے، یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ نے اِس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہُبَل دیوتا کے بُت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے اِستھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کَندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتا پُوچھنا ہو، یا خون کے مقدّمے کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو، اس کے لیے ہُبَل کے پانسا دار (صاحب القِداح) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہُبَل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسا دار اِن تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا، اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا، اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہُبَل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

(۲) تَوَہُّم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل وفکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی وخیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلۂ علمِ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رَمل، نُجوم، جَفَر، مختلف قسم کے شگون اور نچھتر، اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جُوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حُقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فُلاں شخص کا نام نکل آیا ہے، لہٰذا ہزارہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیا اُس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک مُعَمّے کے بہت سے حل صحیح ہیں، مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اُس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ مُعَمّا کے صندوق میں بند ہے۔

اِن تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قُرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حُقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے،

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ

یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے پُوری مایوسی ہو چکی ہے، لٰہذا تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔[15] آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے (لٰہذا حرام و حلال کی جو قیُود تم پر عائد کر دی گئی ہیں اُن کی پابندی کرو)۔[16] البتّہ جو شخص

اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے، اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قُرعہ اندازی پر فیصلے کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں دُرست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قُرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعُموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جب کہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپؐ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہو گا۔

۱۵- ’’آج‘‘ سے مراد کوئی خاص دن اور تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ دَور یا زمانہ مراد ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ ہماری زبان میں بھی آج کا لفظ زمانۂ حال کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

’’کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے‘‘، یعنی اب تمھارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع و مزاحم رہے ہیں، اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اِسے مٹا سکیں گے اور تمھیں پھر پچھلی جاہلیّت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔ ’’لٰہذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو‘‘، یعنی اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دَر اندازی و مزاحمت کا خطرہ تمھارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی۔ اب تمھیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمھارے پاس کوئی ایسا عذر نہ ہو گا جس کی بنا پر تمھارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے۔ اب شریعتِ الٰہی کی خلاف ورزی کے معنٰی یہ نہیں ہوں گے کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو، بلکہ اس کے صاف معنٰی یہ ہوں گے کہ تم خدا کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے۔

اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۳) يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ

بُھوک سے مجبُور ہو کر اُن میں سے کوئی چیز کھالے، بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو، تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[17]

لوگ پُوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہو تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔[18]

---

۱۶ – دین کو مکمل کر دینے سے مُراد اُس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمّل نظامِ تہذیب و تمدّن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جُملہ مسائل کا جواب اُصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے مُراد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچّا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو، اس لیے میں نے اسے درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمھیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی کا جُوا تمھاری گردنوں پر باقی نہیں رہا۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو، اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبوری تمھیں لاحق نہیں رہی ہے۔ ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ سکوت اختیار فرماتا ہے، مگر اندازِ کلام سے خود بخود یہ بات نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کیے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حُدود پر قائم رہنے میں تمھاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

مستند رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حَجّۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ واقع ہوئی ہے، وہ صُلحِ حُدَیبِیَہ سے مُتّصِل زمانہ (۶ ھ) کا ہے، اور سیاقِ عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ابتدا میں یہ سلسلۂ کلام اِن فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انھیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا۔ میرا قیاس یہ ہے، وَالْعِلْمُ عِنْدَاللہ، کہ ابتداءً یہ آیت اِسی سیاقِ کلام میں نازل ہوئی تھی، اس لیے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے۔ بعد میں جب تمام عرب مسخّر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبیؐ پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

۱۷ – مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۱۷۲۔

۱۸ – اس جواب میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ مذہبی طرزِ خیال کے لوگ اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دُنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں، جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر وہمی پن اور قانونیت کا تسلّط ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ

اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سَدھایا ہو ـــــ جن کو خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو ـــــ وہ جس جانور کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو،[19] البتہ اس پر اللہ کا نام

ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنوع تو نہیں۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پُوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انھیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے، تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل اُلٹ گیا۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے، بجز اس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اُصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے، بجز اُس کے جس کی حُرمت کی تصریح کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دُنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حِلّت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دُنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حُرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مُستثنیٰ کر کے ساری دُنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔

حلال کے لیے ”پاک“ کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس اِباحت کی دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیا کے ”پاک“ ہونے کا تعیُّن کس طرح ہو گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اُصولِ شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں، یا جن چیزوں سے ذوقِ سلیم کراہت کرے، یا جنھیں مہذّب انسان نے بالعُموم اپنے فطری احساسِ نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

١٩- شکاری جانوروں سے مراد کُتّے، چیتے، باز، شِکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سَدھائے ہوئے جانور کی خُصُوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ جس کا شکار کرتا ہے اُسے عام درندوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سَدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال۔

اس مسئلے میں فقہا کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے، خواہ وہ درندہ ہو یا پرندہ، شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہو گا کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا۔ یہی مسلک امام شافعیؒ کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا، حتّٰی کہ اگر ایک تہائی حصّہ بھی وہ کھا لے تو بقیہ دو تہائی حلال ہے، اور اس معاملے میں درندے اور پرندے کے درمیان کچھ فرق نہیں۔

عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④ اَلْيَوْمَ
اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۗ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ
لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۙ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ

---

[20] لے لو اور اللہ کا قانون توڑنے سے ڈرو، اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے۔[21] اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں

یہ مسلک امام مالکؒ کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھا لیا ہو تو وہ حرام ہوگا، لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے، لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شکاری پرندے کا شکار سرے سے جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ اسے تعلیم سے یہ بات نہیں سکھائی جا سکتی کہ شکار کو خود نہ کھائے بلکہ مالک کے لیے پکڑ رکھے۔

۲۰ – یعنی شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عَدِیؓ بن حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا میں کُتّے کے ذریعے سے شکار کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ’’اگر اس کو چھوڑتے ہوئے تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو نہ کھاؤ، کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا۔‘‘ پھر انھوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کُتّا چھوڑوں اور بعد میں دیکھوں کہ کوئی اور کُتّا وہاں موجود ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ’’اس شکار کو نہ کھاؤ۔ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کُتّے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کُتّے پر۔‘‘

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے ہوئے خدا کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر شکار زندہ ملے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا، کیونکہ ابتداءً شکاری جانور کو اس پر چھوڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جا چکا تھا۔ یہی حکم تیر کا بھی ہے۔

۲۱ – اہلِ کتاب کے کھانے میں اُن کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے اُن کا اور اُن کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم اُن کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ ’’تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر پاکی و طہارت کے اُن قوانین کی پابندی

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ
وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ
حَبِطَ عَمَلُهٗ ز وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ⑤ ع ۱ ع ۵

یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی[۲۲]، بشرطیکہ تم اُن کے مَہر ادا کر کے نکاح میں اُن کے محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھُپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی رَوِش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا[۲۳]۔ ع

نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر اُن کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اَور کا نام لیں، تو اُسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اِسی طرح اگر اُن کے دسترخوان پر شراب، یا سُور، یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

اہلِ کتاب کے سوا دُوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہلِ کتاب ہی کا جائز ہے، جب کہ انھوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہلِ کتاب، تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

۲۲ – اِس سے مُراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ نکاح کی اجازت صرف انھی کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ وہ مُحصَنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابنِ عباسؓ کا خیال ہے کہ یہاں اہلِ کتاب سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں۔ رہے دار الحرب اور دار الکفر کے یہود و نصاریٰ، تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا دُرست نہیں۔ حَنَفِیَّہ اس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیرونی مَمالک کے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں ہے مگر مکرُوہ ضرور ہے۔ بخلاف اس کے سعید بن المُسَیَّبؒ اور حَسَن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے، لہٰذا ذِمّی اور غیر ذمّی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر مُحصَنات کے مفہوم میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس سے مراد پاک دامن، عصمت مآب عورتیں ہیں، اور اس بنا پر وہ اہلِ کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حسنؒ، شَعبیؒ اور ابراہیم نَخَعیؒ کی ہے اور حَنَفِیَّہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے، یعنی اس سے مراد اہلِ کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں۔

۲۳ – اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے بعد یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى
الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ
مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لیے اُٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔[۲۴] اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔[۲۵] اگر بیمار ہو، یا سفر کی حالت میں ہو، یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت کر کے آئے، یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو، اور پانی نہ ملے، تو پاک مٹی سے کام لو، بس اُس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔[۲۶] اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، مگر وہ چاہتا ہے کہ

کہ جو شخص اِس اجازت سے فائدہ اُٹھائے، وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مُبتلا ہو کر یا اس کے عقائد اور اعمال سے مُتاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے، یا اَخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

۲۴ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کُلّی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور کان چونکہ سر کا ایک حصہ ہیں، اس لیے سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصّوں کا مسح بھی شامل ہے۔ نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں، تا کہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو، وہ خود پہلے پاک ہو جائیں۔

۲۵ – جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادّۂ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے، دونوں صورتوں میں غُسل واجب ہے۔ اس حالت میں غُسل کے بغیر نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حواشی ۶۷، ۶۸ و ۶۹)۔

لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦ وَ
اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ
قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ
بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ
اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٨ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے،[۲۷] شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے[۲۸] اس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اُس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمھارا یہ قول کہ ”ہم نے سُنا اور اطاعت قبول کی“۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔[۲۹] کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے پُوری طرح باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں،

۲۶- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۶۹ و ۷۰۔

۲۷- جس طرح پاکیزگیِ نفس ایک نعمت ہے، اسی طرح پاکیزگیِ جسم بھی ایک نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جب کہ نفس و جسم دونوں کی طہارت و پاکیزگی کے لیے پُوری ہدایت اسے مل جائے۔

۲۸- یعنی یہ نعمت کہ زندگی کی شاہراہِ مستقیم تمھارے لیے روشن کر دی اور دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے منصب پر تمھیں سرفراز کیا۔

۲۹- مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۶۴ و ۱۶۵۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٩﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ
يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١١﴾ ع

اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور انھیں بڑا اجر ملے گا۔ رہے وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھٹلائیں، تو وہ دوزخ میں جانے والے ہیں۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جب کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا، مگر اللہ نے اُن کے ہاتھ تم پر اُٹھنے سے روک دیے۔[۳۰] اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ ع

۳۰- اشارہ ہے اس واقعے کی طرف جسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے رِوایت کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاص خاص صحابہؓ کو کھانے کی دعوت پر بُلایا تھا اور خفیہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے۔ لیکن عین وقت پر اللہ کے فضل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا اور آپؐ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ چونکہ یہاں سے خطاب کا رُخ بنی اسرائیل کی طرف پھر رہا ہے، اس لیے تمہید کے طور پر اس واقعے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کے دو مقاصد ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رُو اہلِ کتاب چل رہے تھے۔ چنانچہ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل سے اور مسیح علیہ السلام کی اُمت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہوئے، اُسی طرح تم بھی اُسے توڑ دو اور گمراہ ہو جاؤ۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں کو اُن کی غلطیوں پر مُتنبِّہ کیا جائے اور انھیں دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ
وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ

اللہ نے بنی اسرائیل سے پُختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب[۳۱] مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ ”میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی، اور زکوٰۃ دی، اور میرے رسولوں کو مانا، اور ان کی مدد کی،[۳۲] اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے،[۳۳] تو یقین رکھو کہ میں تمھاری بُرائیاں تم سے زائل کر دُوں[۳۴] گا

۳۱- نقیب کے معنیٰ نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلے سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا، تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انھیں بے دینی و بداخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ بائبل کی کتاب گنتی میں بارہ ”سرداروں“ کا ذکر موجود ہے، مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ ”نقیب“ سے قرآن میں بیان کی گئی ہے، بائبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائبل انھیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگرانِ کار کی قرار دیتا ہے۔

۳۲- یعنی جو رسول بھی میری طرف سے آئیں، ان کی دعوت پر اگر تم لبیک کہتے اور ان کی مدد کرتے رہے۔

۳۳- یعنی خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس ایک ایک پائی کو، جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گُنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کو ”قرض“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ ”اچھا قرض“ ہو، یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے، اور خلوص و حُسنِ نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

۳۴- کسی سے اُس کی بُرائیاں زائل کر دینے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ راہِ راست کو اختیار کرنے اور خدا کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان کا نفس بہت سی بُرائیوں سے، اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیتِ مجموعی کمال کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ بُرائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مؤاخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا، کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اِصلاح قبول کر لی ہو، اس کی جُزوی اور ضمنی بُرائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔

وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ
كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا

اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اُس نے سَواءُ السَّبِیل[۳۵] گُم کر دی۔'' پھر یہ اُن کا

۳۵- یعنی اس نے ''سَواءُ السَّبِیل'' کو پا کر پھر کھو دیا اور وہ تباہی کے راستوں میں بھٹک نکلا۔ ''سَواءُ السَّبِیل'' کا ترجمہ ''توسُّط و اعتدال کی شاہراہ'' کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے پُورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں اصل لفظ ہی کو جُوں کا تُوں لے لیا ہے۔

اِس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالَمِ اصغر ہے، جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رُجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے، وہ بھی بے حد و حساب پیچیدہ تعلّقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدّن و تہذیب کے نَشو و نُما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدُّن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔

انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پُورے عرصۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رُجحانات میں توازُن قائم رہے، اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسُب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے، اور مادّی اشیا کو بھی شخصی اور تمدّنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلّط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اِس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازُن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حُدُود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ اُن کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر وہی عمل رُونما

ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہالے جاتا ہے، جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اِس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی چلی جاتی ہے۔ تمام وہ راستے جو خود انسان نے اپنی زندگی کے لیے بنائے ہیں، خطِ مُنحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سَمت سے چلتے ہیں اور غلط سَمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سَمت کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔

اِن بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ، اس کے تمام جذبات و رُجحانات کے ساتھ، اس کی رُوح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ، اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پُورا پُورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے جا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی و بامُرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے، اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اُس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہراہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس کی طرف صرف خدا رہنمائی کر سکتا ہے، اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اِس راہِ راست کی طرف انسان کی رہنمائی کریں۔

قرآن اسی راہ کو سَوَاء السبیل اور صراطِ مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دُنیا کی اِس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گزرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا، وہ یہاں راست رَو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے، اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا، وہ یہاں غلط بیں، غلط رَو اور غلط کار ہے، اور آخرت میں لامحالہ اُسے دوزخ میں جانا ہے، کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ کی طرف جاتے ہیں۔

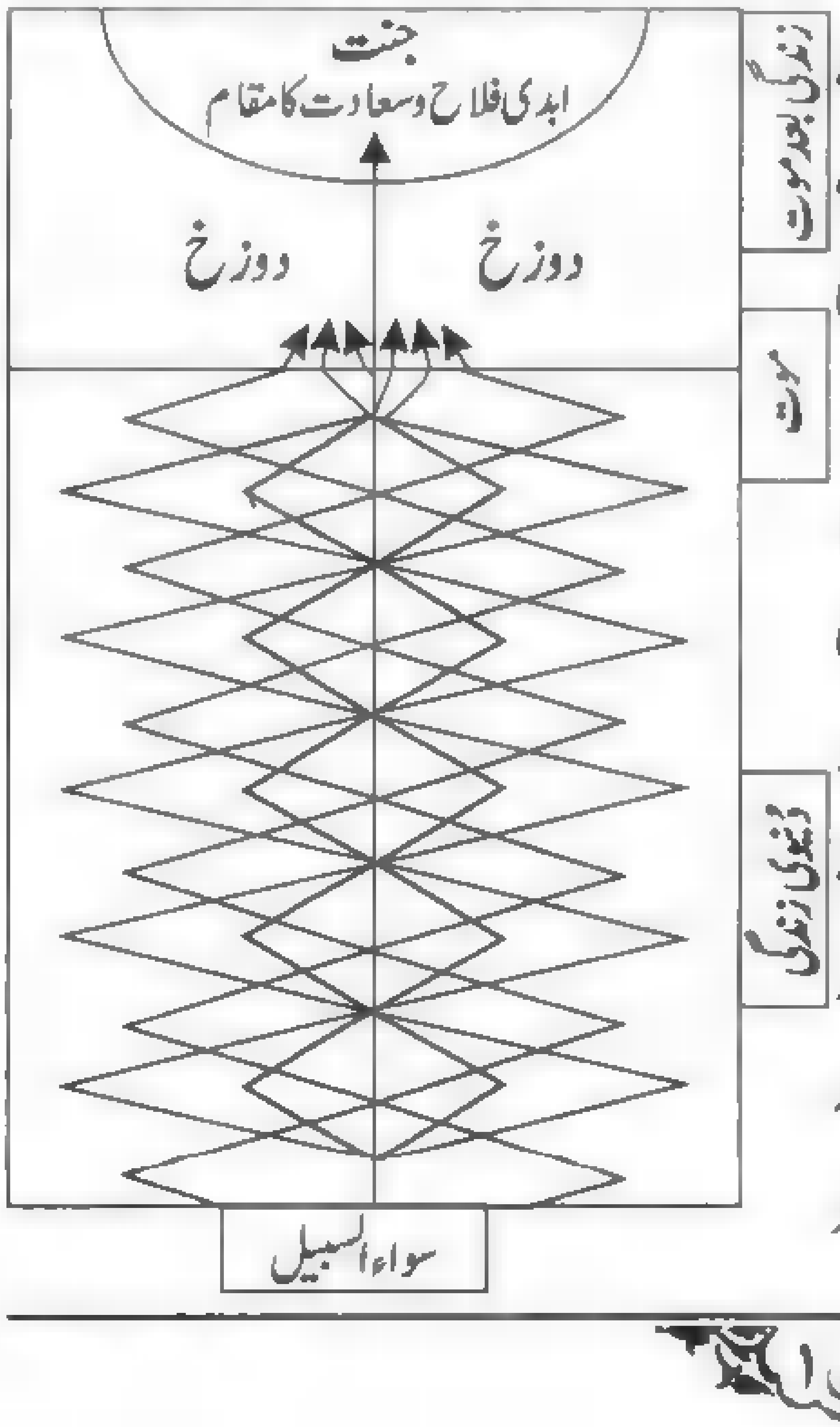

موجودہ زمانے کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکّے کھاتی چلی جا رہی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ "جَدَلی عمل" (dialectical process) انسانی زندگی کے ارتقا کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقا کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (thesis) اُسے ایک رُخ پر بہالے جائے، پھر

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انھیں دی گئی تھی، اُس کا بڑا حصّہ بُھول چکے ہیں، اور آئے دن تمھیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتا چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ (پس جب یہ اِس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں، وہ ان سے عین متوقع ہیں)

اِس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (antithesis) اُسے دُوسری انتہا کی طرف کھینچے، اور پھر دونوں کے امتزاج (synthesis) سے ارتقائے حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقا کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اُس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سَوَاءَ السَّبِیل سے بہت دُور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دُوسری حقیقتیں، جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی، اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سَمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جُوں جُوں سَوَاءَ السَّبِیل قریب آتی ہے، ان متصادم دعووں کے درمیان مُصَالَحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں۔ لیکن جب وہاں نہ سَوَاءَ السَّبِیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھیرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے زور میں اُسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں ایک دوسری بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر اِن کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سَوَاءَ السَّبِیل کو دیکھ لیا ہوتا، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لیے ارتقا کا صحیح راستہ یہی سَوَاءَ السَّبِیل ہے، نہ کہ خطِ مُنْحَنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۳) وَمِنَ
الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا
مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ص فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی
یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (۱۴)
یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا
مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ؕ

لٰہذا انھیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اِسی طرح ہم نے اُن لوگوں سے بھی پُختہ عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم ”نصاریٰ“[۳۶] ہیں، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصّہ اُنھوں نے فراموش کر دیا، آخر کار ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور آپس کے بُغض و عناد کا بیج بو دیا، اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمھارے پاس آگیا ہے جو کتابِ الٰہی کی بہت سی اُن باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے، اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔[۳۷]

۳۶- لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ”نصاریٰ“ کا لفظ ”ناصرہ“ سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السّلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ ”نصرت“ ہے، اور اس کی بِنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حَواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مصنّفین کو بالعُموم محض ظاہری مُشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیّت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا، اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ایبونی کہا جاتا تھا، انھی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ ہم ”نصاریٰ“ ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔ (اس مسئلے کی مزید تشریح کے لیے

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو، جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے[۳۸] اور اپنے اذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ مسیحؑ ابنِ مریم ہی خدا ہے[۳۹]۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ

صفحہ ۵۱۷ پر ضمیمے میں الگ نوٹ درج ہے)۔

۳۷- یعنی تمھاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے، اور بعض سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔

۳۸- ”سلامتی“ سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے، اُسے فکر و عمل کے ہر چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔

۳۹- عیسائیوں نے ابتداءً مسیحؑ کی شخصیّت کو انسانیت اور اُلوہیت کا مُرکّب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے لیے مسیحؑ کی حقیقت ایک مُعمّا بن کر رہ گئی، جسے اُن کے علما نے لفّاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی، اُتنے ہی زیادہ اُلجھتے چلے گئے۔ اُن میں سے جس کے ذہن پر اِس مُرکّب شخصیّت کے جُزوِ انسانی نے غلبہ کیا، اس نے مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جُزوِ اُلوہیّت کا اثر زیادہ غالب ہوا، اس نے مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظُہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے مسیحؑ کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی، انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صَرف کر دیا جن سے مسیحؑ کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جا سکے، خدا اور مسیحؑ الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔ (ملاحظہ ہو: سُورۂ نساء، حاشیہ ۲۱۲، ۲۱۳ و ۲۱۵)

فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ
وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ
مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اگر خدا مسیحؑ ابنِ مریم اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اُس کو اِس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور اُن سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے[۴۰] اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

یہُود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پُوچھو: پھر وہ تمھارے گناہوں پر تمھیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔

---

۴۰ – اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیحؑ کی اعجازی پیدائش اور ان کے اَخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ مسیحؑ ہی خدا ہے، وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیحؑ تو اللہ کے بے شمار عجائبِ تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چُندھیا گئیں۔ اگر اِن لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ پس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ
عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ
وَّ لَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ؑ ﴿۱۹﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ ۳ ع ۸ ۷
عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ
يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ

زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی مِلک ہیں، اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمھارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمھیں دے رہا ہے جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدّت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو! اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آ گیا ـــــ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۴۱] ع

یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اُس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اُس نے تم میں نبی پیدا کیے، تم کو فرماں روا بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہ دیا[۴۲] تھا۔ اے برادرانِ قوم! اس مقدّس سرزمین میں داخل ہو جاؤ

۴۱- اِس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ ولطیف ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا پہلے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر تھا، اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر ونذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو کہ اللہ قادر وتوانا ہے۔ ہر سزا جو وہ تمھیں دینا چاہے بلا مُزاحمت دے سکتا ہے۔

۴۲- یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس عظمتِ گزشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کسی

الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا
خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ
نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا
دٰخِلُوْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا

جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے،[۴۳] پیچھے نہ ہٹو، ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔[۴۴]" انھوں نے جواب دیا: "اے موسیٰؑ! وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں۔" اُن ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے[۴۵] جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ

زمانے میں اُن کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اُن کی قوم میں پیدا ہوئے، اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور اُن کے بعد مصر میں اُن کو بڑا اِقتدار نصیب ہُوا۔ مدّتِ دراز تک یہی اس زمانے کی مہذّب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے اور انھی کا سکّہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عُموماً لوگ بنی اسرائیل کے عُروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع کرتے ہیں، لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانۂ عُروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا تھا، جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

۴۳ – اِس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا مَسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کرلو۔

۴۴ – حضرت موسیٰؑ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جب کہ مصر سے نکلنے کے تقریباً دو سال بعد آپ اپنی قوم کو لیے ہوئے دشتِ فاران میں خیمہ زن تھے۔ یہ بیابان جزیرہ نمائے سینا میں عرب کی شمالی اور فلسطین کی جُنوبی سرحد سے متصل واقع ہے۔

۴۵ – قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ جو لوگ جبّاروں سے ڈر رہے تھے، اُن کے درمیان سے دو شخص بول اُٹھے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ خدا سے ڈرنے والے تھے، ان میں سے دو شخصوں نے یہ بات کہی۔

ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَإِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى
اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا
لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ
وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ

”اِن جبّاروں کے مقابلے میں دروازے کے اندر گُھس جاوٴ، جب تم اندر پہنچ جاوٴ گے تو تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ پر بھروسا رکھو اگر تم مومن ہو۔“ لیکن اُنھوں نے پھر یہی کہا کہ ”اے موسیٰؑ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب، دونوں جاوٴ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس پر موسیٰؑ نے کہا: ”اے میرے رب! میرے اختیار میں کوئی نہیں، مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں اِن نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔“ اللہ نے جواب دیا: ”اچھا تو وہ مُلک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے،[۴٦]

۴٦- اِس قصّے کی تفصیلات بائبل کی کتاب گنتی، اِستثنا اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دشتِ فاران سے بنی اسرائیل کے ١٢ سرداروں کو فلسطین کا دَورہ کرنے کے لیے بھیجا، تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دَورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انھوں نے قوم کے مجمعِ عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دُودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، ”لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں...... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں...... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد آور ہیں، اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبّار ہیں اور جبّاروں کی نسل سے ہیں، اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹِڈّے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔“ یہ بیان سُن کر سارا مجمع چیخ اُٹھا کہ ”اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اِس بیابان ہی میں مرتے! خداوند! کیوں ہم کو اُس مُلک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لُوٹ کا مال ٹھیریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہو گا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔“ پھر وہ آپس میں کہنے لگے

۳
ع
۸

فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ ع وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ
ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وقف لازم
وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا
یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ النصف

اِن نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔[۴۷]“ ع

اور ذرا انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصّہ بھی بے کم و کاست سُنا دو۔ جب اُن دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دُوسرے کی نہ کی گئی۔ اُس نے کہا: ”میں تجھے مار ڈالوں گا۔“ اس نے جواب دیا: ”اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔[۴۸] اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے

کہ آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لَوٹ چلیں۔ اِس پر اُن بارہ سرداروں میں سے، جو فلسطین کے دَورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار، یُوشَع اور کالِب اُٹھے اور انھوں نے اِس بُزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا: ”چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کرلیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرُّف کریں۔“ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا: ”اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا...... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو...... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو ان کا خوف نہ کرو۔“ مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ ”انھیں سنگسار کر دو۔“ آخرکار اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے فیصلہ فرمایا کہ اچھا اب یُوشَع اور کالِب کے سوا اس قوم کے بالغ مَردوں میں سے کوئی بھی اُس سرزمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ قوم چالیس برس تک بے خانماں پھرتی رہے گی، یہاں تک کہ جب ان میں سے ۲۰ برس سے لے کر اُوپر کی عمر تک کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اُٹھے گی، تب انھیں فلسطین فتح کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ اس فیصلۂ خداوندی کے مطابق بنی اسرائیل کو دشتِ فاران سے شرقِ اُردُن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۳۸ برس لگ گئے۔ اِس دَوران میں وہ سب لوگ مرکھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے۔ شرقِ اُردُن فتح کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت یُوشَع بن نُون کے عہدِ خلافت میں بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کرسکیں۔

۴۷- یہاں اس واقعے کا حوالہ دینے کی غرض سلسلۂ بیان پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قصے کے پیرایے میں دراصل بنی اسرائیل کو یہ جتانا مقصود ہے کہ موسیٰؑ کے زمانے میں نافرمانی، انحراف اور پست ہمتی سے کام لے کر جو سزا تم نے پائی تھی، اب اس سے بہت زیادہ سخت سزا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں باغیانہ روش اختیار کر کے

لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۚ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتْ
لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۳۰﴾

ہاتھ اُٹھائے گا تو مَیں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا،[۴۹] مَیں اللہ ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تُو ہی سمیٹ لے[۵۰] اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔" آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

پاؤ گے۔

۴۸ – یعنی تیری قربانی اگر قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قصُور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، لہٰذا میری جان لینے کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

۴۹ – اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مُدافعت نہ کروں گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تُو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا۔ تو میرے قتل کی تدبیر میں لگنا چاہے تو تجھے اختیار ہے، لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تو میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ کوشش نہ کروں گا کہ پہلے مَیں ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملے کی مُدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہُوا ہے، تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اُس کی طرف سے ہو، نہ کہ میری طرف سے۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السّلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔

۵۰ – یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قتل کی سعی میں ہم دونوں گناہ گار ہوں، میں اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دونوں کا گناہ تنہا تیرے ہی حصّے میں آ جائے، تیرے اپنے قاتلانہ اقدام کا گناہ بھی، اور اس نقصان کا گناہ بھی جو اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہاتھ سے تجھے پہنچ جائے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ
سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا
الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ ۚۛ مِنْ معانقة ۵
اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ وقف النبی ۱۰ صلی اللہ علیہ وسلم

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھُپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا: ''افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھُپانے کی تدبیر نکال لیتا۔''[۵۱] اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔[۵۲]

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا[۵۳] کہ ''جس نے کسی انسان کو خون کے

---

۵۱ - اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے سے آدمؑ کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر مُتنَبِّہ کیا، اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوّے سے پیچھے کیوں رہ گیا، بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ کہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

۵۲ - یہاں اس واقعے کا ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کو ان کی اُس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جلیل القدر صحابہؓ کو قتل کرنے کے لیے کی تھی (ملاحظہ ہو اِسی سورت کا حاشیہ ۳۰)۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے اِن اُمّیوں کو قبولیّت کا درجہ عطا فرمایا اور اُن پُرانے اہلِ کتاب کو رَد کر دیا، سراسر اِس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف تقویٰ تھا اور دوسری طرف تقویٰ نہ تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جنھیں رد کیا گیا تھا، اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اُس قصُور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ رَد کیے گئے تھے، ان پر ٹھیک اُسی جاہلیّت کا دَورہ پڑ گیا جس میں آدمؑ کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا، اور اُسی کی طرح وہ ان لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے جنھیں خدا نے قُبولیّت عطا فرمائی تھی۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ ایسی جاہلانہ حرکتوں سے وہ خدا کے مقبول نہ ہو سکتے تھے، بلکہ یہ کرتوت انھیں اور زیادہ مردود بنا دینے والے تھے۔

۵۳ - یعنی چونکہ بنی اسرائیل کے اندر اُنھی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدمؑ کے اس ظالم بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتلِ نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے

نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا
فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ٚ
ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا
جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ

بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی، اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش[54] دی۔" مگر اُن کا حال یہ ہے کہ ہمارے رُسول پے در پے ان کے پاس کُھلی کُھلی ہدایات لے کر آئے، پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دَو کرتے پھرتے

تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائبل پائی جاتی ہے وہ فرمانِ خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ البتہ تلمود میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: "جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، کتاب اللہ کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کیا، اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔" اسی طرح تلمود میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ قتل کے مقدّمات میں بنی اسرائیل کے قاضی گواہوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے کہ "جو شخص ایک انسان کی جان ہلاک کرتا ہے، وہ ایسی باز پُرس کا مستحق ہے کہ گویا اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو قتل کیا ہے۔"

[54] ۵۴ – مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفّظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے، وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے، وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔

فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ
وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ
خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۳۳﴾ اِلَّا
الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

ہیں کہ فساد برپا کریں،[۵۵] اُن کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سُولی پر چڑھائے جائیں، یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سَمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیے جائیں۔[۵۶] یہ ذلّت و رسوائی تو اُن کے لیے دُنیا میں ہے اور آخرت میں اُن کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ ـــــ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ

---

۵۵ - زمین سے مراد یہاں وہ مُلک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمّہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو۔ اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اُس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے مُلک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی کے لیے اس نے اپنا رسول بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اُس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں، نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطعِ نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو اُلٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے، دراصل وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اُس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرے ”بادشاہ کے خلاف لڑائی“ (waging war against the king) کا مجرم قرار دیا گیا، چاہے اس کی کارروائی مُلک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دست رس سے کتنا ہی دُور ہو۔

۵۶ - یہ مختلف سزائیں برسبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں، تاکہ قاضی یا امامِ وقت اپنے اجتہاد سے ہر مُجرم کو اس کے جرم کی نوعیّت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اُلٹنے کی کوشش کرنا بدترین جُرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

ع ٨ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ؃۳۴ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِهٖ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۳۵

اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[٥٧] ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اُس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو[٥٨] اور اس کی راہ میں جِدّ وجُہد کرو،[٥٩] شاید کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو جائے۔

٥٧- یعنی اگر وہ سعیِ فساد سے باز آ گئے ہوں، اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا اُلٹنے کی کوشش چھوڑ چکے ہوں، اور اُن کا بعد کا طرزِ عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند، مطیعِ قانون، اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں، اور اس کے بعد اُن کے سابق جرائم کا پتا چلے، تو اُن سزاؤں میں سے کوئی سزا اُن کو نہ دی جائے گی جو اُوپر بیان ہوئی ہیں۔ البتہ آدمیوں کے حُقوق پر اگر کوئی دست درازی انھوں نے کی تھی تو اس کی ذمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی انسان کو انھوں نے قتل کیا تھا، یا کسی کا مال لیا تھا، یا کوئی اور جُرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا، تو اسی جرم کے بارے میں فوجداری مقدّمہ ان پر قائم کیا جائے گا، لیکن بغاوت اور غدّاری اور خدا و رسول کے خلاف مُحارَبہ کا کوئی مقدّمہ نہ چلایا جائے گا۔

٥٨- یعنی ہر اُس ذریعے کے طالب اور جویاں رہو جس سے تم اللہ کا تقرّب حاصل کر سکو اور اس کی رضا کو پہنچ سکو۔

٥٩- اصل میں لفظ جَاهِدُوْا استعمال فرمایا گیا ہے، جس کا مفہُوم محض ”جِدّو جُہد“ سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلے کا مُقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں، جو تم کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پُوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمھیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام اِمکانی طاقتوں سے کشمکش اور جِدّو جُہد کرو۔ اسی جدو جہد پر تمھاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمھارے تقرب کا انحصار ہے۔

اس طرح یہ آیت بندۂ مومن کو ہر محاذ پر چَوطَرفہ لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف ابلیسِ لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے۔ دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں۔ تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدُّنی اور مَعاشی تعلّقات میں بندھا ہوا ہے۔ چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدّنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں اور بندگیِ حق کے بجائے بندگیِ باطل پر انسان کو مجبُور کرتے ہیں۔ ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں۔ بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا اور تقربِ خداوندی کے مَقام تک اس کے عُروج کا انحصار بالکُلّیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصتاً اس کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اِس کے

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ
مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا

خُوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویّہ اختیار کیا ہے، اگر اُن کے قبضے میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اَور اس کے ساتھ، اور وہ چاہیں کہ اسے فدیے میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انھیں درد ناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں، مگر نہ نکل سکیں گے اور انھیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو،[۶۰] یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے

ممکن نہیں ہے کہ وہ اِن تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو، ہر وقت ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رُکاوٹوں کو پامال کرتا ہُوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔

[۶۰] دونوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک ہاتھ۔ اور اُمّت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ پہلی چوری پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ لا قطع علی خائنٍ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سَرقے کا اطلاق خیانت وغیرہ پر نہیں ہوتا، بلکہ صرف اِس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ایک ڈھال کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بروایتِ عبد اللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایتِ ابنِ عمرؓ تین درہم، بروایتِ اَنَسؓ بن مالک ۵ دِرہم، اور بروایتِ حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔ اسی اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصابِ سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سرقے کا نصاب دس درہم ہے، اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک چوتھائی دینار۔ (اُس زمانے کے درہم میں تین ماشہ ۱$\frac{1}{5}$ رتی چاندی ہوتی تھی، اور ایک چوتھائی دینار ۳ دِرہم کے برابر تھا)۔

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظرِ عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی[۶۱]، اللہ بہت درگزر کرنے والا

پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ لا قطع فی ثمرة ولا کثر (پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا)۔ لا قطع فی طعام (کھانے کی چوری میں قطعِ ید نہیں ہے)۔ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ لم یکن قطع السارق علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الشیء التافه (حقیر چیزوں کی چوری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا)۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا فیصلہ ہے اور صحابۂ کرامؓ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے کہ لا قطع فی الطّیر (پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے)۔ نیز سیّدنا عُمر و علی رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اور اس معاملے میں بھی صحابۂ کرامؓ میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ اِن مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمۂ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطعِ ید کے حکم سے مُستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلّہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطعِ ید کی سزا نہیں ہے۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی وہ قطعِ ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمّہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اِن چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

۶۱ — اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کرکے اللہ کا صالح بندہ بن جائے، وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا، اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھودے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی، اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اِسی لیے قرآنِ مجید چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظامِ تمدّن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رُجوع اِلی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلّق احادیث میں مذکور ہے کہ ایک چور کا ہاتھ جب آپؐ کے حکم کے مطابق کاٹا جا چکا تو آپؐ نے اُسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا: قل استغفر اللّٰه

رَّحِيْمٌ ﴿٣٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿٤٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ

اور رحم فرمانے والا ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے؟ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

اے پیغمبرؐ! تمھارے لیے باعثِ رنج نہ ہوں وہ لوگ جو کفر کی راہ میں بڑی تیز گامی دکھا رہے ہیں۔[٦٢]

واتوب الیه، ”کہہ، میں خدا سے معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔“ اُس نے آپؐ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے۔ پھر آپؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ۔ ”خدایا! اسے معاف فرما دے۔“

٦٢ – یعنی جن کی ذہانتیں اور سرگرمیاں ساری کی ساری اس کوشش میں صَرف ہو رہی ہیں کہ جاہلیّت کی جو حالت پہلے سے چلی آ رہی ہے وہی برقرار رہے اور اسلام کی یہ اصلاحی دعوت اُس بگاڑ کو دُرست کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ تمام اَخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کی رکیک سے رکیک چالیں چل رہے تھے۔ جان بُوجھ کر حق نِگل رہے تھے۔ نہایت بے باکی و جسارت کے ساتھ جھوٹ، فریب، دغا اور مکر کے ہتھیاروں سے اُس پاک انسان کے کام کو شکست دینے کی کوشش کر رہے تھے جو کامل بے غَرضی کے ساتھ سراسر خیر خواہی کی بنا پر عام انسانوں کی اور خود اُن کی فلاح و بہبود کے لیے شب و روز محنت کر رہا تھا۔ اُن کی اِن حرکات کو دیکھ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کُڑھتا تھا، اور یہ کُڑھنا بالکل فطری امر تھا۔ جب کسی پاکیزہ انسان کو پست اخلاق لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ محض اپنی جہالت اور خود غرضی و تنگ نظری کی بنا پر اس کی خیر خواہانہ مساعی کو روکنے کے لیے گھٹیا درجے کی چال بازیوں سے کام لیتے ہیں تو فطرتاً اُس کا دل دُکھتا ہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ نہیں ہے کہ اِن حرکات پر جو فطری رنج آپؐ کو ہوتا ہے وہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ منشا دراصل یہ ہے کہ اس سے آپؐ دل شکستہ نہ ہوں، ہمّت نہ ہاریں، صبر کے ساتھ بندگانِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کیے چلے جائیں۔ رہے یہ لوگ، تو جس قسم کے ذلیل اخلاق انھوں نے اپنے اندر پرورش کیے ہیں، اُن کی بنا پر یہ روش ان سے عین متوقع ہے، کوئی چیز اِن کی اِس روش میں خلافِ توقع نہیں ہے۔

مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ
الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ
یَاْتُوْكَ ؕ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ
اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ

مع ۲ الوقف علی الاولی اجوز ۱۲

خواہ وہ اُن میں سے ہوں جو منہ سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے مگر دل اُن کے ایمان نہیں لائے، یا اُن میں سے ہوں جو یہودی بن گئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جھُوٹ کے لیے کان لگاتے ہیں[۶۳]، اور دُوسرے لوگوں کی خاطر، جو تمھارے پاس کبھی نہیں آئے، سُن گُن لیتے پھرتے ہیں[۶۴]، کتاب اللہ کے الفاظ کو اُن کا صحیح محل متعیّن ہونے کے باوجود اصل معنٰی سے پھیرتے ہیں[۶۵]، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمھیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہیں تو نہ مانو[۶۶]۔ جسے اللہ ہی نے فتنے میں

---

[۶۳] اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ لوگ چونکہ خواہشات کے بندے بن گئے ہیں، اس لیے سچّائی سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جھُوٹ ہی انھیں پسند آتا ہے اور اسی کو یہ جی لگا کر سُنتے ہیں، کیونکہ ان کے نفس کی پیاس اُسی سے بُجھتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں یہ جھُوٹ کی غرض سے آکر بیٹھتے ہیں، تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور جو باتیں سُنیں، اُن کو اُلٹے معنٰی پہنا کر یا ان کے ساتھ اپنی طرف سے غلط باتوں کی آمیزش کر کے آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے لوگوں میں پھیلائیں۔

[۶۴] اس کے بھی دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مجلسوں میں اس لیے گشت لگاتے پھرتے ہیں کہ کوئی راز کی بات کان میں پڑے تو اسے آپؐ کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے مواد فراہم کرتے پھرتے ہیں، تاکہ اُن لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

[۶۵] یعنی تورات کے جو احکام ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں، ان کے اندر جان بُوجھ کر ردّوبدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنٰی بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں۔

[۶۶] یعنی جاہل عوام سے کہتے ہیں کہ جو حکم ہم بتا رہے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی حکم تمھیں بتائیں تو اسے قبول کرنا ورنہ رد کر دینا۔

فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ
يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّلَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ
لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ

ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو، اس کو اللہ کی گرفت سے بچانے کے لیے تم کچھ نہیں کر سکتے۔[۶۷] یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا۔[۶۸] ان کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

یہ جھُوٹ سُننے والے اور حرام کے مال کھانے والے ہیں۔[۶۹] لہٰذا اگر یہ تمھارے پاس (اپنے مقدّمات لے کر) آئیں تو تمھیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کرو، ورنہ انکار کر دو۔

---

۶۷ - اللہ کی طرف سے کسی کے فتنے میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ کسی قسم کے بُرے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے، اس کے سامنے پے در پے ایسے مواقع لاتا ہے جن میں اس کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اگر وہ شخص ابھی بُرائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمائشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں موجود ہوتی ہیں وہ اُبھر آتی ہیں۔ لیکن اگر وہ بُرائی کی طرف پُوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی سے اندر ہی اندر شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمائش کے موقع پر وہ اور زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی بگڑتے ہوئے انسان کو بچا لینا اس کے کسی خیر خواہ کے بس میں نہیں ہوتا۔ اور اس فتنے میں صرف افراد ہی نہیں ڈالے جاتے بلکہ قومیں بھی ڈالی جاتی ہیں۔

۶۸ - اس لیے کہ انھوں نے خود پاک ہونا نہ چاہا۔ جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے، اُسے پاکیزگی سے محروم کرنا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ اللہ پاک کرنا اُسی کو نہیں چاہتا جو خود پاک ہونا نہیں چاہتا۔

۶۹ - یہاں خاص طور پر اُن کے مفتیوں اور قاضیوں کی طرف اشارہ ہے جو جھُوٹی شہادتیں لے کر اور جھُوٹی رودادیں سُن کر اُن لوگوں کے حق میں انصاف کے خلاف فیصلے کیا کرتے تھے جن سے انھیں رشوت پہنچ جاتی تھی یا جن کے ساتھ ان کے ناجائز مفاد وابستہ ہوتے تھے۔

وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾
وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ
ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

۶ ع ۱۰

انکار کر دو تو یہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ کرو، کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے[۶۹] ــــــ اور یہ تمھیں کیسے حَکَم بناتے ہیں جب کہ ان کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہُوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں[۷۰]؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ع

---

۷۰ – یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کی باقاعدہ رعایا نہیں بنے تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلّقات مُعاہَدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رُو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور ان کے مقدّمات کے فیصلے انھی کے قوانین کے مطابق اُن کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپؐ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدّمات لانے کے لیے وہ از رُوئے قانون مجبور نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرنا نہ چاہتے تھے، اُن کا فیصلہ کرانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس اُمید پر آجاتے تھے کہ شاید آپؐ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔

یہاں خاص طور پر جس مقدّمے کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ توراۃ کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی، یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (اِستِثنا، باب ۲۲، آیت ۲۳-۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدّمے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پنچ بنایا جائے۔ اگر وہ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے، اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدّمہ آپؐ کے سامنے لایا گیا۔ آپؐ نے رجم کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا: تمھارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا: کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپؐ نے ان کے علما کو قسم دے کر اُن سے پوچھا: کیا توراۃ میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انھوں نے پھر وہی جھوٹا جواب دیا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص ابنِ صوریا، جو خود یہودیوں کے بیان

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا
النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ
وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی، جو مُسلم تھے، اُسی کے مطابق اِن یہودی بن جانے والوں[۷۲] کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے، اور اِسی طرح ربّانی اور اَحبار[۷۳] بھی (اسی پر فیصلے کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمّہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر

کے مطابق اپنے وقت میں تورات کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپؐ نے اُس سے مُخاطَب ہو کر فرمایا کہ میں تجھے اُس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طُور پر تمھیں شریعت عطا کی، کیا واقعی تورات میں زِنا کی یہی سزا لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”اگر آپؐ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو مَیں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زِنا کی سزا تو رجم ہی ہے، مگر ہمارے ہاں جب زِنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حُکّام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کر دیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے تورات کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کیا جائے۔“ اس کے بعد یہودیوں کے لیے کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

۷۱ – اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ ”مذہبی لوگ“ جنھوں نے تمام عرب پر اپنی دین داری اور اپنے علمِ کتاب کا سکّہ جما رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ جس کتاب کو خود کتاب اللہ مانتے تھے اور جس پر ایمان رکھنے کے مدّعی تھے، اس کے حکم کو چھوڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدّمہ لائے تھے جن کے پیغمبر ہونے سے ان کو بشدّت انکار تھا۔ اس سے یہ راز بالکل فاش ہو گیا کہ یہ کسی چیز پر بھی صداقت کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے، دراصل ان کا ایمان اپنے نفس اور اس کی خواہشات پر ہے، جسے کتاب اللہ مانتے ہیں اس سے صرف اس لیے منہ موڑتے ہیں کہ اس کا حکم ان کے نفس کو ناگوار ہے، اور جسے معاذ اللہ! جھوٹا مدّعیِ نبوت کہتے ہیں، اس کے پاس صرف اس اُمید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ حاصل ہو جائے جو ان کے منشا کے مطابق ہو۔

۷۲ – یہاں ضمناً اس حقیقت پر بھی مُتنَبِّہ کر دیا گیا کہ انبیاؑ سب کے سب ”مسلم“ تھے، بخلاف اس کے یہ یہودی ”اِسلام“ سے ہٹ کر اور فرقہ بندی میں مبتلا ہو کر صرف ”یہودی“ بن کر رہ گئے تھے۔

۷۳ – ربّانی: عُلما۔ اَحبار: فُقَہا۔

شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا
قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ
الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ
قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ

گواہ تھے۔ پس (اے گروہِ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ[۷۴]۔ پھر جو قِصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفّارہ[۷۵] ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ کو بھیجا۔ تورات میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں

---

[۷۴] – تقابل کے لیے مُلاحظہ ہو: تورات کی کتابِ خُروج، باب ۲۱، آیت ۲۳-۲۵۔

[۷۵] – یعنی جو شخص صدقہ کی نیت سے قِصاص معاف کر دے اس کے حق میں یہ نیکی اس کے بہت سے گناہوں کا کفّارہ ہو جائے گی۔ اسی معنیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ من جرح فی جسدہ جراحۃ فتصدق بھا کفر عنہ ذنوبہ بمثل ما تصدق بہ – یعنی جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا، تو جس درجے کی

هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى
وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ؕ﴿۴۶﴾ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اُس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی[۷۶] اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں[۷۷]۔

یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

۷۶ – یعنی مسیح علیہ السلام کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین، جو تمام پچھلے انبیاؑ کا دین تھا، مسیحؑ کا دین بھی تھا اور اسی کی طرف وہ دعوت دیتے تھے۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیحؑ خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی (ملاحظہ ہو: متّی، باب ۵، آیت ۱۷-۱۸)۔ قرآن اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے انبیاؑ دنیا کے کسی گوشے میں آئے ہیں، اُن میں سے کوئی بھی پچھلے انبیاؑ کی تردید کے لیے اور ان کے کام کو مٹا کر اپنا نیا مذہب چلانے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ ہر نبی اپنے پیشرو انبیاؑ کی تصدیق کرتا تھا اور اسی کام کو فروغ دینے کے لیے آتا تھا جسے اگلوں نے ایک پاک ورثے کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی کتاب اپنی ہی پچھلی کتابوں کی تردید کرنے کے لیے کبھی نہیں بھیجی، بلکہ اس کی ہر کتاب پہلے آئی ہوئی کتابوں کی مؤید اور مصدّق تھی۔

۷۷ – یہاں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے، وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے: اوّلاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنیٰ ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا، اس لیے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی و اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ
الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا

پھر اے محمدؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور ”الکتاب“ میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے[۷۸] والی اور اس کی محافظ ونگہبان ہے[۷۹]۔ لٰہذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق

ازحکمِ خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو، وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ البتہ جس طرح انحراف کے دَرَجات ومراتب میں فرق ہے، اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں بھی فرق ہے۔ جو شخص حکمِ الٰہی کے خلاف اس بِنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا کسی دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے، وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو اعتقاداً حکمِ الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج ازملّت تو نہیں ہے، مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔ اِسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکمِ الٰہی سے انحراف اختیار کرلیا ہے، وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض میں منحرف ہے، اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر وظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسُب کے ساتھ ہے جس تناسُب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے ان آیات کو اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص قرار دینے کی کوشش کی ہے، مگر کلامِ الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجایش موجود نہیں۔ اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حُذَیفہ رضی اللہ عنہ نے دیا ہے۔ ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔ کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کیا ہو، وہی کافر، وہی ظالم اور وہی فاسق ہے۔ اس پر حضرت حُذَیفہؓ نے فرمایا: نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلّا واللّٰہ لتسلکن طریقھم قدر الشراك۔ ”کتنے اچھے بھائی ہیں تمھارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب اُن کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے! ہرگز نہیں، خدا کی قسم! تم انھی کے طریقے پر قدم بقدم چلو گے۔“

۷۸ – یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا تھا کہ ”پچھلی کتابوں“ میں سے جو کچھ اپنی اصلی اور صحیح صورت پر باقی ہے، قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ”پچھلی کتابوں“ کے بجائے ”الکتاب“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ قرآن اور تمام وہ کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں۔

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ

تمھارے پاس آیا ہے، اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ـــــ ہم[۸۰] نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرّر کی۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بھی بنا سکتا تھا، لیکن اُس نے یہ اِس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے،

ایک ہی ان کا مصنّف ہے، ایک ہی ان کا مدّعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے، اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا کیا گیا۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے، جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ پس حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں، مؤیِّد ہیں، تردید کرنے والی نہیں، تصدیق کرنے والی ہیں، بلکہ اصل حقیقت اس سے کچھ بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی ''الکتاب'' کے مختلف ایڈیشن ہیں۔

۷۹ - اصل میں لفظ ''مُھَیْمِنْ'' استعمال ہوا ہے۔ عربی میں ھیمن یھیمن ھیمنۃ کے معنیٰ مُحافَظَت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ ھیمن الرجل الشیٔ، یعنی آدمی نے فُلاں چیز کی حفاظت و نگہبانی کی۔ ھیمن الطائر علیٰ فراخہ، یعنی پرندے نے اپنے چُوزے کو اپنے پَروں میں لے کر محفوظ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا: انی داعٍ فھیمنوا، یعنی میں دعا کرتا ہوں، تم تائید میں آمین کہو۔ اسی سے لفظ ھمیان ہے، جسے اُردو میں ہمیانی کہتے ہیں، یعنی وہ تھیلی جس میں آدمی اپنا مال رکھ کر محفوظ کرتا ہے۔ پس قرآن کو ''الکِتٰب'' پر مھیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی کُتُبِ آسمانی میں دی گئی تھیں، اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ان پر نگہبان ہے، اس معنیٰ میں کہ اب ان کی تعلیماتِ برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا۔ وہ ان کا مؤیِّد ہے، اس معنیٰ میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے، قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ ان پر گواہ ہے، اس معنیٰ میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام کی جو آمیزش ہو گئی ہے، قرآن کی شہادت سے اس کو پھر چھانٹا جا سکتا ہے، جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام۔

۸۰ - یہ ایک جملۂ معترضہ ہے، جس سے مقصود ایک سوال کی توضیح کرنا ہے جو اُوپر کے سلسلۂ تقریر کو سُنتے ہوئے مخاطَب کے ذہن میں اُلجھن پیدا کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تمام انبیاؑ اور تمام کتابوں کا دین ایک ہے، اور یہ سب ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے آئے ہیں، تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ عبادت کی صُورتوں میں، حرام اور حلال کی قُیود میں اور قوانینِ تمدّن و معاشرت کے فُروع میں مختلف انبیاؑ اور

فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ ۙ وَ اَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ

اس میں تمھاری آزمایش کرے۔ لٰہذا بھلائیوں میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخرکار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو[۸۱] ——پس[۸۲] اے محمدؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق

کُتُبِ آسمانی کی شریعتوں کے درمیان تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے؟

۸۱ – یہ مذکورۂ بالا سوال کا پُورا جواب ہے۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے:

(۱) محض اختلافِ شرائع کو اس بات کی دلیل قرار دینا غلط ہے کہ یہ شریعتیں مختلف مآخذ سے ماخوذ اور مختلف سرچشموں سے نکلی ہوئی ہیں۔ دراصل وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مختلف قوموں کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں مختلف ضابطے مقرر فرمائے۔

(۲) بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک اُمّت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاؑ کی شریعتوں کے درمیان رکھا، اُس کے اندر دوسری بہت سی مَصلَحتوں کے ساتھ ایک بڑی مَصلَحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقے سے لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا۔ جو لوگ اصل دین اور اس کی رُوح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں، اور دین میں اِن ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں، اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو، جس صُورت میں بھی وہ آئے گا، پہچان لیں گے اور قُبول کر لیں گے۔ اُن کو اللہ کے بھیجے ہوئے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تأمُّل نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ رُوحِ دین سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، اور جنھوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصّب اختیار کر لیا ہے، وہ ہر اُس ہدایت کو رَدّ کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو مُمیَّز کرنے کے لیے یہ آزمایش ضروری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا۔

(۳) تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو پانا ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکمِ خدا ہو، اُس کی پیروی کی جائے۔ لٰہذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں، ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے فُروق پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اُس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو۔

(۴) جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصّب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی اُپَج سے خود پیدا کر لیے ہیں، ان کا آخری فیصلہ نہ مجلسِ مناظرہ میں ہو سکتا ہے، نہ میدانِ جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جب کہ حقیقت بے نقاب

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ
يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ
وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۴۹) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ
يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵۰) ع ۷ ۱۱

اِن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اُس ہدایت سے ذرّہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اِن کے بعض گناہوں کی پاداش میں ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا ارادہ ہی کر لیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔ (اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیّت[۸۳] کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ع

کر دی جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں وہ عمریں کھپا کر دُنیا سے آئے ہیں اُن کی تہ میں ’’حق‘‘ کا جوہر کتنا تھا اور باطل کے حاشیے کس قدر۔

۸۲– یہاں سے پھر وہی سلسلۂ تقریر چل پڑتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

۸۳– جاہلیّت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے، کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیّت کا طریقہ ہے۔ عرب کے زمانۂ قبلِ اسلام کو جاہلیت کا دَور اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں علم کے بغیر محض وہم، یا قیاس و گمان، یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کر لیے تھے۔ یہ طرزِ عمل جہاں جس دَور میں بھی انسان اختیار کریں، اسے بہر حال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ محض ایک جُزوی علم ہے اور کسی معنیٰ میں بھی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو نظامِ زندگی اِس جُزوی علم کے ساتھ ظُنون و اَوہام اور قیاسات و خواہشات کی آمیزش کر کے بنا لیے گئے ہیں، وہ بھی اُسی طرح ’’جاہلیت‘‘ کی تعریف میں آتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے جاہلی طریقے اِس

وقف لازم
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ؔ
وقف غفران
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۱) فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ
تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دُوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نِفاق کی بیماری ہے، وہ اُنھی میں دوڑ دُھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ”ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکّر میں نہ پھنس جائیں[۸۴]“۔ مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمھیں فیصلہ کُن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات

تعریف میں آتے تھے۔

۸۴ – اُس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کشمکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیروؤں کی سرفروشیوں کے سبب سے ایک طاقت بن چکا تھا، لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا، ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا۔ اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے، وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھنا چاہتے تھے، تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ علاوہ بریں اُس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی مَعاشی قوت سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارا بیشتر انھی کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز و شاداب خِطّے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سُودخواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا مَعاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلّقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کشمکش میں ہمہ تن منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلّقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرِ پیکار ہے، تو یہ فعل سیاسی اور مَعاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔

عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿٥٢﴾
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ
اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٥٣﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي
اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ
اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ

ظاہر کرے[٨٥] گا تو یہ لوگ اپنے اِس نفاق پر، جسے یہ دلوں میں چُھپائے ہوئے ہیں، نادم ہوں گے۔ اور اُس وقت اہلِ ایمان کہیں گے: ”کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟“ ـــــــ ان کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور آخر کار یہ ناکام و نامُراد ہو کر رہے[٨٦]۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اَور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبُوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہو گا، جو مومنوں پر نرم اور کفّار پر سخت ہوں[٨٧] گے، جو اللہ کی راہ میں جِدّ و جُہد کریں گے اور

---

٨٥ – یعنی فیصلہ کُن فتح سے کم تر درجے کی کوئی ایسی چیز جس سے عمُوماً لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ ہار جیت کا آخری فیصلہ اسلام ہی کے حق میں ہو گا۔

٨٦ – یعنی جو کچھ انھوں نے اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے، قوانینِ اسلام کی اطاعت کی، یہ سب کچھ اس بنا پر ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا اور وہ سب سے کٹ کر صرف ایک خدا کے ہو کر نہ رہ گئے تھے، بلکہ اپنی دنیا کی خاطر انھوں نے اپنے آپ کو خدا اور اس کے باغیوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹ رکھا تھا۔

٨٧ – ”مومنوں پر نرم“ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے۔ اُس کی ذہانت، اس کی ہوشیاری، اُس کی قابلیّت، اُس کا رُسوخ واثر، اُس کا مال، اُس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی

لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (٥٤) اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ (٥٥) وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ
وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (٥٦) ع ٨ ع ١٢ ٦

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں[٨٨] گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

تمھارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنالے، اُسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔ ع

مسلمانوں کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ مسلمان اپنے درمیان اس کو ہمیشہ ایک نرم خُو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔

''کُفّار پر سخت'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پُختگی، دین داری کے خُلوص، اُصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمان کی فراست کی وجہ سے مخالفینِ اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جاسکے۔ وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارا نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے، ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بِک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا۔

٨٨ - یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اُس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اِس دین کی رُو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اُسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہوگا۔ کسی کی مُخالفت، کسی کی طعن و تشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر میں نکّو بنا لینے کے ہوں، تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچّے دل سے حق جانتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵۷) وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۵۸)
قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ
اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ (۵۹)
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رَو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دُوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ جب تم نماز کے لیے مُنادی کرتے ہو تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اس سے کھیلتے ہیں[۸۹]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے[۹۰]۔ اِن سے کہو: ”اے اہلِ کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اُس تعلیم پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور ہم سے پہلے بھی نازل ہوئی تھی، اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں؟“ پھر کہو: ”کیا میں اُن لوگوں کی نشان دہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟

---

[۸۹] یعنی اذان کی آواز سن کر اُس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر کے لیے اس کے الفاظ بدلتے اور مسخ کرتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔

[۹۰] یعنی ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو مسلمانوں سے مذہبی اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی خفیف حرکات ان سے سرزد نہ ہوتیں۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کرسکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے مُنادی کرے تو اس کا مذاق اُڑایا جائے۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ
الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ
سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا
بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا
يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ
الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾
لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ

وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ٹُوٹا، جن میں سے بندر اور سُؤر بنائے گئے، جنھوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ ان کا درجہ اَور بھی زیادہ بُرا ہے اور وہ سَوَاءُ السَّبِیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔[91]"

جب یہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھُپائے ہوئے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دَوڑ دُھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں۔ بہت بُری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ کیوں اِن کے علما اور مشائخ انھیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام

91– لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف، جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بارہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مُبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں، حتّٰی کہ وہ تنزُّل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انھیں نصیب ہوئی۔ پس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمھاری بے حیائی اور مجرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اَخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لا کر سچّی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ وقف لازم
بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا
مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ وَ

کھانے سے نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی بُرا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[92] ——— باندھے گئے ان کے ہاتھ[93]، اور لعنت پڑی اِن پر اُس بکواس کی بدولت جو یہ کرتے ہیں[94] ——— اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کلام تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، وہ ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں اُلٹے اضافے کا موجب بن گیا ہے[95]، اور (اس کی پاداش میں)

۹۲- عَرَبی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطا اور بخشش سے اُس کا ہاتھ رُکا ہوا ہے۔ پس یہودیوں کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے۔ چونکہ صدیوں سے یہودی قوم ذلّت و نکبت کی حالت میں مبتلا تھی اور اس کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انھیں نظر نہ آتا تھا، اس لیے بالعُموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بے ہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ! خدا تو بخیل ہو گیا ہے، اس کے خزانے کا منہ بند ہے، ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات اور مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک ہی محدود نہیں، دوسری قوموں کے جُہلا کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

۹۳- یعنی بخل میں یہ خود مُبتلا ہیں۔ دُنیا میں اپنے بخل اور اپنی تنگ دِلی کے لیے ضربُ المَثَل بن چکے ہیں۔

۹۴- یعنی اس قسم کی گستاخیاں اور طعن آمیز باتیں کر کے یہ چاہیں کہ خدا ان پر مہربان ہو جائے اور عنایات کی بارش کرنے لگے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ ان باتوں کا الٹا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی نظرِ عنایت سے

اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ

ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں، مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اگر (اِس سرکشی کے بجائے) یہ اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم اِن کی بُرائیاں اِن سے دُور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنّتوں میں پہنچاتے۔ کاش انھوں نے تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اِن کے رب کی طرف سے اِن کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو اِن کے لیے اُوپر سے رزق برستا اور نیچے سے

اور زیادہ محروم اور اس کی رحمت سے اَور زیادہ دُور ہوتے جاتے ہیں۔

۹۵- یعنی بجائے اس کے کہ اس کلام کو سُن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے، اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر مُتنبّہ ہو کر ان کی تلافی کرتے، اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے، اُن پر اس کا اُلٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں آ کر انھوں نے حق و صداقت کی مُخالفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے بھُولے ہوئے سبق کو سُن کر خود راہِ راست پر آنا تو درکنار، اُن کی اُلٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں، تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے نہ سُننے پائے۔

أَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
سَآءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ ع يٰٓأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِينَ ﴿٦٧﴾
قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيمُوا
التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

ع ٩ ١٣

اُبلتا۔[٩٦] اگر چہ اِن میں کچھ لوگ راست رَو بھی ہیں، لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔ ع

اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمھارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ صاف کہہ دو کہ ”اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور اُن دُوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں[٩٧]۔“

٩٦- بائبل کی کتابِ اَحبار (باب ٢٦) اور اِستثنا (باب ٢٨) میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انھوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اگر تم احکامِ الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے، اور اگر کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہُجوم کریں گی۔ حضرت موسیٰؑ کی وہ تقریر قرآن کے اِس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔

٩٧- تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کرنا اور انھیں اپنا دستورِ زندگی بنانا ہے۔ اِس موقع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بائبل کے مجموعۂ کُتبِ مقدّسہ میں ایک قسم کی عبارات تو وہ ہیں جو یہودی اور عیسائی مصنّفین نے بطورِ خود لکھی ہیں۔ اور دوسری قسم کی عبارات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات یا حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کے اقوال ہونے کی حیثیت سے منقول ہیں اور جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے ایسا فرمایا، یا فُلاں نبی نے ایسا کہا۔ ان میں سے پہلی قسم کی عبارات کو الگ کر کے اگر کوئی شخص صرف دوسری قسم کی عبارات کا تتبُّع کرے تو بآسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا
وَكُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا
وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصّٰبِـُٔونَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اَور زیادہ بڑھا دے[98] گا۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (یقین جانو کہ یہاں اِجارہ کسی کا بھی نہیں ہے) مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، بے شک اس کے لیے نہ کسی خوف کا مَقام ہے نہ رنج کا[99]۔

تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگرچہ مترجموں اور ناسخوں اور شارحوں کی دَراندازی سے، اور بعض جگہ زبانی راویوں کی غَلَطی سے، یہ دوسری قسم کی عبارات بھی پوری طرح محفوظ نہیں رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں بعینہٖ اسی خالص توحید کی دعوت دی گئی ہے جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے، وہی عقائد پیش کیے گئے ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور اسی طریقِ زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جس کی ہدایت قرآن دیتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اُسی تعلیم پر قائم رہتے جو اِن کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے، تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعْثَت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رَو گروہ پائے جاتے اور انھیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں پائی جاتی تھی۔ اس صورت میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے میں تبدیلِ مذہب کا سرے سے کوئی سوال پیدا ہی نہ ہوتا، بلکہ وہ اُسی راستے کے تسلسل میں، جس پر وہ پہلے سے چلے آ رہے تھے، آپؐ کے متبع بن کر آگے چل سکتے تھے۔

۹۸- یعنی یہ بات سُن کر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے بجائے وہ ضد میں آ کر اور زیادہ شدید مُخالَفت شروع کر دیں گے۔

۹۹- دیکھو سورۂ بقرہ، آیت ۶۲- و حاشیہ ۸۰۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ
رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ
فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۗ﴿۷۰﴾ وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ
صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ
كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ
قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور اُن کی طرف بہت سے رسُول بھیجے، مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول اُن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو کسی کو اُنھوں نے جھُٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا، اور اپنے نزدیک یہ سمجھے کہ کوئی فتنہ رُونما نہ ہوگا، اس لیے اندھے اور بہرے بن گئے۔ پھر اللہ نے اُنھیں معاف کیا تو اُن میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے بنتے چلے گئے۔ اللہ اُن کی یہ سب حرکات دیکھتا رہا ہے۔

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیحؑ نے کہا تھا کہ ”اے بنی اسرائیل! اللہ کی بندگی کرو، جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔“ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

وقف لازم

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٤﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٧٥﴾

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اِن باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اُس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مسیح ابنِ مریمؑ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسُول تھا، اُس سے پہلے اَور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے، اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی، اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کدھر اُلٹے پھرے جاتے ہیں[100]۔

---

۱۰۰ – اِن چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیحؑ کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھا، تو ان علامات سے بالکل غیر مُشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جس کا شجرۂ نسب تک موجود ہے، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو اُن تمام حُدُود سے محدود اور ان تمام قیُود سے مقیّد اور ان تمام صفات سے متّصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا، کھاتا تھا، گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا، حتّٰی کہ جسے شیطان کے ذریعے سے آزمایش میں بھی ڈالا گیا، اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ وہ

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع

ع ۱۰ ۱۱ ۱۳

اِن سے کہو: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمھارے لیے نقصان کا اختیار رکھتا ہے نہ نفع کا؟ حالانکہ سب کی سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا تو اللہ ہی ہے۔ کہو: اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غُلُوّ نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیُّلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور ”سَوَاءُ السَّبِیل“ سے بھٹک گئے[۱۰۱]۔ ع

خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک و سہیم ہے۔ لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیحؑ کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے مُتَّصِف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس تاریخی مسیحؑ کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالَمِ واقعہ میں ظاہر ہوا تھا، بلکہ انھوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اُسے خدا بنا لیا ہے۔

۱۰۱- اشارہ ہے اُن گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفۂ یونان کی طرف، جن کے تخیُّلات سے متاثّر ہو کر عیسائی اُس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیحؑ کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے، وہ بڑی حد تک اُس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مُشاہَدہ انھوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیحؑ کی عقیدت اور تعظیم میں غُلُوّ کر کے، اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اَوہام اور فلسفوں سے متاثّر ہو کر، اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیحؑ کی اصل تعلیمات سے دُور کا واسطہ بھی نہ رہا۔ اس باب میں خود ایک مسیحی عالمِ دینیات (ریورینڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابلِ مُلاحظہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں ”یسُوع مسیح“ (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

”پہلی تین انجیلوں (متّی، مرقُس، لُوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ

اِن انجیلوں کے لکھنے والے یسُوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی رُوح سے فیض یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلّق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق بجانب ہے۔ خود متّی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو ’’مسیح‘‘ تسلیم کرنے کے بعد ’’الگ ایک طرف لے جا کر اُسے ملامت کی‘‘ (متّی ۱۶:۲۲)۔ لُوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعۂ صلیب کے بعد یسُوع کے دو شاگرد اِمّاؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ ’’وہ خدا اور ساری اُمّت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا‘‘ (لُوقا ۲۴:۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ ’’مَرقُس‘‘ کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسُوع کے لیے لفظ ’’خداوند‘‘ (Lord) کا استعمال عام طور پر چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسُوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متّی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسُوع کے ابتلا کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں، جیسا کہ اس واقعے کے شایانِ شان ہے، مگر مَرقُس کی ’’فِدیہ‘‘ والی عبارت (مَرقُس ۱۰: ۴۵) اور آخری فسح کے موقع پر چند الفاظ کو مُستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعے کو وہ معنیٰ نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے۔ حتّٰی کہ اس بات کی طرف کہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ یسُوع کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفّارے سے کوئی تعلّق تھا۔‘‘

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

’’یہ بات کہ یسُوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، اناجیل کی متعدّد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ’’مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے، کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو‘‘ (لُوقا ۱۳: ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر ’’ابنِ آدم‘‘ کے نام سے کرتا ہے...... یسُوع کہیں اپنے آپ کو ’’ابن اللہ‘‘ نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جب اس کے متعلّق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا مَسُوح سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً ’’بیٹے‘‘ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے...... مزید برآں وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلّق کو بیان کرنے کے لیے بھی ’’باپ‘‘ کا لفظ اسی اِطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے...... اِس تعلّق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دَور میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا کے ساتھ اِس خاص گہرے تعلّق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع کے عمیق مطالعے نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملے میں وہ اکیلا ہے۔‘‘

پھر یہی مصنّف لکھتا ہے:

"عیدِ پنجکُسْت کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسُوع کو اُس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے...... انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسُوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اُس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا، وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافتِ احوال کا محتاج تھا، اُس نے دُکھ اُٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے...... درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اُس پورے تصوُّر کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعے کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں، ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی۔ تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیحؑ جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیّت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیّت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اُسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیحؑ کو قادرِ مُطلَق سمجھنے کی گنجایش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اِس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں ٹل سکتی"، اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حیثیت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانے سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جب کہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو اِلٰہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیحؑ کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اِس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیحؑ اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔"

اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے:

"وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعلِ رفع کے ذریعے سے یسُوع پورے اختیارات کے ساتھ "ابن اللہ" کے مرتبے پر علانیہ فائز کیا گیا...... یہ "ابن اللہ" کا لفظ یقینی طور پر ذاتی اِبنیّت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسُوع کو "خدا کا اپنا بیٹا" کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اِس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جا سکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال جس نے مسیحؑ کے لیے "خداوند" کا خطاب اصل مذہبی معنیٰ میں

> استعمال کیا۔ شاید یہ فعل مقدّم الذکر گروہ ہی کا ہو۔ لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنیٰ میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مُدّعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ ''خداوندِ یسُوع مسیحؑ'' کی طرف بہت سے وہ تصوّرات اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیے جو قدیم کُتُبِ مقدسہ میں خداوند یہُوَہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیحؑ کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مُساوی قرار دیا اور اُسے مُطلَق معنیٰ میں خدا کا بیٹا ٹھیرایا۔ تاہم متعدّد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیحؑ کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود پال اُس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔''

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک دوسرے مضمون ''مسیحیّت'' (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچا یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکّب ہے، مذہبی خیالات بائبل کے، اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صُورتوں میں۔
>
> باپ، بیٹا اور رُوح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسُوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا، تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے (اگرچہ اس مرکّب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا، وہ نہ کوئی اَخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اَقانیم (باپ، بیٹے اور روح) کے درمیان تعلّق کی حقیقت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا، وہ اُس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا، اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خُصوصیّات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔''

اسی سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک اور مضمون ''تاریخِ کلیسا'' (church history) کی یہ عبارت بھی قابلِ مُلاحظہ ہے:

> ''تیسری صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے مسیحؑ کو عام طور پر ''کلام'' کا جَسَدی ظُہور تو مان لیا گیا تھا، تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیحؑ کی اُلوہیّت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلے پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے اُلُوہیّتِ مسیحؑ کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتّب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدّت تک جھگڑا چلتا رہا، لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے

> فیصلے کی ہوئی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی اُلوہیت کے ساتھ رُوح کی اُلوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیحؑ کا جو تصور قائم کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جُزوِلاینفک قرار پا گیا۔
>
> پھر اس دعوے پر کہ ”بیٹے کی اُلوہیت مسیحؑ کی ذات میں مجسّم ہوئی تھی“ ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا، جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدّتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیحؑ کی شخصیت میں اُلوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کی کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیحؑ کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں مجتمع ہیں، ایک الٰہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خُصوصیات بلا کسی تغیّر و تبدّل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیّتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیحؑ بیک وقت دو مختلف مشیّتوں کا حامل ہے...... اِسی دَوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلے پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدّتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملے میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا۔ آخرکار ۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں...... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہُبُوطِ آدمؑ کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضلِ خداوندی سے، جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کر لے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالتِ خیر میں اِستمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ رہے۔ اور فضلِ خداوندی کی یہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسّط سے حاصل رہ سکتی ہے۔“

مسیحی علما کے اِن بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداءً جس چیز نے مسیحیوں کو گمراہ کیا، وہ عقیدت اور محبّت کا غُلُو تھا۔ اسی غُلُو کی بنا پر مسیح علیہ السّلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طرف منسوب کی گئیں، اور کفّارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا، حالانکہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب فلسفے کی ہَوا مسیحیوں کو لگی تو بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو سمجھ کر اس سے بچنے کی سعی کرتے، انھوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نباہنے کے لیے ان کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیحؑ کی اصل تعلیمات کی طرف رُجوع کیے بغیر محض مَنطِق اور فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو مُتنبّہ فرمایا ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۷۸) كَانُوْا لَا
يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۷۹) تَرٰى
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ
اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۸۰) وَلَوْ
كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اُن پر داوٗدؑ اور عیسٰیؑ ابنِ مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے، اُنھوں نے ایک دُوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا[۱۰۲] تھا، بُرا طرزِ عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا۔ آج تم اُن میں بکثرت ایسے لوگ دیکھتے ہو جو (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کفّار کی حمایت و رفاقت کرتے ہیں۔ یقیناً بہت بُرا انجام ہے جس کی تیاری اُن کے نفسوں نے اُن کے لیے کی ہے، اللہ اُن پر غضب ناک ہو گیا ہے اور وہ دائمی عذاب میں مُبتلا ہونے والے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ اور پیغمبرؐ اور اُس چیز کے ماننے والے ہوتے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تھی تو کبھی (اہلِ ایمان کے مقابلے میں) کافروں کو اپنا رفیق نہ بناتے۔[۱۰۳]

۱۰۲- ہر قوم کا بگاڑ ابتداءً چند افراد سے شروع ہوتا ہے۔ اگر قوم کا اجتماعی ضمیر زندہ ہوتا ہے تو رائے عام اِن بگڑے ہوئے افراد کو دبائے رکھتی ہے اور قوم بحیثیتِ مجموعی بگڑنے نہیں پاتی۔ لیکن اگر قوم ان افراد کے معاملے میں تساہُل شروع کر دیتی ہے اور غلط کار لوگوں کو ملامت کرنے کے بجائے انھیں سوسائٹی میں غلط کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے، تو پھر رفتہ رفتہ وہی خرابی جو پہلے چند افراد تک محدود تھی، پُوری قوم میں پھیل کر رہتی ہے۔ یہی چیز تھی جو آخرِ کار بنی اسرائیل کے بگاڑ کی موجب ہوئی۔

حضرت داوٗدؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی زبان سے جو لعنت بنی اسرائیل پر کی گئی، اس کے لیے مُلاحظہ ہو: زبور، ۱۰ و ۵۰

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾
وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ الجزء ۷
مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا

مگر ان میں سے تو بیشتر لوگ خدا کی اطاعت سے نکل چکے ہیں۔

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہُود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اِس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدُّنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور اُن میں غُرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سُنتے ہیں جو رسُول پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں کہ ”پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔“ اور وہ کہتے ہیں کہ ”آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ

اور متّی، ۲۳۔

۱۰۳- مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں، انھیں فطرتاً مشرکین کے مقابلے میں اُن لوگوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں، مگر بہر حال انھی کی طرح خدا اور سلسلۂ وحی و رسالت کو مانتے ہوں۔ لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کُھلّم کُھلّا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں، اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں

مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۵﴾
وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۸۶﴾ ع
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ

مان لیں، جب کہ ہم اِس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے؟" اُن کے اِس قول کی وجہ سے اللہ نے اُن کو ایسی جنّتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رَوِیّہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انھیں جھٹلایا، وہ جہنّم کے مستحق ہیں۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو پاک چیزیں اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرلو[۱۰۴] اور

منکرینِ نبوّت کے ساتھ ہیں، اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم وحیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں۔

۱۰۴۔ اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں: ایک یہ کہ خود حلال وحرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا، اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام کرو گے تو قانونِ الٰہی کے بجائے قانونِ نفس کے پیرو قرار پاؤ گے۔ دوسری بات یہ کہ عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں، بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور اِشراقی مُتصوِّفین کی طرح رَہبانیّت اور قطعِ لذّات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس وجسم کے حُقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذّتوں سے محروم کرنا، اور دنیا کے سامانِ زِیست سے تعلق توڑنا، بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرّب اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحابۂ کرامؓ میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جن کے اندر یہ ذہنیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض صحابیوں نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے، راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کرتے رہیں گے، گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے، عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ تمھارے نفس کے

لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا
يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

حد سے تجاوُز نہ کرو،[105] اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال وطیّب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اُسے کھاؤ پیو اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔

تم لوگ جو مُہمَل قسمیں کھا لیتے ہو اُن پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بُوجھ کر کھاتے ہو

بھی تم پر حُقوق ہیں۔ روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ مجھے دیکھو، میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں۔ روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی۔ پس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا وہ مجھ سے نہیں ہے۔" پھر فرمایا: "یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند اور دنیا کی لذّتوں کو اپنے اُوپر حرام کر لیا ہے؟ میں نے تو تمھیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و عُزلت نشینی ہے۔ ضبطِ نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے، رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے اُوپر سختی کی، اور جب انھوں نے خود اپنے اُوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انھی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔" اسی سلسلے میں بعض روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے ہیں اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں، تو آپؐ نے بُلا کر اُن کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ، کعب بن سَور الازدی کو اُن کے مقدّمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا، اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی چاہیں عبادت کریں، مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

۱۰۵- "حد سے تجاوز کرنا" وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھیرائی ہوئی پاک چیزوں سے اِس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی زیادتی ہے۔ پھر حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کے حُدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے۔ اللہ کو یہ تینوں

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ
ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

اُن پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفّارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اَوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچّوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفّارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو[١٠٦]۔ اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو[١٠٧]۔ اس طرح اللہ اپنے احکام تمھارے لیے واضح کرتا ہے شاید کہ تم شکر ادا کرو۔

باتیں ناپسند ہیں۔

١٠٦- چونکہ بعض لوگوں نے حلال چیزوں کو اپنے اُوپر حرام کر لینے کی قسم کھا رکھی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلے میں قَسم کا حکم بھی بیان فرما دیا کہ اگر کسی شخص کی زبان سے بلاارادہ قَسم کا لفظ نکل گیا ہے تو اس کی پابندی کرنے کی ویسے ہی ضرورت نہیں، کیونکہ ایسی قسم پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، اور اگر جان بُوجھ کر کسی نے قسم کھائی ہے تو وہ اُسے توڑ دے اور کَفّارہ ادا کر دے، کیونکہ جس نے کسی معصیت کی قسم کھائی ہو، اسے اپنی قسم پر قائم نہ رہنا چاہیے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۴۳ و ۲۴۴۔ نیز کفّارہ کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ نساء، حاشیہ ۱۲۵)

١٠٧- قَسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں: ایک یہ کہ قَسم کو صحیح مَصرَف میں استعمال کیا جائے، فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے، ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اُسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے۔ تیسرے یہ کہ جب کسی صحیح معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے، اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفّارہ ادا کیا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جُوا اور یہ آستانے اور پانسے[۱۰۸]، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب[۱۰۹] ہو گی۔

۱۰۸- آستانوں اور پانسوں کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ مائدہ، حاشیہ ۱۲ و ۱۴۔ اِسی سلسلے میں جُوئے کی تشریح بھی حاشیہ ۱۴ میں مل جائے گی۔ اگرچہ پانسے (اَزلام) اپنی نوعیت کے اعتبار سے مَیْسِر (جُوئے) ہی کی ایک قسم ہیں، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ عربی زبان میں اَزلام فال گیری اور قرعہ اندازی کی اُس صورت کو کہتے ہیں جو مشرکانہ عقائد اور وہمیات سے آلودہ ہو۔ اور مَیْسِر کا اطلاق اُن کھیلوں اور اُن کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقی اُمور کو کمائی اور قسمت آزمائی اور تقسیمِ اموال و اشیا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

۱۰۹- اِس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں: ایک، شراب۔ دوسرے، قِمار بازی۔ تیسرے، وہ مقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا خدا کے سوا کسی اَور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔ چوتھے، پانسے۔ مؤخّر الذکر تین چیزوں کی ضروری تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ شراب کے متعلّق احکام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

شراب کی حُرمت کے سلسلے میں اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے، جو سورۂ بقرہ آیت ۲۱۹ اور سورۂ نساء آیت ۴۳ میں گزر چکے ہیں۔ اب اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں لوگوں کو مُتنبِّہ فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حُرمت کا حکم آ جائے، لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدّت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے اعلان کرایا کہ اب جن کے پاس شراب ہے، وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینے کی گلیوں میں شراب بہا دی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”جس نے یہ چیز حرام کی ہے اُس نے اِسے تحفتاً دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔“ بعض لوگوں نے پوچھا: ہم شراب کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں؟ آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ ”نہیں، اسے بہا دو۔“ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر استعمال کی تو اجازت ہے؟ فرمایا: ”نہیں، وہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے۔“ ایک اَور صاحب نے عرض کیا: یارسولَ اللہ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے، اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا: مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں

مانیں گے۔ فرمایا: ”اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔“

ابنِ عمرؓ کی رِوایَت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: لَعن اللّٰہ الخمر و شاربھا وساقیھا وبائعھا ومُبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ۔ ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب[۱] پر، اور اس کے پینے[۲] والے پر اور پلانے[۳] والے پر، اور بیچنے[۴] والے پر، اور خریدنے[۵] والے پر، اور کشید[۶] کرنے والے پر، اور کشید[۷] کرانے والے پر، اور ڈھو[۸] کر لے جانے والے پر، اور اس شخص[۹] پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا جس پر شراب پی جارہی ہو۔ ابتداءً آپؐ نے اُن برتنوں تک کے استعمال کو منع فرمادیا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حُرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہوگیا تب آپؐ نے برتنوں پر سے یہ قید اُٹھادی۔

خَمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور مجازاً گیہوں، جَو، کِشمِش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی یہ لفظ بولتے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حُرمت کے اس حکم کو تمام اُن چیزوں پر عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کے یہ واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔ ”ہر نشہ آور چیز خَمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔“ کل شرابٍ اسکر فھو حرام۔ ”ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔“ وانا انھی عن کل مسکرٍ۔ ”اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ الخمر ما خامر العقل۔ ”خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔“

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اُصول بھی بیان فرمایا کہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ ”جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔“ اور ما اسکر الفرق منہ فملء الکف منہ حرام۔ ”جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہو، اس کا ایک چُلّو پینا بھی حرام ہے۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی۔ جو شخص اِس جُرم میں گرفتار ہوکر آتا تھا، اُسے جُوتے، لات، مُکّے، بل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سَنٹے مارے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ۴۰ ضربیں آپؐ کے زمانے میں اس جُرم پر لگائی گئی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ۴۰ کوڑے مارے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ابتداءً ۴۰ کوڑوں ہی کی سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جُرم سے باز نہیں آتے تو انھوں نے صحابۂ کرامؓ کے مشورے سے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ، اور ایک رِوایَت کے بموجب امام شافعیؒ بھی، شراب کی حد قرار دیتے ہیں۔ مگر امام احمد ابن حَنبلؒ اور ایک دوسری رِوایَت کے مطابق امام شافعیؒ ۴۰ کوڑوں کے قائل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

شریعت کی رُو سے یہ بات حکومتِ اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزورِ قوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی ثَقِیف کے ایک شخص رُوَیْشِد نامی کی دکان اس بنا پر جلوادی گئی کہ وہ

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ
فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ
وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ
الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۲ ع ۷ ۲
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عُدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمّہ داری تھی۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی، بشرطیکہ وہ آیندہ اُن چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رُکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اُسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رَوِیّہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تمھیں اُس شکار کے ذریعے سے سخت آزمائش میں ڈالے گا

خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پُورا گاؤں حضرت عمرؓ کے حکم سے اِس قُصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کی کشید اور فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔

تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ
فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾ يٰۤأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا
فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِينَ أَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ

جو بالکل تمھارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم میں سے کون اس سے غائبانہ ڈرتا ہے، پھر جس نے اس تنبیہ کے بعد اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا اُس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو،[۱۱۰] اور اگر تم میں سے کوئی جان بُوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو، اسی کے ہم پلّہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے، اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اِس گناہ کے کفّارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بقدر روزے رکھنے ہوں گے،[۱۱۱] تاکہ وہ اپنے کیے کا مزا چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، لیکن اب اگر کسی نے اس حرکت کا اعادہ کیا

---

۱۱۰ – شکار خواہ آدمی خود کرے، یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور پر مدد دے، دونوں باتیں حالتِ احرام میں منع ہیں۔ نیز اگر مُحرِم کی خاطر شکار مارا گیا ہو تب بھی اس کا کھانا مُحرِم کے لیے جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا ہو اور پھر وہ اس میں سے مُحرِم کو بھی تحفتاً کچھ دے دے تو اس کے کھانے میں کچھ مضایقہ نہیں۔ اس حکمِ عام سے مُوذی جانور مستثنیٰ ہیں۔ سانپ، بچھّو، باؤلا کتّا اور ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں حالتِ احرام میں مارے جاسکتے ہیں۔

۱۱۱ – اِن اُمور کا فیصلہ بھی دو عادل آدمی ہی کریں گے کہ کس جانور کے مارنے پر آدمی کتنے مسکینوں کو کھلائے، یا کتنے روزے رکھے۔

فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ
صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ
عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا
لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

تو اس سے اللہ بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے۔

تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا[۱۱۲]، جہاں تم ٹھیرو وہاں بھی اُسے کھا سکتے ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی بنا سکتے ہو۔ البتہ خشکی کا شکار، جب تک تم اِحرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے۔ پس بچو اُس خدا کی نافرمانی سے جس کی پیشی میں تم سب کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا۔

اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا اور ماہِ حرام اور قربانی کے جانوروں اور قلادوں کو بھی (اِس کام میں معاون بنا دیا[۱۱۳])، تاکہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کے سب حالات سے باخبر ہے

---

[۱۱۲] – چونکہ سمندر کے سفر میں بسا اوقات زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور غذا کی فراہمی کے لیے، بجز اس کے کہ آبی جانوروں کا شکار کیا جائے، اور کوئی تدبیر ممکن نہیں ہوتی، اس لیے بحری شکار حلال کر دیا گیا۔

[۱۱۳] – عرب میں کعبے کی حیثیت محض ایک مقدّس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی، بلکہ اپنی مرکزیّت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی مَعاشی وتمدّنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عُمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدّنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی مَعاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے

وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ
الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا یَسْتَوِی
الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا

اور اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[۱۱۴] خبردار ہو جاؤ! اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے اور اس کے ساتھ بہت درگزر اور رحم بھی کرنے والا ہے۔ رسُول پر تو صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمّہ داری ہے، آگے تمھارے کُھلے اور چُھپے سب حالات کا جاننے والا اللہ ہے۔ اے پیغمبرؐ! اِن سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں، خواہ ناپاک کی بہتات تمھیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو،[۱۱۵] پس اے لوگو

دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے بھی اس نقل وحرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹّے پڑے ہوتے، انھیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت نہ ہوتی۔

۱۱۴- یعنی اگر تم اس انتظام پر غور کرو تو تمھیں خود اپنے ملک کی تمدّنی ومعاشی زندگی ہی میں اس امر کی ایک بَیّن شہادت مل جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور اُن کی ضروریات کا کیسا مکمّل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک ایک حکم کے ذریعے سے انسانی زندگی کے کتنے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سیکڑوں برس جو محمدؐ عَرَبی کے ظُہور سے پہلے گزرے ہیں، ان میں تم لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے، مگر اللہ تمھاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اُس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیّت قائم کر کے تمھارے لیے وہ انتظام کر دیا تھا جس کی بدولت تمھاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمھیں یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ نے جو احکام تمھیں دیے ہیں، اُن کی پابندی میں تمھاری اپنی بھلائی ہے اور ان میں تمھارے لیے وہ مَصلَحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔

۱۱۵- یہ آیت قدر وقیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے، جو ظاہر میں انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بیں نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں، کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہوں تو وہ ناپاک ہیں، اور پانچ روپے اگر خدا کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ پاک ہیں، اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو، بہرحال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں

۱۳ ع ۳

اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ
يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

جو عقل رکھتے ہو! اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو، اُمّید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہو گی۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایسی باتیں نہ پُوچھا کرو جو تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں ناگوار ہوں[۱۱۶]، لیکن اگر تم انھیں ایسے وقت پُوچھو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہو تو وہ تم پر کھول دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ تم نے کیا اُسے اللہ نے معاف کر دیا، وہ درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔

ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلے میں پاک پانی کا ایک چُلّو زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا ایک سچّے دانش مند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو، اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شان دار ہو۔

۱۱۶- نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگ عجیب عجیب قسم کے فضول سوالات کیا کرتے تھے، جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت ہوتی تھی اور نہ دُنیا ہی کے کسی معاملے میں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک صاحب بھرے مجمع میں آپؐ سے پوچھ بیٹھے کہ ”میرا اصلی باپ کون ہے؟“ اسی طرح بعض لوگ احکامِ شرع میں غیر ضروری پُوچھ گچھ کیا کرتے تھے، اور خواہ مخواہ پُوچھ پُوچھ کر ایسی چیزوں کا تعیُّن کرانا چاہتے تھے جنھیں شارع نے مَصلحتاً غیر معیّن رکھا ہے۔ مثلاً قرآن میں مُجملاً یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج تم پر فرض کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے حکم سنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ”کیا ہر سال فرض کیا گیا ہے؟“ آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر پوچھا۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ تیسری مرتبہ پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا: ”تم پر افسوس ہے۔ اگر میری زبان سے ہاں نکل جائے تو حج ہر سال فرض قرار پا جائے۔ پھر تم ہی لوگ اس کی پیروی نہ کر سکو گے اور نافرمانی کرنے لگو گے۔“ ایسے ہی لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ان اعظم المسلمين في المسلمين جرما من سأل عن شئ لم يحرم على الناس فحرم من اجل مسألته۔ ”مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلّق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔“ ایک دُوسری حدیث میں ہے: ان

قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ (۱۰۲) مَا جَعَلَ
اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ

تم سے پہلے ایک گروہ نے اِسی قسم کے سوالات کیے تھے، پھر وہ لوگ انھی باتوں کی وجہ سے کفر میں مُبتلا ہو گئے۔[۱۱۷]

اللہ نے نہ کوئی بَحِیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبَہ اور نہ وَصِیلہ اور نہ حام۔[۱۱۸] مگر

اللّٰہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحَدّ حُدُودًا فلا تعتدُوْھَا وسَکتَ عَنْ اشیَاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ ’’اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حُدُود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلّق خاموشی اختیار کی ہے، بغیر اس کے کہ اُسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔‘‘ ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبّہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مُجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی، یا جو احکام بر سبیلِ اِجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعیُّنات کا ذکر نہیں کیا ہے، ان میں اِجمال اور عدَمِ تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی، تفصیلات بتانی چاہیے تھیں مگر نہ بتائیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان اُمور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعیُّنات اور تقیُّدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے، اِستنباط سے کسی نہ کسی طرح مُجمل کو مُفصّل، مُطلَق کو مُقیّد، غیر معیّن کو معیّن بنا کر ہی چھوڑتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے کہ مابعد الطبیعی اُمور میں جتنی تفصیلات زیادہ ہوں گی، ایمان لانے والے کے لیے اتنے ہی زیادہ اُلجھن کے مواقع بڑھیں گے، اور احکام میں جتنی قُیود زیادہ ہوں گی، پیروی کرنے والے کے لیے خلاف ورزیِ حکم کے امکانات بھی اسی قدر زیادہ ہوں گے۔

۱۱۷- یعنی پہلے انھوں نے خود ہی عقائد اور احکام میں مُوشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلّق سوال کر کر کے تفصیلات اور قُیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا، پھر خود ہی اُس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے ـــــ اِس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود، مسلمانوں نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

۱۱۸- جس طرح ہمارے مُلک میں گائے، بیل اور بکرے خدا کے نام پر یا کسی بُت یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انھیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اُٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے،

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۳ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۴

یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں (کہ ایسے وہمیّات کو مان رہے ہیں)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبرؐ کی طرف، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انھیں خبر ہی نہ ہو؟

اسی طرح زمانۂ جاہلیّت میں اہلِ عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پُن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

بَحِیرہ اُس اُونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ بچے جَن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اُسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دُودھ پیا جاتا، نہ اُسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اُون اُتارا جاتا۔ اُسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چَرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیے۔

سائبہ اُس اُونٹ یا اُونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مَنّت کے پورا ہونے، یا کسی بیماری سے شفا پانے، یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے پُن کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اُونٹنی نے دس مرتبہ بچّے دیے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وَصِیلہ: اگر بکری کا پہلا بچہ نر ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا، اور اگر وہ پہلی بار مادہ جنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کے بجائے یونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وَصیلہ تھا۔

حام: اگر کسی اُونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بُوڑھے اُونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اُونٹ کے نُطفے سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا
اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ
مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دُوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔[۱۱۹] اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیّت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمھاری جماعت میں سے دو صاحبِ عدل[۱۲۰] آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر مسلموں ہی میں سے

۱۱۹- یعنی بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا بُرائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے فکر اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کر رہا ہے، اور راست روی و راست بازی کے مُقتضیات پورے کر رہا ہے، جن میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی شخص کی گمراہی و کج روی اس کے لیے نقصان دِہ نہیں ہو سکتی۔

اِس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں: ”لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ بُرائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں، تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم! تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور بُرائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے

الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى

دو گواہ لے لیے جائیں۔[۱۲۱] پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں)، اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔“ لیکن اگر پتا چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مُبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لیے اہل تر ہوں، ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہماری شہادت اُن کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے۔“ اس طریقے سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے

لوگوں کو مسلّط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دُعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

۱۲۰ – یعنی دین دار، راست باز اور قابلِ اعتماد مسلمان۔

۱۲۱ – اِس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو شاہد بنانا صرف اُس حالت میں دُرست ہے جب کہ کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے میسّر نہ آ سکے۔

اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ع ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ ع ۱۴ ۸ ۲
قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ
يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ وقف لازم
اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَ

کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قَسموں کے بعد دُوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے۔ اللہ سے ڈرو اور سُنو، اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ ع

جس[۱۲۲] روز اللہ سب رسولوں کو جمع کر کے پُوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب[۱۲۳] دیا گیا، تو وہ عرض کریں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں[۱۲۴]، آپ ہی تمام پوشیدہ حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ پھر تصوّر کرو اس موقع کا جب اللہ فرمائے[۱۲۵] گا کہ "اے مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ! یاد کر میری اس نعمت کو جو مَیں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی، مَیں نے رُوحِ پاک سے تیری مدد کی، تُو گہوارے میں بھی لوگوں سے بات کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی،

۱۲۲- مراد ہے قیامت کا دن۔

۱۲۳- یعنی اسلام کی طرف جو دعوت تم نے دُنیا کو دی تھی اس کا کیا جواب دنیا نے تمھیں دیا۔

۱۲۴- یعنی ہم تو صرف اُس محدُود ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو ہمیں اپنی زندگی میں مِلتا ہُوا محسوس ہُوا۔ باقی رہا یہ کہ فی الحقیقت ہماری دعوت کا ردِّ عمل کہاں کس صُورت میں کتنا ہُوا، تو اس کا صحیح علم آپ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔

۱۲۵- ابتدائی سوال تمام رسولوں سے بحیثیتِ مجموعی ہو گا۔ پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی، جیسا کہ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بتصریح ارشاد ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا، وہ یہاں بطورِ خاص نقل کیا جا رہا ہے۔

اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ
تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ
طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ
الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ
بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ

میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی، تُو میرے حکم سے مٹی کا پُتلا پرندے کی شکل کا بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا، تُو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا، تُو مُردوں کو میرے حکم سے نکالتا تھا،[۱۲۶] پھر جب تو بنی اسرائیل کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچا اور جو لوگ ان میں سے منکرِ حق تھے انھوں نے کہا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، تو میں نے ہی تجھے اُن سے بچایا، اور جب میں نے حواریوں کو اشارہ کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب اُنھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں"[۱۲۷] —— (حواریوں[۱۲۸] کے سلسلے میں) یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب

۱۲۶- یعنی حالتِ موت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لاتا تھا۔

۱۲۷- یعنی حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل اور توفیق کا نتیجہ تھا، ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اُس جھٹلانے والی آبادی میں ایک ہی تصدیق کرنے والا اپنے بل بُوتے پر پیدا کر لیتا —— ضمناً یہاں یہ بھی بتا دیا کہ حواریوں کا اصل دین اسلام تھا نہ کہ عیسائیت۔

۱۲۸- چونکہ حواریوں کا ذکر آ گیا تھا اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعے کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا، جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ مسیحؑ سے براہِ راست جن

الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا
اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا
وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ قلے
عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا
لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

حواریوں نے کہا: اے عیسٰی ابنِ مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اُتار سکتا ہے؟ تو عیسٰیؑ نے کہا: اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ اُنھوں نے کہا: ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھانا کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ اس پر عیسٰی ابنِ مریمؑ نے دُعا کی: ”خدایا! ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کر، جو ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے خوشی کا موقع قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو، ہم کو رزق دے اور تُو بہترین

جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ مسیحؑ کو ایک انسان اور محض ایک بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریکِ خدا یا فرزندِ خدا ہونے کا تصوّر نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیحؑ نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جو گفتگو قیامت کے روز ہونے والی ہے، اس کے اندر اس جملۂ معترضہ کا کون سا موقع ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملۂ معترضہ اُس گفتگو سے متعلق نہیں ہے جو قیامت کے روز ہو گی، بلکہ اُس کی اس پیشگی حکایت سے متعلق ہے جو اس دنیا میں کی جا رہی ہے۔ قیامت کی اس ہونے والی گفتگو کا ذکر یہاں کیا ہی اس لیے جا رہا ہے کہ موجودہ زندگی میں عیسائیوں کو اُس سے سبق ملے اور وہ راہِ راست پر آئیں۔ لہٰذا اس گفتگو کے سلسلے میں حواریوں کے اس واقعے کا ذکر بطور ایک جملۂ معترضہ کے آنا کسی طرح غیر متعلق نہیں ہے۔

الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ
مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ وَ
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ
اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ

رازق ہے۔" اللہ نے جواب دیا: "مَیں اُس کو تم پر نازل کرنے والا ہوں[129] مگر اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا، اسے میں ایسی سزا دوں گا جو دُنیا میں کسی کو نہ دی ہوگی"۔ ع —— غرض جب (یہ احسانات یاد دلا کر) اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسٰیؑ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟[130]" تو وہ جواب میں عرض کرے گا کہ "سبحان اللہ! میرا یہ کام نہ تھا کہ

۱۲۹- قرآن اس باب میں خاموش ہے کہ یہ خوان فی الواقع اُتارا گیا یا نہیں۔ دوسرے کسی معتبر ذریعے سے بھی اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ نازل ہوا ہو، اور ممکن ہے کہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سن کر اپنی درخواست واپس لے لی ہو۔

۱۳۰- عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیحؑ اور رُوح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسیحؑ کی والدۂ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی اُلوہیّت یا قدُّوسیّت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیُّل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دَور میں اسکندریہ کے بعض علمائے دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریمؑ کے لیے "اُمّ اللہ" یا "مادرِ خدا" کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیّتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ لیکن اوّل اوّل چرچ اسے باقاعدہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطُورِیَس کے اس عقیدے پر کہ مسیحؑ کی واحد ذات میں دو مستقل جُداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دُنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر اِفسُوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی، اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریمؑ کے لیے "مادرِ خدا" کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا، وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا، حتّٰی کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریمؑ اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ، بیٹا اور رُوح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسّمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے، ان کے آگے عبادت

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ق بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا
فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾
مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ

وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے اُن سے اُس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اُسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بُلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔ اب اگر

کے جملہ مَراسم ادا کیے جاتے تھے، انھی سے دُعائیں مانگی جاتی تھیں، وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کُشا اور بے کسوں کی پُشتیبان تھیں، اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ ”مادرِ خدا“ کی حمایت و سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جَسْٹِینَین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریمؑ کو اپنی سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدانِ جنگ میں حضرت مریمؑ سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہِرَقْل نے اپنے جھنڈے پر ”مادرِ خدا“ کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریکِ اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدّت سے آواز اُٹھائی، لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع ۱۶ ع ۲

آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں، اور اگر معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔'' تب اللہ فرمائے گا: ''یہ وہ دن ہے جس میں سچّوں کو اُن کی سچّائی نفع دیتی ہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، یہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ع

ضمیمہ

(نوٹ بسلسلہ حاشیہ ۳۶)

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے اپنے پیروؤں کا نام کبھی ''عیسائی'' یا ''مسیحی'' نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بِنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اُسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی، جسے حضرت موسٰیؑ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیا لے کر آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروانِ شریعتِ موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیرو خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملّت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے ہیکل میں عبادت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: کتابِ اعمال ۳: ۱-۱۰، ۱۴: ۱، ۱۵: ۱ و ۵، ۲۱: ۲۱)

آگے چل کر جدائی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰؑ کے پیروؤں میں سے پولوس (سینٹ پال) نے شریعت کی پابندی ختم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ بس مسیحؑ پر ایمان لے آنا نجات کے لیے کافی ہے۔ اور دوسری طرف یہودی علما نے پیروانِ مسیحؑ کو ایک گمراہ فرقہ قرار دے کر عامۂ بنی اسرائیل سے کاٹ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود ابتداءً اس نئے فرقے کا کوئی خاص نام نہ تھا۔ خود پیروانِ مسیحؑ اپنے لیے کبھی ''شاگرد'' کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کبھی اپنے رفقا کا ذکر ''بھائیوں'' (اِخْوان)، ''ایمان داروں'' (مُؤْمِنِیْن)، ''جو ایمان لائے'' (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا)، اور ''مُقدّسوں'' کے الفاظ سے کرتے تھے (کتابِ اعمال ۲: ۴۴، ۴: ۳۲، ۹: ۲۶، ۱۱: ۲۹، ۱۳: ۵۲، ۱۵: ۱ و ۲۳۔ رومیوں ۱۵: ۲۵۔ گلتیوں ۱: ۲)۔ بخلاف اس کے یہودی ان لوگوں کو کبھی ''گلیلی'' کہتے تھے اور کبھی ''ناصریوں کا بدعتی فرقہ'' کہہ کر پکارتے تھے (اعمال ۲۴: ۵۔ لُوقا ۱۳: ۲)۔ یہ نام دھرنے کی کوشش انھوں نے ازراہِ طنز و تشنیع اس بنا پر کی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ناصرہ تھا اور وہ فلسطین کے ضلع گلیل میں واقع تھا۔ لیکن یہ طنزیہ الفاظ اس حد تک رائج نہ ہو سکے کہ پیروانِ مسیحؑ کے لیے نام کی حیثیت اختیار کر جاتے۔

اس گروہ کا موجودہ نام مسیحی (Christian) پہلی مرتبہ ۴۳ء یا ۴۴ء میں انطاکیہ کے مشرک باشندوں نے رکھا تھا، جب کہ سینٹ پال اور بَرنَباس نے وہاں پہنچ کر اپنے مذہب کی تبلیغ عام شروع کی (اعمال ۱۱: ۲۶)۔ یہ نام بھی دراصل طنز و تمسخر کے طور پر مخالفین کی طرف سے رکھا گیا تھا، اور پیروانِ مسیحؑ اسے خود اپنے نام کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن جب ان کے دشمنوں نے ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا تو ان کے لیڈروں نے کہا کہ اگر تمھیں مسیحؑ کی طرف نسبت دے کر ''مسیحی'' کہا جاتا ہے تو تمھیں اس پر شرمانے کی کیا ضرورت ہے (۱۔ پطرس ۴: ۱۶)۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے موسوم کرنے لگے جس سے ان کے دشمنوں نے طنزاً انھیں موسوم کیا تھا، یہاں تک کہ آخرِ کار ان کے اندر سے یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ یہ دراصل ایک بُرا لقب تھا جو انھیں دیا گیا تھا۔

قرآنِ مجید نے اسی لیے مسیحؑ کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے، بلکہ انھیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنھیں عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ، ''کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے''، اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ، ''ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں''۔ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاد دہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے ان کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا!

تفہیم القرآن

الانعام

(۶)

الاَنْعام

نام اِس سُورہ کے رکوع ۱۶ و ۱۷ میں بعض اَنعام (مویشیوں) کی حُرمت اور بعض کی حِلّت کے متعلق اہلِ عرب کے توہُّمات کی تردید کی گئی ہے۔ اِسی مناسبت سے اس کا نام ”الانعام“ رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ پُوری سورہ مکّہ میں بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت مُعاذؓ بن جَبَل کی چچازاد بہن اَسماءؓ بنتِ یزید کہتی ہیں کہ ”جب یہ سورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہی تھی، اس وقت آپؐ اُونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اُونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔“ روایات میں اس کی بھی تصریح ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی اسی رات کو آپؐ نے اسے قلم بند کرا دیا۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکّی دَور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہوگی۔ حضرت اَسماءؓ بنتِ یزید کی روایت بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوفہ انصار میں سے تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائیں۔ اگر قبولِ اسلام سے پہلے محض بربنائے عقیدت وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقیناً یہ حاضری آپؐ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی۔ اس سے پہلے اہلِ یَثرِب کے ساتھ آپؐ کے تعلقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

شانِ نزول زمانۂ نزول متعین ہو جانے کے بعد ہم بآسانی اس پَس منظر کو دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے۔ اس وقت اللہ کے رسول کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گزر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفاکاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم وستم سے عاجز آ کر ملک چھوڑ چکی تھی اور حَبَش میں مقیم تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وحمایت کے لیے نہ ابوطالب باقی رہے تھے اور نہ حضرت خدیجہؓ، اس لیے ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر آپؐ شدید مزاحمتوں کے مقابلے میں تبلیغ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ آپؐ کی تبلیغ کے اثر سے مکّہ میں اور گردونواح کے قبائل میں بھی صالح افراد پے درپے اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، لیکن قوم بحیثیتِ مجموعی ردّ و انکار پر تُلی ہوئی تھی۔ جہاں کوئی شخص اسلام کی طرف ادنیٰ میلان بھی ظاہر کرتا تھا، اسے طعن وملامت، جسمانی اذیّت اور مَعاشی ومعاشرتی مقاطعے کا ہدف بننا پڑتا تھا۔ اس تاریک ماحول میں صرف ایک ہلکی سی شعاع یثرب کی طرف سے نمودار ہوئی تھی جہاں سے اَوس اور خَزرَج کے بااثر لوگ آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور جہاں کسی اندرونی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس حقیر سی ابتدا میں مستقبل کے جو امکانات پوشیدہ تھے، انھیں کوئی ظاہر بیں آنکھ

نہ دیکھ سکتی تھی۔ بظاہر دیکھنے والوں کو جو کچھ نظر آتا تھا، وہ بس یہ تھا کہ اسلام ایک کمزور سی تحریک ہے جس کی پُشت پر کوئی مادّی طاقت نہیں، جس کا داعی اپنے خاندان کی ضعیف سی حمایت کے سوا کوئی زور نہیں رکھتا، اور جسے قبول کرنے والے چند مُٹّھی بھر بے بس اور منتشر افراد اپنی قوم کے عقیدہ و مسلک سے منحرف ہو کر اس طرح سوسائٹی سے نکال پھینکے گئے ہیں جیسے پتّے اپنے درخت سے جھڑ کر زمین پر پھیل جائیں۔

مَباحِث

اِن حالات میں یہ خطبہ ارشاد ہوا ہے اور اس کے مضامین کو سات بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) شرک کا اِبطال اور عقیدۂ توحید کی طرف دعوت،

(۲) عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے،

(۳) جاہلیّت کے اُن توہّمات کی تردید جن میں لوگ مبتلا تھے،

(۴) اُن بڑے بڑے اُصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا تھا،

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب،

(۶) طویل جِدّوجُہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی اس پر تسلّی،

(۷) منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت و سرشاری اور نادانستہ خودکُشی پر نصیحت، تنبیہ اور تہدید۔

لیکن خطبے کا انداز یہ نہیں ہے کہ ایک ایک عنوان پر الگ الگ یکجا گفتگو کی گئی ہو۔ بلکہ خطبہ ایک دریا کی سی روانی کے ساتھ چلتا جاتا ہے اور اس کے دوران میں یہ عنوانات مختلف طریقوں سے بار بار چِھڑتے ہیں اور ہر بار ایک نئے انداز سے ان پر گفتگو کی جاتی ہے۔

مکّی زندگی کے اَدوار

یہاں چونکہ پہلی مرتبہ ناظرین کے سامنے ایک مفصّل مکّی سورہ آرہی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ہم مکّی سورتوں کے تاریخی پَس منظر کی ایک جامع تشریح کر دیں، تاکہ آیندہ تمام مکی سورتوں کو، اور ان کی تفسیر کے سلسلے میں ہمارے اشارات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

جہاں تک مدنی سورتوں کا تعلق ہے، ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانۂ نزول معلوم ہے یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ان کی تو بکثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے۔ لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصّل ذرائعِ معلومات موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نُزول اور موقعِ نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو۔ کیونکہ اُس زمانے کی تاریخ اس قدر جُزئی تفصیلات کے ساتھ مُرتّب نہیں ہوئی ہے جیسی کہ مدنی دَور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکّی سورتوں کے معاملے میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر اُن اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور اندازِ بیان میں، اور اپنے پَس منظر کی طرف اُن کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس

نوعیّت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعیین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کیا جاسکتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکّی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دُوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابُل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورت کس دَور سے تعلق رکھتی ہے۔

اس طرزِ تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہم کو چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے:

پہلا دَور، آغازِ بِعثت سے لے کر اعلانِ نبوّت تک، تقریباً ۳ سال، جس میں دعوت خفیہ طریقے سے خاص خاص آدمیوں کو دی جارہی تھی اور عام اہلِ مکہ کو اس کا علم نہ تھا۔

دوسرا دَور، اعلانِ نبوّت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ (persecution) کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، جس میں پہلے مخالفت شروع ہوئی، پھر اس نے مزاحمت کی شکل اختیار کی، پھر تضحیک، استہزا، الزامات، سَبّ وشتم، جھوٹے پروپیگنڈے اور مخالفانہ جتھّا بندی تک نوبت پہنچی، اور بالآخر ان مسلمانوں پر زیادتیاں شروع ہوگئیں جو نسبتاً زیادہ غریب، کمزور اور بے یارومددگار تھے۔

تیسرا دَور، آغازِ فتنہ (۵ نبویؐ) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات (۱۰ نبویؐ) تک، تقریباً پانچ چھ سال۔ اس میں مخالفت انتہائی شدّت اختیار کرتی چلی گئی، بہت سے مسلمان کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر حبش کی طرف ہجرت کر گئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خاندان اور باقی ماندہ مسلمانوں کا مَعاشی ومعاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور آپؐ اپنے حامیوں اور ساتھیوں سمیت شِعبِ ابی طالب میں محصور کر دیے گئے۔

چوتھا دَور، ۱۰ نبویؐ سے لے کر ۱۳ نبویؐ تک، تقریباً ۳ سال۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی ومصیبت کا زمانہ تھا۔ مکہ میں آپؐ کے لیے زندگی دُوبھر کر دی گئی تھی، طائف گئے تو وہاں بھی پناہ نہ ملی، حج کے موقع پر عرب کے ایک ایک قبیلے سے آپؐ اپیل کرتے رہے کہ وہ آپؐ کی دعوت قبول کرے اور آپؐ کا ساتھ دے، مگر ہر طرف سے کورا جواب ہی ملتا رہا۔ اور ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورے کرتے رہے کہ آپؐ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ آخرِکار اللہ کے فضل سے انصار کے دل اسلام کے لیے کُھل گئے اور ان کی دعوت پر آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

ان میں سے ہر دَور میں قرآنِ مجید کی جو سورتیں نازل ہوئی ہیں، وہ اپنے مضامین اور اندازِ بیان میں دوسرے دَور کی سورتوں سے مختلف ہیں۔ اُن میں بکثرت مَقامات پر ایسے اشارات بھی پائے جاتے ہیں جن سے پَسِ منظر کے حالات اور واقعات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ ہر دَور کی خُصوصیات کا اثر اُس دَور کے نازل شدہ کلام میں بہت بڑی حد تک نمایاں نظر آتا ہے۔ انھی علامات پر اعتماد کر کے ہم آیندہ ہر مکّی سورہ کے دیباچے میں یہ بتائیں گے کہ وہ مکہ کے کس دَور میں نازل ہوئی ہے۔

۱۶۵
آیاتہا

۲۰
رکوعاتہا

سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَ النُّوْرَ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ① هُوَ الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًاؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔ پھر بھی وہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، دُوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھیرا رہے ہیں[1]۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا[2] کیا، پھر تمھارے لیے زندگی کی ایک مدّت مقرر کر دی، اور ایک دُوسری مدّت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے[3] شدہ ہے۔

---

[1] یاد رہے کہ مُخاطَب وہ مشرکینِ عرب ہیں جو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے، وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کام لات یا ہُبَل یا عُزّیٰ یا کسی اَور دیوی یا دیوتا کے ہیں۔ اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانو! جب تم خود یہ مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردشِ لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو یہ دوسرے کون ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے سجدے کرتے ہو، نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، دعائیں مانگتے ہو اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہو۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ فاتحہ حاشیہ ۲، سورۂ بقرہ حاشیہ ۱۶۳)

روشنی کے مقابلے میں تاریکیوں کو بصیغۂ جمع بیان کیا گیا، کیونکہ تاریکی نام ہے عَدَمِ نور کا، اور عَدَمِ نور کے بے شمار مدارج ہیں۔ اس لیے نور واحد ہے اور تاریکیاں بہت ہیں۔

[2] انسانی جسم کے تمام اجزا زمین سے حاصل ہوتے ہیں، کوئی ایک ذرہ بھی اس میں غیر ارضی نہیں ہے، اس لیے فرمایا کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔

[3] یعنی قیامت کی گھڑی، جب کہ تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور حساب دینے کے لیے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ② وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ؕ
يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③ وَمَا تَاْتِيْهِمْ
مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ④ فَقَدْ
كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑤ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ
مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ
عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۖ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ

مگر تم لوگ ہو کہ شک میں پڑے ہوئے ہو۔ وہی ایک خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی، تمہارے کھُلے اور چھُپے سب حال جانتا ہے اور جو بُرائی یا بھلائی تم کماتے ہو، اس سے خوب واقف ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ایسی نہیں جو ان کے سامنے آئی ہو اور انھوں نے اس سے منہ نہ موڑ لیا ہو۔ چنانچہ اب جو حق ان کے پاس آیا تو اسے بھی انھوں نے جھٹلا دیا۔ اچھّا، جس چیز کا وہ اب تک مذاق اُڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کے متعلّق کچھ خبریں انھیں پہنچیں[۴] گی۔ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانے میں دَور دورہ رہا ہے؟ اُن کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار بخشا تھا جو تمھیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں،

---

۴ - اشارہ ہے ہجرت اور اُن کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے در پے حاصل ہونے والی تھیں۔ جس وقت یہ اشارہ فرمایا گیا تھا، اُس وقت نہ کفار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں انھیں پہنچنے والی ہیں، اور نہ مسلمانوں ہی کے ذہن میں اس کا کوئی تصوّر تھا۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی آیندہ کے امکانات سے بے خبر تھے۔

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ⑥
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑦ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ
عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ⑧
وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ

(مگر جب انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انھیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دُوسرے دَور کی قوموں کو اُٹھایا۔

اے پیغمبرؐ! اگر ہم تمھارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھُو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا[۵]۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انھیں کوئی مُہلت نہ دی جاتی[۶]۔ اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اُتارتے اور اس طرح انھیں اُسی شبہے میں مبتلا کر دیتے جس میں

۵- یعنی جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبرؐ ہے، اس کی بات مانو، ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض و سما کسی کو پیغمبرؐ مقرر کرے اور پھر اس طرح اُسے بے یار و مددگار، پتھر کھانے اور گالیاں سننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے اسٹاف کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اَردلی میں رہنا چاہیے تھا، تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا، اس کا رُعب بٹھاتا، اس کی ماموریت کا یقین دلاتا اور فوق الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

۶- یہ ان کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمھیں ملی ہوئی ہے، یہ اُسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہوا، پھر مُہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اُس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی

مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝٩ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ
بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝١٠ ع
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ۝١١ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ

ع ۱

اب یہ مبتلا ہیں[۷]۔

اے محمدؐ! تم سے پہلے بھی بہت سے رسُولوں کا مذاق اُڑایا جا چکا ہے، مگر ان مذاق اُڑانے والوں پر آخرِ کار وہی حقیقت مسلّط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ع اِن سے کہو: ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہُوا ہے[۸]۔

ان سے پُوچھو: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ — کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے[۹]،

رہ جائے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمھارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے، اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل وفکر کے صحیح استعمال سے اس کا اِدراک کرتے ہو یا نہیں، اور اِدراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق دُرست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرطِ لازم ہے، اور تمھاری دُنیوی زندگی، جو دراصل مہلتِ امتحان ہے، اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجۂ امتحان نکلنے کا وقت آ پہنچے گا۔ لہٰذا تمھارے مطالبے کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمھارے امتحان کی مدّت ختم نہیں کرنا چاہتا۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ حاشیہ ۲۲۸)

[۷] – یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ فرشتے کے آنے کی پہلی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا۔ لیکن اُوپر بتا دیا گیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آئے تو اس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔

[۸] – یعنی گزری ہوئی قوموں کے آثارِ قدیمہ اور ان کے تاریخی افسانے شہادت دیں گے کہ صداقت وحقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئیں۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اُوپر لازم کر لیا ہے (اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمھیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا)، قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا، یہ بالکل ایک غیر مُشتَبہ حقیقت ہے، مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو خود تباہی کے خطرے میں مُبتلا کر لیا ہے وہ اسے نہیں مانتے۔

رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ کہو: اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں؟ اُس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں[10] ہے؟ کہو: مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے)

۹- یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو، زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں۔ سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھیر گیا۔ مُخاطَب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے، لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں، اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انھیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے مشرکانہ عقیدے کے خلاف اِستدلال کرے گا۔ اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔ تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو کہ سب کچھ اللہ کا ہے۔

۱۰- اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا خدا بنا رکھا ہے، وہ سب اپنے ان بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحبِ قبر کی شانِ معبُودیت قائم نہیں ہو سکتی جب تک

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۴﴾ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ
رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ
رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿۱۶﴾ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ ؕ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيمُ
الْخَبِيرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيدٌۢ
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأُنْذِرَكُمْ

تُو بہرحال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ کہو: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے (خوفناک) دن مجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔ اُس دن جو سزا سے بچ گیا، اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے، اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ان سے پُوچھو: کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے؟ —— کہو: میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہ ہے[۱۱]، اور یہ قرآن میری طرف بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے، تاکہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے،

اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربارِ خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پُجاری اس کا مجسّمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کو تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوندِ عالَم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بُوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں، بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔

۱۱– یعنی اس بات پر گواہ ہے کہ میں اس کی طرف سے مامور ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔

بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ
قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ⑲ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ وقف لازم
اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۠ ⑳ وَ ع ۲ ۸ وقف لازم
مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

سب کو مُتنبِّہ کر دُوں۔ کیا واقعی تم لوگ یہ شہادت دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دُوسرے خدا بھی ہیں؟[12] کہو: میں تو اس کی شہادت ہرگز نہیں[13] دے سکتا۔ کہو: خدا تو وہی ایک ہے اور میں اُس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مُبتلا ہو۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس بات کو اس طرح غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ پیش نہیں آتا۔[14] مگر جنھوں نے اپنے آپ کو خود خسارے میں ڈال دیا ہے، وہ اِسے نہیں مانتے۔ؑ اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھُوٹا بہتان لگائے،[15] یا اللہ کی نشانیوں کو جھُٹلائے؟[16] یقیناً

۱۲- کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے علم ہونا ضروری ہے جس کی بِنا پر آدمی یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ پس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمھیں یہ علم ہے کہ اس جہانِ ہستِ و بُود میں خدا کے سوا اَور بھی کوئی کارفرما حاکمِ ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو؟

۱۳- یعنی اگر تم علم کے بغیر محض جھُوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو، میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔

۱۴- یعنی کُتُبِ آسمانی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مُشتبَہ طور پر پہچانتے ہیں کہ خدا ایک ہی ہے اور خدائی میں کسی کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ جس طرح کسی کا بچّہ بہت سے بچّوں میں مِلا جُلا کھڑا ہو تو وہ الگ پہچان لے گا کہ اس کا بچہ کون سا ہے، اسی طرح جو شخص کتابِ الٰہی کا علم رکھتا ہو، وہ اُلُوہیّت کے متعلّق لوگوں کے بے شمار مختلف عقیدوں اور نظریّوں کے درمیان بلا کسی شک واِشتباہ کے یہ پہچان لیتا ہے کہ ان میں سے امرِ حق کون سا ہے۔

۱۵- یعنی یہ دعویٰ کرے کہ خدا کے ساتھ دُوسری بہت سی ہستیاں بھی خدائی میں شریک ہیں، خدائی صفات سے متّصف ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں، اور اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیّت کا رَوِیّہ اختیار کرے۔ نیز یہ بھی اللہ پر بہتان ہے کہ کوئی یہ کہے کہ خدا نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنا مُقرّبِ خاص قرار دیا ہے اور اُسی نے یہ حکم

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ
لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾
ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا
مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا

ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

جس روز ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے اور مشرکوں سے پوچھیں گے کہ اب وہ تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریک کہاں ہیں جن کو تم اپنا خدا سمجھتے تھے، تو وہ اِس کے سوا کوئی فتنہ نہ اُٹھا سکیں گے کہ (یہ جھوٹا بیان دیں کہ) اے ہمارے آقا! تیری قسم ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھو، اُس وقت یہ کس طرح اپنے اُوپر آپ جھوٹ گھڑیں گے، اور وہاں اُن کے سارے بناوٹی معبُود گم ہو جائیں گے۔

ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمھاری بات سُنتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ہم نے

دیا ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ اِس پر راضی ہے کہ اس کی طرف خدائی صفات منسوب کی جائیں اور اس سے وہ معاملہ کیا جائے جو بندے کو اپنے خدا کے ساتھ کرنا چاہیے۔

۱۶ – اللہ کی نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں بھی ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ بھی جو پیغمبروں کی سیرت اور ان کے کارناموں میں ظاہر ہوئیں، اور وہ بھی جو کُتُبِ آسمانی میں پیش کی گئیں۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، یعنی یہ کہ موجوداتِ عالم میں خدا صرف ایک ہے، باقی سب بندے ہیں۔ اب جو شخص ان تمام نشانیوں کے مقابلے میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم، کسی مُشاہدے اور کسی تجرِبے کے بغیر، مُجرّد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر، دوسروں کو اُلُوہیّت کی صفات سے مُتّصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھیراتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ حقیقت و صداقت پر ظلم کر رہا ہے، اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریّے کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے۔

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ
يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اُن کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کو کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے (کہ سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہیں سنتے[۱۷])۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان لاکر نہ دیں گے۔ حدیہ ہے کہ جب وہ تمھارے پاس آکر تم سے جھگڑتے ہیں تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار کا فیصلہ کرلیا ہے وہ (ساری باتیں سُننے کے بعد) یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک داستانِ پارینہ کے سوا کچھ نہیں[۱۸]۔

۱۷- یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قانونِ فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے، کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں، وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن وارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرینِ حق کا سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعیِ حق کی کسی بات کا ان کے دل میں نہ اُترنا اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصّب اور جمود کا فطری نتیجہ ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اُتر آتا ہے اور بے تعصّبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رَوِیّہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا، اس کے دل کے دروازے ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں۔ کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقتِ واقعہ کا اظہار فرماتا ہے۔

۱۸- نادان لوگوں کا عُموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی، یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریّہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے۔ حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانے سے ایک ہی امرِ حق کو پیش کرتے آئے ہیں، اور آیندہ بھی جو اس منبعِ علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دُہرائے گا۔ البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم ہو کر اَزَلی و اَبَدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کی اُپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرۂ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ
أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا
يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾
بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا
لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوْٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا
الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ

وہ اس امرِ حق کو قبول کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ (وہ سمجھتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں) حالانکہ دراصل وہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کر رہے ہیں مگر انھیں اس کا شُعور نہیں ہے۔ کاش! تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھُٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔ درحقیقت یہ بات وہ محض اس وجہ سے کہیں گے کہ جس حقیقت پر انھوں نے پردہ ڈال رکھا تھا وہ اس وقت بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی ہوگی،[19] ورنہ اگر انھیں سابق زندگی کی طرف واپس بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انھیں منع کیا گیا ہے، وہ تو ہیں ہی جھوٹے (اس لیے اپنی اس خواہش کے اظہار میں بھی جھُوٹ ہی سے کام لیں گے)۔ آج یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ کاش وہ منظر تم دیکھ سکو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے۔

۱۹- یعنی ان کا یہ قول درحقیقت عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلیِ رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدۂ حق کا نتیجہ ہوگا، جس کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی کٹے سے کٹا کافر بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ؑ ۝۳۰ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰى ۳ ع ۱۰
اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ
وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۳۱
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ

اس وقت ان کا رب ان سے پُوچھے گا: ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے: ”ہاں اے ہمارے رب! یہ حقیقت ہی ہے۔“ وہ فرمائے گا: ”اچھا! تو اب اپنے انکارِ حقیقت کی پاداش میں عذاب کا مزا چکھو۔“ ؑ

نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو یہی لوگ کہیں گے: ”افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔“ اور ان کا حال یہ ہوگا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا بُرا بوجھ ہے جو یہ اُٹھا رہے ہیں۔ دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور ایک تماشا ہے[۲۰]، حقیقت میں آخرت ہی کا مقام

---

۲۰ – اس کا یہ مطلب نہیں کہ دُنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل سنجیدہ کاروبار کی طرف واپس ہو جائے۔ نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ یہاں حقیقت کے مخفی ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں اور ان غلط فہمیوں میں پھنس کر لوگ حقیقتِ نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے، اس کی حیثیت حقیقت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں ہوتی جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے۔ حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے، قید کیا جاتا ہے اور اس کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔

خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۲﴾ قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَصَبَرُوۡا عَلٰى

اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو زیاں کاری سے بچنا چاہتے ہیں، پھر کیا تم لوگ عقل سے کام نہ لوگے؟

اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمھیں رنج ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں[۲۱]۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رُسول جھٹلائے جا چکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور اُن اذیّتوں پر جو انھیں پہنچائی گئیں، انھوں نے

ایسے ہی تماشے اس دُنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں، حالاں کہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام و نشان تک موجود نہیں۔ کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے، حالاں کہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رزّاق بنا ہوا ہے، حالاں کہ بیچارہ خود اپنے رزق کے لیے کسی اَور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزّت اور ذلّت دینے والا، نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گرد و پیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے، حالاں کہ بندگی کی ذلّت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا جھٹکا اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انھی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلے جا رہے ہیں، موت کی ساعت آتے ہی یکلخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اُس عالَم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابقِ حقیقت ہوگا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ لایا ہے جو میزانِ حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

۲۱- واقعہ یہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپؐ کی قوم کے سب لوگ آپؐ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپؐ کی راست بازی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو جھٹلایا اُس وقت جب کہ آپؐ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دُوسرے دَور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپؐ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپؐ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ دنیا کے کسی معاملے میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے جتنی آپؐ کی تکذیب کی، وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ اس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ
وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ
اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی
السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى

صبر کیا، یہاں تک کہ انھیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں[۲۲] ہے، اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سُرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو[۲۳]۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا،

سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: انا لا نکذبك ولکن نکذب ما جئت بہ۔ ”ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں، اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔“ جنگِ بدر کے موقع پر اَخنَس بن شَرِیق نے تخلیے میں ابو جہل سے پوچھا کہ یہاں میرے اور تمھارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ اس نے جواب دیا کہ ”خدا کی قسم محمدؐ ایک سچّا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا، مگر جب لِوا اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصّے میں آ جائے تو بتاؤ، باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟“ اسی بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو تسلی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمھاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمل و بُردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔

۲۲ – یعنی اللہ نے حق اور باطل کی کش مکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے، اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹّی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا، اپنی راست بازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکُّل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دَور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اِسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاقِ فاضلہ و سیرتِ صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نُصرت ٹھیک اپنے وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

۲۳ – نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدّتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستی پر

النصف
وقف غفران

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ

لٰہذا نادان مت[۲۴] بنو۔ دعوتِ حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سُننے والے ہیں،

نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش! کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے اِن لوگوں کا کفر ٹُوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کر لیں۔ آپؐ کی اِسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں، اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیّتِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو، اُسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمُود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا، اور تمھیں گمان ہے کہ اس جمُود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمھارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گُھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے اُمّید نہ رکھو کہ ہم تمھاری یہ خواہش پوری کریں گے، کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۴- یعنی اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رَو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلے میں جِدّ و جُہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارے سے انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقے پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشا تو یہ ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں، وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اُس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوّق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعے میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اُصُولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جِدّ و جُہد کر کے فطری ارتقا کی راہ سے اقامتِ دینِ حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلے پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے، وہ مدد بھی انھیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلا دے اور تمدُّنِ فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیّتِ صالحہ تعمیر کر دے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا، کیونکہ یہ اللہ کی اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمّہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، اسے تصرُّف کے اختیارات دیے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مُہلت عطا کی ہے، اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلے کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ
لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا
طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى
الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ

وقف منزل
عند البعض عن ابن مسعود

رہے مُردے[25]، تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اُٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری؟ کہو: اللہ نشانی اتارنے کی پُوری قدرت رکھتا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مُبتلا ہیں[26]۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نِوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں، وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں[27]۔ اللہ جسے چاہتا ہے

۲۵- سُننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ضمیر زندہ ہیں، جنھوں نے اپنی عقل وفکر کو معطّل نہیں کر دیا ہے، اور جنھوں نے اپنے دل کے دروازوں پر تعصب اور جمود کے قفل نہیں چڑھا دیے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مُردہ وہ لوگ ہیں جو لکیر کے فقیر بنے اندھوں کی طرح چلے جا رہے ہیں اور اس لکیر سے ہٹ کر کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ صریح حق ہی کیوں نہ ہو۔

۲۶- نشانی سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں، بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے، جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے

يُضْلِلْهُ ۖ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ

بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے رستے پر لگا دیتا ہے۔[28] ان سے کہو:

نہیں سمجھتے۔

۲۷ – مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں محض تماش بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبیؐ جس چیز کی طرف بُلا رہا ہے وہ امرِ حق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمھارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہَوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک اس کے مناسبِ حال بنائی گئی ہے۔ کس طرح اس کی جِبِلّت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حُدُود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی، اُسی مقام پر جہاں وہ ہے، خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطے کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدایش، تناسُل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اِسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمھیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رَوِیّے کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائبِ قدرت کے کرشمے دکھا کر تمھارا دل بہلایا جائے۔

۲۸ – خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعے کی توفیق نہ بخشی جائے، اور ایک متعصّب غیر حقیقت پسند طالبِ علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہمیوں میں اُلجھانے والی چیزیں اسے حق سے دُور اور دُور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالبِ حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور اَنفُس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انھیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانیات (Zoology)، نباتات (Botany)، حیاتیات (Biology)، ارضیات (Geology)، فلکیات (Astronomy)، عضویات (Physiology)، علم التشریح (Anatomy) اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاریخ، آثارِ قدیمہ اور عُلُومِ اجتماع (Social Sciences) کی تحقیق کرتے ہیں اور

اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ
اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع ۴ ع ۱۱ ۱۰

ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی بڑی مصیبت آ جاتی ہے یا آخری گھڑی آ پہنچتی ہے تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اَور کو پُکارتے ہو؟ بولو اگر تم سچّے ہو۔ اس وقت تم اللہ ہی کو پُکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو بھُول جاتے ہو۔[۲۹] ع

ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ مگر چونکہ وہ مطالعے کا آغاز ہی تعصّب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر دُنیا اور اس کے فوائد و مَنافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدے کے دَوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی، بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انھیں اُلٹی دہریّت، الحاد، مادّہ پرستی اور نیچریّت ہی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہِ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

۲۹ – گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمھارے گردوپیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدے کی طرف توجّہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے جو خود منکرینِ حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آ جاتی ہے، یا موت اپنی بھیانک صُورت کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، اُس وقت ایک خدا کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اُسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبُودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ کٹّے سے کٹّا دہریہ تک خدا کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے، جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیے گئے ہوں، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عِکرِمَہ کو اِسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکّۂ معظّمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝۴۲ فَلَوْلَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۴۳ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝۴۴ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسُول بھیجے اور اُن قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جُھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو، جو انھیں کی گئی تھی، بُھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوش حالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ اُن بخششوں میں، جو انھیں عطا کی گئی تھیں، خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنھوں نے

ہو گیا تو عِکرِمہ جِدّہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حَبَش کی راہ لی۔ راستے میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اوّل اوّل تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا، مگر جب طوفان کی شدّت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے، وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت عِکرِمہ کی آنکھیں کُھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو۔ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عِکرِمہ کی زندگی میں فیصلہ کُن لمحہ تھا۔ انھوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف

ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ
اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ
غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ
يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً
اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ
الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ
فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

ظلم کیا تھا، اور تعریف ہے اللہ ربّ العالمین کے لیے (کہ اس نے ان کی جڑ کاٹ دی)۔

اے محمدؐ! ان سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ تمھاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمھارے دلوں پر مُہر کر دے[۳۰] تو اللہ کے سوا اور کون سا خدا ہے جو یہ قوتیں تمھیں واپس دلا سکتا ہو؟ دیکھو، کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چُرا جاتے ہیں۔ کہو: کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ کی طرف سے اچانک یا علانیہ تم پر عذاب آ جائے تو کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہو گا؟ ہم جو رسُول بھیجتے ہیں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔ پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں، وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں سزا بھگت کر رہیں گے۔

مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی۔

۳۰– یہاں دلوں پر مُہر کرنے سے مراد سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب کر لینا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۧ ۵۰ ۵ ع ۱۱

اے محمدؐ! ان سے کہو: ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔“[۳۱] پھر ان سے پوچھو: ”کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟[۳۲] کیا تم غور نہیں کرتے؟“ ع

۳۱– نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ احمقانہ تصور رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے، اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہییں، وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے، وہ حکم دے اور زمین سے خزانے اُبلنے لگیں، اس پر لوگوں کے اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں، وہ بتا دے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، حاملہ کے پیٹ میں نر ہے یا مادہ۔ پھر اس کو انسانی کمزوریوں اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہوا جسے بھوک اور پیاس لگے، جس کو نیند آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا پھرے، جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اسی قسم کے تصورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی ذہنیت پر مسلّط تھے۔ وہ جب آپؐ سے پیغمبری کا دعویٰ سُنتے تھے تو آپؐ کی صداقت جانچنے کے لیے آپؐ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارق عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپؐ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ انھی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۳۲– مطلب یہ ہے کہ میں جن حقیقتوں کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربے میں آئی ہیں، مجھے وحی کے ذریعے سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے۔ بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو، وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر۔ لہٰذا میرے اور تمھارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے، نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں، یا میں عالم الغیب ہوں، یا انسانی کمزوریوں سے مُبرّا ہوں۔

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰی رَبِّهِمۡ لَیۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ (۵۱) وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَیۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ

اور اے محمدؐ! تم اس (علمِ وحی) کے ذریعے سے اُن لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو ان کا حامی و مددگار ہو، یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ (اس نصیحت سے مُتنبّہ ہوکر) وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں[۳۳]۔ اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پُکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں، انھیں اپنے سے دُور نہ پھینکو[۳۴]۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔

۳۳۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایسے مدہوش ہیں کہ انھیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے، ان پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اور اسی طرح ان لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس بے بنیاد بھروسے پر جی رہے ہیں کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کر گزریں، آخرت میں ہمارا بال تک بیکا نہ ہوگا، کیونکہ ہم فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، یا فلاں ہماری سفارش کردے گا، یا فلاں ہمارے لیے کفّارہ بن چکا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم اپنا رُوئے سُخَن ان لوگوں کی طرف رکھو جو خدا کے سامنے حاضری کا بھی اندیشہ رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ جھوٹے بھروسوں پر پھُولے ہوئے بھی نہ ہوں۔ اس نصیحت کا اثر صرف ایسے ہی لوگوں پر ہو سکتا ہے اور انھی کے دُرست ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

۳۴۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپؐ کے گردوپیش ہماری قوم کے غلام، مَوالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزّز لوگ ملے ہیں، بِلال، عَمّار، صُہَیب اور خَبّاب۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو برگزیدہ کیا جاسکتا تھا! پھر وہ ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ ان میں سے جس جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ

فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۲) وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ
بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (۵۳) وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ
سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۴)

اس پر بھی اگر تم انھیں دُور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہو گے۔[۳۵] دراصل ہم نے اس طرح ان لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمایش میں ڈالا ہے،[۳۶] تاکہ وہ اِنھیں دیکھ کر کہیں: ”کیا یہ ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے؟“ —— ہاں! کیا خدا اپنے شکر گزار بندوں کو اِن سے زیادہ نہیں جانتا ہے؟ جب تمھارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہو: ”تم پر سلامتی ہے۔ تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی کے ساتھ کسی بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اُسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔[۳۷]“

فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا، آج وہ بھی اس ”برگزیدہ گروہ“ میں شامل ہے۔ انھی باتوں کا جواب یہاں دیا جا رہا ہے۔

۳۵ – یعنی ہر شخص اپنے عیب و صواب کا ذمہ دار آپ ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جواب دِہی کے لیے تم کھڑے نہ ہو گے اور نہ تمھاری جواب دِہی کے لیے ان میں سے کوئی کھڑا ہو گا۔ تمھارے حصّے کی کوئی نیکی یہ تم سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصّے کی کوئی بدی تم پر ڈال نہیں سکتے۔ پھر جب یہ محض طالبِ حق بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تو آخر تم کیوں انھیں اپنے سے دُور پھینکو۔

۳۶ – یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں، سب سے پہلے ایمان کی توفیق دے کر ہم نے دولت اور عزّت کا گھمنڈ رکھنے والے لوگوں کو آزمایش میں ڈال دیا ہے۔

۳۷ – جو لوگ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان میں بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جن سے

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ ع قُلْ
اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ
اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾
قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ

اور اس طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔[۳۸] ع

اے محمدؐ! اِن سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دُوسروں کو پکارتے ہو، اُن کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو: میں تمھاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔ کہو: میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر قائم ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، اب میرے اختیار میں وہ چیز ہے نہیں جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو۔[۳۹] فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین

زمانۂ جاہلیّت میں بڑے بڑے گناہ ہو چکے تھے۔ اب اسلام قبول کرنے کے بعد اگرچہ ان کی زندگیاں بالکل بدل گئی تھیں، لیکن مخالفینِ اسلام اُن کو سابق زندگی کے عُیُوب اور افعال کے طعنے دیتے تھے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اہلِ ایمان کو تسلّی دو۔ انھیں بتاؤ کہ جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے، اس کے پچھلے قصوروں پر گرفت کرنے کا طریقہ اللہ کے ہاں نہیں ہے۔

۳۸- ’’اس طرح‘‘ کا اشارہ اُس پورے سلسلۂ تقریر کی طرف ہے جو چوتھے رُکوع کی اِس آیت سے شروع ہوا تھا: ’’یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ ایسی صاف اور صریح دلیلوں اور نشانیوں کے بعد بھی جو لوگ اپنے کفر و انکار پر اصرار ہی کیے چلے جائیں، ان کا مجرم ہونا بالکل غیر مُشتبہ طور پر ثابت ہوا جاتا ہے، اور یہ حقیقت بالکل آئینے کی طرح نمایاں ہوئی جاتی ہے کہ دراصل یہ لوگ ضلالت پسندی کی بنا پر یہ راہ چل رہے ہیں، نہ اس بنا پر کہ راہِ حق کے دلائل واضح نہیں ہیں، یا یہ کہ کچھ دلیلیں ان کی اس گمراہی کے حق میں بھی موجود ہیں۔

۳۹- اشارہ ہے عذابِ الٰہی کی طرف۔ مخالفین کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہو اور ہم

الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ
بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ
الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ
مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّ
لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ
وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ
مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

۷ ع ۱۳

فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو: اگر کہیں وہ چیز میرے اختیار میں ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمھارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ مگر اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیے۔ اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب کچھ ایک کُھلی کتاب میں لکھا ہُوا ہے۔ وہی ہے جو رات کو تمھاری رُوحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دُوسرے روز وہ تمھیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے، تاکہ زندگی کی مقرر مدّت پوری ہو۔ آخرِ کار اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ ع

کُھلّم کُھلّا تم کو جھٹلا رہے ہیں تو کیوں نہیں خدا کا عذاب ہم پر ٹوٹ پڑتا؟ تمھارے مامون من اللہ ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ اِدھر کوئی تمھاری تکذیب یا توہین کرتا اور اُدھر فوراً زمین دھنستی اور وہ اس میں سما جاتا، یا بجلی گرتی اور وہ بھسم ہو جاتا۔ یہ کیا ہے کہ خدا کا فرستادہ اور اس پر ایمان لانے والے تو مصیبتوں پر مصیبتیں اور ذلّتوں پر ذلّتیں سہ رہے ہیں اور ان کو گالیاں دینے اور پتھر مارنے والے چین کیے جاتے ہیں؟

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ (۶۱) ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى
اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ قف وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (۶۲)
قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (۶۳) قُلِ اللّٰهُ
يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ (۶۴)

اپنے بندوں پر وہ پُوری قدرت رکھتا ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے مقرر کر کے بھیجتا ہے،[۴۰] یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اس کے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اپنا فرض انجام دینے میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے، پھر سب کے سب اللہ، اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جاتے ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! فیصلے کے سارے اختیارات اسی کو حاصل ہیں اور وہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

اے محمدؐ! ان سے پوچھو: صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمھیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چُپکے چُپکے دُعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تُو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے؟ —— کہو: اللہ تمھیں اُس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے، پھر تم دُوسروں کو اُس کا شریک ٹھیراتے ہو۔[۴۱]

۴۰۔ یعنی ایسے فرشتے جو تمھاری ایک ایک جنبش اور ایک ایک بات پر نگاہ رکھتے ہیں اور تمھاری ہر ہر حرکت کا ریکارڈ محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

۴۱۔ یعنی یہ حقیقت کہ تنہا اللہ ہی قادرِ مُطلَق ہے، اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمھاری بھلائی اور بُرائی کا مختارِ کُل ہے، اور اسی کے ہاتھ میں تمھاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے، اِس کی شہادت تو تمھارے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سر رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت تم بے اختیار اُسی کی طرف

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ
بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ
بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ؕ لِكُلِّ نَبَاٍ

کہو: وہ اِس پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اُوپر سے نازل کر دے، یا تمھارے قدموں کے نیچے سے برپا کر دے، یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک گروہ کو دُوسرے گروہ کی طاقت کا مزا چکھوا دے۔ دیکھو، ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں، شاید کہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں[۴۲]۔ تمھاری قوم اُس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ وہ حقیقت ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میں تم پر حوالہ دار نہیں بنایا گیا ہوں[۴۳]، ہر خبر کے

رُجوع کرتے ہو۔ لیکن اس کُھلی علامت کے ہوتے ہوئے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل و حجت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے۔ پلتے ہو اس کے رزق پر اور اَن داتا بناتے ہو دوسروں کو۔ مدد پاتے ہو اس کے فضل و کرم سے اور حامی و ناصر ٹھیراتے ہو دوسروں کو۔ غلام ہو اس کے اور بندگی بجالاتے ہو دوسروں کی۔ مشکل کشائی کرتا ہے وہ، بُرے وقت پر گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے، اور جب وہ وقت گزر جاتا ہے تو تمھارے مشکل کُشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں کے نام کی۔

۴۲- جو لوگ عذابِ الٰہی کو اپنے سے دُور پا کر حق دشمنی میں جرأت پر جرأت دکھا رہے تھے، انھیں متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ہوا کا ایک طوفان تمھیں اچانک برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمھاری بستیوں کو پیوندِ خاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔ قبیلوں اور قوموں اور ملکوں کی عداوتوں کے میگزین میں ایک چنگاری وہ تباہی پھیلا سکتی ہے کہ سال ہا سال تک خوں ریزی و بد امنی سے نجات نہ ملے۔ پس اگر عذاب نہیں آ رہا ہے تو یہ تمھارے لیے غفلت و مدہوشی کی پینک نہ بن جائے کہ مطمئن ہو کر صحیح و غلط کا امتیاز کیے بغیر اندھوں کی طرح زندگی کے راستے پر چلتے رہو۔ غنیمت سمجھو کہ اللہ تمھیں مہلت دے رہا ہے اور وہ نشانیاں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے جن سے تم حق کو پہچان کر صحیح راستہ اختیار کر سکو۔

۴۳- یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمھیں دکھاؤں اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو

مُسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶۷) وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ
اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا
يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۶۸)
وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۶۹) وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا

ظُہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا۔

اور اے محمدؐ! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دُوسری باتوں میں لگ جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تمھیں بھُلاوے میں ڈال دے[۴۴] تو جس وقت تمھیں اس غلطی کا احساس ہو جائے، اس کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ اُن کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمّہ داری پرہیز گار لوگوں پر نہیں ہے، البتہ نصیحت کرنا اُن کا فرض ہے، شاید کہ وہ غلط روی سے بچ جائیں[۴۵]۔ چھوڑو اُن لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے

وہ بزور تمھاری سمجھ میں اُتار دوں۔ اور میرا یہ کام بھی نہیں ہے کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں۔ میرا کام صرف حق اور باطل کو ممیّز کر کے تمھارے سامنے پیش کر دینا ہے۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس بُرے انجام سے میں تمھیں ڈراتا ہوں، وہ اپنے وقت پر خود تمھارے سامنے آجائے گا۔

۴۴۔ یعنی اگر کسی وقت ہماری یہ ہدایت تمھیں یاد نہ رہے اور تم بھُولے سے ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھے رہ جاؤ۔

۴۵۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے خود بچ کر کام کرتے ہیں، ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے، پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث و مناظرہ کر کے ضرور انھیں قائل کر کے ہی چھوڑیں گے، اور ان کے ہر لغو و مُہمل اعتراض کا جواب ضرور ہی دیں گے، اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح منوا کر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنھیں گمراہی میں بھٹکتے دیکھ رہے ہیں انھیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے

وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا
كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ
كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ
لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۧ ۝۷۰ قُلْ ۸ ع ۱۰ ۱۳
اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓي
اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي
الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۠ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ

اور جنھیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں، مگر یہ قرآن سُنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتُوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے، اور گرفتار بھی اِس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لیے نہ ہو، اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیے میں دے کر چھُوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے، ان کو تو اپنے انکارِ حق کے معاوضے میں کھَولتا ہُوا پانی پینے کو اور درد ناک عذاب بھگتنے کو ملے گا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے پُوچھو: کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پُکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جب کہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں؟ کیا ہم اپنا حال اُس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگردان پھر رہا ہو، درآں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ اِدھر آ، یہ سیدھی راہ موجود ہے؟

پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اُتر آئیں تو اہلِ حق کا یہ کام نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کُشتیاں لڑنے میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انھیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو

قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۱﴾ ۙ
وَاَنۡ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوۡهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ
هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ

کہو: حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو، اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے[۴۶]۔ اور جس دن وہ کہے گا کہ

اُن لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صَرف کرنا چاہیے جو خود طالبِ حق ہوں۔

۴۶ – قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے یا حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ ارشاد بہت وسیع معانی پر مشتمل ہے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایشور جی کی لیلا نہیں ہے۔ یہ کسی بچے کا کھلونا نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے وہ اس سے کھیلتا رہے اور پھر یونہی اُسے توڑ پھوڑ کر پھینک دے۔ دراصل یہ ایک نہایت سنجیدہ کام ہے جو حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے، ایک مقصدِ عظیم اس کے اندر کارفرما ہے، اور اس کا ایک دَور گزر جانے کے بعد ناگزیر ہے کہ خالق اُس پُورے کام کا حساب لے جو اُس دَور میں انجام پایا ہو، اور اسی دَور کے نتائج پر دوسرے دَور کی بنیاد رکھے۔ یہی بات ہے جو دوسرے مقامات پر یوں بیان کی گئی ہے: رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ ”اے ہمارے رب! تُو نے یہ سب کچھ فضول پیدا نہیں کیا ہے۔“ اور وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ۔ ”ہم نے آسمان و زمین اور ان چیزوں کو جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔“ اور اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ۔ ”تو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟“

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ سارا نظامِ کائنات حق کی ٹھوس بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ عدل اور حکمت اور راستی کے قوانین پر اس کی ہر چیز مبنی ہے۔ باطل کے لیے فی الحقیقت اس نظام میں جڑ پکڑنے اور بارآور ہونے کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ اللہ باطل پرستوں کو موقع دے دے کہ وہ اگر اپنے جھوٹ اور ظلم اور ناراستی کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اپنی کوشش کر دیکھیں۔ لیکن آخرکار زمین باطل کے ہر بیج کو اُگل کر پھینک دے گی اور آخری فردِ حساب میں ہر باطل پرست دیکھ لے گا کہ جو کوششیں اس نے اس شجرِ خبیث کی کاشت اور آبیاری میں صَرف کیں وہ سب ضائع ہو گئیں۔

كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي
الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (٧٣)
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ

حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے۔ اور جس روز صُور پھونکا جائے گا،[٤٧] اس روز پادشاہی اُسی کی ہوگی،[٤٨] وہ غیب اور شہادت[٤٩] ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: ”کیا تُو بتوں کو خدا بناتا ہے؟[٥٠] میں تو

تیسرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اس ساری کائنات کو برِبنائے حق پیدا کیا ہے اور اپنے ذاتی حق کی بنا پر ہی وہ اس پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس کا حکم یہاں اس لیے چلتا ہے کہ وہی اپنی پیدا کی ہوئی کائنات میں حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔ دوسروں کا حکم اگر بظاہر چلتا نظر بھی آتا ہو تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ، فی الحقیقت نہ ان کا حکم چلتا ہے، نہ چل سکتا ہے، کیونکہ کائنات کی کسی چیز پر بھی ان کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنا حکم چلائیں۔

۴۷ – صُور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہوگی، اس کی تفصیل ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ قرآن سے جو کچھ ہمیں معلوم ہُوا ہے، وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے ایک مرتبہ صُور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر نہ معلوم کتنی مدّت بعد، جسے اللہ ہی جانتا ہے، دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور تمام اوّلین و آخرین از سرِ نو زندہ ہو کر اپنے آپ کو میدانِ حشر میں پائیں گے۔ پہلے صُور پر سارا نظامِ کائنات دَرہم برہم ہو گا اور دوسرے صُور پر ایک دوسرا نظام نئی صورت اور نئے قوانین کے ساتھ قائم ہو جائے گا۔

۴۸ – یہ مطلب نہیں ہے کہ آج پادشاہی اس کی نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس روز جب پردہ اُٹھایا جائے گا اور حقیقت بالکل سامنے آ جائے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب جو بااختیار نظر آتے تھے، یا سمجھے جاتے تھے، بالکل بے اختیار ہیں اور پادشاہی کے سارے اختیارات اسی ایک خدا کے لیے ہیں جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔

۴۹ – غیب: وہ سب کچھ جو مخلوقات سے پوشیدہ ہے۔

شہادت: وہ سب کچھ جو مخلوقات کے لیے ظاہر و معلوم ہے۔

۵۰ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے کا ذکر اس امر کی تائید اور شہادت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت سے آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے شرک کا انکار کیا ہے اور سب مصنوعی خداؤں سے منہ موڑ کر صرف ایک مالکِ کائنات کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے، اسی طرح کل یہی کچھ ابراہیم علیہ السلام بھی کر چکے ہیں۔

أَرَىٰكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾

تجھے اور تیری قوم کو کُھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔“ ابراہیمؑ کو ہم اِسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے[۵۱] تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو[۵۲] جائے۔

اور جس طرح آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والوں سے ان کی جاہل قوم جھگڑ رہی ہے، اسی طرح کل حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے بھی ان کی قوم یہی جھگڑا کر چکی ہے۔ اور کل جو جواب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو دیا تھا، آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیرووں کی طرف سے ان کی قوم کو بھی وہی جواب ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس راستے پر ہیں جو نوحؑ اور ابراہیمؑ اور نسلِ ابراہیمی کے تمام انبیاؑ کا راستہ رہا ہے۔ اب جو لوگ ان کی پیروی سے انکار کر رہے ہیں، انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ انبیاؑ کے طریقے سے ہٹ کر ضلالت کی راہ پر جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ عرب کے لوگ بالعموم حضرت ابراہیمؑ کو اپنا پیشوا اور مقتدا مانتے تھے۔ خُصوصاً قریش کے تو فخر و ناز کی ساری بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد اور ان کے تعمیر کردہ خانۂ خدا کے خادم ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کے عقیدۂ توحید کا اور شرک سے اُن کے انکار اور مشرک قوم سے اُن کی نزاع کا ذکر کرنے کے معنٰی یہ تھے کہ قریش کا سارا سرمایۂ فخر و ناز اور کفارِ عرب کا اپنے مشرکانہ دین پر سارا اطمینان ان سے چھین لیا جائے، اور اُن پر ثابت کر دیا جائے کہ آج مسلمان اُس مقام پر ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ تھے، اور تمھاری حیثیت وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے لڑنے والی جاہل قوم کی تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے معتقدوں اور قادری النسب پیرزادوں کے سامنے حضرتِ شیخؒ کی اصل تعلیمات اور ان کی زندگی کے واقعات پیش کر کے یہ ثابت کر دے کہ جن بزرگ کے تم نام لیوا ہو، تمھارا اپنا طریقہ ان کے بالکل خلاف ہے اور تم نے آج انھی گمراہ لوگوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے جن کے خلاف تمھارے مُقتدا تمام عمر جہاد کرتے رہے۔

۵۱ – یعنی جس طرح تم لوگوں کے سامنے آثارِ کائنات نمایاں ہیں اور اللہ کی نشانیاں تمھیں دکھائی جا رہی ہیں، اُسی طرح ابراہیمؑ کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ مگر تم لوگ انھیں دیکھنے پر بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے اور ابراہیمؑ نے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہی سورج اور چاند اور تارے جو تمھارے سامنے طُلوع و غروب ہوتے ہیں اور روزانہ تم کو جیسا گمراہ طلوع ہوتے وقت پاتے ہیں ویسا ہی غروب ہوتے وقت چھوڑ جاتے ہیں، انھی کو اُس آنکھوں والے انسان نے بھی دیکھا تھا اور انھی نشانات سے وہ حقیقت تک پہنچ گیا۔

۵۲ – اس مقام کو اور قرآن کے اُن دوسرے مقامات کو جہاں حضرت ابراہیمؑ سے اُن کی قوم کی نزاع کا ذکر آیا

ہے، اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے مذہبی و تمدّنی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جدید اثری تحقیقات کے سلسلے میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے، بلکہ دَورِ ابراہیمی میں اُس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی (Sir Leonard Woolley) نے اپنی کتاب ("Abraham", London, 1935) میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے ہیں، ان کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبلِ مسیح کے لگ بھگ زمانے میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیمؑ کے ظُہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی، اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلّقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حُدود موجودہ حکومتِ عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادّہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسایش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُود خواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدّمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دُعائیں زیادہ تر درازیِ عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہُوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی:

(۱) عَمیلو: یہ اُونچے طبقے کے لوگ تھے جن میں پُجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(۲) مِشکینو: یہ تُجّار، اہلِ صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اَردو: یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقہ، یعنی عَمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے، اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمُود میں ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عَمیلو طبقے کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدے دار تھا۔ (دیکھو سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۹۰)

اُر کے کَتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربُّ البلد، مہادیو یا رئیس الآلہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبُودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُر کا ربّ البلَد ”ننّار“ (چاند دیوتا) تھا، اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اس شہر کا نام ”قمرینہ“ بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لَرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اُس کا ربّ البلَد ”شماش“ (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیّاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے،

اور لوگ اپنی مختلف فُروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بُتوں کی شکل میں بنالی گئی تھیں اور تمام مراسِمِ عبادت انھی کے آگے بجالائے جاتے تھے۔

نَنّار کا بُت اُر میں سب سے اُونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ’’نَنّار‘‘ کی بیوی ’’نن گل‘‘ کا مَعبَد تھا۔ نَنّار کے مَعبَد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پُجارن جا کر اس کی دُلھن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (religious prostitutes) کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو ’’خدا‘‘ کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو ’’راہِ خدا‘‘ میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا عورت کے لیے ذریعۂ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پُجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

نَنّار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ مُلک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تُجّار سب ہر قسم کے غلّے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے، جنھیں وصول کرنے کے لیے مندر میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پُجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر مُلک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پُجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے ’’خدا‘‘ کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی نَنّار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نَنّار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبُودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

اُر کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں حکمران تھا، اس کے بانیِ اوّل کا نام اُرنَمُّو تھا، جس نے ۲۳۰۰ برس قبلِ مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حُدُودِ مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لُبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُسی سے اس خاندان کو ’’نَمُّو‘‘ کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو نَنّار کے بُت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لَرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابِل نے زور پکڑا اور لَرسہ اور اُر دونوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے نَنّار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا، کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

تعیُّن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے اَدوار میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ قبلِ مسیح میں بابِل کے بادشاہ حَمورابی (بائبل کے اَمرافیل) نے جو قوانین مرتب کیے تھے، وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی تدوین میں مشکوٰۃِ نبوّت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ
لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ
الضَّاۤلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ
فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْۤءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ

چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اُس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا: یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا: ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا: یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا: یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھا: ”اے برادرانِ قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے[۵۳] ہو۔ میں نے تو

ان قوانین کا مُفصَّل کتبہ ۱۹۰۲ بعدِ مسیح میں ایک فرانسیسی مفتش آثارِ قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C.H.W. John نے ۱۹۰۳ بعدِ مسیح میں (The Oldest Code of Law) کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطۂ قوانین کے بہت سے اُصول اور فُروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدُّنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے، اس کا اثر صرف بُتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیّت، پجاریوں اور اُونچے طبقوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت، اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اُس کی زد میں آئی جاتی تھی۔ اُن کی دعوت کو قبول کرنے کے معنیٰ یہ تھے کہ نیچے سے اُوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے ازسرِنَو توحیدِ الٰہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اِسی لیے ابراہیم علیہ السّلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۵۳ – یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اُس ابتدائی تفکّر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے

پہلے اُن کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدّماغ اور سلیم النظر انسان، جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہ ہوسکتی تھی، کس طرح آثارِ کائنات کا مشاہدہ کرکے اور ان پر غور وفکر اور ان سے صحیح اِستدلال کرکے امرِ حق معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُوپر قومِ ابراہیمؑ کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد وپیش ہر طرف چاند، سورج اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہوسکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انھوں نے غور وفکر کیا اور آخرِکار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جن جن کے رب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی رُبُوبیت کا شائبہ تک نہیں ہے، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا ہے۔

اس قصّے کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر چاند دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو یہ کہا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا، اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں اور سورج کو طلوع وغروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ غور وفکر تو انھوں نے سِنِ رُشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ پھر یہ قصّہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا؟ گویا اس خاص واقعے سے پہلے انھیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مُستَبعَد ہے۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انھیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصّہ تصنیف کریں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش ایک غار میں ہوئی تھی جہاں سِنِ رُشد کو پہنچنے تک وہ چاند، تاروں اور سورج کے مُشاہدَے سے محروم رکھے گئے تھے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلّق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہوگیا کہ اشیا آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانونِ جذب وکشش کے اِستِنباط تک پہنچ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعے سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی اور بارہا دیکھی ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مُشاہدَے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روز مرّہ کے ایسے سیکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہی کہ غور وفکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثّر نہیں ہوا کرتا۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اُسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہوجاتی ہے، جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ﴿٧٩﴾ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَ
قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ
شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ

یکسُو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: ”کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے۔ اور میں تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہُوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟[۵۴] اور آخر میں تمھارے

طرف کام کرنے لگتی ہیں۔ یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن اُلجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرّہ ہی کے مُشاہَدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گُتّھی کا وہ سِرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری اُلجھنیں سُلجھتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں۔ سورج اور چاند اور تارے سب ہی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اُس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحیدِ الٰہ کی مرکزی حقیقت تک پہنچ کر رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظامِ زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے، اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آ کر کشودِ کار کے لیے کلید بن گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے ہی سے ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر ہی سہی، وہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سَمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری مَقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو

اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَكۡتُمۡ وَلَا تَخَافُوۡنَ اَنَّكُمۡ اَشۡرَكۡتُمۡ بِاللّٰهِ مَا
لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَيۡكُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَىُّ الۡفَرِيۡقَيۡنِ اَحَقُّ
بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ⑧١ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا وقف لازم
اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ⑧٢ ع

۹ ع ۱۴ ۱۵

ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ، اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انھی کے لیے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔[۵۵]" ع

ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہُوا کرتا ہے نہ کہ حکمی۔ طالب جب اِن میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو دراصل یہ اس کی آخری رائے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا، وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔

۵۴- اصل میں لفظ تَذَکُّر استعمال ہوا ہے، جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بُھلاوے میں پڑا ہُوا ہو، وہ چونک کر اُس چیز کو یاد کر لے جس سے وہ غافل تھا۔ اسی لیے ہم نے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، تمہارا اصلی و حقیقی رب اس سے بے خبر نہیں ہے، اس کا علم ساری چیزوں پر وسیع ہے، پھر کیا اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی تمھیں ہوش نہ آئے گا؟

۵۵- یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ وہ قوم اللہ فاطر السماوات والارض کی ہستی کی منکر نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جُرم اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور خداوندانہ حُقوق میں شریک قرار دینا تھا۔ اوّل تو حضرت ابراہیمؑ خود ہی فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرتے ہو۔ دوسرے جس طرح آپ ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ اندازِ بیان صرف اُنھی لوگوں کے مقابلے میں اختیار کیا جا سکتا ہے جو اللہ کے نفسِ وجود سے منکر نہ ہوں۔ لٰہذا اُن مفسّرین کی رائے درست نہیں ہے جنھوں نے اس مقام پر اور حضرت ابراہیمؑ کے سلسلے میں دوسرے مقامات پر قرآن کے

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ
نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (٨٣) وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ
دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (٨٤) ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ

یہ تھی ہماری وہ حجّت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے۔

پھر ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی۔ (وہی راہِ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو (ہدایت بخشی)۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ (اُسی کی اولاد سے) زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا)۔

بیانات کی تفسیر اس مفروضہ پر کی ہے کہ قومِ ابراہیمؑ اللہ کی منکر یا اس سے ناواقف تھی اور صرف اپنے معبُودوں ہی کو خدائی کا بالکُلّیّہ مالک سمجھتی تھی۔

آخری آیت میں یہ جو فقرہ ہے کہ ”جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا“، اس میں لفظ ظلم سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس سے مراد معصیت ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرما دی کہ دراصل یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ کو مانیں اور اپنے اس ماننے کو کسی مشرکانہ عقیدہ و عمل سے آلودہ نہ کریں، امن صرف اُنھی کے لیے ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ واقعہ جو حضرت ابراہیمؑ کی عظیم الشان پیغمبرانہ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے، بائبل میں کوئی جگہ نہیں پا سکا ہے۔ البتہ تَلمُود میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں قرآن سے مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی جُستجوئے حقیقت کو سورج سے شروع کر کے تاروں تک اور پھر خدا تک لے جاتی ہے۔ دوسرے اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب سورج کو ھٰذَا رَبِّیْ کہا تو ساتھ ہی اس کی پرستش بھی کر ڈالی، اور اسی طرح

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ
وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۸۶﴾ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ
وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ
اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ

ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ (اسی کے خاندان سے) اسماعیلؑ، الیسعؑ، اور یونسؑ اور لُوطؑ کو (راستہ دکھایا)۔ اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دُنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آبا و اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انھیں اپنی خدمت کے لیے چُن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے

چاند کو بھی انھوں نے هٰذَا رَبِّيْ کہہ کر اس کی پرستش کی۔

۵۶ - یعنی جس شرک میں تم لوگ مُبتلا ہو، اگر کہیں وہ بھی اسی میں مُبتلا ہوئے ہوتے تو یہ مرتبے ہرگز نہ پا سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص کامیاب ڈاکا زنی کر کے فاتح کی حیثیت سے دُنیا میں شہرت پا لیتا، یا زر پرستی میں کمال پیدا کر کے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا، یا کسی اور صورت سے دُنیا کے بدکاروں میں نامور بدکار بن جاتا۔ لیکن یہ امامِ ہدایت اور امام المتقین ہونے کا شرَف اور یہ دُنیا بھر کے لیے خیر و صلاح کا سرچشمہ ہونے کا مقام تو کوئی بھی نہ پا سکتا اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتا۔

۵۷ - یہاں انبیا علیہم السلام کو تین چیزیں عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے: ایک کتاب، یعنی اللہ کا ہدایت نامہ۔ دوسرے حُکم، یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم، اور اس کے اُصولوں کو معاملاتِ زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیّت، اور مسائلِ حیات

وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ
اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ ۱۰ ع ۸ ۱۲
حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى

کچھ اَور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں[۵۸]۔ اے محمدؐ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، اُنھی کے راستے پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے۔ ع

ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے[۵۹]۔ ان سے پوچھو: پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور

میں فیصلہ کُن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت۔ تیسرے نبوت، یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں۔

۵۸ – مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر و مشرک لوگ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کر دیں، ہم نے اہلِ ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا ہے جو اس نعمت کی قدر کرنے والا ہے۔

۵۹ – پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کی جوابی تقریر سے صاف مُتَرَشّح ہوتا ہے کہ یہ قول یہودیوں کا تھا۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نبی ہوں اور مجھ پر کتاب نازل ہوئی ہے، اس لیے قدرتی طور پر کفّارِ قریش اور دوسرے مشرکینِ عرب اس دعوے کی تحقیق کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف رُجوع کرتے تھے اور ان سے پُوچھتے تھے کہ تم بھی اہلِ کتاب ہو، پیغمبروں کو مانتے ہو، بتاؤ کیا واقعی اس شخص پر اللہ کا کلام نازل ہوا ہے؟ پھر جو کچھ جواب وہ دیتے، اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سرگرم مخالفین جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو برگشتہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو، جسے مخالفینِ اسلام نے حجت بنا رکھا تھا، نقل کر کے اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک یہودی جو خود توراۃ کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچّی باتوں کو ردّ کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس کی اپنی مسلّمہ صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کو ردّ کرنے پر تُلے ہوئے تھے اور اپنی مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے

لِلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ

ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھُپا جاتے ہو، اور جس کے ذریعے سے تم کو وہ علم دیا گیا جو نہ تمھیں حاصل تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو، آخر اُس کا نازل کرنے والا کون تھا؟[۶۰] ــــــ بس اتنا کہہ دو کہ اللہ، پھر اُنھیں اپنی دلیل بازیوں سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دو۔ (اُسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے سے تم بستیوں کے اِس مرکز (یعنی مکّہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبّہ کرو۔

تھے کہ حضوؐر کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود رسالت ہی کی تردید کر گزرتے تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب یہ کہا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت کا اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر علمِ حق اور ہدایت نامۂ زندگی نازل نہیں کیا ہے، وہ یا تو بشر پر نُزولِ وحی کو ناممکن سمجھتا ہے اور یہ خدا کی قدرت کا غلط اندازہ ہے، یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرُّف کے اختیارات تو دے دیے مگر اس کی صحیح رہنمائی کا کوئی انتظام نہ کیا، بلکہ اسے دنیا میں اندھا دُھند کام کرنے کے لیے یونہی چھوڑ دیا، اور یہ خدا کی حکمت کا غلط اندازہ ہے۔

۶۰ – یہ جواب چونکہ یہودیوں کو دیا جا رہا ہے اس لیے موسٰی علیہ السلام پر تورات کے نزول کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ خود اس کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ تسلیم کرنا کہ حضرت موسٰیؑ پر تورات نازل ہوئی تھی، ان کے اس قول کی آپ سے آپ تردید کر دیتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ نیز اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ
اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں، وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں[۶۱]۔ اور اُس شخص سے بڑا ظالم اَور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھا دوں گا؟ کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکراتِ موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے

---

۶۱ – پہلی دلیل اس بات کے ثبوت میں تھی کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور عملاً ہُوا بھی ہے۔ اب یہ دوسری دلیل اس بات کے ثبوت میں ہے کہ یہ کلام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اُصول پیش کیے گئے ہیں۔ عقائدِ صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاقِ فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے، اور پھر یہ جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فحش اور دوسری اُن بُرائیوں سے، جن کا انبار تم لوگوں نے کُتُبِ مُقدّسہ کے مجموعے میں بھر رکھا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے، یہ کتاب اُن سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اُسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو اُن میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اُسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نُزول کا مقصد رہا ہے، یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجامِ بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا ہے جن کی نظر حیاتِ دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رُونما ہوا ہے، اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ

بَاسِطُوٓا اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ اَخۡرِجُوٓا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ
الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَقِّ وَكُنۡتُمۡ عَنۡ
اٰيٰتِهٖ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰكُمۡ وَرَآءَ ظُهُوۡرِكُمۡ ۚ وَمَا نَرٰى
مَعَكُمۡ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ اَنَّهُمۡ فِيۡكُمۡ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدۡ
تَّقَطَّعَ بَيۡنَكُمۡ وَضَلَّ عَنۡكُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ع اِنَّ اللّٰهَ
فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَمُخۡرِجُ

ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ”لاؤ، نکالو اپنی جان، آج تمھیں اُن باتوں کی پاداش میں ذِلّت کا عذاب دیا جائے گا جو تم اللہ پر تہمت رکھ کر ناحق بکا کرتے تھے اور اُس کی آیات کے مقابلے میں سرکشی دکھاتے تھے۔“ (اور اللہ فرمائے گا:) ”لو اب تم ویسے ہی تنِ تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمھیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا، جو کچھ ہم نے تمھیں دُنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور اب ہم تمھارے ساتھ تمھارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلّق تم سمجھتے تھے کہ تمھارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصّہ ہے، تمھارے آپس کے سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زُعم رکھتے تھے۔“ ع

دانے اور گُٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔[۶۲] وہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو

انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ کیا یہ خصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہو سکتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان نے گھڑ لیا ہو، جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی انتہائی مجرمانہ جسارت تک کر گزرے؟

[۶۲] یعنی زمین کی تہوں میں بیج کو پھاڑ کر اس سے درخت کی کونپل نکالنے والا۔

الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ
الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ
لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

زندہ سے خارج کرتا ہے۔[۶۳] یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کر کے وہی صبح نکالتا ہے۔ اُسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اُسی نے چاند اور سُورج کے طُلوع وغروب کا حساب مقرّر کیا ہے۔ یہ سب اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔[۶۴] اور وہی ہے جس نے ایک مُتنفِّس سے تم کو پیدا کیا،[۶۵] پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بُوجھ رکھتے ہیں۔[۶۶]

---

۶۳ – زندہ کو مُردہ سے نکالنے کا مطلب بے جان مادے سے زندہ مخلوقات کو پیدا کرنا ہے، اور مُردہ کو زندہ سے خارج کرنے کا مطلب جان دار اجسام میں سے بے جان مادّوں کو خارج کرنا ہے۔

۶۴ – یعنی اِس حقیقت کی نشانیاں کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی دوسرا نہ خدائی کی صفات رکھتا ہے، نہ خدائی کے اختیارات میں حصّہ دار ہے، اور نہ خدائی کے حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے۔ مگر ان نشانیوں اور علامتوں سے حقیقت تک پہنچنا جاہلوں کے بس کی بات نہیں، اس دولت سے بہرہ ور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو علمی طریق پر آثارِ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ
كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا
مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ
مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹) وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیے جو بوجھ کے مارے جُھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دُوسرے سے ملتے جُلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خُصوصیّات جُدا جُدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ اِس پر بھی لوگوں نے جِنّوں کو اللہ کا شریک ٹھیرا دیا،[۶۷]

---

۶۵ – یعنی نسلِ انسانی کی ابتدا ایک متنفّس سے کی۔

۶۶ – یعنی نوعِ انسانی کی تخلیق، اور اس کے اندر مرد و زن کی تفریق، اور تناسُل کے ذریعے سے اس کی افزائش، اور رحمِ مادر میں انسانی بچّے کا نُطفہ قرار پا جانے کے بعد سے زمین میں اس کے سونپے جانے تک اس کی زندگی کے مختلف اطوار پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بے شمار کُھلی کُھلی نشانیاں آدمی کے سامنے آئیں گی جن سے وہ اُس حقیقت کو پہچان سکتا ہے جو اُوپر بیان ہوئی ہے۔ مگر ان نشانیوں سے یہ معرفت حاصل کرنا انھی لوگوں کا کام ہے جو سمجھ بُوجھ سے کام لیں۔ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے والے، جو صرف اپنی خواہشات سے اور انھیں پُورا کرنے کی تدبیروں ہی سے غرض رکھتے ہیں، اِن نشانیوں میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

۶۷ – یعنی اپنے وہم و گمان سے یہ ٹھیرا لیا کہ کائنات کے انتظام میں اور انسان کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں اللہ کے ساتھ دُوسری پوشیدہ ہستیاں بھی شریک ہیں، کوئی بارش کا دیوتا ہے تو کوئی روئیدگی کا، کوئی دولت کی دیوی

وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يَصِفُوْنَ ۧ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ ع ۱۲ ۱۸
وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ
فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ
وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾ قَدْ جَآءَكُمْ
بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ

حالانکہ وہ اُن کا خالق ہے، اور بے جانے بُوجھے اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں،[۶۸] حالانکہ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ ع وہ تو آسمانوں اور زمین کا مُوجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ کوئی اس کی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمھارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔

دیکھو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اُٹھائے گا، میں

ہے تو کوئی بیماری کی، وغیر ذالك مِن الخرافات۔ اِس قسم کے لَغو اعتقادات دُنیا کی تمام مشرک قوموں میں ارواح اور شیاطین اور راکشسوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلق پائے جاتے رہے ہیں۔

[۶۸] جُہلائے عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اِسی طرح دُنیا کی دُوسری مشرک قوموں نے بھی خدا سے سلسلۂ نسب چلایا ہے اور پھر دیوتاؤں اور دیویوں کی ایک پُوری نسل اپنے وہم سے پیدا کر دی ہے۔

مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ
وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ

تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں[۶۹]۔

اِس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں، تم کسی سے پڑھ آئے ہو، اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کر دیں[۷۰]۔ اَے محمدؐ! اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے،

---

[۶۹] یہ فقرہ اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہے مگر نبیؐ کی طرف سے ادا ہو رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں جس طرح مُخاطَب بار بار بدلتے ہیں کہ کبھی نبیؐ سے خطاب ہوتا ہے، کبھی اہلِ ایمان سے، کبھی اہلِ کتاب سے، کبھی کُفّار و مُشرکین سے، کبھی قریش کے لوگوں سے، کبھی اہلِ عرب سے اور کبھی عام انسانوں سے، حالانکہ اصل غرض پوری نوعِ انسانی کی ہدایت ہے، اسی طرح مُتکلّم بھی بار بار بدلتے ہیں کہ کہیں متکلّم خدا ہوتا ہے، کہیں وحی لانے والا فرشتہ، کہیں فرشتوں کا گروہ، کہیں نبیؐ، اور کہیں اہلِ ایمان، حالانکہ ان سب صُورتوں میں کلام وہی ایک خدا کا کلام ہوتا ہے۔

”مَیں تم پر پاسباں نہیں ہوں“ یعنی میرا کام بس اتنا ہی ہے کہ اس روشنی کو تمھارے سامنے پیش کر دوں۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمھارا اپنا کام ہے۔ میرے سُپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنھوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انھیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔

[۷۰] یہ وہی بات ہے جو سُورۂ بَقرہ رُکوع ۳ میں فرمائی گئی ہے کہ مچھّر اور مکڑی وغیرہ چیزوں کی تمثیلیں سُن کر حق کے طالب تو اس صداقت کو پا لیتے ہیں جو ان تمثیلوں کے پیرایے میں بیان ہوئی ہے، مگر جن پر انکار کا تعصّب مسلّط ہے، وہ طنز سے کہتے ہیں کہ بھلا اللہ کے کلام میں ان حقیر چیزوں کے ذکر کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اُسی مضمون کو یہاں ایک دُوسرے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ یہ کلام لوگوں کے لیے آزمایش بن گیا ہے، جس سے کھوٹے اور کھرے انسان ممیّز ہو جاتے ہیں۔ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو اس کلام کو سُن کر یا پڑھ کر اس کے مقصد و مدّعا پر غور کرتے ہیں اور جو حکمت و نصیحت کی باتیں اس میں فرمائی گئی ہیں ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک دوسری طرح کے انسانوں کا حال یہ ہے کہ اسے سُننے اور پڑھنے کے بعد ان کا ذہن مغزِ کلام کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اس ٹٹول میں لگ جاتا ہے کہ آخر یہ اُمّی انسان یہ مضامین لایا کہاں سے ہے، اور چونکہ مخالفانہ تعصّب پہلے سے ان کے دل پر قبضہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس لیے ایک خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صُورتیں وہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں اور انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کر لی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ

کیونکہ اُس ایک رب کے سوا کوئی اَور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیّت ہوتی تو (وہ خود ایسا بندوبست کر سکتا تھا کہ) یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔[۷۱] اور (اے ایمان لانے والو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پُکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔[۷۲] ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوش نما

---

[۷۱] – مطلب یہ ہے کہ تمھیں داعی اور مبلّغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمھارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اِس روشنی کو پیش کرو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمھاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمھارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انھیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اُس کی آزمایش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمھارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمھیں دکھا دی گئی ہے اُس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دُوسروں کو اُس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انھیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو، خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصِر ہیں، اس کی طرف جانے کے لیے انھیں چھوڑ دو۔

عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ
لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا
جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ

بنا دیا ہے،[۷۳] پھر انھیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی[۷۴] ہمارے سامنے آجائے تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے محمدؐ! ان سے کہو کہ ”نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں[۷۵]۔“ اور تمھیں کیسے سمجھایا جائے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں تو یہ ایمان لانے والے نہیں[۷۶]۔ ہم اُسی طرح ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر رہے ہیں جس طرح یہ

---

[۷۲] یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبُودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دُور پھینک دے گی۔

[۷۳] یہاں پھر اُس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے جس کی طرف اس سے پہلے بھی ہم اپنے حواشی میں اشارہ کر چکے ہیں کہ جو اُمور قوانینِ فطرت کے تحت رُونما ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنا فعل قرار دیتا ہے، کیونکہ وہی ان قوانین کا مقرر کرنے والا ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت رُونما ہوتا ہے وہ اسی کے امر سے رُونما ہوتا ہے۔ جس بات کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا ہے، اسی کو اگر ہم انسان بیان کریں تو اس طرح کہیں گے کہ فطرتاً ایسا ہی ہُوا کرتا ہے۔

[۷۴] نشانی سے مراد کوئی ایسا صریح محسوس معجزہ ہے جسے دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپؐ کے مامور من اللہ ہونے کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

[۷۵] یعنی نشانیوں کے پیش کرنے اور بنا لانے کی قدرت مجھے حاصل نہیں ہے، ان کا اختیار تو اللہ کو ہے، چاہے دکھائے اور نہ چاہے نہ دکھائے۔

[۷۶] یہ خطاب مسلمانوں سے ہے جو بے تاب ہو ہو کر تمنّا کرتے تھے اور کبھی کبھی زبان سے بھی اس خواہش کا

ع ۱۳ ۱۹

يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا
عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا
شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے تھے[۷۶]۔ ہم انھیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑے دیتے ہیں[۷۷]۔ اگر ہم فرشتے بھی ان پر نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے، اِلّا یہ کہ مشیّتِ الٰہی یہی ہو کہ وہ ایمان لائیں[۷۸]، مگر اکثر لوگ نادانی کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جِنّوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے، جو ایک دُوسرے پر خوش آیند

اظہار کر دیتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے اُن کے گمراہ بھائی راہِ راست پر آ جائیں۔ ان کی اسی تمنا اور خواہش کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ آخر تمھیں کس طرح سمجھایا جائے کہ ان لوگوں کا ایمان لانا کسی نشانی کے ظہور پر موقوف نہیں ہے۔

۷۷- یعنی ان کے اندر وہی ذہنیّت کام کیے جا رہی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پہلی مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سُن کر اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر میں ابھی تک کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا ہے۔ وہی عقل کا پھیر اور نظر کا بھینگا پن جو انھیں اُس وقت صحیح سمجھنے اور صحیح دیکھنے سے روک رہا تھا، آج بھی ان پر اسی طرح مُسلّط ہے۔

۷۸- یعنی یہ لوگ اپنے اختیار و انتخاب سے تو حق کو باطل کے مقابلے میں ترجیح دے کر قبول کرنے والے ہیں نہیں۔ اب اِن کے حق پرست بننے کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے اور وہ یہ کہ عملِ تخلیق وتکوین سے جس طرح تمام بے اختیار مخلوقات کو حق پرست پیدا کیا گیا ہے اسی طرح انھیں بھی بے اختیار کر کے جِبلّی و پیدائشی حق پرست بنا ڈالا جائے۔ مگر یہ اُس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا تمھارا یہ توقع کرنا فضول ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنی تکوینی مداخلت سے ان کو مومن بنائے گا۔

زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ
وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصۡغٰۤى اِلَيۡهِ اَفۡـِٕدَةُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ

باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر اِلقا کرتے رہتے ہیں۔[۷۹] اگر تمھارے رب کی مشیّت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔[۸۰] پس تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔ (یہ سب کچھ ہم انھیں اسی لیے کرنے دے رہے ہیں کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے

---

۷۹ – یعنی آج اگر شیاطینِ جنّ واِنس متفق ہو کر تمھارے مقابلے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو تمھارے ہی ساتھ پیش آ رہی ہو۔ ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیغمبر دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے لیے اُٹھا تو تمام شیطانی قوتیں اس کے مشن کو ناکام کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔

’’خوش آیند باتوں‘‘ سے مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک وشبہات واعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعیِ حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں۔ پھر ان سب باتوں کو بحیثیتِ مجموعی دھوکے اور فریب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفینِ حق استعمال کرتے ہیں، وہ نہ صرف دُوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

۸۰ – یہاں ہماری سابق تشریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہیے کہ قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی مَشِیّت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے، جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعُموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیّت اور اس کے اذن کے تحت رُونما ہونا لازمی طور پر یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دُنیا میں کوئی واقعہ کبھی صُدُور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صُدُور کا اذن نہ دے اور اپنی عظیم الشان اسکیم میں اس کے صُدُور کی گنجایش نہ نکالے اور اسباب کو اس حد تک مساعد نہ کر دے کہ وہ واقعہ صادر ہو سکے۔ کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم ومفسد کا ظلم وفساد اور کسی کافر ومشرک کا کفر وشرک اللہ کی مشیّت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح کسی مومن اور کسی مُتّقی انسان کا ایمان وتقویٰ بھی مشیّتِ الٰہی کے بغیر محال ہے۔ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر مَشِیّت کے تحت رُونما ہوتے ہیں۔ مگر پہلی قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے اور اس کے برعکس دُوسری قسم کے واقعات کو اُس کی رضا اور اس کی پسندیدگی ومحبوبیت کی سند حاصل ہے۔ اگرچہ آخرِ کار کسی خیرِ عظیم ہی کے لیے فرمانروائے کائنات کی مشیّت کام کر رہی ہے، لیکن اُس خیرِ عظیم کے ظُہور کا راستہ نُور وظلمت، خیر وشر اور صلاح وفساد کی مختلف قوتوں کے ایک دُوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہونے ہی سے صاف ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی بزرگ تر مَصلَحتوں کی بنا پر وہ طاعت

بِالۡاٰخِرَةِ وَلِيَرۡضَوۡهُ وَلِيَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾
اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ

اُن کے دل اِس (خوشنما دھوکے) کی طرف مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور اُن بُرائیوں کا اِکتساب کریں جن کا اِکتساب وہ کرنا چاہتے ہیں ـــــ پھر جب حال یہ ہے تو کیا مَیں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پُوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف

اور معصیت، ابراہیمیّت اور نمرُودیّت، مُوسویّت اور فرعونیّت، آدمیّت اور شیطنت، دونوں کو اپنا اپنا کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اس نے اپنی ذی اختیار مخلوق (جن اور انسان) کو خیر اور شر میں سے کسی ایک کے انتخاب کر لینے کی آزادی عطا کر دی ہے۔ جو چاہے اِس کارگاہِ عالَم میں اپنے لیے خیر کا کام پسند کر لے اور جو چاہے شر کا کام۔ دونوں قسم کے کارکنوں کو، جس حد تک خدائی مَصلحتیں اجازت دیتی ہیں، اسباب کی تائید نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور اس کی پسندیدگی صرف خیر ہی کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہے اور اللہ کو محبوب یہی بات ہے کہ اس کے بندے اپنی آزادیِ انتخاب سے فائدہ اُٹھا کر خیر کو اختیار کریں نہ کہ شر کو۔

اس کے ساتھ یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ دُشمنانِ حق کی مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیّت کا بار بار حوالہ دیتا ہے، اس سے مقصود دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپؐ کے ذریعے سے اہلِ ایمان کو، یہ سمجھانا ہے کہ تمھارے کام کی نوعیّت فرشتوں کے کام کی سی نہیں ہے جو کسی مزاحمت کے بغیر احکامِ الٰہی کی تعمیل کر رہے ہیں۔ بلکہ تمھارا اصل کام شریروں اور باغیوں کے مقابلے میں اللہ کے پسند کردہ طریقے کو غالب کرنے کے لیے جِدّوجُہد کرنا ہے۔ اللہ اپنی مشیّت کے تحت اُن لوگوں کو بھی کام کرنے کا موقع دے رہا ہے جنھوں نے اپنی سعی وجُہد کے لیے خود اللہ سے بغاوت کے راستے کو اختیار کیا ہے، اور اسی طرح وہ تم کو بھی، جنھوں نے طاعت و بندگی کے راستے کو اختیار کیا ہے، کام کرنے کا پورا موقع دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی رضا اور ہدایت و رہنمائی اور تائید ونصرت تمھارے ہی ساتھ ہے، کیونکہ تم اُس پہلو میں کام کر رہے ہو جسے وہ پسند کرتا ہے، لیکن تمھیں یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اُن لوگوں کو ایمان لانے پر مجبُور کر دے گا جو ایمان نہیں لانا چاہتے، یا ان شیاطینِ جنّ واِنس کو زبردستی تمھارے راستے سے ہٹا دے گا جنھوں نے اپنے دل و دماغ کو اور دست و پا کی قوتوں کو اور اپنے وسائل و ذرائع کو حق کی راہ روکنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں، اگر تم نے واقعی حق اور نیکی اور صداقت کے لیے کام کرنے کا عزم کیا ہے تو تمھیں باطل پرستوں کے مقابلے میں سخت کش مکش اور جِدّوجُہد کر کے اپنی حق پرستی کا ثبوت دینا ہو گا۔ ورنہ معجزوں کے زور سے باطل کو مٹانا اور حق کو غالب کرنا ہوتا تو تمھاری ضرورت ہی کیا تھی، اللہ خود ایسا انتظام کر سکتا تھا کہ دنیا میں کوئی شیطان نہ ہوتا اور کسی شرک و کفر کے ظُہور کا امکان نہ ہوتا۔

مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ
رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

کتاب نازل کردی ہے[۸۱]؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمھارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔[۸۲] تمھارے رب کی بات سچّائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔

اور اے محمدؐ! اگر تم اُن لوگوں کی اکثریّت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔[۸۳]

۸۱- اس فقرے میں متکلّم نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خطاب مسلمانوں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے اپنی کتاب میں صاف صاف یہ تمام حقیقتیں بیان کر دی ہیں اور یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ فوق الفطری مداخلت کے بغیر حق پرستوں کو فطری طریقوں ہی سے غلبۂ حق کی جِدّوجُہد کرنی ہوگی، تو کیا اب مَیں اللہ کے سوا کوئی اور ایسا صاحبِ امر تلاش کروں جو اللہ کے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور ایسا کوئی معجزہ بھیجے جس سے یہ لوگ ایمان لانے پر مجبُور ہو جائیں؟

۸۲- یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو واقعات کی توجیہ میں آج گھڑی گئی ہو۔ تمام وہ لوگ جو کُتُبِ آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنھیں انبیا علیہم السلام کے مِشن سے واقفیت حاصل ہے، اس بات کی شہادت دیں گے کہ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے ٹھیک ٹھیک امرِ حق ہے اور وہ اَزَلی و اَبَدی حقیقت ہے جس میں کبھی فرق نہیں آیا ہے۔

۸۳- یعنی بیشتر لوگ جو دنیا میں بستے ہیں، علم کے بجائے قیاس و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور ان کے عقائد، تخیُّلات، فلسفے، اُصُولِ زندگی اور قوانینِ عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کا راستہ، یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے، لازماً صرف وہی ایک ہے جس کا علم اللہ نے خود دیا ہے، نہ کہ وہ جس کو

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَن يَضِلُّ عَن سَبِيلِهِۦ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ
بِٱلْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾ فَكُلُوا۟ مِمَّا ذُكِرَ ٱسْمُ ٱللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِـَٔايَٰتِهِۦ
مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا۟ مِمَّا ذُكِرَ ٱسْمُ ٱللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ
فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا ٱضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ

درحقیقت تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کے راستے سے ہٹا ہُوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

پھر اگر تم لوگ اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو تو جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اُس کا گوشت کھاؤ۔[۸۴] آخر کیا وجہ ہے کہ تم وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے، اُن کی تفصیل وہ تمھیں بتا چکا ہے۔[۸۵]

لوگوں نے بطورِ خود اپنے قیاسات سے تجویز کر لیا ہے۔ لہٰذا کسی طالبِ حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دُنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں، بلکہ اسے پُوری ثابت قدمی کے ساتھ اُس راہ پر چلنا چاہیے جو اللہ نے بتائی ہے، چاہے اس راستے پر چلنے کے لیے وہ دُنیا میں اکیلا ہی رہ جائے۔

۸۴ – مِن جملہ ان غلط طریقوں کے جو اکثر اہلِ زمین نے بطورِ خود قیاس و گمان سے تجویز کر لیے اور جنھیں مذہبی حُدُود و قُیُود کی حیثیت حاصل ہو گئی، ایک وہ پابندیاں بھی ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں میں مختلف قوموں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ بعض چیزوں کو لوگوں نے آپ ہی آپ حلال قرار دے لیا ہے، حالانکہ اللہ کی نظر میں وہ حرام ہیں۔ اور بعض چیزوں کو انھوں نے خود حرام ٹھیرا لیا ہے، حالانکہ اللہ نے انھیں حلال کیا ہے۔ خُصُوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ جاہلانہ بات جس پر پہلے بھی بعض گروہ مُصِر تھے اور آج بھی دُنیا کے بعض گروہ مُصِر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ کا نام لے کر جو جانور ذبح کیا جائے وہ تو ان کے نزدیک ناجائز ہے اور اللہ کے نام کے بغیر جسے ذبح کیا جائے وہ بالکل جائز ہے۔ اسی کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہاں مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کے احکام کو مانتے ہو تو اُن تمام اَوہام اور تعصّبات کو چھوڑ دو جو کفّار و مشرکین میں پائے جاتے ہیں، اُن سب پابندیوں کو توڑ دو جو خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر لوگوں نے خود عائد کر رکھی ہیں، حرام صرف اسی چیز کو سمجھو جسے خدا نے حرام کیا ہے اور حلال اسی کو ٹھیراؤ جس کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔

۸۵ – مُلاحظہ ہو سورۂ نحل، آیت ۱۱۵۔ اس اشارے سے ضمناً یہ بھی متحقق ہُوا کہ سورۂ نحل اس سُورہ سے پہلے نازل

وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ
اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا
يَقْتَرِفُوْنَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ
لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿١٢١﴾ ع ١٣ ١١ ١

بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر محض اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کُن باتیں کرتے ہیں، ان حد سے گزرنے والوں کو تمھارا رب خوب جانتا ہے۔ تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھُپے گناہوں سے بھی، جو لوگ گناہ کا اکتساب کرتے ہیں وہ اپنی اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔ اور جس جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس کا گوشت نہ کھاؤ، ایسا کرنا فسق ہے۔ شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات اِلقا کرتے ہیں تا کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔[٨٦] لیکن اگر تم نے اُن کی اطاعت قبول کر لی تو یقیناً تم مشرک ہو۔[٨٧] ع

ہو چکی تھی۔

٨٦- حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ علمائے یہود جُہلائے عرب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے لیے جو سوالات سکھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ”آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام ہو اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو جائے۔“ یہ ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اس ٹیڑھی ذہنیت کا جو ان نام نہاد اہلِ کتاب میں پائی جاتی تھی۔ وہ اس قسم کے سوالات گھڑ گھڑ کر پیش کرتے تھے تا کہ عوام کے دلوں میں شُبہات ڈالیں اور انھیں حق سے لڑنے کے لیے ہتھیار فراہم کر کے دیں۔

٨٧- یعنی ایک طرف اللہ کی خداوندی کا اقرار کرنا اور دوسری طرف اللہ سے پھرے ہوئے لوگوں کے احکام پر چلنا اور ان کے مقرر کیے ہوئے طریقوں کی پابندی کرنا، شرک ہے۔ توحید یہ ہے کہ زندگی سراسر اللہ کی اطاعت میں بسر ہو۔ اللہ کے ساتھ اگر دُوسروں کو اعتقاداً مستقل بالذّات مُطاع مان لیا جائے تو یہ اعتقادی شرک ہے، اور اگر عملاً ایسے

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي
النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا

کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی[۸۸] اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہُوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟[۸۹] کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نُما بنا دیے گئے ہیں،[۹۰] اور اسی طرح ہم نے

لوگوں کی اطاعت کی جائے جو اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود امر و نہی کے مختار بن گئے ہوں تو یہ عملی شرک ہے۔

۸۸۔ یہاں موت سے مُراد جَہالت و بے شُعوری کی حالت ہے، اور زندگی سے مُراد علم و اِدراک اور حقیقت شناسی کی حالت۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہِ راست کیا ہے، وہ طبیعیات کے نقطۂ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسّر نہیں ہے۔ وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شُعور حاصل ہے۔

۸۹۔ یعنی تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ جس انسان کو انسانیت کا شُعور نصیب ہو چکا ہے اور جو علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو صاف دیکھ رہا ہے، وہ اُن بے شُعور لوگوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرے گا جو نادانی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

۹۰۔ یعنی جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں، جنھیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں ہی پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر انھیں تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھُول نظر آتے ہیں۔ انھیں ہر بدکاری میں مزا آتا ہے، ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے ہیں، اور ہر فساد انگیز تجَربے کے بعد اُس سے بڑھ کر دُوسرے فساد انگیز تجرِبے کے لیے وہ اِس اُمّید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دَہکتے ہوئے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعلِ بدخشاں ہاتھ آ جائے گا۔

فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا
يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ
اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ
اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا
يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ
لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا
حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ

وقف منزل
وقف لازم

ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ دراصل وہ اپنے فریب کے جال میں آپ پھنستے ہیں، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ”ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسُولوں کو دی گئی ہے۔[91]“ اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغامبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔ قریب ہے وہ وقت جب یہ مجرم اپنی مکّاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں ذلّت اور سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا اِرادہ کرتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے[92]، اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اُس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اِسلام کا تصوّر کرتے ہی) اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اِس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی اُن

۹۱- یعنی ہم رسُولوں کے اِس بیان پر ایمان نہیں لائیں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آیا اور خدا کا پیغام لایا، بلکہ ہم صرف اسی وقت ایمان لا سکتے ہیں جب کہ فرشتہ خود ہمارے پاس آئے اور براہِ راست ہم سے کہے

عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ
اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا

لوگوں پر مسلّط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے، حالانکہ یہ راستہ تمھارے رب کا سیدھا راستہ ہے اور اس کے نشانات اُن لوگوں کے لیے واضح کر دیے گئے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس سلامتی کا گھر[93] ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے، اُس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا۔

جس روز اللہ ان سب لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا، اس روز وہ جِنّوں[94] سے خطاب کر کے فرمائے گا کہ ”اے گروہِ جن! تم نے تو نوعِ انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا“۔ انسانوں میں سے جو اُن کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے: ”پروردگار! ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے کو خوب استعمال کیا ہے،[95] اور اب ہم اُس وقت پر آ پہنچے ہیں جو تُو نے ہمارے لیے مقرر کر دیا تھا“۔ اللہ فرمائے گا: ”اچھا اب آگ تمھارا ٹھکانا ہے، اس میں تم ہمیشہ رہو گے“۔ اُس سے بچیں گے صرف وہی

کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔

۹۲- سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پُوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردُّد کو دُور کر دینا ہے۔

۹۳- ”سلامتی کا گھر“ یعنی جنّت جہاں انسان ہر آفت سے محفوظ اور ہر خرابی سے مامون ہو گا۔

۹۴- یہاں جِنّوں سے مُراد شیاطینِ جن ہیں۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ
بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ع ﴿۱۲۹﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ ۱۵ ع ۸ ۲
وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا
وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ

جنھیں اللہ بچانا چاہے گا، بے شک تمھارا رب دانا اور علیم[96] ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دُوسرے کا ساتھی بنائیں گے اُس کمائی کی وجہ سے جو وہ (دُنیا میں ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر) کرتے تھے[97] ع (اس موقع پر اللہ ان سے یہ بھی پوچھے گا کہ) ”اے گروہِ جن و اِنس! کیا تمھارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اِس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں، ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں[98]۔“ آج دُنیا کی زندگی نے اِن لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، مگر اُس وقت وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ

۹۵- یعنی ہم میں سے ہر ایک نے دُوسرے سے ناجائز فائدے اُٹھائے ہیں، ہر ایک دُوسرے کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی خواہشات پوری کرتا رہا ہے۔

۹۶- یعنی اگرچہ اللہ کو اختیار ہے کہ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، مگر یہ سزا اور معافی بلاوجہِ معقول، مجرّد خواہش کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگی۔ خدا معاف اسی مجرم کو کرے گا جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ خود اپنے جُرم کا ذمہ دار نہیں ہے اور جس کے متعلق اس کی حکمت یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے سزا نہ دی جانی چاہیے۔

۹۷- یعنی جس طرح وہ دنیا میں گناہ سمیٹنے اور بُرائیوں کا اکتساب کرنے میں ایک دُوسرے کے شریک تھے، اسی طرح آخرت کی سزا پانے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوں گے۔

۹۸- یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسُول پر رسُول آتے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ ہمارا اپنا قصور تھا کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی۔

كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ
وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ
بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ

کافر تھے۔[۹۹] (یہ شہادت اُن سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمھارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔[۱۰۰]

ہر شخص کا درجہ اُس کے عمل کے لحاظ سے ہے اور تمھارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ تمھارا رب بے نیاز ہے اور مہربانی اس کا شیوہ ہے۔[۱۰۱] اگر وہ چاہے تو

---

[۹۹] یعنی بے خبر اور ناواقف نہ تھے بلکہ کافر تھے۔ وہ خود تسلیم کریں گے کہ حق ہم تک پہنچا تھا مگر ہم نے خود اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

[۱۰۰] یعنی اللہ اپنے بندوں کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ اس کے مقابلے میں یہ احتجاج کر سکیں کہ آپ نے ہمیں حقیقت سے تو آگاہ کیا نہیں، اور نہ ہم کو صحیح راستہ بتانے کا کوئی انتظام فرمایا، مگر جب ناواقفیت کی بنا پر ہم غلط راہ پر چل پڑے تو اب آپ ہمیں پکڑتے ہیں۔ اِسی حجت کو قطع کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں، تاکہ جِنّ و اِنس کو صاف صاف خبردار کر دیا جائے۔ اب اگر لوگ غلط راستوں پر چلتے ہیں اور اللہ ان کو سزا دیتا ہے تو اس کا الزام خود ان پر ہے نہ کہ اللہ پر۔

[۱۰۱] ”تمھارا رب بے نیاز ہے“ یعنی اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی نہیں ہے، اس کا کوئی مفاد تم سے وابستہ نہیں ہے کہ تمھاری نافرمانی سے اس کا کچھ بگڑ جاتا ہو، یا تمھاری فرماں برداری سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ جاتا ہو۔ تم سب مل کر سخت نافرمان بن جاؤ تو اس کی بادشاہی میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے، اور سب کے سب مل کر اس کے مطیع فرمان اور عبادت گزار بن جاؤ تو اس کے ملک میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تمھاری سلامیوں کا محتاج ہے اور نہ تمھاری نذر و نیاز کا۔ اپنے بے شمار خزانے تم پر لُٹا رہا ہے بغیر اس کے کہ ان کے بدلے میں اپنے لیے تم سے کچھ چاہے۔

”مہربانی اس کا شیوہ ہے۔“ یہاں موقع و محل کے لحاظ سے اس فقرے کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ تمھارا رب تم کو راہِ راست پر چلنے کی جو تلقین کرتا ہے اور حقیقتِ نفس الامری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے جو منع کرتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ راست روی میں تمھارا اپنا فائدہ اور غلط روی میں تمھارا اپنا نقصان ہے۔ لہٰذا یہ سراسر

يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؕ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

تم لوگوں کو لے جائے اور تمھاری جگہ دوسرے جن لوگوں کو چاہے لے آئے، جس طرح اُس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اُٹھایا ہے۔ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ یقیناً آنے والی ہے[۱۰۲] اور تم خدا کو عاجز کر دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور مَیں بھی اپنی جگہ عمل کر رہا ہوں[۱۰۳]، عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ انجامِ کار کس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمھیں اُس صحیح طرزِ عمل کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکتے ہو، اور اس غلط طرزِ عمل سے روکتا ہے جس کی بدولت تم پست مراتب کی طرف تنزّل کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمھارا رب سخت گیر نہیں ہے، تم کو سزا دینے میں اُسے کوئی لُطف نہیں آتا ہے، وہ تمھیں پکڑنے اور مارنے پر تُلا ہُوا نہیں ہے کہ ذرا تم سے قصور سرزد ہو اور وہ تمھاری خبر لے ڈالے۔ درحقیقت وہ اپنی تمام مخلوقات پر نہایت مہربان ہے، غایت درجے کے رحم و کرم کے ساتھ خدائی کر رہا ہے، اور یہی اس کا معاملہ انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اسی لیے وہ تمھارے قصور پر قُصور معاف کرتا چلا جاتا ہے۔ تم نافرمانیاں کرتے ہو، گناہ کرتے ہو، جرائم کا ارتکاب کرتے ہو، اس کے رزق سے پَل کر بھی اس کے احکام سے منہ موڑتے ہو، مگر وہ حلم اور عفو ہی سے کام لیے جاتا ہے اور تمھیں سنبھلنے اور سمجھنے اور اپنی اصلاح کر لینے کے لیے مُہلت پر مُہلت دیے جاتا ہے۔ ورنہ اگر وہ سخت گیر ہوتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تمھیں دنیا سے رخصت کر دیتا اور تمھاری جگہ کسی دُوسری قوم کو اُٹھا کھڑا کرتا، یا سارے انسانوں کو ختم کر کے کوئی اور مخلوق پیدا کر دیتا۔

۱۰۲- یعنی قیامت، جس کے بعد تمام اگلے پچھلے انسان از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے سامنے آخری فیصلے کے لیے پیش ہوں گے۔

۱۰۳- یعنی اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے اور اپنی غلط روی سے باز نہیں آتے تو جس راہ پر تم چل رہے ہو چلے جاؤ، اور مجھے اپنی راہ چلنے کے لیے چھوڑ دو، انجامِ کار جو کچھ ہو گا وہ تمھارے سامنے بھی آ جائے گا اور میرے سامنے بھی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا

اِن لوگوں[۱۰۴] نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصّہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں: یہ اللہ کے لیے ہے، بزَعمِ خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے۔[۱۰۵] پھر جو حصّہ ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو

---

۱۰۴ – اُوپر کا سلسلۂ تقریر اس بات پر تمام ہُوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیّت پر اصرار ہی کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم اپنے طریقے پر عمل کرتے رہو اور مَیں اپنے طریقے پر عمل کروں گا، قیامت ایک دن ضرور آنی ہے، اس وقت تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوتا ہے، بہر حال یہ خوب سمجھ لو کہ وہاں ظالموں کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔ اس کے بعد اب اُس جاہلیّت کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر وہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ تمھارا وہ "ظلم" کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کسی فلاح کی اُمّید نہیں کر سکتے۔

۱۰۵ – اِس بات کے وہ خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اگاتا ہے۔ نیز اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ کا یہ فضل اُن دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جِنّات، اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سَلَف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظرِ کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصّے نکالتے تھے۔ ایک حصّہ اللہ کے نام کا، اس شکریے میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انھیں بخشے۔ اور دُوسرا حصّہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبُودوں کی نذر و نیاز کا، تاکہ اُن کی مہربانیاں ان کے شاملِ حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ان کے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کیے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں، ان میں یہ دُوسروں کی نذر و نیاز کیسی؟ یہ نمک حرامی نہیں تو کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو، جو اس نے سراسر خود اپنے فضل و کرم سے تم پر کیا ہے، دُوسروں کی مداخلت اور ان کے توسُّط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریے کے استحقاق میں انھیں اُس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ پھر اشارتاً دُوسری گرفت اس بات پر بھی فرمائی ہے کہ یہ اللہ کا حصّہ جو انھوں نے مقرر کیا ہے، یہ بھی بزَعمِ خود کر لیا ہے، اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں، آپ ہی جو حصّہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دُوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک و مختار خود اللہ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصّہ اس کے شکریے کے لیے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حق دار ہیں۔ پس درحقیقت اس خود مختارانہ طریقے سے جو حصّہ یہ لوگ اپنے زَعمِ باطل میں خدا

يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[۱۰۶]۔ کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ!

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو

کے لیے نکالتے ہیں اور فقرا و مساکین وغیرہ پر خیرات کرتے ہیں وہ بھی کوئی نیکی نہیں ہے۔ خدا کے ہاں اس کے مقبول ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

۱۰۶- یہ لطیف طنز ہے اُن کی اس حرکت پر کہ وہ خدا کے نام سے جو حصّہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صُورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصّہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انھیں اپنے ان شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلّے یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے، ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گرتا، یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اُسے انھی کے حصّے میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا، اگر اس میں سے پانی اُس حصّے کی طرف پھُوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّے میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صُورت پیش آتی تو خدا کے حصّے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی تو خدا کا حصّہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آ جاتی تو وہ خدا کے حصّے سے پُوری کی جاتی تھی، لیکن خدا کے حصے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصے میں سے ایک حبّہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دل فریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے، اس کے حصے میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ رہے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں، خدا کی طرح غنی نہیں ہیں، اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

اِن توہُّمات کی اصل جڑ کیا تھی، اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جُہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لیے نکالتے تھے، وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صَرف کیا جاتا تھا، اور جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے، وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صُورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پُجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان خود غرض مذہبی

قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ

خوشنما بنا دیا ہے[۱۰۷] تاکہ ان کو ہلاکت میں مُبتلا کریں[۱۰۸] اور ان پر ان کے دین کو مُشتبَہ بنا دیں۔[۱۰۹]

پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصّے میں کمی ہو جائے تو کچھ مضایقہ نہیں، مگر ”خدا کے پیاروں“ کے حصّے میں کمی نہ ہونی چاہیے، بلکہ حتّی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

۱۰۷- یہاں ”شریکوں“ کا لفظ ایک دُوسرے معنٰی میں استعمال ہُوا ہے جو اُوپر کے معنٰی سے مختلف ہے۔ اوپر کی آیت میں جنھیں ”شریک“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا، وہ ان کے معبود تھے جن کی برکت یا سفارش یا توسُّط کو یہ لوگ نعمت کے حُصُول میں مددگار سمجھتے تھے اور شکرِ نعمت کے استحقاق میں انھیں خدا کے ساتھ حصّہ دار بناتے تھے۔ بخلاف اس کے، اس آیت میں ”شریک“ سے مُراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنھوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنا دیا تھا۔ انھیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح بندوں کے لیے قانون بنانے اور جائز و ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حق دار بھی صرف اللہ ہے۔ لہٰذا جس طرح کسی دُوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنٰی ہے، اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حُدُود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنٰی ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں، خواہ اُن کا مرتکب ان ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کیے ہوئے قانون کو واجب الاطاعت مانتا ہے۔

قتلِ اولاد کی تین صُورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں اور قرآن میں تینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(۱) لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے، یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں، یا کسی دُوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

(۲) بچّوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اُٹھایا جا سکے گا اور ذرائعِ مَعاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔

(۳) بچّوں کو اپنے معبُودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

۱۰۸- یہ ہلاکت کا لفظ نہایت معنٰی خیز ہے۔ اِس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگ دلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے اس میں جوہرِ انسانیت تو درکنار، جوہرِ حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اور نوعی و قومی ہلاکت بھی، کہ قتلِ اولاد کا لازمی نتیجہ نسلوں کا گھٹنا اور آبادی کا کم ہونا ہے، جس سے نوعِ انسانی کو بھی نقصان پہنچتا ہے، اور وہ قوم بھی تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے جو اپنے حامیوں اور اپنے تمدّن

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ
عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں۔[۱۱۰]

کہتے ہیں: یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں، انھیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔[۱۱۱] پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے،[۱۱۲] اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے،[۱۱۳] عنقریب اللہ انھیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔

کے کارکنوں اور اپنی میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی، یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں انھیں ختم کر ڈالتی ہے۔ اور اس سے مراد انجامی ہلاکت بھی ہے کہ جو شخص معصوم بچّوں پر یہ ظلم کرتا ہے، اور جو اپنی انسانیّت کو بلکہ اپنی حیوانی فطرت تک کو یوں اُلٹی چھُری سے ذبح کرتا ہے، اور جو نوعِ انسانی کے ساتھ اور خود اپنی قوم کے ساتھ یہ دشمنی کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

۱۰۹ – زمانۂ جاہلیّت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں، وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے سیکھا تھا، اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رُسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے، جنھیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جُز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں، یا تاریخ میں، یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کیا چیزیں کس زمانے میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پُورا دین مُشتبَہ ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہی کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جز ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا، اور نہ یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رُسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔ اِسی صُورتِ حال کی ترجمانی اس فقرے میں کی گئی ہے۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا

اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے، یہ ہمارے مَردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں[112]۔ یہ باتیں جو انھوں نے گھڑ لی ہیں، ان کا بدلہ اللہ انھیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔

یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھیرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے

---

۱۱۰ – یعنی اگر اللہ چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کر سکتے تھے، لیکن چونکہ اللہ کی مشیّت یہی تھی کہ جو شخص جس راہ پر جانا چاہتا ہے اسے جانے کا موقع دیا جائے، اسی لیے یہ سب کچھ ہُوا۔ پس اگر یہ لوگ تمھارے سمجھانے سے نہیں مانتے اور ان افترا پردازیوں ہی پر انھیں اصرار ہے، تو جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دو، ان کے پیچھے پڑنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

۱۱۱ – اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلّق یا بعض کھیتیوں کی پیداوار کے متعلّق منت مان لیتے تھے کہ یہ فُلاں آستانے یا فُلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصُوص ہیں۔ اُس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصّل ضابطہ تھا، جس کی رُو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصُوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہ صرف مشرکانہ افعال میں شمار کرتا ہے، بلکہ اس پہلو پر بھی تنبیہ فرماتا ہے کہ یہ ضابطہ ان کا خود ساختہ ہے۔ یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منّتیں مانتے اور نیازیں کرتے ہیں، اس نے نہ ان منّتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے متعلّق یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ سب کچھ ان خود سر اور باغی بندوں نے اپنے اختیار سے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔

۱۱۲ – روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص منّتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، یا ان کو کھانے کے وقت

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ ۱۶ ع ۱۱ ۳
غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ

اور ہرگز وہ راہِ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔[115] ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان[116] اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اُگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صُورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ

اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔

۱۱۳ – یعنی یہ قاعدے خدا کے مقرر کیے ہوئے نہیں ہیں، مگر وہ ان کی پابندی یہی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں کہ انھیں خدا نے مقرر کیا ہے، اور ایسا سمجھنے کے لیے ان کے پاس خدا کے کسی حکم کی سند نہیں ہے بلکہ صرف یہ سند ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

۱۱۴ – اہلِ عرب کے ہاں نذروں اور منّتوں کے جانوروں کے متعلّق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی، اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچّہ پیدا ہو، اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مُردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔

۱۱۵ – یعنی اگرچہ وہ لوگ جنھوں نے یہ رسم و رواج گھڑے تھے تمھارے باپ دادا تھے، تمھارے مذہبی بزرگ تھے، تمھارے پیشوا اور سردار تھے، لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے، ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتلِ اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو، جنھوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو، جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کر کے خدا کی طرف منسوب کی ہوں، وہ آخر فلاح یاب اور راست رَو کیسے ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال تھے وہ گمراہ، اور اپنی اس گمراہی کا بُرا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے۔

۱۱۶ – اصل میں جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مراد دو طرح کے باغ ہیں: ایک وہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ دُوسرے وہ جن کے درخت خود اپنے تنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری زبان میں باغ کا لفظ صرف دوسری قسم کے باغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم نے جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ کا ترجمہ

أَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۚ كُلُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۚ
قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ

یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔[117] کھاؤ اُن چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔[118] یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے محمدؐ! ان سے پُوچھو کہ اللہ نے اُن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچّے جو بھیڑوں

''باغ'' کیا ہے اور جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ کے لیے ''تاکستان'' (یعنی انگوری باغ) کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۱۱۷- اصل میں لفظ فَرْش استعمال ہوا ہے۔ جانوروں کو فرش کہنا یا تو اس رعایت سے ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں اور زمین سے لگے ہوئے چلتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ ان کی کھالوں اور ان کے بالوں سے فرش بنائے جاتے ہیں۔

۱۱۸- سلسلۂ کلام پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ تین باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے: ایک یہ کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں، یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں، کسی دُوسرے کا اس بخشش میں کوئی حصّہ نہیں ہے، اس لیے بخشش کے شکریے میں بھی کسی کا کوئی حصّہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ جب یہ چیزیں اللہ کی بخشش ہیں تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے قانون کی پیروی ہونی چاہیے۔ کسی دُوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے حدود مقرر کر دے۔ اللہ کے سوا کسی اَور کی مقرر کردہ رسموں کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اَور کے آگے شُکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا ہی حد سے گزرنا ہے اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے پینے اور استعمال کرنے ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے پیدا نہیں کیں کہ انھیں خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے۔ اپنے اوہام اور قیاسات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں، وہ

اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ۙ وَ
مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَاۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ؑ قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ

اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔[119] اور اِسی طرح دو اُونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پُوچھو: اِن کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اُونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟[120] کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمھیں دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اَور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے، تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے، اس میں تو مَیں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو

سب منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

۱۱۹ – یعنی گمان و وہم یا آبائی روایات نہ پیش کرو بلکہ علم پیش کرو اگر وہ تمھارے پاس ہو۔

۱۲۰ – یہ سوال اس تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اُن پر خود اپنے ان توہُّمات کی غیر معقولیّت واضح ہو جائے۔ یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام، یا مادہ حلال ہو اور نر حرام، یا جانور خود حلال ہو مگر اس کا بچّہ حرام، یہ صریحاً ایسی نامعقول بات ہے کہ عقلِ سلیم اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی عقل انسان یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ خدا نے ایسی لغویات کا حکم دیا ہوگا۔ پھر جس طریقے سے قرآن نے اہلِ عرب کو اُن کے اِن توہُّمات کی غیر معقولیت سمجھانے کی کوشش کی ہے، بعینہٖ اسی طریقے پر دُنیا کی اُن دُوسری قوموں کو بھی اُن کے توہُّمات کی لغویات پر متنبّہ کیا جا سکتا ہے جن کے اندر کھانے پینے کی چیزوں میں حُرمت و حلّت کی غیر معقول پابندیاں اور چھوت چھات

مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا
مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ
بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کسی کھانے والے پر حرام ہو، الا یہ کہ وہ مُردار ہو، یا بہایا ہُوا خون ہو، یا سُور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اَور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔[۱۲۱] پھر جو شخص مجبُوری کی حالت میں (کوئی چیز اِن میں سے کھالے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حدِ ضرورت سے تجاوُز کرے، تو یقیناً تمھارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

کی قیُود پائی جاتی ہیں۔

۱۲۱ – یہ مضمون سُورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ مائدہ آیت ۳ میں گزر چکا ہے، اور آگے سُورۂ نحل آیت ۱۱۵ میں آنے والا ہے۔

سُورۂ بقرہ کی آیت اور اس آیت میں بظاہر اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہاں محض ”خون“ کہا گیا ہے اور یہاں خون کے ساتھ مَسْفُوْح کی قید لگائی گئی ہے، یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کر کے یا ذبح کر کے نکالا گیا ہو۔ مگر دراصل یہ اختلاف نہیں بلکہ اُس حکم کی تشریح ہے۔ اِسی طرح سُورۂ مائدہ کی آیت میں ان چار چیزوں کے علاوہ چند اور چیزوں کی حُرمت کا بھی ذکر ملتا ہے، یعنی وہ جانور جو گلا گھُٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گِر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ لیکن فی الحقیقت یہ بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک تشریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور اس طور پر ہلاک ہوئے ہوں، وہ بھی مُردار کی تعریف میں آتے ہیں۔

فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا ہر چیز کا کھانا جائز ہے۔ یہی مسلک حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کا تھا۔ لیکن متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کے کھانے سے یا تو منع فرمایا ہے یا ان پر کراہت کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے، کچلیوں والے درندے اور پنجوں والے پرندے۔ اس وجہ سے اکثر فقہا تحریم کو ان چار چیزوں تک محدود نہیں مانتے بلکہ دُوسری چیزوں تک اسے وسیع قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کے بعد پھر مختلف چیزوں کی حِلّت و حُرمت میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ مثلاً پالتو گدھے کو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ حرام قرار دیتے ہیں، لیکن بعض دُوسرے فقہا کہتے ہیں کہ وہ حرام نہیں ہے بلکہ کسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس کی ممانعت فرما دی تھی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور جن لوگوں نے یہودیّت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی، بجز اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈّی سے لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انھیں دی تھی،[۱۲۲] اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

درندہ جانوروں اور شکاری پرندوں اور مُردار خور حیوانات کو حَنَفِیَہ مُطلَقاً حرام قرار دیتے ہیں، مگر امام مالکؒ اور اَوزاعیؒ کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں۔ لَیثؒ کے نزدیک بلّی حلال ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ۔ عِکْرِمہ کے نزدیک کوّا اور بجّو دونوں حلال ہیں۔ اسی طرح حَنَفِیَہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں، مگر ابنِ ابی لیلیٰ، امام مالکؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعتِ الٰہی میں قطعی حُرمت اُن چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان کے سوا دُوسری حیوانی غذاؤں میں مختلف درجوں کی کراہت ہے۔ جن چیزوں کی کراہت صحیح روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ حُرمت کے درجے سے قریب تر ہیں، اور جن چیزوں میں فقہا کے درمیان اختلاف ہُوا ہے ان کی کراہت مشکوک ہے۔ رہی طبعی کراہت جس کی بنا پر بعض اشخاص بعض چیزوں کو کھانا پسند نہیں کرتے، یا طبقاتی کراہت جس کی بنا پر انسانوں کے بعض طبقے بعض چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں، یا قومی کراہت جس کی بنا پر بعض قومیں بعض چیزوں سے نفرت کرتی ہیں، تو شریعتِ الٰہی کسی کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ خواہ مخواہ ہر اس چیز کو ضرور ہی کھا جائے جو حرام نہیں کی گئی ہے۔ اور اسی طرح شریعت کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتی کہ وہ اپنی کراہت کو قانون قرار دے اور ان لوگوں پر الزام عائد کرے جو ایسی غذائیں استعمال کرتے ہیں جنھیں وہ ناپسند کرتا ہے۔

۱۲۲ – یہ مضمون قرآنِ مجید میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ”کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدی میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو کہ لاؤ تورات اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچّے ہو۔“ (آیت ۹۳) پھر سُورۂ نساء میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی بنا پر ”ہم نے بہت سی وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔“ (آیت ۱۶۰) اور یہاں ارشاد ہُوا ہے کہ ان کی سرکشیوں کی

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

اب اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمھارے رب کا دامنِ رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا۔[۱۲۳]

یہ مشرک لوگ (تمھاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ ”اگر اللہ چاہتا

پاداش میں ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھیرا دی۔ اِن تینوں آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محمدؐی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حِلّت و حُرمت کے معاملے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے:

ایک یہ کہ نُزولِ تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السّلام نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی ان چیزوں کی تارک رہی، حتّٰی کہ یہودی فقہا نے ان کو باقاعدہ حرام سمجھ لیا اور ان کی حُرمت تورات میں لکھ لی۔ اِن اشیا میں اُونٹ اور خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائبل میں تورات کے جو اجزا ہم کو ملتے ہیں، اُن میں ان تینوں چیزوں کی حُرمت کا ذکر ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۴-۶۔ اِستثنا ۱۴: ۷) لیکن قرآنِ مجید میں یہودیوں کو جو چیلنج دیا گیا تھا کہ لاؤ تورات اور دکھاؤ یہ چیزیں کہاں حرام لکھی ہیں، اس سے معلوم ہُوا کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ اس کے بعد کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر اس وقت تورات میں یہ احکام موجود ہوتے تو بنی اسرائیل فوراً لا کر پیش کر دیتے۔

دُوسرا فرق اس وجہ پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انھوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی مُوشگافیوں سے خود حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر انھیں اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ ان اشیا میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں، یعنی شُتُرمُرغ، قاز، بط وغیرہ۔ دُوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکامِ تورات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ (اَحبار ۱۱: ۱۶-۱۸۔ اِستثنا ۱۴: ۱۴-۱۵-۱۶۔ اَحبار ۳: ۱۷ و ۷: ۲۲-۲۳) لیکن سُورۂ نساء سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد حرام ہوئی ہیں، اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دُوسری صدی عیسوی کے آخر میں رَبّی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر ان چیزوں کے متعلق یہاں اور سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے حَرَّمْنَا (ہم نے حرام کیا) کا لفظ کیوں استعمال کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدائی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر اور کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے۔ بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں

مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ
عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ

تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔"[۱۲۴] ایسی ہی باتیں بنا بنا کر اِن سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا، یہاں تک کہ آخرِ کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو: "کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" پھر کہو: (تمھاری اس حجّت کے مقابلے میں) "حقیقت رس حُجّت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت

کو مسلّط کر دے اور وہ ان پر طیّبات کو حرام کر دیں۔ پہلی قسم کی تحریم خدا کی طرف سے رحمت کے طور پر ہوتی ہے اور یہ دُوسری قسم کی تحریم اس کی پھٹکار اور سزا کی حیثیت سے ہُوا کرتی ہے۔

۱۲۳- یعنی اگر تم اب بھی اپنی نافرمانی کی روش سے باز آ جاؤ اور بندگی کے صحیح رَوِیّے کی طرف پلٹ آؤ تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کشادہ پاؤ گے۔ لیکن اگر اپنی اِسی مجرمانہ و باغیانہ روش پر اَڑے رہو گے تو خوب جان لو کہ اس کے غضب سے بھی پھر کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

۱۲۴- یعنی وہ اپنے جرم اور اپنی غلط کاری کے لیے وہی پُرانا عذر پیش کریں گے جو ہمیشہ سے مجرم اور غلط کار لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیّت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام ٹھیرا رکھا ہے انھیں حرام ٹھیرائیں۔ ورنہ اگر خدا نہ چاہتا کہ ہم ایسا کریں تو کیوں کر ممکن تھا کہ یہ افعال ہم سے صادر ہوتے۔ پس چونکہ ہم اللہ کی مشیّت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں اس لیے دُرست کر رہے ہیں، اس کا الزام اگر ہے تو ہم پر نہیں، اللہ پر ہے۔ اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں ایسا ہی کرنے پر مجبُور ہیں، کہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔

أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ
اللَّهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا

دے دیتا۔[۱۲۵]

ان سے کہو کہ ”لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے اِن چیزوں کو حرام کیا ہے“۔ پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا،[۱۲۶] اور ہرگز اُن لوگوں

---

۱۲۵ - یہ ان کے عذر کا مکمّل جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے:

پہلی بات یہ فرمائی کہ اپنی غلط کاری و گمراہی کے لیے مشیّتِ الٰہی کو معذرت کے طور پر پیش کرنا اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا قدیم شیوہ رہا ہے، اور اس کا انجام یہ ہُوا ہے کہ آخر کار وہ تباہ ہوئے اور حق کے خلاف چلنے کا بُرا نتیجہ انھوں نے دیکھ لیا۔

پھر فرمایا کہ یہ عذر جو تم پیش کر رہے ہو، یہ دراصل علمِ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض گمان اور تخمینہ ہے۔ تم نے محض مَشِیّت کا لفظ کہیں سے سن لیا اور اس پر قیاسات کی ایک عمارت کھڑی کر لی۔ تم نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مَشِیّت کیا ہے۔ تم مشیت کے معنیٰ یہ سمجھ رہے ہو کہ چور اگر مشیّتِ الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے، کیونکہ اس نے یہ فعل خدا کی مشیت کے تحت کیا ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کے حق میں خدا کی مشیّت یہ ہے کہ وہ شُکر اور کفر، ہدایت اور ضلالت، طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا، خدا وہی راہ اس کے لیے کھول دے گا، اور پھر غلط یا صحیح، جو کام بھی انسان کرنا چاہے گا، خدا اپنی عالمگیر مَصلَحتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جس حد تک مناسب سمجھے گا اسے اس کام کا اذن اور اس کی توفیق بخش دے گا۔ لہٰذا اگر تم نے اور تمھارے باپ دادا نے مشیّتِ الٰہی کے تحت شرک اور تحریم طیّبات کی توفیق پائی تو اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ تم لوگ اپنے اِن اعمال کے ذمّہ دار اور جواب دہ نہیں ہو۔ اپنے غلط انتخابِ راہ اور اپنے غلط ارادے اور سعی کے ذمہ دار تو تم خود ہی ہو۔

آخر میں ایک ہی فقرے کے اندر کانٹے کی بات بھی فرما دی کہ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ یعنی تم اپنی معذرت میں یہ حُجّت پیش کرتے ہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے“، اس سے پُوری بات ادا نہیں ہوتی۔ پوری بات کہنا چاہتے ہو تو یوں کہو کہ ”اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔“ بالفاظِ دیگر، تم خود اپنے انتخاب سے راہِ راست اختیار کرنے پر تیار نہیں ہو، بلکہ یہ چاہتے ہو کہ خدا نے جس طرح فرشتوں کو پیدایشی راست رَو بنایا ہے اس طرح تمھیں بھی بنا دے۔ تو بے شک اگر اللہ کی مشیت انسان کے حق میں یہ ہوتی تو وہ ضرور ایسا کر سکتا تھا، لیکن یہ اس کی مشیّت

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ع ﴿۱۵۰﴾ قُلْ تَعَالَوْا
اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

۱۸ ع ۶ ۵

کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور جو دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سُناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں:[۱۲۷]

(۱) یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو،[۱۲۸]

نہیں ہے، لہٰذا جس گمراہی کو تم نے اپنے لیے خود پسند کیا ہے اللہ بھی تمھیں اسی میں پڑا رہنے دے گا۔

۱۲۶ - یعنی اگر وہ شہادت کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ شہادت اُسی بات کی دینی چاہیے جس کا آدمی کو علم ہو، تو وہ کبھی یہ شہادت دینے کی جُرأت نہ کریں گے کہ کھانے پینے پر یہ قُیود، جو ان کے ہاں رسم کے طور پر رائج ہیں، اور یہ پابندیاں کہ فلاں چیز کو فلاں نہ کھائے اور فلاں چیز کو فلاں کا ہاتھ نہ لگے، یہ سب خدا کی مقرر کردہ ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری کو محسُوس کیے بغیر اتنی ڈِھٹائی پر اُتر آئیں کہ خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تأمُّل نہ کریں، تو ان کے اس جھُوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو۔ کیونکہ اُن سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جارہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو تم ان کی بات مان لوگے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے، ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچّائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ ضوابط خدا ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں تو وہ اپنی رسموں کی حقیقت پر غور کریں گے، اور جب ان کے مِن جانبِ اللہ ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں کی پابندی سے باز آجائیں گے۔

۱۲۷ - یعنی تمھارے رب کی عائد کی ہوئی پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو، بلکہ اصل پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عائد کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائِع الٰہیہ کی اصل الاُصُول رہی ہیں۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتابِ خُروج، باب ۲۰)

۱۲۸ - یعنی نہ خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراؤ، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے اختیارات میں، اور نہ اس کے حُقوق میں۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ

---

(۲) اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو،[۱۲۹]

(۳) اور اپنی اولاد کو مُفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔

(۴) اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ،[۱۳۰] خواہ وہ کُھلی ہوں یا چُھپی۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جَوہرِ اُلُوہیّت میں کسی کو حصّہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث، مشرکینِ عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا، اور دوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنسِ آلہہ کے افراد قرار دینا۔ یہ سب شرک فی الذّات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات، جیسی کہ وہ خدا کے لیے ہیں، ویسا ہی اُن کو یا اُن میں سے کسی صفت کو کسی دُوسرے کے لیے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلّق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں، یا وہ سب کچھ سُنتا اور دیکھتا ہے، یا وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے مُنزَّہ اور بالکل بے خطا ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں، اُن کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع وضرر پہنچانا، حاجت روائی و دستگیری کرنا، محافظت و نگہبانی کرنا، دُعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا۔ نیز حرام وحلال اور جائز و ناجائز کی حُدُود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لیے قانون وشرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے۔

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں، وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لیے مانا جائے۔ مثلاً رُکوع وسُجود، دست بستہ قیام، سلامی و آستانہ بوسی، شُکرِ نعمت یا اعترافِ برتری کے لیے نذر و نیاز اور قربانی، قضائے حاجات اور رفعِ مشکلات کے لیے مَنّت، مصائب و مشکلات میں مدد کے لیے پکارا جانا، اور ایسی ہی پرستش و تعظیم و تمجید کی دُوسری تمام صُورتیں اللہ کے مخصُوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح ایسا محبُوب ہونا کہ اس کی مَحبّت پر دوسری سب مَحبّتیں قربان کی جائیں، اور ایسا مستحقِ تقویٰ وخَشیّت ہونا کہ غیب وشہادت میں اس کی ناراضی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے، اور اس کی ہدایت کو صحیح وغلط کا معیار مانا جائے، اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

---

(۵) اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ[۱۳۱]۔
یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بُوجھ سے کام لو۔
(۶) اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین[۱۳۲] ہو،
یہاں تک کہ وہ اپنے سِنِّ رُشد کو پہنچ جائے،

اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لیے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ اِن حُقوق میں سے جو حق بھی دُوسرے کو دیا جائے گا، وہ اللہ کا شریک ٹھیرے گا، خواہ اس کو خدائی ناموں میں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

۱۲۹ – نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضاجوئی، خدمت، سب داخل ہیں۔ والدین کے اِس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدّم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

۱۳۰ – اصل میں لفظ ”فَوَاحِشَ“ استعمال ہُوا ہے، جس کا اطلاق اُن تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی بُرائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زِنا، عملِ قومِ لوط، برہنگی، جھوٹی تُہمت، اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فُحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو مِن جملۂ فواحش کہا گیا ہے۔ اِسی طرح دُوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشادِ الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ عَلانیَہ کیے جائیں نہ چھُپ کر۔

۱۳۱ – یعنی انسانی جان، جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھیرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ ”حق کے ساتھ“ کا کیا مفہُوم ہے، تو اس کی تین صُورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں، اور دو صُورتیں اس پر زائد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صُورتیں یہ ہیں:

(۱) انسان کسی دُوسرے انسان کے قتلِ عمد کا مجرم ہو اور اس پر قِصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

(۲) دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

(۳) دار الاسلام کے حُدُود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظامِ حکومت کو اُلٹنے کی سعی کرے۔

وَ اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَ الۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ۚ
وَ اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى ۚ وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ اَوۡفُوۡا ؕ

(۷) اور ناپ تول میں پُورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمّہ داری کا اُتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے،[۱۳۳]

(۸) اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو،

(۹) اور اللہ کے عہد کو پُورا کرو۔[۱۳۴]

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، یہ ہیں:

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۵) ارتداد اور خُروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

اِن پانچ صُورتوں کے سوا کسی صُورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے، خواہ وہ مومن ہو یا ذمّی یا عام کافر۔

۱۳۲- یعنی ایسا طریقہ جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم کی خیر خواہی پر مبنی ہو، اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو۔

۱۳۳- یہ اگرچہ شریعتِ الٰہی کا ایک مستقل اُصول ہے، لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے، وہ اپنی ذمّہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا۔ بھُول چُوک یا نادانستہ کمی وبیشی ہو جانے پر اس سے باز پُرس نہ ہوگی۔

۱۳۴- ”اللہ کے عہد“ سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسان کے درمیان اُسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شعوری وارادی ہیں، اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد (natural contract) ہے، جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی ونفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے، اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اُٹھانا، اور اُن مواقعِ زندگی سے متمتّع ہونا جو قوانینِ قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرتاً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے۔ اور

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ ۙ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ
مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ
عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

(۱۰) نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے، لٰہذا تم اِسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں[۱۳۵] گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

اِسی طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، ایک باپ کی محنتوں سے بسے ہوئے گھر میں پیدا ہونا، اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صُورتوں میں متمتّع ہونا، علیٰ قدرِ مراتب اس کے ذمّے بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے۔ انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا، مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے۔ انسان نے اسے شُعُور و ارادہ کے ساتھ نہیں باندھا، مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رہینِ منّت ہے۔ اسی عہد کی طرف سُورۂ بَقَرہ آیت ۲۷ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو ”اللہ کے عہد کو اس کی اُستواری کے بعد توڑتے ہیں، اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔“ اور اسی کا ذکر آگے چل کر سُورۂ اعراف آیت ۱۷۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے اَزَل میں آدمؑ کی پیٹھوں سے ان کی ذرّیّت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی تھی کہ کیا مَیں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ ہاں، ہم گواہ ہیں۔

۱۳۵ – اُوپر جس فطری عہد کا ذکر ہُوا، یہ اس عہد کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خودمختاری یا بندگیِ غیر کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اُس عہد کی اوّلین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس نہایت نازک، نہایت وسیع اور نہایت پیچیدہ عہد کی ذمہ داریوں سے انسان ہرگز عہدہ برآ نہیں ہوسکتا جب تک وہ خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو قبول نہ کرنے کے دو زبردست نقصان ہیں: ایک یہ کہ ہر دُوسرے راستے کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قُرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے۔ دُوسرے یہ کہ اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ
تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٥٤﴾ ع وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ ١٩ ع ۴ ٦
اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾ لا اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ
الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ
لَغٰفِلِيْنَ ﴿١٥٦﴾ لا اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ

پھر ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی (اور اس لیے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں[١٣٦] ع اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اِس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو، بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی،[١٣٧] اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانہ بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم

جن میں بھٹک کر پُوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے، اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بُلوغ و ارتقا کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ انھی دونوں نقصانات کو اس فقرے میں بیان کیا گیا ہے کہ ”دُوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے۔“ (مُلاحظہ ہو: سُورۂ مائدہ، حاشیہ ٣۵)

[١٣٦] – رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دِہ سمجھنا اور ذمّہ دارانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمّہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگ اس اعلیٰ درجے کے نظامِ زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمتِ ہدایت اور اس رحمت کے اثرات دیکھ کر یہ محسُوس کر لیں کہ انکارِ آخرت کی غیر ذمّہ دارانہ زندگی کے مقابلے میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اقرارِ آخرت کی بنیاد پر ذمّہ دارانہ طریقے سے بسر کی جاتی ہے، اور اس طرح یہ مُشاہدہ و مُطالعہ انھیں انکار سے ایمان کی طرف کھینچ لائے۔

اَهۡدٰى مِنۡهُمۡ ۚ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّ
رَحۡمَةٌ ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنۡهَا ؕ
سَنَجۡزِى الَّذِيۡنَ يَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ اٰيٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا
كَانُوۡا يَصۡدِفُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ
اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوۡمَ يَاۡتِىۡ بَعۡضُ
اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ
اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا ؕ قُلِ انۡتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

ان سے زیادہ راست رَو ثابت ہوتے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔[۱۳۸] جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں اس رُوگردانی کی پاداش میں ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔ کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آ کھڑے ہوں، یا تمھارا رب خود آجائے، یا تمھارے رب کی بعض صریح نشانیاں[۱۳۹] نمودار ہو جائیں؟ جس روز تمھارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو، یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔[۱۴۰] اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

---

۱۳۷ – یعنی یہود و نصاریٰ کو۔

۱۳۸ – اللہ کی آیات سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے، اور وہ نشانیاں بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آ رہی تھیں، اور وہ آثارِ کائنات بھی جنھیں قرآن اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي
شَيْءٍ ؕ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۵۹﴾
مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۚ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، یقیناً ان سے تمھارا کچھ واسطہ نہیں[۱۴۱]، ان کا معاملہ تو اللہ کے سُپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس[۱] گنا اجر ہے، اور جو بدی لے کر آئے گا

---

۱۳۹ – یعنی آثارِ قیامت، یا عذاب، یا کوئی اور ایسی نشانی جو حقیقت کی بالکل پردہ کُشائی کر دینے والی ہو اور جس کے ظاہر ہو جانے کے بعد امتحان و آزمائش کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔

۱۴۰ – یعنی ایسی نشانیوں کو دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی کافر اپنے کفر سے توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اس کا ایمان لانا بے معنٰی ہے، اور اگر کوئی نافرمان مومن اپنی نافرمانی کی رَوِش چھوڑ کر اطاعت کیش بن جائے تو اس کی اطاعت بھی بے معنٰی، اس لیے کہ ایمان اور اطاعت کی قدر تو اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردے میں ہے، مُہلت کی رسّی دراز نظر آ رہی ہے، اور دنیا اپنی ساری متاعِ غرور کے ساتھ یہ دھوکا دینے کے لیے موجود ہے کہ کیسا خدا اور کہاں کی آخرت، بس کھاؤ پیو اور مزے کرو۔

۱۴۱ – خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور آپؐ کے واسطے سے دینِ حق کے تمام پیرو اس کے مُخاطَب ہیں۔ ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ ایک خدا کو الٰہ اور رب مانا جائے۔ اللہ کی ذات، صفات، اختیارات اور حُقوق میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے آخرت پر ایمان لایا جائے، اور ان وسیع اُصول و کُلّیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو اوّل یومِ پیدائش سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے، وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں کے لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اُپج سے، یا خواہشاتِ نفس کے غلبے سے، یا عقیدت کے غُلُوّ سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اَوہام و قیاسات اور فلسفوں سے کمی وبیشی اور ترمیم و تحریف کی۔ اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بنائے۔ جُزئیات میں مُوشگافیاں کیں۔ فُروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنایا۔ اس کے لانے والے انبیا اور اس کے عَلَم بردار بزرگوں میں سے کسی کی عقیدت میں غُلُوّ کیا اور کسی کو بُغض و مخالفت کا نشانہ بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے اور ہر مذہب و فرقہ کی پیدائش نوعِ انسانی کو مُتخاصم گروہوں میں تقسیم کرتی

فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦٠﴾ قُلْ اِنَّنِيْ
هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٦١﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ
نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِيْكَ
لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٦٣﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ

اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قُصُور کیا ہے، اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

اے محمدؐ! کہو: میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ جسے[۱۴۲] یکسُو ہو کر اُس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو: میری نماز، میرے تمام مراسِم عبودیت[۱۴۳]، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو: کیا میں اللہ کے سوا

چلی گئی۔ اب جو شخص بھی اصل دینِ حق کا پیرو ہو، اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کر لے۔

[۱۴۲] – ''ابراہیمؑ کا طریقہ''، یہ اس راستے کی نشان دہی کے لیے مزید ایک تعریف ہے۔ اگرچہ اس کو موسیٰؑ کا طریقہ یا عیسیٰؑ کا طریقہ بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حضرت موسیٰؑ کی طرف دنیا نے یہودیّت کو اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف مسیحیّت کو منسوب کر رکھا ہے، اس لیے ''ابراہیمؑ کا طریقہ'' فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہُودی اور عیسائی، دونوں گروہ برحق تسلیم کرتے ہیں، اور دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ یہُودیت اور عیسائیّت کی پیدائش سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ نیز مشرکینِ عرب بھی ان کو راست رَو مانتے تھے اور اپنی جہالت کے باوجود کم از کم اتنی بات انھیں بھی تسلیم تھی کہ کعبہ کی بِنا رکھنے والا پاکیزہ انسان خالص خدا پرست تھا نہ کہ بُت پرست۔

[۱۴۳] – اصل میں لفظ ''نُسُکْ'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنیٰ قربانی کے بھی ہیں اور اس کا اطلاق عُمومیّت کے ساتھ بندگی و پرستش کی دُوسری تمام صُورتوں پر بھی ہوتا ہے۔

أَبْغِي رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ط وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا
عَلَيْهَا ج وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ج ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم
مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾ وَهُوَ الَّذِي
جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ط إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ

کوئی اور رب تلاش کروں حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟[۱۴۴] ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمّہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا،[۱۴۵] پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔[۱۴۶] بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے

---

۱۴۴ – یعنی کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے، میرا رب کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے؟ کس طرح یہ بات معقول ہو سکتی ہے کہ ساری کائنات تو اللہ کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو، اور کائنات کا ایک جُز ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اُسی نظام پر عامل ہو، مگر مَیں اپنی شُعوری و اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں؟ کیا پُوری کائنات کے خلاف مَیں اکیلا ایک دُوسرے رُخ پر چل پڑوں؟

۱۴۵ – یعنی ہر شخص خود ہی اپنے عمل کا ذمّہ دار ہے، ایک کے عمل کی ذمّہ داری دوسرے پر نہیں ہے۔

۱۴۶ – اس فقرے میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں:

ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنیٰ میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرّف کے اختیارات بخشے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرّف کے اختیارات دیے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم، اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت میں ہیں۔

تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے، اور جس کو جو کچھ بھی

٢٠ ع ١١ ٧

وَ إِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٥﴾ ع

اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ ع

خدا نے دیا ہے، اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرّف کیا، کہاں تک امانت کی ذمّہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیت یا نا قابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر زندگی کے دُوسرے مرحلے میں انسان کے درجے کا تعیُّن منحصر ہے۔

فہرست موضوعات

الف

(۱) ابراہیم علیہ السلام

— آپ کی بعثت کے وقت قوم ابراہیم کی مذہبی اور تمدنی حالت پر تبصرہ ۵۵۳تا۵۵۹
— آپ پر عالمگیر دعوت کی ذمہ داری اور آپ کی مہاجرت اور تبلیغی مشن کی تفصیلات ۱۰۸ تا ۱۱۰
— آپ کی نسل کی دو شاخیں ۱۰۸
— آپ کے بعد حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب کی نسل کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے، انھیں دنیا کی امامت کا منصب سونپا گیا ۱۰۹
— آپ کا اصل کام جس کے لیے آپ کو منصب دیا گیا ۱۰۹
— خدا تعالیٰ کی آزمائشوں پر پورا اترنا اور راہِ حق میں بے مثال قربانیاں دینا ۱۱۰
— آپ کی اپنی نسل سے ایک مسلم قوم اور اس میں ایک رسول اٹھائے جانے کی دعا ۱۱۲
— مکہ شہرِ امن و امان اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا گہوارہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا نتیجہ ۱۱۱
— حضرت ابراہیم کو تمام نسل انسانی کا پیشوا بنایا گیا ۱۱۰
— آپ کی نسل میں سے صرف صالح افراد کے متعلق وعدہ کیا گیا ۱۱۰
— حضرت ابراہیم کو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے چنا گیا ۱۱۳
— رسول اللہؐ کی طرف سے ابراہیمی طریقہ اختیار کرنے کا اعلان
— آپ ہرگز مشرک نہ تھے ۱۱۴-۲۷۴-۶۰۵
— جزا و سزا کے لیے عیسائی یا یہودی ہونا باعث نجات نہیں ہے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ درکار ہے یہودیت و نصرانیت سب بعد کی پیداوار ہیں ۲۰۲-۱۱۴-۱۱۵-۱۶۲-۱۹۷
— آپ کا نمرود سے مباحثہ ۱۹۷تا۱۹۹
— حیات بعد الموت کے عینی مشاہدے کی درخواست ۲۰۱
— آپ سے نسبت کے حق دار لوگ ۲۶۳
— آپ کے طریقے کی پیروی کا حکم ۲۷۴-۴۴۰
— آپ کی اولاد کو ”ملک عظیم“ بخشنے کا مفہوم ۳۶۱
— شرک کے خلاف آپ کی کشمکش ۵۵۲تا۵۶۰
— شرک کے خلاف آپ کا اپنے باپ سے خطاب ۵۵۳
— آپ کا آیاتِ الٰہیہ سے درست استفادہ ۵۵۳-۵۵۶-۵۵۷
— آپ پر قریش کا بے جا فخر و ناز ۵۵۳
— آپ کے ظہور کا زمانہ ۵۵۴
— تلاشِ حقیقت کے لیے آپ کا ابتدائی تفکر ۵۵۶ تا ۵۵۸
— آپ کی دعوتِ توحید کا ہدف ۵۵۶
— قوم کی طرف سے مزاحمت اور آپ کی ثابت قدمی ۵۵۸-۵۵۹
— قومِ ابراہیم وجودِ خداوندی کی منکر نہ تھی ۵۵۹
— آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صالح اولاد کی نعمت ۵۶۰
— دینِ ابراہیمی سے متعلق اہل عرب کے غلط مزعومات ۵۸۷
— آپ کے طریقے کی تعریف ۶۰۵
— فرقہ بندی کا اسلام اور طریقہ ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں ۶۰۵-۶۰۴

(۲) ابلیس

— لفظ ابلیس کے معانی اور اس کی حقیقت ۶۵

— انسان کو سجدے سے اس کا انکار ۶۴
— نافرمانوں کی ایک پوری جماعت اس کے ساتھ تھی ۶۶

(۳) آثارِ قدیمہ

— یہ دنیا سیر سپاٹے کی جگہ نہیں بلکہ مقام عبرت ہیں ۵۲۶
— اللہ تعالیٰ چاہے تو منکرین حق کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے ۵۸۳
— ہر بستی کے بڑے گمراہوں کا انجام ۵۷۹-۵۸۰

(۴) اجر

— اجر کے مستحق کام ۱۰۳-۲۱۰
— اجر کے حق دار لوگ ۲۰۳-۲۱۷-۲۵۹-۳۰۲-۳۰۳-۳۹۶-۴۱۲-۴۱۴-۴۲۴-۴۳۰-۴۵۰-
— کسی کا اجر ضائع نہیں کیا جائے گا ۲۰۹-۲۱۷-۳۰۲
— اللہ تعالیٰ نیکی کا اجر اپنی طرف سے بڑھا دیتا ہے ۳۵۳-۴۳۰
— جہاد کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ۳۷۲
— اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کے اجر کا ضامن اللہ تعالیٰ خود ہے ۳۸۷
— انبیائے کرام پر کسی تفریق کے بغیر ایمان لانے والوں کے لیے اجر عظیم ۴۱۴
— انسان کا کوئی اچھا اور برا فعل چھپ نہیں سکتا، مکمل جزا و سزا پائے گا ۱۰۳
— نیکی کے ارادے کا بھی ان کو اجر ملے گا ۳۸۷

(۵) احبار

— احبار اور مشائخ کا کام ہے کہ لوگوں کو گناہ و گمراہی سے اور حرام نہ کھانے کی تلقین کریں ۴۸۴

(۶) احد جنگ (غزوہ)

— نقشہ جنگ احد ۲۸۴
— سورۂ آل عمران سے اس کا تعلق ۲۲۸
— تحریک اسلامی کی تاریخ میں غزوۂ احد کا مقام ۲۲۹-۲۳۰
— معرکہ احد کی تفصیلات ۲۸۴-۲۸۵
— اس موقع پر رسول اللہؐ کی بددعا اور گرفت ۲۸۷
— دنیا طلبی کا لایا ہوا وبال ۲۹۴
— مسلمانوں کو رنج پر رنج دینے کا مقصود ۲۹۵
— عین حالت جنگ میں مسلمانوں پر غنودگی کا غلبہ ۲۹۶
— نبی کے بارے میں سوءِ ظن کا نتیجہ ۲۹۹
— شکست کے زیر اثر عام مسلمانوں کی ایک فکری الجھن ۳۰۰
— احد کی آزمائش اور مصیبت کی وجہ اور ذمہ داری ۳۰۱
— جنگ احد کے بعد تقسیم میراث ۳۱۶
— احد کی ہزیمت کا دشمنوں پر ردِ عمل ۳۷۱-۳۱۷
— احد کی ہزیمت کا مسلمانوں پر اثر ۴۳۵
— جنگ احد سے واپسی کے بعد مشرکین کا اظہار تأسف اور مسلمانوں کا سنبھلنا ۳۰۳
— احد سے روانگی کے وقت ابوسفیان کا چیلنج کہ اگلے سال بدر میں پھر ملیں گے لیکن مکہ سے نکل کر بھی پلٹ گیا ۳۰۴

(۷) اِحرام

— احرام کی تشریح ۴۳۷
— احرام کی حالت میں پابندیاں ۱۵۵- ۴۳۷-۵۰۴-۵۰۵
— احرام شعائر اللہ میں سے ہے ۴۳۹
— احرام کی حالت میں شکار کرنے کا کفارہ ۵۰۴
— احرام کی حالت میں سمندر کے شکار کی اجازت ۵۰۵

(۸) احسان

— احسان کا مفہوم ۴۱۲
— اطاعت کا سب سے اونچا مقام ۱۵۳
— دوسروں کی غلط روش سے چشم پوشی کر کے احسان کا رویہ اختیار کرنے کا حکم ۴۵۵-۴۵۴-۵۰۳
— احسان کی دنیوی جزا ۵۶۱

(۹) احکام القرآن

— (تفصیل کے لیے دیکھو ''اصول قانون'')

— اللہ تعالیٰ اپنے احکام نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تا کہ انسان یوں ہی نہ بھٹکتا رہے ۴۳۲
— اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام بہت وضاحت سے بیان کر دیے ہیں، بہترین رویہ جواز کی آخری حدود سے دور رہنا ہے ۱۴۷
— شرعی رعایتیں ۱۵۴
— مسافر اور بیمار کے لیے رعایتیں ۳۵۴- ۳۵۵
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں ۱۷۵
— احکام خداوندی میں حسن اخلاق کی ترغیب ۱۶۸
— اللہ تعالیٰ کے احکام کو کھیل بنانا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے ۱۷۷
— تعمیل احکام میں وہ نہیں کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے بیان نہ کیا ہو ۵۰۷- ۵۰۸
— اللہ تعالیٰ ہی قوانین میں نرمی کرنے والا ہے ۳۵۵
— اہل ایمان کو حکم خداوندی پر کیوں عمل کرنا چاہیے ۱۲۴
— احکام خداوندی پر عمل ہی فلاح کا راستہ ہے ۱۲۵
— احکام خداوندی پر عمل نہ کرنے والوں کی مثال ۱۳۳- ۱۳۴
— احکام خداوندی پر عمل نہ کرنے والے خیانت کرتے ہیں ۱۴۵
— اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو ۵۵
— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہے ۱۷۳
— احکام القرآن ۱۰۰- ۱۲۱- ۱۲۴- ۱۲۷- ۱۳۲ تا ۱۳۵- ۱۶۷ تا ۱۸۳- ۲۰۹- ۲۱۱- ۱۲۷ تا ۲۲۱- ۲۲۳- ۲۴۴- ۲۷۷- ۲۸۲- ۲۸۷- ۳۱۷ تا ۳۳۱- ۳۳۳- ۳۳۵ تا ۳۴۲- ۳۴۵- ۳۴۸ تا ۳۵۰- ۳۵۴ تا ۳۵۵- ۳۶۲ تا ۳۶۵- ۳۷۱- ۳۷۲- ۳۷۸- ۳۸۰ تا ۳۸۴- ۳۸۸ تا ۳۹۳- ۴۰۱- ۴۰۲- ۴۰۵ تا ۴۰۸- ۴۱۱- ۴۳۱- ۴۳۲- ۴۳۷ تا ۴۴۲- ۴۴۵- ۴۴۶ تا ۴۴۸- ۴۶۵- ۴۶۷- ۷۴۱- ۴۷۲- ۴۷۶- ۷۴۸ تا ۴۸۰- ۴۴۸- ۴۹۹- ۵۰۱- ۵۰۳- ۵۰۵- ۵۱۰ تا ۵۱۲- ۵۷۰- ۵۷۶- ۵۷۷- ۵۹۲- ۵۹۳- ۵۹۸ تا ۶۰۰
— احکام خداوندی کو چھپانے والے اللہ تعالیٰ اور تمام انسانوں کی لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸

(۱۰) آخرت

— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ۸۲- ۱۷۳- ۴۷۲-
— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ایمان)
— روز جزا و سزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے ۴۴
— عقیدۂ آخرت کی تشریح ۵۱- ۶۰- ۷۴- ۲۴۲
— عقیدۂ آخرت کے اخلاقی نتائج ۷۴- ۲۴۲
— دلائل آخرت ۳۱۱
— دنیا اور آخرت کا موازنہ ۲۳۷- ۲۳۸
— فرداً فرداً جواب دہی کی ذمہ داری ۲۲۳- ۵۶۵
— تمام اختلافات کا آخری فیصلہ ۲۵۹- ۴۷۸- ۶۰۶
— آخرت کی کامیابی ہی اصل منزل ہے ۳۰۸
— آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی حقیقت ۳۰۸- ۳۷۴- ۵۳۳
— دنیا کی کارگزاری کے واضح ہونے کا دن ۴۵۵- ۵۱۰- ۵۱۶- ۵۷۱
— وہاں حقیقت مکمل بے نقاب ہوگی ۵۳۲
— اصل جائے قرار وہی ہے ۵۳۳
— وہاں جواب دہی کی ذمہ داری دوسرے پر نہ ہوگی ۵۴۴
— مکافاتِ عمل قابل انتقال شے نہیں ہے ۵۴۴
— کچھ لوگ سرخرو ہوں گے اور کچھ کا منہ کالا ہوگا ۲۷۴
— اقوال و اعمال کا مکمل ریکارڈ رکھا جا رہا ہے ۱۰۳- ۳۰۶- ۳۰۷- ۵۴۷
— اس دن اچھے لوگوں کے اعمال ضائع نہ ہوں گے ۳۱۲
— آخرت کا محاسبہ اور افرادِ انسانی کے درمیان مساوات ۳۱۳
— دنیوی سزا، اخروی سزا سے نہیں بچاتی ۲۱۴- ۴۶۵
— وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہے گی ۳۵۴

— دنیا میں اچھا برا کیے کا پھل پانے کا دن ۲۴۲-۴۰۰
— وہاں کون سے لوگ دیوالیہ ہوں گے ۴۴۷
— وہاں صرف سچائی نافع ہوگی ۵۱۷
— وہاں ظالموں کا حساب متقیوں سے نہیں لیا جائے گا ۴۸۹
— وہاں مجرمین خود اپنے اوپر گواہ ہوں گے ۵۸۱
— وہاں مقدمے میں باقاعدہ اتمام حجت کیا جائے گا ۵۸۲
— نیکی کا اجر دس گنا اور بدی کا بدلہ برابر ملے گا ۶۰۴
— وہاں کسی پر ظلم نہ ہوگا ۲۴۲-۶۰۵
— آخرت جس کا آنا یقینی ہے ۲۴۲
— آخرت پر ایمان لانے میں کیا کیا شامل ہے ۵۱
— خوفِ آخرت کی تلقین ۲۷
— رب سے ملاقات کا خوف رکھنے والوں کی حالت ۷۲
— مرغوبات دنیا کے مقابلے میں آخرت کا انعام ۲۳۸
— جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا اسے ہی ثوابِ آخرت ملے گا ۲۹۲
— آخرت کے ماننے والوں کا عملی رویہ ۲۵۴
— قیامت کے دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے ۲۳۵-۲۳۶
— صرف دنیوی زندگی کی نہیں آخرت کی بھی فکر کرنی چاہیے کیونکہ وہی اصل زندگی ہے ۲۰۶
— ایمان بالآخرت اہم ترین عقیدہ ہے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے ۱۹۰
— آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ۲۰۶
— آخرت کی رسوائی اور مصیبت سے بچنے کا حکم ۳۱۸
— منکرین آخرت خود فریبی میں مبتلا ہیں ۵۲۷-۵۷۴
— انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— اقرارِ آخرت اور انکارِ آخرت کے رویوں کا تقابل ۶۰۲
— انکارِ آخرت ہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے ۵۷۳-۵۷۴
— آخرت میں ایک اور موقع دینے کی درخواست رد کر دی جائے گی ۱۳۲-۵۳۲
— آخرت میں دنیوی اسباب و وسائل کسی کام نہ آئیں گے ۱۳۲
— نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی اور سفارش کام آئے گی ۱۹۳-۴۳۰-۵۵۰
— آخرت کا انجام کسی کی خوش خیالیوں پر موقوف نہیں ہے ۳۹۹
— وہاں ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا ۴۸۹-۵۴۹
— خود ساختہ شریکوں کے بارے میں سوال ۵۳۰
— روز آخرت دنیا میں کمزور ہونے کا بہانہ نہ چلے گا ۳۷۸
— آخرت میں دنیا پرستوں کے جھوٹے بھروسوں کی نفی ۵۳۳-۵۴۳
— وہاں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہوگا جو کسی کی حمایت اور سفارش کر سکے ۵۴۳
— سفارشیوں کا کھو جانا اور دنیوی رابطوں کا ٹوٹ جانا ۵۶۵
— اللہ تعالیٰ کی پیشی پر لوگوں کو گھیر کر حاضر کیا جائے گا ۴۳۰-۵۰۵-۵۳۰
— تنِ تنہا اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ۵۶۵
— زیادہ سے زیادہ فدیہ دے کر بھی خلاصی نہ ہو سکے گی ۴۶۷
— آخرت کے آنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے ۳۷۸-۳۷۹
— تمام موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۴۵۸-۵۱۰-۶۰۶
— قیامت کا دن اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے ۵۲۳
— جس روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس دن حشر برپا ہو جائے گا ۵۵۲-۵۵۱
— آخرت کا وعدہ ضرور پورا ہوگا ۵۸۳
— اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت دیتا ہے ۵۶۵-۵۶۶
— آخرت کے دن سزا سے بچنا ہی اللہ تعالیٰ کا بڑا رحم اور اصل کامیابی ہے ۵۲۸

— دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کے نتائج ۹۰
— آخرت میں کن چیزوں کی باز پرس ہو گی ۱۱۴-۱۱۸-۳۴۶
— آخرت میں شہادت علی الناس کے فریضے کی جواب دہی ۱۱۹
— قوموں پر ان کے انبیائے کرام سے شہادت طلبی ۳۵۳-۵۱۳
— حضرت عیسیٰ سے شہادت کی طلبی اور ان کی اپنی قوم کی عاجزانہ شفاعت کی درخواست ۵۱۲ تا ۵۱۷
— آخرت میں گمراہ دینوی پیشواؤں کی روش اور ان کی پیروی کرنے والوں کی ناکام حسرت ۱۳۲
— دنیا پرستوں کے لیے آخرت میں کامیابی کا کوئی حصہ نہیں ۱۵۷
— ریاکارانہ اعمالِ دنیا روز آخرت میں بے برگ و بار رہیں گے ۲۰۶
— وہاں کن لوگوں کے لیے محرومی ہے ۲۶۶-۲۷۰
— آخرت کی فلاح کا دارومدار کثرتِ رزق پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے ۱۱۱-۱۶۲
— اللہ کی رحمت کے جائز امیدوار کون ہیں؟ ۱۶۶
— مجرمین کی بعد از وقت پشیمانی ۲۴۵
— کفر مزرعۂ آخرت کے لیے تباہ کن ہے ۲۸۲
— آخرت کے لیے دینوی مفاد کی قربانی ۳۷۲
— آخرت میں شیاطین جن سے خطاب ۵۸۰
— دنیا و آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب کے مستحق ۹۱

(۱۱) اخلاق، اخلاقی تعلیمات

— والدین سے حسن سلوک ۹۰-۱۶۴-۳۵۱-۵۹۸
— یتیموں سے حسن سلوک ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۱۶۷-۱۶۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۵۱-۴۰۱-۵۹۹
— رشتہ داروں اور ہمسایہ سے حسن سلوک ۳۵۱
— علیحدگی کی صورت میں زوجین کو حسن سلوک کی تلقین ۱۷۴
— زوجین کو بھلے طریقے سے زندگی بسر کرنے کی تاکید ۳۳۴-۳۳۵
— اطاعت شعار بیویوں پر خواہ مخواہ دست درازی نہ کی جائے ۳۵۰
— باہمی فیاضانہ برتاؤ کی تلقین ۱۸۱-۱۸۲-۳۴۱
— ''امت وسط'' ہونے کے اخلاقی تقاضوں کی یاددہانی ۱۷۷
— مسلمانوں کو امامت عالم دیتے وقت ہدایات ۱۲۵-۱۲۶
— اخلاق میں احسان اور انفاق کی اہمیت ۱۵۳-۱۶۴
— قرآن ازدواجی زندگی میں استعارہ و کنایہ کی زبان میں حیاداری کی تعلیم دیتا ہے ۱۷۰
— جو شوہر بیوی کو تحفہ وغیرہ دے چکا اسے واپس مانگنے کی ممانعت ۱۷۵
— انفاق کے ساتھ احسان دھرنے کی ممانعت ۲۰۳
— ریا سے بچنے اور خلوص پر کاربند ہونے کی نصیحت ۲۰۴-۲۰۵-۳۵۲
— امانت داری کی تلقین ۲۲۲
— شہادت (گواہی) کو چھپانے کی ممانعت ۲۲۰-۲۲۲
— شہادت کے معتبر ہونے کے لیے اخلاقی سیرت کا لحاظ ۲۲۰
— اخلاق میں ''اپنی اپنی کمائی'' کا اصول ۲۲۴-۲۲۵
— اجتماعی قوت میں اخلاق کی اہمیت ۲۳۷-۲۳۸
— دینوی مفاد سے نگاہ اونچی رکھنے کی نصیحت ۲۳۸-۲۹۲
— معاف کرنے اور احسان کرنے کا اخلاقی اسلوب اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ۴۱۳-۴۵۵
— تنگ نظر لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ۲۰۷
— اہل حاجت کی آگے بڑھ کر مدد کرنے کی اہمیت ۲۰۹
— بدحالی میں باوقار رہنا ۲۰۹-۲۱۰
— مارے گئے حق کو لوٹانے کا درس ۲۱۴
— دو قسم کے انسانی کرداروں کا تقابل ۲۱۷
— لین دین میں فیاضانہ طرز عمل کی نصیحت ۲۱۸-۲۲۱
— مقروض کے ساتھ نرمی کرنے کی تلقین ۲۱۸
— پڑھے لکھے آدمی کی ذمہ داریاں ۲۱۹

— سود خوری اور انفاق سے دو الگ الگ قسم کی سیرتیں بنتی ہیں ۲۸۸
— غلطی کے بعد فوری ندامت اور اصلاح کی روش ۲۸۹-۳۶۸-۳۹۵
— عزم و ہمت ایمان کے لازمی اوصاف ہیں ۲۸۹
— اسلامی اخلاقیات کا فیصلہ کن سوال ۲۹۲
— باطل کے مقابلے میں ثابت قدمی کی تلقین ۲۹۳-۳۱۴-۳۹۳
— حرص اور لالچ کے اخلاقی مفاسد پر تبصرہ ۲۹۴
— اللہ کی راہ میں خرچ پر کنجوسی شرمناک ہے ۳۰۷
— خوشحال فرد کی کنجوسی مکروہ اور سخت ناپسند ہے ۳۰۶-۳۵۲
— اشتعال انگیزی کے جواب میں صبر اور خدا ترسی کا رویہ حوصلہ مندی کی علامت ہے ۳۰۹
— تقسیم وراثت کے وقت وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنا چاہیے ۳۲۴-۳۲۵
— وصیت میں حق تلفی کی ممانعت ۳۲۹
— ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو'' کے تین مفہوم ۳۴۵
— اللہ نے جو فضل کسی کو تم سے زائد دیا ہو اس کی تمنا نہ کرو ۳۴۷-۳۴۸
— غرور اللہ کو پسند نہیں ہے ۳۵۲
— عدل و امانت کی تاکید ۳۶۲
— اہل ایمان کو ہمیشہ بھلائی کی سفارش کرنی چاہیے ۳۷۷
— باہمی تحیہ وسلام کرنے کی تاکید ۳۷۸
— ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھنے کا فائدہ ۴۳
— نظام اخلاق میں توبہ کی اہمیت ۶۸
— قرآن بھلائیاں پیدا کرنا چاہتا ہے ۹۰-۱۳۷
— وہ برائیاں جن کو قرآن مٹانا چاہتا ہے ۶۰-۹۰
— حج میں اسلامی اخلاق کی تربیت ۱۵۵
— ایسے کاموں کی تعریف چاہنے والوں کی مذمت جو کیے ہی نہیں گئے ۳۱۰
— اگرچہ کسی کا حق نہ بھی ہو تو بھی اسے ضرور کچھ دو ۳۲۵
— کسی بھی شخص سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی جگہ خود کو تصور کرو ۳۲۵
— صدقہ خیرات اور نیک کام کی خفیہ تلقین ۳۹۶
— مظلوم اگر ظالم کے خلاف زبان کھولے تو اس کا حق دار ۴۱۳
— نیکی کے کام میں تعاون اور برائی میں عدم تعاون کرو ۴۴۰
— دوسروں کی غلطی پر چشم پوشی کا رویہ احسان کی روش ہے ۴۵۴-۴۵۵
— بدلے اور قصاص کو صدقہ کرنا گناہوں کا کفارہ ہے ۴۷۴
— اہل ایمان باہم نرم اور کفار کے لیے سخت ہیں ۴۸۲-۴۸۱
— جو شخص اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اسے معاشی و معاشرتی کمزوری کے سبب نظر انداز نہ کرو ۵۴۳-۵۴۴
— کوئی گروہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں، ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا ۲۶۶-۲۶۷
— نیکی اور بھلائی کی طرف سبقت کرو ۱۲۳
— دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے ساتھ طلب کرنی چاہیے ۱۵۷-۱۶۷
— اخلاق کے لیے ایمان بالآخرت کی اہمیت ۱۵۸
— رضائے الٰہی کے لیے جان کی بازی لگا دینے والے کا کردار ۱۵۹
— خدا ہماری کارگزاریوں کو خوب جانتا ہے ۱۶۴
— صدقات سے اخلاقی آلودگیاں دور ہوتی ہیں ۲۰۸
— احکام خداوندی میں حسن اخلاق کی ترغیب کا اہتمام ۱۶۸
— اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اخلاقی بلندی کی ضرورت ہے ۲۰۲-۳۱۸
— مکہ میں مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے خطوط ۲۲۶
— روزہ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے ۱۴۳

— حق کے لیے جانی قربانی دینے کا جذبہ ۲۹۸-۳۱۲
— انصاف کے ساتھ گواہی دینے اور انصاف کا علمبردار بننے کا حکم ۴۰۵-۴۰۶-۴۴۹-۴۷۲
— برائی کے جواب میں بھلائی کرنے یا درگزر کرنے کی تلقین ۴۱۳
— راستی پر قائم رہنے والے بنو ۴۴۹
— اللہ پر بھروسہ رکھو اور حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو ۴۵۰-۴۹۹
— نیکی اور بھلائی میں مقابلہ ومسابقت کرو ۴۷
— ہر بات انصاف سے کہو ۶۰۰
— ضلالت وگمراہی میں مبتلا انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸
— ضمیر سے خیانت کرنے کی حالت ۱۴۵-۳۹۴
— دھاندلی سے مال حاصل کرنے کی ممانعت ۱۴۷-۳۴۵
— دل کا گناہ آلودہ ہونا ۲۲۲
— غیروں کو رازدار اور رفیق بنانے کی ممانعت ۲۸۲-۴۱۱
— احد کی جنگ میں شکست اخلاقی کمزوریوں کا نتیجہ تھی ۲۹۷
— سوءِظن کی ممانعت ۲۹۹
— خیانت کا اخروی انجام ۲۹۹
— اللہ کی رضا چاہنے والے اور اللہ کے غضب میں گھر جانے والے برابر نہیں ۳۰۰
— انصاف میں تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے ۳۹۴
— ناپسندیدہ باتوں کے لیے خفیہ مشاورت کی ممانعت ۳۹۵-۳۹۶
— اپنے گناہ دوسروں کے سر تھوپنے کا اخلاقی اثر ۳۹۵
— نجویٰ کے جائز حدود ۳۹۶
— تنگ دلی سے پرہیز کی تلقین ۴۰۲
— بدگوئی کی ممانعت ۴۱۳
— اسراف سے بچنے کی تلقین ۴۹۹
— شراب اور جوئے کی حرمت ۵۰۱
— فضول سوالات کی ممانعت ۵۰۷-۵۰۸-۵۱۰
— دوسروں کے معبود کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ۵۷۰
— کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو ۵۷۷
— فواحش کے قریب نہ پھٹکو ۵۹۹
— انسانی جان کا احترام کرو ۵۹۹
— ناپ تول پورا رکھنے کا حکم ۶۰۰
— ''عہد اللہ'' کو پورا کرو ۶۰۰
— ہدیہ یا تحفہ دے کر واپس لینے کو رسولؐ اللہ نے کتے کی اس حرکت سے تشبیہ دی ہے جو قے کر کے چاٹ لیتا ہے ۱۷۵

(۱۲) آدم علیہ السلام

— آدم علیہ السلام ۱۷-۶۱ تا ۶۹
— آپ کے دو بیٹوں کا قصہ ۴۶۱ تا ۴۶۳
— جنت میں ان کا امتحان اور اس کا مقصد ۶۶
— حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو ایک خاص درخت کے علاوہ ہر نعمت سے بہرہ ور ہونے کی اجازت دی گئی ۶۵-۶۶
— حضرت آدمؑ وحواؑ کو امتحان کے لیے جنت ہی میں کیوں رکھا گیا؟ ۶۶
— شیطان نے انہیں گمراہ کر کے ممنوع پھل کھلوا دیا ۶۷
— حضرت آدم وحوا کو اللہ تعالیٰ نے توبہ سکھلائی اور ان کی توبہ قبول ہوگئی ۶۷
— حضرت آدم وحوا کو توبہ قبول ہونے پر بھی جنت سے کیوں نکالا گیا ۶۸-۶۷
— حضرت آدم کو جنت سے اخراج پر بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے لیے رنج وغم کا کوئی موقع نہیں ۶۸
— حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ تشبیہ ۲۵۹

(۱۳) اذان

— اذان کا مذاق اڑانے والوں کی مذمت ۴۸۳

(۱۴) اُر

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن ۵۵۴

— اس کی آبادی کی طبقاتی تقسیم ۵۵۴
— ان کا مشرکانہ طرزِ فکر ۵۵۴-۵۵۵
— دورِ ابراہیمی کا شاہی خاندان ۵۵۵

(۱۵) ارتداد

— دنیا و آخرت میں تمام اعمال کو برباد کرنے والا گناہ ۱۶۶
— یہود کا ایمان لانے کے بعد کفر کرنا اور اس کا وبال ۲۷۱
— ایمان کی نعمت پا کر پھر کفر کرنے والوں کا انجام ۲۷۸
— کفر و ایمان کو کھیل بنا لینا ۴۰۷

(۱۶) ازدواجی زندگی

— انسانی تمدن میں ازدواجی زندگی کی اہمیت ۹۹
— ازدواجی زندگی کے آداب ۱۶۹-۱۷۰
— ازدواجی زندگی کو صبر سے نباہنا ۳۳۴
— ازدواجی تعلق کی نوعیت ۱۴۵-۱۶۹
— مہر کے معاملے میں فریقین کو فیاضانہ برتاؤ کا حکم ۱۸۱
— بیوی کا مہر معاف کرنا ۳۲۲
— مہر مارنے کے لیے عورت کو تنگ نہ کیا جائے ۳۳۴
— بیویوں کے نان و نفقہ کے لیے وصیت کرنے کا حکم ۱۸۳
— مرد ہر عورت کے نفقہ کا ذمہ دار ہے ۳۴۹
— تعدد ازدواج کو محدود کیا گیا ہے ۳۲۰ تا ۳۲۲
— تعدد ازدواج کی صورت میں بیویوں میں عدل کرنے کا حکم ۳۲۰-۴۰۲ تا ۴۰۴
— زوجین باہم تنگ دلی سے برتاؤ نہ کریں ۴۰۲
— بیویوں کے درمیان عدل کے برتاؤ کی حد ۴۰۲
— بیویوں کو معلق رکھنے کی ممانعت ۴۰۳
— طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہوتا ہے ۳۳۴
— زوجین کے لیے مصالحت، جدائی سے زیادہ بہتر ہے ۴۰۲
— زوجین کے اصلاح تعلقات کے لیے ثالثی کا طریقہ ۳۵۰-۳۵۱
— مرد کی قوامیت اسلامی معاشرت میں ۳۴۹
— بہترین بیوی کی صفات اور شوہر کی اطاعت کے حدود ۳۴۹
— عورت کا نشوز اور اس کے آخری حدود ۳۴۹-۳۵۰
— میاں بیوی میں جدائی کے ذمہ دار افراد کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۹۹
— وراثت، نکاح و طلاق اور رضاعت وغیرہ کے معاملات خفیہ نہیں ہونے چاہییں ۱۸۲
— بیوی کی ناگوار اور ناپسندیدہ باتوں سے درگزر کرو ۳۳۴
— میاں بیوی کے بگڑے تعلقات اصلاح کے طریقے ہیں ۳۴۹-۳۵۰
— مرد عورت پر قوام ہے جو بمعنی شرف و عزت نہیں بلکہ فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ہے ۳۴۹
— اگر زوجین الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز کر دے گا ۴۰۴
— میاں بیوی میں ترکِ تعلق کی مدت اور رجوع وغیرہ کے احکام ۱۷۰-۱۷۱
— (نیز دیکھو ’’ایلا‘‘، ’’خلع‘‘، ’’رضاعت‘‘، ’’طلاق‘‘، ’’عورت‘‘، ’’مہر‘‘ اور ’’نکاح‘‘، ’’اسلام کی معاشرتی تعلیمات‘‘)

(۱۷) ازلام (جوا)

— دیکھو ’’جوا‘‘

(۱۸) آزمائش

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’امتحان‘‘)
— راہِ حق میں آزمائش ناگزیر ہے ۱۲۶- ۱۶۳- ۳۰۸-۵۷۴
— آزمائش کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا ۳۴
— انسان کی دنیوی زندگی سراسر آزمائش ہے ۱۶۰- ۱۶۱-۶۰۷
— انسان کی آزمائش کا دارومدار اس کی آزادی اور اختیار پر ہے ۵۷۰

— آزمائش کے مختلف طریقے ہیں ۱۲۶-۱۲۷
— دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا بلکہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے ۱۶۳
— مذاہب کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں ۱۹۲-۱۹۳
— نافرمانوں کا پھلنا پھولنا اور اطاعت گزاروں کی آزمائش پر قرآن کا تبصرہ ۲۴۳
— دنیا کی زندگی میں آزمائش اور امتحان کی نوعیت ۵۲۶
— دنیوی زندگی میں حقیقت پر پردہ آزمائش کا سامان ہے ۵۳۲
— مرغوبات دنیا کا وجہ آزمائش ہونا ۲۳۸
— ایمان میں غربا کی سبقت امیر لوگوں کے لیے آزمائش ہے
— اللہ انسان پر ظلم نہیں کرتا، انسان خود کو آزمائش میں ڈالتا ہے ۴۷۹
— اللہ تعالیٰ انسانوں میں نشیب و فراز کی گردش کرتا رہتا ہے ۲۹۰
— آزمائش و ابتلا کی بنیادی وجہ انسان کی اپنی شامت اعمال ہے ۲۹۳
— آزمائش پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مقابلہ کرنا چاہیے ۲۹۵
— آزمائش و ابتلا انسان پر اپنی حرکتوں کی وجہ سے آتی ہے ۳۶۷-۴۷۹-۳۷۵-۳۶۷
— انسان پر بھلائی صرف اللہ کی عنایت اور فضل سے آتی ہے اور مصیبت انسان کے اپنے کسب و اعمال کی وجہ سے آتی ہے ۳۷۵
— اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہی مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹
— بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر فوقیت حقیقت میں آزمائش ہے ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ضرور آزماتا ہے تاکہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے ۳۰۵
— آزمائش پر پورا اترنے اور بھلائی میں سبقت لینے کی کوشش کرنی چاہیے ۴۷۷-۴۷۸
— اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی آزمائش کرتا ہے ۷۵
— دنیوی آزمائش داعیانِ حق کو چھانٹنے کا طریقہ ہے ۲۹۰
— آزمائش و ابتلا دلوں کے کھوٹ چھانٹنے کے لیے ضروری ہے ۲۹۷
— جنگ احد کی ہزیمت مومنین اور منافقین کے چھانٹنے کا ذریعہ بنی ۳۰۱
— آزمائش کا مقابلہ صبر و تقویٰ سے کرو ۳۰۸-۳۰۹
— حق و باطل کی کشمکش میں آزمائش کا مقام ۵۳۶
— دنیوی خوش حالی میں آزمائش ۵۴۰
— ہدایت یافتہ کے لیے کوئی بھی آزمائش سخت نہیں ۱۲۰
— ابتلا و آزمائش اور مصیبت کی دعا ۱۲۶-۱۲۷
— آزمائش سے بچاؤ کی دعا ۲۲۵
— آزمائش، جہاد اور دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا ۲۹۳
— آزمائش میں دل شکستہ ہونے کے بجائے صبر کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ صابروں کو پسند کرتا ہے ۲۹۲-۲۹۳
— تحویل قبلہ میں آزمائش ۱۲۰
— آزمائش کے لیے پردۂ غیب کے قائم رہنے کی اہمیت ۱۶۰-۱۶۱-۵۲۵-۵۲۶
— اختلاف شرائع میں انسان کا امتحان ۴۷۷-۴۷۸
— قرآن مجید اپنے مخاطب کے لیے آزمائش بن گیا ۵۶۹
— حالت آزمائش اور ایمان ۶۰۴
— انسان کو ذہانت اور تصرف کا اختیار بھی آزمائش ہے ۵۶۳

(۱۹) اسبابِ ضلالت

— قانون الٰہی کے بجائے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنا گمراہی کا سبب ہے ۴۷۶-۴۷۷
— خواہشات کی پیروی کرنا ۴۷۹-۵۰۹

— علم کے بغیر محض خواہشات نفس کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرنا ۵۷۷
— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام رد کرنے والے بھٹک گئے ۵۸۹
— مذہبی پیشواؤں، سرداروں اور باپ دادا کی اختیار کردہ جاہلی رسومات کی مذمت اور تردید ۵۸۸-۵۸۹
— اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۵۹۰
— ارتداد تمام اعمال کے برباد ہونے کا سبب ہے ۱۶۶-۲۷۱-۲۷۸-۳۰۷
— جہالت وحماقت بھی ضلالت کا سبب ہے ۱۱۲
— اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا، انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷
— انبیائے کرام کے طریقے سے ہٹ جانا ۵۵۳
— بنی اسرائیل کی گمراہی کی بڑی وجہ ۴۹۷
— تقلید ایک اہم ترین وجہ گمراہی ۱۱۸-۱۳۲-۱۳۳-۵۰۹-۵۸۸-۵۸۹

(۲۰) اسحاق علیہ السلام

— انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— انھیں راہِ راست دکھائی گئی، وہ صالحین میں سے تھے ۵۵۹-۵۶۰

(۲۱) اسلام

— اس کی تشریح ۱۷-۱۱۳-۲۷۰-۳۷۴-۴۰۰-۵۵۱
— اصل دین اسلام تھا، دوسرے مذاہب اس کے مسخ ہونے سے بنے ۱۷-۱۹
— اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ۱۱۳-۲۳۹-۴۴۳-۶۶۶
— تمام انبیائے کرام کا دین اسلام تھا ۲۴۰
— اسلام ہی دین حق ہے ۲۷۰-۴۴۳-۶۶۶
— اسلام کے برحق ہونے کے دلائل ۱۶۲-۱۶۳-۲۳۳-۲۴۰-۲۷۰
— اسلام کے تین بنیادی نکات ۲۵۴-۲۵۵
— اسلامی عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ ۴۲۴
— اسلام کے مقابلے میں جاہلیت کی اصطلاح ۴۷۹
— دین اسلام ابراہیمؑ کا دین ہے اور ہر قسم کی ٹیڑھ سے بالکل پاک ہے ۶۰۵
— اسلام، جاہلیت کے تعصبات کی بیخ کنی کرتا ہے ۱۲۰
— اسلام تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لیے آیا ہے ۱۲۸-۴۳۰-۴۳۱
— اللہ پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہی دعائیں سننے والا ہے ۱۴۴
— اسلام دین فطرت ہے، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— اسلام میں جبر اور اکراہ نہیں ہے ۱۹۵-۱۹۶
— مسلم یک سو ۲۶۳
— قانون اسلامی کی پیروی میں سراسر ہماری ہی بھلائی ہے ۳۶۶
— ایمانیاتِ اسلام کے ارکان ۴۰۷
— ایک مکمل دین اور ایک مکمل نظام ۴۴۳-۴۴۴
— اسلام دنیوی زندگی کو آسان اور سہل کرتا ہے ۴۴۴-۴۴۵
— اسلام ہدایت وراہ نمائی کا منصب ۴۴۹
— اسلام ہی دنیوی کامیابی اور اخروی سرفرازی کا ذریعہ ہے ۴۵۲ تا ۴۵۴
— اسلام ایک نور ہے جو قرآن مجید اور رسالت محمدؐ کے ذریعے سے سلامتی کا راستہ بتاتا ہے ۱۶ تا ۱۹-۴۵۶
— خوفِ آخرت رکھنے والے ہی اسلام سے فیض یاب ہوتے ہیں ۵۴۳
— اسلام ہی اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی کا ذریعہ ہے ۵۵۱
— قرآن کو تمام دنیا والوں کے لیے نصیحت بنایا ۵۶۲
— اسلامی تہذیب کے اصول ۴۳
— قبولِ اسلام کی ابتدائی ظاہری علامات ۱۳۴-۴۴۴
— اِس کی عبادات کے نظامِ اوقات کی سادگی ۱۴۵
— ہمہ تن اسلام کے تحت آ جانے کا مطالبہ ۲۰۲-۲۰۳
— اسلام کے سوا کوئی اور روش عند اللہ قبول نہ ہوگی ۲۷۰
— اسلام کے مخالفین کے اعتراضات کا جواب

۲۷۳-۲۷۴
— اسلامی شریعت انسان کی بھلائی کے لیے ہے ۳۴۶
— اسلام کا عقیدہ و مسلک سے آگے بڑھ کر ریاست بن جانا ۴۳۵
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اسلامی ریاست‘‘ اور ’’اسلام کی سیاسی تعلیمات‘‘)
— اسلام کو قبول کر لینے کا مطلب ۴۴۴
— شریعت اسلام کے احکام تنگی پیدا کرنے والے نہیں ۴۴۸
— اسلام کا معاشی نقطہ نظر ۲۰۲-۲۰۳
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اسلام کی معاشی تعلیمات‘‘)
— شرائع الٰہیہ میں اصولی پابندیاں ۵۹۷ تا ۵۹۹
— قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت اور حیثیت سے آشنا کروایا ۱۷ تا ۱۹
— اسلام کی معاشرتی تعلیمات ۹۹
— ایمان کا حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جو روشنی کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۶-۱۹۷
— اسلام قبول کرنے والے کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا ۴۳۱
— اہل ایمان کو نصیحت کہ کس طرح اپنے نظام کی خوبیاں برقرار رکھیں ۴۳۶
— وہ مرحلہ جب اسلام ایک مکمل نظام بن کر چھا گیا ۴۴۳
— ہدایت اور رشد کا راستہ واضح کر دیا گیا ۸۰
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات پوشیدہ نہ رکھنے کا عہد لیا گیا تھا ۳۰۹-۳۱۰
— اسلام نے اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کیا ہے ۴۵۵-۴۵۶
— اہل کتاب اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، ایسے لوگوں سے دوستی اور رفاقت رکھنے کی ممانعت ۴۸۳
— اسلام کی دعوت کئی اہل کتاب میں سرکشی کا باعث بن جاتی ہے ۴۸۵
— اسلام کا مستقبل کی کامیابیوں کے بارے میں پیشگی اشارہ ۵۲۴
— اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے ۵۷۹
— اسلامی احکام پر عمل کرنے میں قیل و قال اور بال کی کھال اتارنے کی روش انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے ۱۰۲
— مسلمانوں کو اللہ کا رنگ اختیار کرنے کا حکم ۱۱۶-۱۱۷
— اسلام افراد کا مرہون منت نہیں ۴۸۱
— اہل ایمان سے مال و جان کی قربانی کا تقاضا ۲۰۲
— برائی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنے کی مذمت ۴۹۶

(۲۲) اسلام کی سیاسی تعلیمات

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اسلام کی معاشرتی تعلیمات‘‘ اور ’’اسلامی معاشرہ‘‘)
— (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’اسلامی ریاست‘‘)
— اسلامی دستور کی اولین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴
— اللہ تعالیٰ اصل اور اولین مطاع ہے ۳۶۳
— اطاعت رسول اگرچہ مستقل بالذات اطاعت نہیں لیکن اطاعت خداوندی کی واحد عملی صورت ہے ۳۶۳
— اطاعت خدا اور اطاعت رسول کے تحت تیسری اطاعت اولی الامر حضرات کی ہے جو اطاعت خدا اور اطاعت رسول کے پابند ہوں ۳۶۳-۳۶۴
— بنیادی قانون حکم خداوندی اور سنت رسول اللہ ہے ۳۶۳-۳۶۵
— حکمرانی کے لیے حکمت اور علم ۱۹۱
— حکمران، حکمرانی کے زعم میں مبتلا رہتے ہیں ۱۹۸-۱۹۹
— مطلوب حکمران امانت دار اور امانت و دیانت سے فیصلے کرنے والے ۳۶۲-۳۶۳
— قیادت کی نااہلی، بددیانتی اور کم ظرفی بنی اسرائیل کو لے ڈوبی ۳۶۲-۳۶۳
— اچھا حکمران مشاورت سے فیصلہ کرتا اور اللہ پر بھروسا کرتا ہے ۲۹۸
— اختیارات کے حق دار لوگ ۳۷۷

(۲۳) اسلام کی معاشرتی تعلیمات

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اخلاقی تعلیمات‘‘، ’’اسلامی نظم جماعت‘‘)
— معاشرتی تعلیمات کی اولین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴
— معاشرتی اور تمدنی احکام میں اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی کا حق نہ مارو بلکہ حق سے زیادہ دو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے ۱۸۳
— اہل ایمان کافروں کو رفیق و دوست نہ بنائیں ۲۴۳-۲۴۴
— یہود سے معاشرتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کیونکہ وہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتے ۲۸۲-۲۸۳
— دین اسلام اہل ایمان کو باہم جوڑتا ہے جب کہ وہ پہلے نااتفاقی کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ۲۷۶-۲۷۷
— صبر و شکر اور خوف خدا سے زندگی گزارنے کا پھل ۲۸۳
— رشتہ داری اور قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے رویوں پر نگران ہے ۳۱۹
— تمام انسان ایک اصل سے ہیں اور حقوق و فرائض میں عین برابر ہیں ۳۱۹
— معاشرے میں فرق مراتب محض ایک اعتباری چیز ہے، حقیقی نہیں ۳۴۱-۳۴۲
— معاشرے میں کسی کی اونچی حیثیت پر حسد نہ کرو ۳۴۷-۳۴۸
— معاشرے میں مختلف طبقات کے حقوق و فرائض ادا کرو اور اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بھی فضل و کرم کی دعا کرتے رہو، اس رویے سے معاشرے میں مکمل امن و سکون رہے گا ۳۵۱-۳۵۲
— معاشی اور معاشرتی برائی پر فخر کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں ہے ۳۵۲
— تحفہ یا ہدیہ واپس لینا اسلام کے اخلاقی اصولوں کی ضد ہے ۱۷۵
— خفیہ عہد و پیمان اور خفیہ معاہدوں کا اسلام قائل نہیں ہے ۱۸۰
— عہد سے پھرنے والا فاسق ہے ۲۶۹
— کفار کے ظلم سے بچنے کے لیے اپنی پہچان چھپانے کی اجازت ہے ۲۴۴
— اسلامی معاشرے میں اولی الامر ہر شخص کو شریک مشورہ رکھتا ہے اور جب عزم کسی فیصلے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر قدم اٹھالیتا ہے ۲۹۸
— کوئی معاشرتی گروہ اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں ہے، کامیابی کا معیار اچھے اعمال ہیں ۲۶۶-۲۶۷
— دعوت حق کے داعین ہدایت کی روشنی میں زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸
— بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر فوقیت حاصل ہے اور اس میں ہر دو گروہ کی آزمائش ہے ۶۰۶
— افراد معاشرہ کے معاشی حقوق ملکیت اور حقوق استعمال پر معاشرہ پابندی لگا سکتا ہے ۳۲۲-۳۲۳
— باطل طریقے سے دوسرے کا مال کھانا معاشرے کو ہلاکت میں ڈالتا ہے ۳۴۵-۳۴۶
— افواہیں پھیلانے کی ممانعت ۳۷۶-۳۷۷
— اختیارات حاصل کرنے کے حق دار افراد ۳۷۷
— اہل ایمان خواہ وہ دار السلام کے ہوں یا دار الحرب کے ہوں ان کے ساتھ نرم رویہ رکھو ۳۸۵
— خفیہ مشوروں میں اکثر و بیشتر بھلائی نہیں ہوتی ۳۹۶
— صدقہ خیرات اور نیکی کے کاموں میں خفیہ تلقین و مشورہ بھلی بات ہے ۳۹۶
— جس محفل میں آیات اللہ کے خلاف کفر بکا جا رہا ہو یا ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہو اس سے فوری الگ ہو جاؤ ۴۰۸-۵۴۹
— نیکی اور بھلائی کے کام میں تعاون کرو ۴۴۰
— عدل و انصاف کے معاملے میں گروہی اختلافات کو الگ رکھو، صرف عدل کرو جو خدا ترسی کے زیادہ قریب ہے ۴۴۹
— چشم پوشی کر کے احسان کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۴۵۴-۴۵۵

— بری خبر معاشرے کے ذمہ داران تک پہنچائیں، معاشرے میں نہ پھیلائیں ۳۷۶-۳۷۷
— اہل ایمان باہم نرم اور کفار کے لیے سخت ہیں ۴۸۱-۴۸۲
— اہل ایمان کے رفیق اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں، ایسے رفیق غلبہ اور کامیابی کے ضامن ہیں ۴۸۲
— باہم اصلاح کے کام کو چھوڑنا قابل مذمت ہے ۴۹۶
— دوسروں کے اعمال کی خرابیاں دیکھنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرو ۵۱۰
— جو شخص اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو اسے الگ نہ کرو ۵۴۳-۵۴۴
— غلط کار لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری پرہیزگار لوگوں پر نہیں ہے ۵۴۹
— میاں بیوی کا رشتہ ایک لباس کی طرح ہے ۱۴۴-۱۴۵
— عورت اور مرد کے درمیان تعلق کی فطری نوعیت کیا ہے ۱۷۰
— شوہر اور بیوی میں ترک تعلق کی مدت اور رجوع کے احکام ۱۷۰تا۱۷۲
— مر جانے پر حقوق وفرائض کا وارثین کی طرف منتقل ہونا ۱۷۸-۱۷۹
— مطلقہ عورت کے نکاح میں رکاوٹ بننے کی ممانعت ۱۷۸
— وراثت اور نکاح وطلاق بعد رضاعت وغیرہ کے معاملات خفیہ نہیں ہونے چاہییں ۱۸۲
— مرد کے لیے بیویوں کی تعداد کو محدود کیا گیا ہے ۳۲۰-۳۲۲-۴۰۳-۴۰۴
— بیوی کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی گزارنے کا حکم ۳۳۴
— منہ بولا رشتہ، دوستی اور عہد و پیمان حق وراثت نہیں، یہ شرعی وارثین کا حق ہے، ہاں ان کے حق میں وصیت کی جاسکتی ہے ۳۴۷-۳۴۸
— زوجین کے بگڑے تعلقات میں اصلاح کا قرآنی طریقہ ۳۵۰-۳۵۱
— ایک اچھا ساتھی فضل خداوندی ہے ۳۷۰
— مرد عورت پر قوام ہے جو بمعنی شرف وعزت نہیں بلکہ فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ہے ۳۴۹
— صالح عورت کی کیا صفات قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ۳۴۹
— زوجین احسن طریقے سے علیحدہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ایک دوسرے سے بے نیاز کردے گا ۴۰۴
— احکام رضاعت ۱۷۸-۱۷۹
— حق تلفی کی ممانعت ۱۸۳
— ادائیگی حقوق ہی تقویٰ کی راہ ہے ۱۸۳
— گمراہی کے کاموں میں عدم تعاون کا حکم ۴۴۰
— نصیحت کا راستہ اختیار کرنے کا حکم ۵۴۹
— قتل انسانی اور قصاص کے احکام ۱۳۷تا۱۳۹
— تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے ۱۳۸-۱۳۹
— قتل اولاد کی صورتیں ۵۸۵-۵۸۸
— انسانی جان کو اللہ تعالیٰ نے محترم ٹھیرایا ہے تاہم قرآن وحدیث میں پانچ صورتیں مستثنیٰ ہیں ۵۹۹-۶۰۰
— خودکشی اور قتل انسانی کی ممانعت ۳۴۵-۳۴۶
— ایک انسان کی جان بچانا گویا تمام انسانیت کی جان بچانا ہے ۴۶۴
— اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے والے فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور جلاوطنی ہے ۴۶۴-۴۶۵
— کسی کو معاف کر دینا انسان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یعنی قصاص ایک صدقہ بن جاتا ہے ۴۷۴
— قرض کی ادائیگی سے معذور شخص کے قرض خواہوں کو مہلت دینے یا قرض کا ایک حصہ یا پورا قرض معاف کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے ۲۱۸-۲۱۹
— قرض اور تجارتی معاملات کو تحریر میں لانا چاہیے تاکہ معاملات صاف رہیں ۲۱۹-۲۲۲
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک

یا نادانستہ کمی بیشی کی باز پرس نہ ہوگی ۶۰۰
— دوسرے سے خیانت کرنے والا دراصل اپنے ہی نفس سے خیانت کرتا ہے ۳۹۴
— والدین سے نیک سلوک کرنے کا حکم ۵۹۸-۵۹۹
— اس دنیا کی چیزوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے والا ہی عقل مند ہے ۳۰۶
— کنجوسی کرنے اور دوسروں کو کنجوسی کی تلقین کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے ۳۵۲-۳۵۳
— یتیم کے مال کی حرمت کا حکم ۵۹۹-۶۰۰
— یتیموں کا مال ان کے سپرد کرتے ہوئے گواہ لے لو ۳۲۴
— شراب اور جوئے سے معاشرہ میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳
— اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بنانے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۴۰۸-۴۱۱
— مظلوم اگر ظالم کے ظلم پر بدگوئی کرے اور زبان درازی کرے تو یہ اس کا حق ہے ۴۱۳
— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں ۴۸۴
— اللہ کے بعد سب سے مقدم حق والدین کا ہے ۵۹۸-۵۹۹
— انسانی معاشروں اور قوموں کا بگاڑ ۴۹۶
— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم کیا جانا ۶۰۴
— معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— ہدایت کی نعمت پا کر اسے کھونے والی قوم کا انجام ۱۶۱

(۲۴) اسلام کی معاشی تعلیمات

— اہل ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کہ وہ اپنا وقت اور کمائیاں اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۲۰۲
— اللہ کی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف قرض حسن قرار دیتا ہے جس کو کئی گنا کر کے واپس کرے گا ۱۸۴-۱۸۵
— انفاق فی سبیل کی بڑھوتی اور ضائع ہونے کی الگ مثالیں ۲۰۲-۲۰۵
— (مزید دیکھو ’’معاشی قانون و تعلیمات‘‘)
— اسلامی معاشرہ ۱۶۱-۱۷۰-۱۷۱-۳۷۶-۳۷۷-۵۰۳-۵۷۸
— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اسلام کی معاشرتی تعلیمات‘‘)

(۲۵) اسلامی ریاست

— دستور کی اولین دفعہ اور تفصیلات ۳۶۳-۳۶۴
— اولوا الامر وہ ہے جو امانت دار ہو اور ایمان داری سے فیصلہ کرے ۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۷۶
— اولوا الامر افراد کو شریک مشورہ رکھتا ہے ۲۹۸
— اقامت صلوٰۃ اور اسلامی ریاست ۳۶۴-۳۶۵
— امیر ہی کو امام صلوٰۃ ہونا چاہیے ۳۹۱
— اجتہاد کی آزادی ۳۶۵
— قانون اسلام پر عمل کرنے میں سراسر ہماری اپنی بھلائی ہے اور یہ تقاضائے ایمان بھی ہے ۳۶۶
— رسول اللہ کی اطاعت محض زبانی نہیں، عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— باہمی تنازعات میں آخری فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہوگا ۳۶۸-۳۶۹
— قرآن حکیم کے بتائے اصولوں پر فیصلہ کرنے کا حکم ۳۹۳-۳۹۴
— نظامِ تمدن و معاشرت کو بے لاگ نصیحت کہ کس طرح خوبیاں برقرار رکھے ۴۳۶
— حکومت اور عوام کے نزاع کا حل ۳۶۵
— مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کی وسعت ۴۳۵
— نظام اسلامی سے بغاوت کی سزا ۴۶۵
— اسلامی ریاست عہد اور معاہدہ کا احترام کرتی ہے ۳۸۰-۳۸۲
— شراب کی بندش اسلامی ریاست کے فرائض میں سے ہے ۵۰۲
— ہجرت نہ کرنے والوں کے لیے حکم ۳۷۹-۳۸۰

— اسلامی قانون پر عمل ایمان کا تقاضا ہے ۳۶۶

— مجرمین کے تبادلے کے احکام کی پابندی ۳۸۰-۳۸۲

— (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلام کی سیاسی تعلیمات'')

(۲۶) اسلامی نظام زندگی

— (تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی نظام جماعت''، ''اسلامی ریاست''، ''اسلام کی معاشرتی تعلیمات'' اور ''دعوت حق'')

(۲۷) اسلامی نظامِ جماعت

— مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرہ'' اور ''دعوت''

— اسلامی نظام جماعت اور اسلامی معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰

— رسولؐ اللہ انسانوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مبعوث ہوئے ۱۱۲

— مسلم اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور اس راہ میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲

— امارت کے اوصاف ۲۹۸

— مشاورت کی اہمیت ۲۹۸

— نظام سمع وطاعت ۳۶۳-۳۶۴

— افواہیں پھیلانے کی مذمت ۳۵۶

(۲۸) آسمان

— سات آسمانوں کا مطلب ۶۱

— اللہ تعالیٰ ہی نے آسمان کو چھت بنایا ۵۷-۵۶۷

— زمین و آسمان (کائنات) کو برحق پیدا کرنے کا مفہوم ۵۵۱-۵۵۲

— آسمان کے تاروں کو اللہ تعالیٰ نے تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ۵۶۶

(۲۹) اسماعیل علیہ السلام

— اللہ تعالیٰ نے اپنی خدمت کے لیے انھیں چن لیا ۵۶۱

— منصب امامت پر آپ کی اولاد کی تعیناتی ۱۰۹-۱۱۰-۱۱۹-۱۲۵-۱۲۶-۲۷۹

(۳۰) اشہرِ حرم

— اس کی حقیقت ۱۵۲

— یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مقرر شدہ ہیں ۱۵۲

— واقعۂ نخلہ ۱۶۴-۱۶۵

— اشہرِ حرم میں جنگ ۱۶۴-۱۶۵

— اشہرِ حرم کا احترام کیا جائے ۴۳۸

(۳۱) اصحاب السبت

— ان کے بندر بنائے جانے کا واقعہ کیا ہے؟ ۸۳-۸۴

(۳۲) اصحابِ صفہ

— مدینہ منورہ میں عاشقانِ رسول کا ایک ہمہ وقت اور بے لوث گروہ ۲۰۹-۲۱۰

(۳۳) اصطباغ

— عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک جاہلانہ رسم ۱۱۶

(۳۴) اصولِ فقہ

— شریعت اسلام بے جا پابندیوں سے آزاد کرتی ہے ۱۵۵

(۳۵) اصولِ قانون

— دستور اسلام کی اوّلین دفعہ ۳۶۳-۳۶۴

— احکام خداوندی کی بنیاد اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہے ۱۷۳

— اللہ تعالیٰ اپنے احکام کی مکمل وضاحت کرتا ہے ۱۷۶-۴۳۲-۵۰۰

— اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکمت اللہ تعالیٰ جانتا ہے، انسان نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے ۱۷۸-۱۸۳-۱۸۴-۳۲۷-۳۲۸-۳۴۳

— اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی استطاعت اور ہمت سے زیادہ معاشی بار نہیں ڈالتا ۱۷۸-۱۷۹

— معروف (رائج طریقہ) کی افادیت کو قبول کرتا ہے

۱۸۰
— انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی صوابدید کا اختیار دیتا ہے ۱۸۳-۱۸۴
— حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام میں نرمی ۱۴۳-۴۳۱
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود پر عمل انعامات اور خلاف ورزی ہمیشگی کے عذاب کا باعث ہوگی ۳۳۰-۳۳۱
— جرم کی سزا عورت اور مرد دونوں کو ملے گی، استثنا نہیں ہے ۳۳۱-۳۳۲
— جرم کے تمام شریک واجب سزا ہیں ۳۳۱
— اگر کسی ماضی کے فعل کو آیندہ کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے جو معاملات اس حکم سے پہلے کیے گئے ہیں وہ بھی کالعدم ہو گئے ۳۳۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— قوانین اسلام اس علیم و دانا ہستی کے دیے ہوئے قوانین ہیں جو تمام مصلحتوں اور حقیقتوں کو جانتا ہے اور اس کے دیے ہوئے قوانین سے بہتر قانون کوئی نہیں دے سکتا ۳۲۷-۳۲۸-۴۳۲-۳۴۳
— قوانین الٰہی کی پابندی لازمی ہے ۳۲۹
— اللہ تعالیٰ انسان پر اس کی خود ساختہ اور خود اختیاری پابندیوں کو دور کرتا ہے ۳۴۴
— اللہ تعالیٰ انسان کا خیر خواہ ہے، انسان کی بھلائی چاہتا ہے اور اس پر مہربان ہے ۳۴۶
— اللہ تعالیٰ انسان کے لیے اپنے قوانین میں نرمی کرنے اور خلاف ورزیوں پر بخشنے والا ہے ۳۵۵
— کائنات کے خالق کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۳۵۸
— اللہ تعالیٰ انسان کو بہترین احکام دیتا ہے ۳۶۲
— کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مکمل اور بے لاگ حکم ۳۶۵
— باہمی تنازعات میں آخری فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ہے ۳۶۸-۳۶۹
— رسول کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— سزا دینے سے چھوڑ دینا بہتر ہے کیونکہ ناجائز سزا دینا برا کام ہے ۳۸۴-۳۸۵
— اجتہاد کے لیے اہل ایمان کا حق ۳۶۵
— اجتہاد کی ضرورت اور حدود ۲۱۷-۲۱۸-۳۳۲-۳۳۳-۳۶۵-۵۰۱-۵۰۳
— نیک کام کا ارادہ کرنے کے بعد، عمل سے پہلے موت آجانے پر بھی اجر ملے گا ۳۸۷
— اصول قانون اور ان میں موجود حکمت ۴۰۵-۴۰۶
— عدل کے علم بردار رہنے کا ہر حالت میں حکم ہے، خواہ اس کی خود انسان کی ذات پر پڑے یا رشتہ داروں پر اور خواہ فریقین امیر ہوں یا غریب ۴۰۵-۴۰۶
— اسلام کے احکام اور بندشوں کی پابندی کا حکم ۴۳۷
— اشیا کی حرمت اور اجازت و عدم اجازت کی اصل بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے اور جو چاہے حکم دے سکتا ہے ۴۳۸
— قرآن کا اصول حلال و حرام ۴۴۵
— کوئی گروہ یا ریاست اہل ایمان سے دستور و قانون کے خلاف سلوک کرے تو جواباً اہل ایمان کو ایسی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے ۴۳۹-۴۴۰
— اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل نہ کرنا ایمان کی روش سے انکار ہے ۴۴۷
— اللہ تعالیٰ کے قوانین انسان کے لیے نعمت ہیں ۴۴۸-۴۴۹
— اللہ تعالیٰ انسان پر زندگی (سخت قوانین و احکام کے ذریعے سے) تنگ نہیں کرتا ۴۴۸-۴۴۹
— قانون سازی میں انسانی مجبوری کہ وہ اپنے لیے قوانین نہیں بنا سکتا کیونکہ معاملے کے تمام پہلو اس کے سامنے نہیں ہوتے ۴۵۲-۴۵۳
— قانون کے نفاذ و اطلاق میں لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے ۴۷۶ تا ۴۷۷
— قانون اسلام کے مطابق فیصلہ کرنے اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا حکم ۴۷۹
— قانون اسلام کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں ۴۷۴ تا ۴۷۶

— قانون کے استعمال میں زیادتی سے اجتناب کا حکم ۴۹۹
— تعمیل احکام میں وہ باتیں ہرگز نہ کرنی چاہییں جو اللہ تعالیٰ نے بیان نہ کی ہوں ۵۰۷-۵۰۸
— اللہ کے نام پر قانون بنانے والے کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں ۵۰۹
— اللہ کے بنائے ہوئے قانون پر عمل ایمان اور عقل کا تقاضا ہے ۵۰۹
— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ لاگو ہیں ۵۷۶
— شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک واعتراضات القا کرتے ہیں تاکہ احکام خداوندی میں شکوک وشبہات پیدا کریں ۵۷۷
— پرستش ہی میں شرک نہیں بلکہ خود ساختہ قوانین کی پیروی بھی شرک ہے ۵۸۶
— حلال وحرام کے قانون کی مجبوراً خلاف ورزی کی اجازت ہے جبکہ نافرمانی کا ارادہ نہ ہو ۵۹۲
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم ۶۰۰
— اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو ۱۵۵
— حدود اللہ کا لحاظ اور احترام کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے ۱۵۲
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں ۱۷۵
— اللہ تعالیٰ کے احکام کو کھیل بنانا ظلم ہے ۱۷۷
— وراثت، نکاح و طلاق اور رضاعت وغیرہ کے قوانین میں اسلام نے معروف (رائج طریقہ) کا خیال رکھا ہے ۱۸۰-۱۸۲
— اسلام نے اپنے تمام قوانین تدریجاً نافذ کیے ہیں ۲۱۷-۲۱۸-۳۳۲-۳۳۳-۳۶۵-۵۰۱تا۵۰۳
— جرم میں ارادے کی شمولیت ضروری ہے ۵۴۴
— قانونِ وراثت کی خلاف ورزی کرنے والے بچ نہیں سکتے ۳۳۰
— مجرم اگر اپنے پچھلے جرم پر توبہ کرے اور آیندہ کے لیے اصلاح کرلے تو وہ قابل رحم اور قابل معافی ہے ۳۳۱
— حرام قرار پانے والے اقدامات کا ماضی میں ارتکاب ہوا ہو تو اس سلسلے میں شریعت کا حکم ۳۵۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— مسافر اور بیمار کے لیے شریعت میں رعایت ۳۵۴-۳۵۵
— رعایتیں جو اللہ نے دی ہیں انھیں ضرور استعمال کرنا چاہیے ۳۹۰
— احکام وحدود الٰہی توڑتے ہوئے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے ہوئے دیر نہیں لگتی ۴۴۶
— اللہ کی کتابیں ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئیں انھی کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرو ۴۷۳

(۳۶) اضطرار

— حالت اضطرار میں اکل حرام اور اس کی شرائط ۱۳۵-۴۴۴-۵۷۶-۵۹۲
— شرعی رعایتیں ۳۵۴-۳۵۵-۳۹۰
— احکام کو نرم کرنے کی گنجائش ۱۴۳-۴۳۱
— کسی نئے قانون کے اطلاقِ ماضی کی شرعی حدود کیا ہیں ۳۳۵-۳۳۶-۵۰۳-۵۰۴
— اللہ تعالیٰ انسان پر احکام وہدایت کے ذریعے سے زندگی تنگ نہیں کرتا ۴۴۸-۴۴۹
— قانون کے استعمال میں زیادتی کیا ہے ۴۹۹
— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ لاگو ہیں ۵۷۶

(۳۷) اعتکاف

— حالت اعتکاف میں پابندیاں ۱۴۶-۱۴۷

(۳۸) اقامت دین

— اقامت دین کے لیے نماز اور صبر کی اہمیت اور باہمی تعلق ۷۳-۷۴
— اللہ کی مدد کا مفہوم ۲۵۶
— امر بالمعروف اور نہی عن المنکر موجب فلاح ہے ۲۷۸

— اہل ایمان پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری بحیثیت خیر امت ۲۷۹-۴۹۶
— اس کے حدود سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ۵۱۰
— اقامت دین ایمان کا تقاضا ہے ۲۸۱
— اہل کتاب پر اقامت تورات و انجیل کی ذمہ داری ۴۸۶
— ''عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ'' کا منشا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری کی نفی نہیں ہے ۵۱۰
— اقامت دین کے لیے مزاحمت ناگزیر ہے ۵۷۴-۵۶۸-۵۸۱-۵۸۸

(۳۹) اقامت صلوٰۃ

— (تفصیلات کے لیے دیکھو ''نماز'')

(۴۰) اقسام القرآن

— منصب رسول پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— کس نوعیت کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے؟ ۱۷۱
— قسم توڑنے پر کفارہ کے احکام ۱۷۱
— بندگانِ خدا کی بھلائی کے کاموں سے اجتناب کی قسم کھانا منع ہے ۱۷۱

(۴۱) اقوام

— جو اقوام اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد کھو دیتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سخت سزا پاتی ہیں ۷۰-۷۴-۸۰-۸۳-۸۶-۱۰۹-۱۶۱-۱۸۷-۴۵۸
— (مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''بنی اسرائیل'')

(۴۲) اللہ سبحانہ وتعالیٰ

— ایمان باللہ ۴۲۴
— اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا بیان
— رحمٰن ۴۳-۱۳۰
— رحیم ۴۳-۶۸-۷۶-۱۱۲-۱۲۱-۱۲۸-۱۳۰-۱۳۵-۱۵۰-۱۵۷-۱۶۷-۱۷۲-۲۴۵-۲۷۱-۲۸۷-۳۳۱-۳۳۹-۳۴۳-۳۶۸-۳۸۶-۳۸۷-۳۹۴-۳۹۵-۴۰۴-۴۱۴-۴۴۴-۴۶۶-۴۶۸-۴۹۰-۵۰۶-۵۴۴-۵۹۲-۶۰۷-
— رب ۷۵-۸۴
— قدیر ۵۶-۱۰۱-۱۰۳-۱۲۳-۲۰۱-۲۲۳-۲۴۳-۲۴۴-۳۰۱-۳۱۰-۴۰۴-۱۴۳-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۹-۵۱۷-۵۲۸
— علیم ۶۱-۶۴-۱۰۵-۱۱۲-۱۱۶-۱۲۸-۱۴۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۷-۱۸۵-۱۸۸-۱۹۶-۲۰۳-۲۰۷-۲۲۱-۲۲۲-۲۴۶-۲۶۵-۲۸۳-۲۸۵-۳۲۷-۳۲۹-۳۳۲-۳۴۱-۳۴۳-۳۴۷-۳۵۰-۳۸۳-۳۵۹-۴۱۲-۴۱۳-۴۲۷-۴۳۲-۴۴۹-۴۸۲-۴۹۱-۵۰۶-۵۶۰-۵۶۸-۵۸۱-۵۸۸
— حکیم ۶۴-۱۱۲-۱۶۱-۱۶۸-۱۷۴-۱۸۳-۲۰۱-۲۳۳-۲۳۹-۲۶۱-۲۸۷-۳۲۷-۳۳۲-۳۴۱-۳۴۳-۳۶۱-۳۸۳-۳۹۳-۴۰۴-۴۲۰-۴۲۶-۴۲۷-۴۶۸-۵۱۷-۵۲۸-۵۵۲-۵۶۰-۵۸۱-۵۸۸
— تواب ۶۷-۷۶-۱۱۲-۳۳۱-۳۶۸
— رب العالمین ۴۳-۳۶۲
— مالک یوم الدین ۴۴
— عظیم ۷۵
— ذو الفضل العظیم ۱۰۱
— واسع ۱۰۵-۱۸۸-۲۰۳-۲۰۷-۲۶۵-۴۰۴-۴۸۲
— سمیع ۱۱۲-۱۱۶-۱۴۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۸۵-۱۹۶-۲۴۶-۲۸۵-۳۶۲-۴۰۵-۴۱۳-۴۹۱
— عزیز ۱۱۲-۱۶۱-۱۶۸-۱۷۴-۱۸۳-۲۰۱-۲۳۳-۲۳۹-۲۶۱-۲۸۷-۳۶۱-۴۲۰-۴۲۶-۴۶۸-۵۱۷
— رؤف ۱۲۱-۱۵۹
— شاکر ۱۲۸

— غفور ۱۳۵- ۱۵۰- ۱۵۷- ۱۷۶- ۱۷۱- ۱۷۲- ۱۸۱- ۲۴۵- ۲۷۱- ۲۸۷- ۲۹۷- ۳۳۹- ۳۴۳- ۳۵۵- ۳۶۸- ۳۸۷- ۳۹۴- ۳۵۹- ۴۰۴- ۴۱۴- ۴۴۴- ۴۶۶- ۴۶۸- ۴۹۰- ۵۰۶-۵۰۷-۵۴۴-۵۹۲-۶۰۷
— حلیم ۱۷۱-۱۸۱-۲۰۴-۳۳۰-۵۰۷
— بصیر ۱۷۹-۱۸۲-۲۰۵-۳۶۲-۴۰۵
— خبیر ۱۸۰- ۲۰۸- ۳۰۶- ۵- ۳۵۰- ۳۸۵- ۴۰۶-۵۲۸-۵۵۲-۵۶۸
— الحی ۱۹۳-۲۳۱
— قیوم ۱۹۳-۲۳۱
— العلی ۱۹۵
— عظیم ۱۹۵
— غنی ۲۰۴-۲۰۷-۴۰۴
— حمید ۲۰۷-۴۰۴
— عزیز ذوانتقام ۲۳۳-۵۰۵
— وہاب ۲۳۵
— شدید العقاب ۲۳۶
— بصیر بالعباد ۲۳۸-۲۴۱
— الرؤف بالعباد ۲۴۵
— سمیع الدعا ۲۴۸
— خیرالماکرین ۲۵۷
— ذوالفضل العظیم ۲۶۵-۳۰۴
— محیط ۲۴۸
— لطیف ۵۸۶
— مالک الملک ہے ۲۴۳
— وکیل ۳۰۳-۳۷۶-۴۰۴-۴۲۹-۵۶۸
— حسیب ۳۴۴-۳۷۸
— کبیر ۳۵۰
— علی ۳۵۰
— عفوا ۳۵۵-۳۸۷-۴۱۳
— محیط ۴۰۰
— شاکر ۴۱۲
— شدید العقاب ۴۴۰
— سریع الحساب ۴۴۶
— سریع العقاب ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا کوئی اور بات منسوب نہ کرو ۴۲۷
— اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی نہایت اہم سیاق وسباق کے حامل اور کہی گئی بات سے متعلقہ ہوتے ہیں ۴۴-۶۱
— اللہ تعالیٰ کی طاقت سے بڑھ کر کوئی طاقت والا نہیں ہے ۲۶۱
— اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے ۵۶-۱۳۲-۴۵۷- ۴۶۹
— تمام کائنات کا رب ہے ۴۳-۴۴
— اور کائنات کا واحد فرمانروا ہے ۱۰۲
— اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ۵۷-۶۱
— مشرق ومغرب سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ۱۱۸
— ساری طاقتیں اور اختیارات اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں ۱۳۲
— اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے ۳۶۱
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں، انسانوں کے اقرار و انکار سے اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۳۸۷
— اللہ تعالیٰ چاہے تو انسانوں کو ایک دوسرے سے بدل ڈالے ۴۰۴-۵۸۳
— اللہ تعالیٰ بس ایک ہی معبود ہے، وہ اس سے بالا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو، کائنات کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے ۴۲۹-۴۳۱
— اللہ تعالیٰ اگر زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کوئی امر مانع نہیں ہے ۴۵۷
— کائنات کی تمام موجودات کا مالک ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے ۴۲۹- ۴۳۱- ۴۵۸-۵۸۳
— اللہ تعالیٰ کائنات کے تمام حالات سے باخبر ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۵۰۵-۵۰۶

— کائنات کی سلطنت کا مالک ہے، جس کو چاہے معاف کردے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۴۶۹
— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا کامل اختیارات رکھتا ہے ۵۲۸
— اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ بدلنے کی طاقت اور اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۵۳۵
— اللہ تعالیٰ اگر انسان کی بینائی اور سماعت چھین لے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لے تو کون ہے جو یہ قوتیں واپس دلوا سکے۵۴۱
— اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جس کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۵۴۶
— زمین وسمندر میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، درخت سے گرنے والے ہر پتے کا اللہ کو علم ہے۵۴۶
— اللہ تعالیٰ کو زمین کے تاریک پردوں میں ایک ایک دانے کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی حد نہیں ہے۵۴۶
— اللہ تعالیٰ بار بار مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں ظاہر کرتا ہے تاکہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آجائے ۵۴۸
— اللہ تعالیٰ نے کائنات کو برحق پیدا کیا، اس کا مفہوم کیا ہے۵۵۱-۵۵۲
— اللہ تعالیٰ ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرے گا۵۶۵-۵۶۶
— اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا میں بہت فرق ہے ۵۷۲-۵۷۳
— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے۵۷۳-۵۷۵
— آخرت کا وعدہ یقیناً پورا ہوگا اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والا کوئی نہیں ہے۵۸۳
— اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کا کیا مقصد بیان کرتا ہے ۵۳۶-۵۳۷
— اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح دین کیا ہے؟۲۳۹-۲۴۰
— اللہ تعالیٰ کا مددگار ہونا۲۵۶
— اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا بیان۴۴
— اللہ تعالیٰ نے کن حدود کے اندر انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی دی ہے؟۲۵۶
— رضائے الٰہی صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۵۷۳-۵۷۵
— اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کا خالق ہے۵۷
— اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم و ادراک رکھتا ہے کیونکہ وہی تمام علوم کا سرچشمہ ہے۶۱-۵۴۶-۵۴۷
— اللہ تعالیٰ کائنات کی تمام حقیقتیں جانتا ہے جو ہم سے مخفی ہیں، جو کچھ ہم چھپاتے یا ظاہر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے۶۴
— جو اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور رسولوں کے دشمن ہیں اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے۹۷
— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت اور انعامات پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۱۰۱
— اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی خبر گیری اور مدد کرنے والا نہیں ہے۱۰۲
— اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرنے کا حکم ۱۱۶-۱۱۷
— اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۱۵۵
— اللہ تعالیٰ کی رحمت و مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی وسیع اور بے حساب ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۴۴
— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے لیکن ساتھ ساتھ درگزر کرنے والا اور رحم والا بھی ہے۵۰۶
— اللہ تعالیٰ مہربان و مشفق ہونے کے ساتھ منصف بھی ہے۴۴
— اللہ تعالیٰ انسان کی کرتوتوں سے بے خبر نہیں، اللہ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو، جو تجاوز کرتا ہے وہ ظالم ہے۱۷۵
— اللہ تعالیٰ انسان پر بڑا فضل و کرم کرتا ہے لیکن انسان ہی ناشکرا ہے۱۸۴

— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے رویوں پر گہری نظر رکھتا ہے ۲۳۸
— اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے غضب سے ڈراتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کا خیر خواہ ہے ۷۱-۷۲- ۳۴۵- ۳۴۶
— ایسے لوگ اللہ کے پیارے کیونکر ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام کی اطاعت سے انکار کریں ۲۴۵
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ فلاح کا راستہ درست اور صاف صاف نظر آ جائے ۲۷۷
— اللہ تعالیٰ کی تخلیقات عبث اور بے مقصد نہیں ہیں، اس حقیقت کو ہوش مند اور غور و فکر کرنے والے ہی پاتے ہیں ۳۱۰-۳۱۱
— اللہ تعالیٰ کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ ۳۵۲
— اللہ تعالیٰ اپنے قوانین میں نرمی کرنے والا اور خلاف ورزیوں پر بخشنے والا ہے ۳۵۵
— کائنات میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے ۳۵۸
— حقیقت جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا علم کافی ہے ۳۷۰
— روز قیامت کے ظہور میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا طے کردہ وعدہ ہے ۳۷۸-۳۷۹
— اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب میں یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کا ہر فعل اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ادا ہونا چاہیے ۴۰۴
— عزت کی طلب میں غیر مسلموں سے تعلقات رکھنے والے جان رکھیں کہ عزت صرف اللہ کے لیے ہے ۴۰۸
— اللہ تعالیٰ سے دھوکا بازی کرنے والے جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۴۰۹
— انسان اگر شکر گزار بندہ بنے تو اللہ تعالیٰ اسے خواہ مخواہ سزا نہیں دیتا کیونکہ وہ بڑا قدردان اور سب کے حال سے واقف ہے ۴۱۲-۴۱۳
— اللہ تعالیٰ حلیم و بردبار ہے جو مجرمین کو بھی رزق دیتا ہے اور درگزر کرتا ہے حالانکہ وہ سزا دینے کی مکمل قدرت رکھتا ہے ۴۱۳
— اللہ تعالیٰ محاسبہ کرنے میں چشم پوشی اور اعمال صالح کی قدر کرنے میں نہایت فیاض ہے ۴۱۲-۴۱۳
— اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے اس طرح ہم کلامی کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے ۴۲۵
— اللہ تعالیٰ کی قرآن مجید کے برحق ہونے پر گواہی ۴۲۶
— اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی سزا اور پکڑ بہت سخت ہے ۴۳۹-۴۴۰
— اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے احکام و قوانین کے ذریعے سے تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ آسانیاں پیدا کرے اور اپنی نعمت انسان پر مکمل کرے ۴۴۸- ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے ۴۵۱
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کو فتنے میں ڈالنے کا کیا مطلب ہے ۴۷۱
— جو پاک نہیں ہونا چاہتے اللہ تعالیٰ انھیں پاک نہیں کرتا اور جو چاہتے ہیں انھیں ضرور توفیق دیتا ہے ۴۷۱
— اہل ایمان کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بہترین فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے، یہ ہی تقاضائے ایمان ہے ۴۷۹
— جو اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھتا ہے اللہ اسے محبوب رکھتا ہے ۴۸۱
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام کی خلاف ورزی پر بدلہ لے گا کیونکہ وہ سب پر غالب ہے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے ۵۰۵
— اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے ۵۱۲
— اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۵۰۹
— اللہ تعالیٰ تمام پوشیدہ حقیقتیں جانتا ہے، وہ جانتا ہے

کہ انسان کے دل میں کیا ہے لیکن انسان نہیں جانتا کہ اللہ کے دل میں کیا ہے ۵۱۶

— اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کے کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے آثار کو جھٹلانے والے اندھے، بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں ۵۳۷

— اللہ تعالیٰ کا دامن رحمت نہایت وسیع ہے ۵۹۴

— اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور رحم و کرم کا شیوہ اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے ۵۴۴-۵۸۲-۵۸۳

— اللہ تعالیٰ ہی امر حق ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ مخالفین حق کو کتنی ڈھیل دینی ہے کیونکہ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶

— اللہ تعالیٰ نے تو حق بالکل واضح کر دیا ہے، انسان ضلالت پسندی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے ۵۴۵

— اللہ تعالیٰ اگر راہ نمائی نہ کرے تو انسان گمراہ ہو کر رہے گا ۵۵۹-۵۶۰

— اللہ تعالیٰ کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے اور کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے ۵۷۵

— اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے پر ہے اور کون بھٹکا ہوا ہے ۵۷۶

— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ وہ دنیا میں درست طرز عمل اختیار کرتے ہیں ۵۸۰

— اللہ تعالیٰ ایسی قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندوں پر اتمام حجت نہ کی گئی ہو ۵۸۲

— اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاؤ پیو اور ان میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو ۵۸۹-۵۹۰

— اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا، انکارِ آخرت اور شرک اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ۵۹۷

— اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے کیا پابندیاں عائد کی ہیں ۵۹۷-۶۰۱

— اللہ تعالیٰ سے کیے گئے اولین اور فطری عہد کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے ۶۰۱-۶۰۲

— اللہ تعالیٰ کی صریح نشانیاں آ جانے کے بعد ایمان لانا اور توبہ کرنا بے اثر ہو جاتا ہے ۶۰۳-۶۰۴

— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ہرگز ظالم نہیں ہے، یہ مصیبتیں اور ابتلا کی کیفیتیں انسان کا اپنا کیا دھرا ہے ۳۰۷

— اللہ تعالیٰ کی طاقت سب سے بالا ہے اور صرف اسی کی حکمت کا نظام اس دنیا میں رائج ہے ۲۶۱

(۴۳) الیاس علیہ السلام

— حضرت الیاس کی مظلومانہ جلاوطنی ۸۱

— ان کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے، اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۴۴) الیسع علیہ السلام

— اللہ تعالیٰ نے دین کی خدمت کے لیے انھیں چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۴۵) امامت

— منصب امامت پر مامور ہونے کے بعد امت محمد کو ضروری ہدایات ۱۲۵-۱۲۶

— امت محمد کی امامت کا اعلان ۱۱۹-۲۷۹

— اس منصب امامت کے لیے لفظ ''نعمت'' کا استعمال ۱۲۵

— اس منصب کے لیے ''ملک عظیم'' کے لفظ کا استعمال ۳۶۱

— اس منصب کے ساتھ اہل ایمان کو کیا اولین ہدایات دی گئیں ۱۲۵-۱۲۶

— امامت ظالموں کو نہیں مل سکتی ۱۱۰

— امامت صالحہ اور رزق دنیا کے استحقاق میں فرق ۱۱۱

— یہ ابراہیمؑ کے نطفے کی میراث نہیں بلکہ سچی اطاعت و فرمانبرداری کا پھل ہے ۱۰۹

— اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا

دیتا لیکن اختلاف مذاہب ہی میں انسانوں کے لیے آزمائش ہے ۴۷۷-۴۷۸

— امت محمد اللہ کے پیغمبروں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتی اور صرف اللہ کی مسلم ہے ۱۱۵-۱۱۶

— امت رسول اللہ کو احکام خداوندی پر عمل کرنے کا حکم تا کہ مخالفین کو اس اعتراض کا موقع نہ ملے کہ وہ خود حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں ۱۲۴

— امامت کے منصب سے بنی اسرائیل کی معزولی اور تبدیلی امامت ۱۰۹

— بیت المقدس بنی اسرائیل کو حاصل منصب امامت کی وجہ سے قبلہ تھا، جب امامت بنی اسماعیل کو دے دی گئی تو مکہ معظمہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا ۱۰۹-۱۱۰

— مشرکین مکہ بھی بنی اسرائیل کی طرح حق امامت کے لیے نااہل اور مستثنیٰ کر دیے گئے ۱۱۱

(۴۶) امانت

— امانت میں خیانت کرنے والا اپنی خیانت سمیت قیامت کو حاضر کیا جائے گا ۲۹۹

(۴۷) امتحان (آزمائش)

— دنیا کی زندگی میں آزمائش وامتحان کی کیا نوعیت ہے ۵۲۶

— دنیوی زندگی میں حقیقت پر پردہ ڈال کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کا سامان کیا ہے ۵۳۲

— اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر مختلف معاملات میں فوقیت دی ہے اس حقیقت میں ہر دو کی آزمائش ہے ۶۰۶

— اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے نتھار کر اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور کافروں کی سرکوبی کرتا ہے ۲۹۰

— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے لیکن اللہ کی رضا صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے ۵۷۳-۵۷۵

— انسان کے سامنے حق و باطل کے انتخاب کی آزادی ہے، یہی آزمائش ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتا ہے ۵۷۰تا۵۷۲

— تمام انسانوں کو راہ راست پر ڈال دینا اللہ کی حکمت کے خلاف تھا، انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے اسے طاعت و عصیان کی آزادی اور تصرف کے اختیارات دے کر اس کی سعی پر جزا و سزا کا ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے ۵۳۶

— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی گمراہی میں مبتلا نہ ہوتا ۵۷۰

— اللہ تعالیٰ ایسی قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندے حقیقت سے واقف نہ ہوں یعنی اتمام حجت نہ کیا گیا ہو ۵۸۲

— اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے پر ظلم کرتے ہیں اور غلط طرز عمل سے باز نہیں آتے ۲۷۹

(۴۸) امت وسط

— امت محمد کسی پیغمبر کی دعوت میں تفریق نہیں کرتی ۱۱۵-۱۱۶

— امت وسط کے اوصاف ۱۱۸-۱۱۹

— اس کی حقیقت ۲۷۰

— اقوام عالم کی صدارت کا منصب ۱۱۹

— دنیا میں بہترین گروہ جس کو انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے منصب پر سرفراز کیا گیا اور امامت عادلہ سپرد کی گئی ۲۷۹

— اس منصب کی پاسداری کرنے کی اہمیت ۱۷۷

(۴۹) امثال القرآن

دیکھو ”قرآنی تمثیلات“

— ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴

— احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے والوں کی مثال بے عقل جانوروں کی سی ہے ۱۳۳-۱۳۴

— انفاق فی سبیل اللہ کی بڑھوتری اور ضائع ہونے کی

الگ الگ مثالیں ۲۰۲-۲۰۵

— انفاق فی سبیل اللہ کے خسران اور بے فائدہ ہونے کی مثال، یہ ظلم نہیں ہوا بلکہ انھوں نے خود اپنے پر ظلم کیا ہے ۲۸۱-۲۸۲

— جو شخص حق کی موجودگی میں ضلالت و گمراہی اختیار کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو شیطان کے ہاتھوں صحرا میں بھٹک رہا ہو اور حیران و پریشان ہو حالانکہ اس کے ساتھی اسے حق کی موجودگی کی اطلاع کر رہے ہیں ۵۵۰

— ہدایت کی مثال زندگی اور حقیقت شناسی جبکہ گمراہی کی مثال مردہ اور جہالت کی ہے ۵۳۵-۵۳۶-۵۷۸

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ہدیہ یا تحفہ دے کر واپسی کا تقاضا کرنے والے کی مثال کتے کی دی ہے ۱۷۵

— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰

(۵۰) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

— بنی اسرائیل کی گمراہی کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہوں نے برے افعال سے ایک دوسرے کو روکنا چھوڑ دیا ۴۹۷

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اقامت دین‘‘ اور ’’دعوت حق‘‘)

(۵۱) انبیائے کرام

— انبیائے کرام کا دائرۂ کار ۱۲۵

— انبیائے کرام کے تین کام ہیں اور ان کی دعوت سہ رخی ہے ۲۵۴-۴۲۵ تا ۴۲۷

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ وہی تھا جو سابقہ انبیائے کرام کا تھا ۱۰۹-۲۲۸

— اسلام تمام انبیائے کرام کا دین تھا ۱۱۳-۱۶۳-۲۲۸-۲۴۰-۲۷۰-۴۷۳

— تمام انبیائے کرام کی دعوت ایک ہی تھی جو رب کی طرف سے آئی امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میں تفریق نہیں کرتی اور صرف اللہ تعالیٰ کی مسلم ہے ۱۱۵-۱۱۶

— تمام انبیائے کرام پر ایمان لانا ضروری ہے ۱۱۵-۱۱۶-۲۲۳-۲۷۰

— انبیائے کرام کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب ۱۱۶

— انبیائے کرام ایک ہی سلسلے کے لوگ تھے ۲۴۶

— ان سب نے ایک ہی قوانین پیش کیے ۳۴۳

— وہ سب اذن الٰہی سے ’’مطاع‘‘ بن کر آئے ۳۶۸

— وہ باہم تردید کرنے والے نہیں بلکہ تصدیق کرنے والے تھے ۲۵۳-۴۷۵

— سب کے سب صالح تھے ۵۶۱

— انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کی ۵۶۱

— انبیائے کرام معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں ۵۶۰-۵۶۱

— انبیائے کرام کے لیے نادان لوگوں کا باطل تصور کہ انھیں بشری تقاضوں سے ماورا ہونا چاہیے اور عجائب وغرائب ان سے صادر ہونے چاہییں ۵۴۲

— انبیائے کرام کو ایمان بالشہادۃ سے سرفراز کیا جاتا ہے ۲۰۲

— قرآن میں تمام انبیائے کرام کا تذکرہ نہیں ہے ۴۲۵

— تمام انبیائے کرام ’’سواء السبیل‘‘ کو واضح کرتے ہیں ۴۵۳

— اللہ تعالیٰ نے انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی ۵۶۱

— انبیائے کرام پر تلاش حق میں شرک کا الزام اور اس کی بھرپور قرآنی تردید ۲۶۸-۵۶۱

— کوئی نبی خائن نہیں ہو سکتا ۲۹۹

— انبیائے کرام کے لیے کتاب، حکم اور نبوت کے سہ گونہ عطیات ۲۶۷-۵۱۳-۵۶۱

— انبیائے کرام پر نزول وحی کے دلائل ۵۶۴

— انبیائے کرام اس قوم سے اٹھائے جاتے ہیں جس کی دعوت پر وہ معمور ہوتے ہیں ۵۸۱

— ان کی بعثت کی غرض کیا تھی؟ ۱۶۲-۴۲۵

— دعوتِ حق کے لیے ان کی جدوجہد ۱۶۳
— ان کے مراتب ۱۹۲
— ان کا کام اور ان کی حیثیت ۲۰۹
— الٰہی ہدایت کے اولین مسلم ۲۲۳
— ان کی ذمہ داری ۲۴۱
— اللہ کی اطاعت کے ساتھ ان کی اطاعت کا مطالبہ ۲۴۵
— وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے بجائے اپنی بندگی کی دعوت نہیں دے سکتے ۲۶۷
— عہد جو انبیائے کرام سے لیا گیا ۲۶۸-۲۶۹
— ان کا اذیتوں پر صبر کرنا ۵۳۴
— ان کی آمد پر نزول مصائب کی حکمت ۵۴۰
— حضرت ابراہیم کے بعد یعقوبؑ و اسحاقؑ کی نسل بنی اسرائیل کو دنیا کی امامت سونپی گئی ۱۰۹
— حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوبؑ یہودی اور نصرانی نہ تھے ۱۱۷
— حضرت آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آل عمران کا رسالت کے لیے چنا جانا اور سارے زمانے پر انھیں ترجیح دی گئی ۲۴۶
— وہ آخرت میں اپنی اپنی قوموں کی گواہی دیں گے ۳۵۳-۵۱۲
— انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کی باہمی رفاقت ۳۷۵
— انبیائے کرام کی امتوں کا بگاڑ ۱۹-۲۸۷
— ان کی مخالفت کفر ہے ۹۷
— بکثرت انبیائے کرام کو جھٹلایا گیا ۳۰۸-۵۳۴
— ان کی نافرمانی کا اخروی انجام ۳۵۳-۵۲۶
— دعوت انبیائے کرام کے اولین مخالف امرا و روٴسا ہوتے ہیں ۵۷۹
— بکثرت انبیائے کرام کا مذاق اڑایا گیا ۵۲۶
— ان کی دعوت سے شیاطین جن و انس کی دشمنی ۵۷۲-۵۷۳
— ان کا نیک کرداروں کے لیے بشیر اور بدکرداروں کے لیے نذیر ہونا ۵۴۱
— ان کے طریقوں سے ہٹ جانا ضلالت و گمراہی ہے ۵۵۳
— حضرات انبیائے کرام کی بعثت تمام بندوں پر اتمام حجت ہے ۴۲۶-۵۸۲
— انبیائے کرام توہمات، قانونی موشگافیوں اور شریعت الٰہیہ میں اضافی حلال و حرام کے بے جا قیود کو درست کرتے ہیں ۲۵۴

(۵۲) انجیل

— خدا کی طرف سے ہدایت دینے والی کتاب ۲۳۱
— انجیل راہ نمائی اور روشنی کا سرچشمہ تھی اور لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۷۵
— قرآن کس انجیل کی تصدیق کرتا ہے؟ ۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی ہے ۴۷۴-۴۷۵
— انجیل میں بھی تورات کی طرح یہی حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون ہی کے مطابق فیصلہ کرو ۴۷۵
— قرآن اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— قرآن مجید حق لے کر آتا ہے اور اپنے سے پہلے آنے والی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۱-۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کو کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم دی گئی تھی ۵۱۳
(مزید دیکھو ”نبوت“)

(۵۴) انسان

— نسل انسانی کی ابتدا اور حضرت آدم کی تخلیق ۶۳-۶۹-۷۰
— اللہ تعالیٰ کو دنیا میں بحیثیت خلیفۃ اللہ اتارا گیا اور اس کی حیثیت اور حقیقت سے آشنا کروا دیا گیا اور درست اور غلط رویوں کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے ۱۷تا۱۹

— انسان کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت و بندگی کرنی چاہیے کیونکہ وہ اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے ۶۱ تا ۶۹
— انسان کو خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا گیا ۶۳-۶۴
— انسان نے اپنی زندگی کا آغاز درست سمت میں ہدایت کے ساتھ کیا، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— انسان کا اپنے خدا سے فطری عہد ۶۰۰
— انسان اگر نیک نیتی سے اصلاح کا طالب ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ نکال دیتا ہے ۳۵۰
— اس شخص سے بہتر کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا ہو، نیک رویہ اختیار کرے اور یکسو ہو کر حضرت ابراہیمؑ کا طریقہ اختیار کرے ۴۰۰
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہل ایمان سے لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴
— اللہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدا ایک متنفس سے کی پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور اس کے سونپے جانے کی جگہ ہے ۵۶۶
— کائنات میں انسان کی حیثیت ۱۷-۶۲-۱۹۲-۱۹۳
— انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت ۱۷- ۱۶۰-۲۰۸-۲۹۲-۳۰۹-۵۳۳
— تمام انسان ایک اصل سے ہیں لہٰذا حقوق و فرائض میں برابر ہیں ۳۱۹
— انسان کی تخلیق پر فرشتوں کا اولین اعتراض ۶۳-۶۴
— انسان اور فرشتوں کے علم کا تقابل ۶۴
— انسان کی عقل و خرد اور ہوش مندی سے اپیل ۱۳۹-۱۵۵
— دنیا میں انسان کے لیے صحیح اور غلط رویے اور ان کا انجام ۱۷
— زمین پر انسان کی زندگی کا آغاز جہالت نہیں، علم کی روشنی میں ہوا ۱۷-۶۸-۱۶۲
— اللہ سے انسان کے تعلق کی نوعیت اور انسان کی اصل ۱۷-۶۲-۳۱۹
— انسان کا اصل مذہب اسلام تھا مگر بھٹکنے کے وجوہ ۱۷-۱۸
— انسان کی خلافت پر فرشتوں کا اعتراض ۶۲-۶۴
— انسان کو ودیعت کیے گئے علم اور انسانی خلافت کی حقیقت ۶۴
— انسان کے ازلی گناہگار ہونے کا غلط تصور ۶۸
— انسان کی نجات اور ہلاکت کا مدار کن چیزوں پر ہے؟ ۶۸-۸۲-۱۱۸-۱۶۰
— انسان کا علم دوررس نتائج پر حاوی نہیں، اس کی وجہ سے احکام کے تمام مصالح کو سمجھ نہیں سکتا ۱۶۴
— خدا کی اطاعت میں انسان کا اپنا فائدہ ہے اور حکم عدولی پر اپنا ہی نقصان ہے ۵۸۲
— اللہ تعالیٰ اپنی لامحدود رحمت و کرم کے ساتھ انسان کی طرف متوجہ ہے، وہ علیم و دانا ہے اور اس کے قانون سے بہتر قانون انسان کو کون دے سکتا ہے ۳۴۳
— قوانین خداوندی انسانوں کے لیے نصیحت ہیں جن پر انسان کو ہر دم شکرگزاری کا رویہ اپنانا چاہیے ۴۴۸-۴۴۹
— انسان اپنے لیے قانون نہیں بنا سکتا کیونکہ معاملے کے سارے پہلو اس کے سامنے نہیں ہوتے ۴۵۲-۴۵۳
— شیطان انسان کو درست رویہ اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ کر رہے ہو بالکل ٹھیک ہے ۵۴۰
— شیطان صفت انسان ہمیشہ ہی حق کے مخالف رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— انسان سے اللہ کے تعلق کی نوعیت ۱۷
— اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی ذمہ داری حسب استطاعت ہے ۲۲۴
— انسان کے نفس میں توحید کی شہادت ۵۳۹-۵۴۰

— اس کے لیے سامان ہدایت فراہم کرنا اللہ کی مہربانی ہے ۵۸۲
— اللہ کے ہاں انسانوں کے مختلف درجات بلحاظ عمل ۵۸۲
— اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرح انسان کو پیدائشی راست رو نہیں بنایا ہے ۵۹۶
— انسان پر فطرتاً اللہ تعالیٰ کے حقوق عائد ہوتے ہیں ۶۰۰
— انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت کا نظام ہدایت و ضلالت ۵۳۶ تا ۵۳۸
— انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اہمیت ۵۹۷-۶۰۱
— انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات ۵۷-۶۰-۶۱-۱۸۴-۲۳۸-۳۴۶-۵۶۳
— انسان کتنا نافرمان ہے کہ اپنے خالق رب سے کفر کرتا ہے جو اسے بے جان سے جاندار بناتا ہے پھر موت دیتا ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے ۶۰-۶۱
— انسان بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— انسان اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد جب کھو دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سخت سزا پاتا ہے ۱۶۱
— اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے فضل و کرم کے ساتھ متوجہ ہے لیکن انسان ہی ناشکرا ہے ۱۸۴
— اللہ تعالیٰ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک خاص حد تک غلبہ و اقتدار حاصل کرنے دیتا ہے ۱۹۱
— انسانوں کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے عین مطابق ہیں ۱۹۲-۱۹۳
— انسان پر ہر دم اللہ تعالیٰ کی نظر ہے ۲۳۸
— اللہ تعالیٰ انسان کو خود سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے ۲۴۵
— اللہ تعالیٰ انسان کا خیر خواہ ہے، انسان کی بھلائی چاہتا ہے اور اس پر مہربان ہے ۳۴۶
— اللہ تعالیٰ چاہے تو انسانوں کو دوسرے گروہوں سے بدل دے کیونکہ وہی کائنات کا واحد مالک و کارساز ہے ۴۰۴
— انسان کا ہر فعل اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ادا ہونا چاہیے، یہ ہر کتاب میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات رہی ہیں ۴۰۴
— اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو راست رو بنا سکتا تھا لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی، اس نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق بنایا جس کو تصرف کے اختیارات طاعت و عصیان کی مکمل آزادی کے ساتھ دیے اور اس کی دنیوی سعی کے مطابق جزا و سزا کا ایک دن مقرر کیا ۵۳۶
— اللہ تعالیٰ انسان کو کبھی خوشحالی اور کبھی مصائب سے آزماتا ہے ۵۴۰
— مصائب و آلام میں اللہ تعالیٰ کی عاجزی اختیار کرنی چاہیے ۵۴۰
— انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کی پاداش میں جب پکڑتا ہے تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے ۵۴۰-۵۴۱
— اگر اللہ تعالیٰ انسان کی بینائی، سماعت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لے تو کون انسان کو یہ واپس دلا سکتا ہے ۵۴۱
— انسان اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونے کے وعدے پر اپنی جان بچاتا ہے لیکن پھر دوسروں کو شریک کرنے لگ جاتا ہے ۵۴۷-۵۴۸
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذہانت کے ہتھیار اور تصرف کے اختیارات دیے اور آزادی و اختیار کے ان اختیارات میں انسان کی آزمائش ہے ۵۶۳-۵۷۰
— انسانی مساوات کا اسلامی تصور ۳۱۳
— شریعت میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ۳۴۴
— انسان کی اجتماعی زندگی میں فطری نامساوات ۳۴۷-۳۴۸

— انسانی مسائل کی پیچیدگیاں اور انسان کی فطری کمزوریاں ۴۵۲
— انسانی تاریخ کا عدم توازن ۴۵۲
— انسان فطرتاً راہِ راست کا طالب ہے ۴۵۳
— انسانی تاریخ کے متعلق ’’جدلی عمل‘‘ کا غلط نظریہ ۴۵۳
— دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ ۶۲ تا ۷۰
— تاریخ انسانی میں پہلا واقعہ قتل ۴۶۲
— انسان کی بقا اور امن کے لیے احترام جان کی اہمیت ۴۶۴
— قتل انسانی اور خودکشی کی ممانعت ۳۴۵-۳۴۶-۴۶۴
— انسان کی زندگی میں حق و باطل کی کشمکش ۴۶۶
— انسانی معاشروں اور قوموں کا بگاڑ ۴۹۶
— انسان کا صحیح معیار قدر و قیمت ۵۰۶
— انسان کی دنیوی زندگی کے متعلق تین اہم حقیقتیں ۶۰۶
— انسان کی تخلیق اور افزائش نسل میں اسباق حقیقت ۵۱۷
— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم ہونا ۶۰۴
— معاشرے کے روابط توڑنے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— ہدایت و ضلالت کا مکمل انحصار انسان کی اپنی سعی، طلب اور چاہت پر ہے ۴۱۰-۴۱۱
— انسان کا جسم ارضی اجزا پر مشتمل ہے ۵۲۳
— انسان کے لیے دنیا میں قیام کی مدت مقرر ہے ۵۲۳
— اس کا اصل ٹھکانا عالم آخرت میں ہے ۵۳۳-۵۳۴
— انسان اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے جو کچھ بھی کرے گا اسے آخرت میں پائے گا کیونکہ انسان کا اچھا برا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا ۱۰۳
— انسان کو اس حقیقت پر غور و غوض کرنے کی فہمائش کہ اگر اس کی زندگی بھر کی کمائی عین بڑھاپے میں غارت ہو جائے، اس لیے اسے ہر دم آخرت کی فکر کرنی چاہیے ۲۰۶-۲۰۸
— کائنات میں ہر طرف پھیلی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں انسان کو حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں، بشرطیکہ انسان اللہ کو یاد کرنے والا ہو، ہوش مند ہو اور غور و فکر کا مادّہ رکھتا ہو ۳۱۰-۳۱۱
— تمام انسانوں کو ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۳۷۹
— ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو کر انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸
— نفس انسان کو تنگ دلی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن انسان اگر احسان اور خدا ترسی کا رویہ اپنائے تو اس کے لیے بہتر ہے ۴۰۲-۴۰۳
— انسان اپنی ضلالت پسندی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے، یہ نہیں کہ اس پر حق و ہدایت واضح نہیں کی گئی ۵۴۵
— ابتدائے آفرینش میں انسان سے لیے گئے فطری عہد کو توڑنے والے سراسر خسارے میں رہیں گے ۶۰
— انسان اور شیطان ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں ۶۷
— انسان کا شیطان کے ہاتھوں میں کھیلنا ۵۸۰
— حق کو رد کر کے انسان اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے ۵۳۲
— پوری نسل انسانی ایک ہی متنفس سے پیدا ہوئی ہے ۵۶۶
— انسان کا علم سے ہٹ کر قیاس آرائیوں میں مبتلا ہونا ۵۷۵ تا ۵۷۷
— انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا گیا ۶۳-۶۴
— انسانی زندگی کو منضبط رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا پابندیاں عائد کی ہیں ۵۹۷-۶۰۱

(۵۴) انصاف

— اللہ تعالیٰ صرف مہربان ہی نہیں، منصف (انصاف پسند) بھی ہے ۴۴

— اللہ تعالیٰ اپنی بات میں سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے اور کوئی اس کے فرامین کو بدلنے والا نہیں ۵۷۵
— جو شخص اپنے حکمران کو حصول انصاف میں دھوکا دیتا ہے وہ خود اپنے آپ کو غلط فہمی اور دھوکے میں مبتلا کرتا ہے ۳۹۶-۳۹۷
— مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ ہمیشہ جو بھی فیصلہ کرنا ہو انصاف اور عدل کے ساتھ کرو ۳۶۳
— اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید حق کے ساتھ نازل کیا تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے ۳۹۲-۳۹۳
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ۴۷۶-۴۷۷
— انصاف کے ساتھ گواہی دینے، عدل میں گروہی دشمنی کو الگ رکھنے اور صاف ستھرا عدل کرنے کا حکم جو خدا ترسی کے قریب ہے ۴۴۹
— یہودیوں کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور حرام کا مال کھانے والوں میں سے ہیں ۴۷۱
— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک اگرچہ معاف ہے ۶۰۰
مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''عدل''

(۵۵) انعام الٰہی

— حقیقی اور ظاہری انعامات کا فرق ۴۵
— اللہ کی نعمت کو شقاوت سے بدلنے کی سزا ۱۶۱
— انبیائے کرام، صدیقین، شہدا اور صالحین کا انعام یافتہ ہونا ۳۷۰
— وہ اطاعت خداوندی اور اطاعت رسول سے مشروط ہے ۳۷۰
— نعمت تمام کرنے کا مفہوم ۴۴۹
— بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ۴۵۸

(۵۶) انفاق فی سبیل اللہ

— نظام دین میں انفاق کی اہمیت، یہ اہل ایمان کی لازمی صفت ہے ۵۰
— انفاق فی سبیل اللہ کے راستے ۱۳۷
— انفاق سے باز رہنا اجتماعی ہلاکت کا موجب ہے ۱۵۳
— اللہ تعالیٰ جو فیاض اور اپنی مخلوق پر ہر وقت عطا اور بخشش کرتا ہے اور ایسی صفت والوں ہی کو پسند کرتا ہے ۲۰۷
— انفاق کے اوصاف کیا ہیں؟ ۲۰۹-۲۱۰
— فیاض اور زر پرست کرداروں کا تقابل ۲۱۰-۲۱۷
— انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں اور سود خواری کرنے والوں کے کرداروں کا نمونہ ۲۸۷-۲۸۸
— اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق (انفاق فی سبیل اللہ) بھی اس میں ادا کرو ۵۸۹-۵۹۰
— کیا خرچ کیا جائے اور کن مصارف پر کیا جائے؟ ۱۶۴
— بچتوں کے خرچ کرنے کا حکم ۱۶۷
— اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دینے کا مفہوم ۱۸۵-۴۵۱
— اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کا پھلنا پھولنا ۱۸۵-۲۰۲-۲۰۵
— انفاق فی سبیل اللہ آخرت میں ذریعہ نجات ہوگا ۱۹۳
— انفاق فی سبیل اللہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے ۲۰۲-۲۰۳
— انفاق فی سبیل ''من واذیٰ'' سے پاک ہونا چاہیے ۲۰۳
— ریاکارانہ انفاق کا انجام بد ۲۰۴-۲۰۶-۳۵۲-۳۵۳
— انفاق فی سبیل اللہ اچھے مال میں سے ہونا چاہیے ۲۰۶
— انفاق فی سبیل اللہ علانیہ بھی کیا جائے اور اخفا کے ساتھ بھی ۲۰۸-۲۱۰
— انفاق برائیوں کے دور کرنے کا ذریعہ ہے ۲۰۸
— انفاق فی سبیل اللہ میں انسان کا اپنا بھلا ہے ۲۰۹
— انفاق کے ذریعے سے غیر مسلموں کی اعانت کا حکم ۲۰۹
— انفاق کے ذریعے سے مالی اعانت کے سب سے

زیادہ مستحق کون لوگ ہیں؟ ۲۱۰
— انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی، روحانی، معاشی اور تمدنی نتائج کا موازنہ ۲۱۴-۲۱۶
— انفاق نیکی کے دروازے کی کنجی ہے ۲۷۲
— انفاق میں عزیز ترین مال خرچ کرنے کا حکم ۲۷۲
— اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی کرنا شرمناک طرزِ عمل ہے ۲۰۷-۳۰۶
— صدقہ بطور کفارہ ۴۷۴-۵۰۰
— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ و خیرات کرے اور ان کا احسان جتا کر اور دکھ دے کر انھیں ضائع نہ کرے ۲۰۴

(۵۷) اولی الامر

— اللہ ہی مالک الملک ہے ۲۴۳
— اللہ تعالیٰ حکمرانوں کو حکمت اور جن جن چیزوں کا چاہتا ہے علم دیتا ہے ۱۹۱
— اولی الامر ہر ایک شخص کو شریک مشورہ رکھتا ہے اور پھر عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے قدم اٹھالیتا ہے ۲۹۸
— اولی الامر امانت دار ہوں اور امانت و دیانت سے فیصلے کریں ۳۶۲-۳۶۳
— صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کے حامل افراد اس قابل ہیں کہ اختیارات ان کے پاس ہوں ۳۷۷
— قرآن میں بتائے گئے راہِ راست کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرنے کا حکم ۳۹۳-۳۹۴-۳۹۶
— اللہ کی حکومت میں کسی کا حصہ نہیں ہوسکتا ۳۶۰
— دنیوی حکمران اس زعم میں مبتلا ہیں کہ تمدنی معاملات میں فرمانروائی کے مکمل اختیارات رکھتے ہیں ۱۹۸-۱۹۹
— جب انھیں زمین میں اقتدار مل جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ انھیں کچھ نہیں آتا ۱۵۹
— اسلام میں اولی الامر کی اطاعت کا وجوب ۳۶۴-۳۶۵
— اولی الامر کی اصطلاح کا درست مفہوم ۳۶۴
— اولی الامر کی اطاعت مشروط ہے ۳۶۴
— اس بارے میں احادیث نبوی کی تصریحات ۳۶۴-۳۶۵
— اس حوالے سے علماو مشائخ کی ذمہ داریاں ۴۸۴

(۵۸) اوہام جاہلیت

— اوہام جاہلیت کی اصل جڑ ۵۸۵
— عربوں کے مشرکانہ توہمات کا تجزیہ کرنے کے لیے قرآن کا ایک اہم سوال ۵۹۰-۵۹۱
— حلت و حرمت کے مشرکانہ وہمی تصورات ۵۸۸
— چاند کی حرکات سے شگون لینا ۱۴۸
— حج سے گھروں کو لوٹتے ہوئے گھروں میں داخل ہونے کا غیر معقول طریقہ ۱۴۸-۱۴۹
— قریش ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کرنے کو گناہ تصور کرتے تھے ۱۵۵
— سفرِ حج میں کسب معاش کو ممنوع اور دنیادارانہ فعل سمجھنا ۱۵۶
— حج کے خاتمے پر مشرکین کا بھرے مجمعوں میں اپنے باپ دادا کے کارنامے بیان کرنا ۱۵۷
— حالت حیض کے متعلق غلط تصورات ۳۴۵
— منہ بولے رشتوں کے لیے میراث میں حصہ ۳۴۸
— ٹونوں، ٹوٹکوں، فال گیریوں اور شگونوں کا رواج ۳۵۹-۴۴۲
— مشرکانہ عقائد کے تحت جانوروں کے کان چیر کران کو دیوتاؤں کے نام پر پن کرنا ۳۸۹
— بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام ۵۰۹
— فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا ۵۶۸
— مشرکانہ عقائد اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز کی رسوم ۵۸۴-۵۸۵-۵۸۹
— قتل اولاد ۵۸۵-۵۸۶-۵۸۸

(۵۹) اہل کتاب

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''عیسائی'' اور ''یہودی'')

— ان کے صالحین کا رویہ ۱۰۷-۲۸۰-۳۱۳
— ان میں سے قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے دہرا اجر ۳۱۴
— مسلمانوں کے لیے ان کے ذبیح کی حلت ۴۴۶
— مسلمانوں کے لیے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت ۴۴۶-۴۴۷
— ان پر بعثت محمدیؐ کے ذریعے سے اتمام حجت ۴۵۸
— ان پر اقامت تورات وانجیل کی ذمہ داری ۴۸۶
— قرآن کا دعویٰ کہ اہل کتاب توحید کی صداقت کو خوب پہچانتے ہیں ۵۲۹
— قرآن کا دعویٰ کہ اہل کتاب قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونا خوب جانتے ہیں ۵۷۵
— مذہبی راہ نمائی کے لیے اہل عرب کا اہل کتاب کی طرف رجوع کرنا ۵۶۲
— اہل کتاب کو راہِ راست پر لانے کے لیے قرآن کی کوشش ۷۰-۸۲
— اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد پورا کرنے کی فہمائش ۷۱
— بنی اسرائیل کو کتاب عطا کرتے ہوئے ان سے کیا وعدہ لیا گیا تھا ۸۳
— اہل کتاب سے فہمائش کہ اگر تم رسول اللہ پر ایمان لاتے ہوتو یہ تمہارے لیے ہی بہتر ہوتا ۲۷۹
— تمام اہل کتاب یکساں نہیں ہیں، ان میں سے راہِ راست پر قائم عابد وزاہد بھی موجود ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں مصروف رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے صالح اہل کتاب کی قدر کرتا ہے ۲۸۱
— اہل کتاب کے نیک عنصر کے لیے بھی آخرت میں نیک انجام ہے ۳۱۳-۳۱۴-۴۸۸
— اہل کتاب اگر ایمان کا رویہ اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر دنیا وآخرت میں مہربان ہوجاتا ۴۸۶-۴۸۷
— کاش! اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو قائم کیا ہوتا تو زمین وآسمان سے ان پر رزق اور رحمت کی بارش ہوتی ۴۸۶-۴۸۷
— اہل کتاب میں سے نیک لوگوں کی صفات اور ان کا انجام خیر ۴۹۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور بعد میں مدینہ آمد پر مدینہ کے اہل کتاب کی دینی اور اخلاقی حالت کیسی تھی؟ ۴۶-۴۷
— اہل کتاب میں سے بہت کم لوگ احکام الٰہی میں خیانت کے عیب سے بچے ہوئے ہیں ۴۵۴
— یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ دین اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کریں جس کے لیے وہ سوال وجواب کرتے رہتے تھے ۱۰۳
— اہل کتاب کا زعم کہ نجات انھی کا اجارہ ہے ۱۰۳-۱۰۴
— ان کے مفسد گروہ کا رویہ ۱۰۶
— ان کے علما کی حق پوشی اور فرقہ بندی اور جانتے بوجھتے حق کی مخالفت ۱۱۸-۱۲۲-۱۲۳-۲۴۱-۲۴۲-۳۵۶-۴۸۴
— آخرت سے متعلق ان کے عقیدے کی خرابی ۲۴۲
— ان کی کج بحثیاں ۲۶۲
— ان کا آیات الٰہی سے انکار ۲۶۳
— دعوتِ اسلامی کے خلاف ان کی چال بازیاں ۲۶۴
— اہل ایمان کو ان سے تکلیف دہ باتیں سننی پڑتی تھیں ۳۰۹
— اہل کتاب کا اللہ کی کتابوں کو پس پشت ڈالنا اور بیچنا ۳۰۹-۳۱۰
— اہل کتاب کی منقبت پسندیاں ۳۱۰
— اہل کتاب کو پاکیزگی اور تقویٰ کا زعم تھا ۳۵۹
— اہل کتاب کی فال گیری اور ٹونے ٹوٹکوں میں دلچسپی ۳۵۹
— اہل کتاب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مضحکہ انگیز مطالبات ۴۱۵
— اہل کتاب کا کھلی نشانیوں کے بعد بھی شرک کرنا ۳۵۸ تا ۳۶۰-۴۱۵

— اہل کتاب کا دین میں غلو ۴۲۷-۴۹۱
— ان کا اذان کا مذاق اڑانا ۴۸۳
— ان کی اکثریت کا بدعمل ہونا ۴۸۷
— اقامت تورات و انجیل کے بغیر اللہ کے نزدیک ان کا دین داری کا دعویٰ بے معنی ہے ۴۸۶-۴۸۷
— کلام اللہ میں تحریف سے کیا مراد ہے جس کے اہل کتاب مجرم تھے ۸۷
— حاملین کتب اقوام نے جانتے بوجھتے محض ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے کتاب اللہ کے مطلوبہ طرز عمل سے الگ راستہ اختیار کیا ۲۳۹-۲۴۰
— اہل کتاب یاد رکھیں کہ گمراہی کی طرف دوسروں کو مائل کرنے والے اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۲۶۳
— یہودیوں کی اخلاقی حالت کہ پرلے درجے کے بے اعتبار ہیں اور فوراً ہی بدنیت ہو جاتے ہیں ۲۶۵-۲۶۶
— یہودیوں کا کتاب اللہ (تورات) میں تحریف کرنا ۲۶۷
— انبیائے کرام اور ان کے ذریعے سے ان کی امتوں سے لیا گیا فطری عہد کہ ہر آنے والے نبی کی تعلیمات کی تصدیق کریں گے لیکن اہل کتاب اس عہد کے انکاری ہو گئے ۲۶۸-۲۶۹
— ہدایت کی موجودگی میں اہل کتاب عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے گمراہی اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے ۲۷۶
— اہل کتاب میں کچھ تعداد باایمان لوگوں کی ہے لیکن اکثریت نافرمانوں اور فاسقوں کی ہے ۲۸۰
— اہل کتاب اہل ایمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ کچھ ستا لیں گے ۲۸۰
— مدینہ منورہ میں یہودیوں سے معاشرتی تعلقات رکھنے کی ممانعت کیونکہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کے کسی موقع سے نہیں چوکتے ۲۸۲-۲۸۳
— اہل ایمان اگر صبر، شکر اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزاریں تو اہل کتاب کی کوئی تدبیر ان کے خلاف کار گر نہ ہوگی ۲۸۳
— اہل کتاب مسلمانوں کے سامنے ایمان لانے کا ڈھونگ کرتے ہیں لیکن الگ ہوتے ہی غصے اور جلاپے سے راکھ ہونے لگتے ہیں ۲۸۳
— اہل ایمان کو خوشی ملتی ہے تو اہل کتاب کو ملال ہوتا ہے اور اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو انھیں راحت ملتی ہے ۲۸۳
— اہل کتاب کے دلوں کا بغض ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے لیکن وہ دلوں میں زیادہ بغض چھپائے رکھتے ہیں ۲۸۳
— اہل ایمان اگر اہل کتاب سے محبت رکھیں تب بھی اہل کتاب کبھی محبت نہیں رکھ سکتے ۲۸۳
— اہل کتاب کی خفیہ اور ظاہر طعن و سازش کے ذریعے اہل ایمان کو آزمایا جاتا ہے، ان حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلے کی بات ہے ۳۰۹
— اہل کتاب کے علما کا رویہ ۳۵۶-۳۵۷
— اہل کتاب کے علما اپنی کتابوں کا کچھ علم رکھتے ہیں کیونکہ باقی حصہ انھوں نے تحریفات اور فرقہ بندی میں ضائع کر دیا ہے ۳۵۶-۳۵۷
— اہل کتاب پر ان کی باطل پرستی اور ضلالت پروری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑی ہے اس لیے کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸-۳۶۰
— اہل کتاب کی اصلی گمراہی شرک ہے ۳۵۸ تا ۳۶۰
— اہل کتاب اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کیونکہ اہل ایمان ہدایت کا راستہ پا چکے ہیں ۳۶۰
— اہل کتاب اس قدر تنگ دل ہیں کہ حق کا اعتراف نہیں کرتے، اگر کہیں کائنات کی حکومت میں ان کا حصہ ہوتا تو کسی کو پھوٹی کوڑی نہ دیتے ۳۶۰
— اہل کتاب (بنی اسرائیل) سے ملک عظیم اور دنیا کی راہ نمائی اور امامت کا منصب لے کر اہل ایمان اور اولاد ابراہیم (بنی اسماعیل) کو دے دیا گیا جس پر بنی اسرائیل جل بھن رہے ہیں ۳۶۰-۳۶۱
— اہل کتاب جان لیں کہ انجام کار آرزوؤں اور

خواہشات پر ہرگز منحصر نہیں ہے ۳۹۹

— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں عیسائی عقیدت ومحبت میں اور یہودی انکار ومخالفت میں حد سے گزر گئے، اس کو اللہ تعالیٰ نے دین میں غلو قرار دیا ہے ۴۲۷

— اہل ایمان کو فہمائش کہ جس طرح کا عہد تم سے لیا گیا ہے اسی طرح کا عہد یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی لیا گیا تھا لیکن تم ان کی طرح بدعہد نہ ہونا ۴۵۰

— اہل کتاب اپنے فطری عہد سے پھر گئے، وہ احکام الٰہی کو محض الفاظ کے ہیر پھیر سے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں ۴۵۴

— اہل کتاب تعلیمات خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور ان کی احکام الٰہی میں خیانتوں کا پول آئے دن کھلتا رہتا ہے ۴۵۴

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل کتاب کی حرکات اور خیانتوں سے چشم پوشی کرنے کا حکم ۴۵۵-۴۵۶

— اہل کتاب کی حالت کی حضرت آدمؑ کے قاتل و مقتول بیٹوں کے واقعہ سے مماثلت ۴۶۳

— اہل کتاب میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلانے والے ہیں ۴۶۴

— اہل کتاب کی کتمان حق حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا انجام فاسقوں سے بھی بدتر ہے ۴۸۳

— اہل کتاب کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان قیامت تک دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے، جب کبھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے ۴۸۶

— قرآن حکیم نے اہل کتاب کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دیا ۴۸۸

— رسولؐ اللہ کو اہل کتاب کی انکار اور سرکشی کی روش پر ملال نہ کرنے کی ہدایت کیونکہ دین پر کسی کا اجارہ نہیں ہے ۴۸۸

— جو ایمان لا کر نیک عمل کرے گا خواہ یہودی ہو یا عیسائی، اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸

— اہل کتاب میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل چکے ہیں اور فاسق قرار پائے ہیں ۴۹۷

— اہل کتاب میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلانے والے ہیں ۴۶۴

(۶۰) ایام تشریق (حج)

(تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۶۱) آیت

— لفظ ''آیت'' کے معنی ۶۹

— آیات قرآنی میں صرفِ کلام کا اسلوب ۵۶۹

— آیات الٰہی کا لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۶۹-۵۳۰-۶۰۳

— آیات کتاب اللہ کی دو قسمیں ۲۳۴-۲۳۵

— آیات الٰہی کی مجموعی شہادت کیا ہے؟ ۳۱۱

— آیت بمعنی کتاب اللہ ۷۲-۸۰

— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آیت الٰہی سے استفادہ ۵۵۳

— عقل سے کام لینے والوں کے لیے ہر طرف آیات ہی آیات موجود ہیں ۱۳۰-۳۱۱-۵۳۷-۵۳۸

— آیات الٰہی فلاح تک جانے والے سیدھے راستے کو واضح کرتی ہیں ۲۷۷

— کیسے لوگ آیات الٰہی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ۳۱۱

— آیات الٰہی سے صحیح استفادہ صرف سمجھ بوجھ رکھنے والے اہل ایمان ہی کر سکتے ہیں ۵۶۶-۵۶۷

— تنسیخ آیات سے کیا مراد ہے؟ ۱۰۱-۱۰۲

— سب سے بڑی آیت (نشانی) یہ ہے کہ تعلیمات رسول اللہ برحق ہیں ۱۰۶-۱۰۷

— آیت الکرسی جس کو سید آیات القرآن بھی کہا جاتا ہے ۱۹۳ تا ۱۹۶

— اللہ تعالیٰ بار بار مختلف طریقوں سے اپنی آیات (نشانیاں) ظاہر کرتا ہے تاکہ لوگوں کو حقیقت مکمل سمجھ میں آجائے ۵۴۸

— آیات الٰہی سے انکار کا انجام عذاب ہے ۲۳۳-۲۳۶-۳۶۱-۴۹۸-۵۴۱-۵۶۵

— آیات الٰہی کے خلاف جہاں کفر بکا جا رہا ہو وہاں ایک مسلمان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ ۴۰۸-۵۴۹
— جو لوگ آیاتِ الٰہی سے انکار کرتے ہیں وہی حق کو جھٹلاتے ہیں ۵۲۴
— آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے پیچھے چلنے کی ممانعت ۵۹۷
— اللہ کی آیات کو کھیل بنانا اصل میں اپنے اوپر ظلم کرنا ہے ۱۷۷
— کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی آیات کو جھٹلانے والے گونگے، بہرے اور تاریکیوں میں گم کردہ ہیں ۵۳۷
— اللہ کی آیات سے منہ موڑنے والوں کو بدترین سزا اور دردناک عذاب مل کر رہے گا ۶۰۳
— اللہ تعالیٰ کی صریح آیات (نشانیاں) آ جانے کے بعد ایمان اور توبہ وغیرہ بے اثر ہو جاتی ہے ۶۰۳-۶۰۴

(۶۲) ایلا

— اس کا بطور شرعی اصطلاح کیا مفہوم ہے؟ ۱۷۱
— اس کے احکام ۱۷۱ تا ۱۷۳

(۶۳) ایوب علیہ السلام

— حضرت ایوب علیہ السلام کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا، وہ صالحین میں تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۶۴) ایمان

— ایمانیات کی تفصیل ۱۲۸-۲۲۳-۲۷۰-۴۰۶
— ایمان باللہ ۵۲-۸۲-۴۲۴-۴۸۸
— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان باللہ ہے ۱۷۳
— ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خیرات کرے اور صدقات کا احسان جتلا کر، دکھ دے کر اسے ضائع نہ کرے ۲۰۴
— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت انسان کو انفاق فی سبیل اللہ کی طرف مائل کرتے ہیں ۳۵۳
— ایمان باللہ کے ساتھ ''کفر بالطاغوت'' کی اہمیت ۱۹۶
— ریا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی ضد ہے ۲۰۴
— ایمان بالآخرت ۵۱-۵۲-۴۲۴-۴۸۸
— ایمان بالآخرت اور ایمان بالقرآن کا لزوم ۵۶۴
— احکام خداوندی پر عمل کی بنیاد ایمان بالآخرت ہے ۱۷۳
— ایمان بالقرآن اور ایمان بالکتاب ۵۰-۵۱-۵۸-۴۲۳-۴۸۷-۴۸۸
— ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تعلق ۵۸-۶۰
— احکام کتاب اللہ کو جزوی طور پر ماننے کے رویے کی مذمت ۹۱
— ایمان لانے کا دو رخی مفہوم ۴۰۷
— وہ کام جو اہل ایمان کو نہیں کرنے چاہییں ۱۰۰ تا ۱۰۲
— ایمان لانے والوں کا طرزِ فکر ۲۳۵
— تمام انبیائے کرام کی تعلیمات پر ایمان لانے کا مطالبہ ۱۱۵-۲۷۰-۴۱۴
— ایمان کے تقاضے ۵۰ تا ۵۲-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۴-۱۶۶-۱۶۹-۱۷۳-۱۷۸-۲۰۴-۲۲۵-۲۴۴-۲۷۶-۲۷۸-۲۸۷-۲۹۰-۲۹۷-۲۹۹-۳۰۴-۳۴۵-۳۵۱-۳۵۲-۳۶۳-۳۶۶-۳۷۳-۳۸۲-۳۸۴-۴۰۵-۴۱۱-۴۲۳-۴۳۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۶۰-۴۶۶-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۸-۴۸۹-۵۰۱-۵۰۳-۵۷۶
— اہل ایمان کی صفات و علامات ۵۰ تا ۵۲-۱۳۷-۲۳۸-۳۹۷-۴۷۷-۴۸۱-۴۸۲
— ایمان کے ہوتے ہوئے اطمینان قلب کی طلب ۲۰۱
— ایمان کے ساتھ سمع وطاعت لازم ہے ۲۲۳-۳۶۶
— اہل ایمان کافروں کو ہم دم وہم راز نہ بنائیں ۲۴۳-۴۸۰
— ایمان کے نتائج ۲۸۹-۳۰۲

— مومن کا ایمان مخالفتوں سے اور بڑھ جاتا ہے ۳۰۳
— اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا شرطِ ایمان ہے ۳۰۴
— ایمان کی آزمائش ضروری ہے ۳۰۵
— امورِ غیب کی حد تک خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے ۳۰۶
— مسلمانوں کے مدارج کے لیے حقیقی وجہِ امتیاز ایمان ہے ۳۴۱
— رسول کا جملہ معاملات میں حکم ماننا شرط ہے ۳۶۸
— طاغوت کے لیے لڑنا منافی ایمان ہے، اہل ایمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں ۳۷۳
— جو ایمان لا کر نیک عمل کرے خواہ یہودی ہو یا عیسائی اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— ایمان بالغیب ۵۰
— ایمان لانے کی مدت اس وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں ہے ۵۲۵-۶۰۳
— اقامت صلوٰۃ اہل ایمان کی لازمی صفت ہے ۵۰
— ایمان اور عمل صالح کا لزوم ۸۲
— اہل ایمان صالحین کا انعام ۵۸-۵۹
— ایمان اور تقویٰ کا لزوم ۱۰۰
— ایمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
— ایمان لانے والوں کو شاہد (گواہ) قرار دیا گیا ہے ۲۵۶-۲۵۷
— اہل ایمان اپنے اچھے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائیں گے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مزید اجر عطا فرمائے گا ۴۳۰
— صرف ایمان کافی نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ (عمل صالح) بھلائی کمانا بھی ضروری ہے ۶۰۳
— شکر اور ایمان کا تعلق ۴۱۲
— دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں؟ ۵۳۶
— مومن وہ ہے جو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرے ۴۱۲
— کمزوری کا عذر و بہانہ کر کے ایمان کے تقاضوں کو چھوڑنے والوں کا انجام ۳۸۶
— اہل ایمان کو کن طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا؟ ۴۶۶
— ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرنے والوں کا اخروی انجام ۴۴۷
— ایمان محض زبانی دعوے کا نام نہیں ہے ۴۷۰
— اہل ایمان کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اہل ایمان کی حمایت اور مددگاری کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے ۳۵۶-۳۵۷
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہل ایمان سے اللہ تعالیٰ کا لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے اور وہ صرف اللہ ہی پر بھروسا کرتے ہیں ۴۵۱-۴۶۰
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ انھوں نے دنیا میں درست طرزِ عمل اختیار کیا ہے ۵۸۰
— اختیاری ایمان مطلوب و مقصود ہے ۵۳۶-۵۷۴
— دنیا و آخرت میں یہ خوف اور رنج سے بچانے کا وسیلہ ہے ۵۴۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل ایمان سے کس طرز عمل کی ہدایت کی گئی ہے ۵۴۴
— اہل ایمان کے لیے دنیا و آخرت میں حقیقی امن ہے ۵۵۹
— ایمان کو ظلم سے آلودہ کرنے کا مطلب ۵۵۹
— ایمان معرفت حقیقت کی کنجی ہے ۵۶۷
— اہل ایمان سے مطالبات ۴۰۵
— اہل ایمان کو انصاف کا علمبردار ہونا چاہیے ۴۰۵
— ایمان کے ساتھ شرعی بندشوں کی پابندی ضروری ہے ۴۳۷
— ایمان کی پختگی ہی پر حلال و حرام کی پابندی کا انحصار ہے ۴۴۲-۴۹۸
— اللہ تعالیٰ کو کیسے اہل ایمان مطلوب ہیں؟ ۴۸۱
— اہل ایمان کا حلقہ رفاقت ۴۸۲
— ایمان پر کسی فرد یا گروہ کا اجارہ نہیں ہے ۴۸۸
— ایمان کی کھلی پہچان ۴۹۶
— قبول ایمان کے لیے صحیح جذبات کی تصویر ۴۹۷

— اہل ایمان پر اصل ذمہ داری ان کی اپنی ذات ہے ۵۱۰
— اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہی ہماری بھلائی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری دعائیں سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۱۴۴
— ایمان کا حامی اللہ تعالیٰ ہے جو اہل ایمان کو روشنی اور نور کی طرف لے جاتا ہے۱۹۶-۱۹۷
— ایمان لانے والوں کی خصوصیات اور ان کی دعائیں ۲۳۸-۲۳۹-۳۱۱
— عملاً راسخ افراد ہی ایمان لاتے ہیں۴۲۳
— ایمان لانا انسان کے اپنے مفاد میں ہے کیونکہ انکار سے کائنات کے مالک علیم وحکیم رب تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا۴۲۷-۴۲۸
— ایمان کی دولت اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۴۸۲
— ایمان لاکر توبہ کرنے والے اور آیندہ نیک اعمال کرنے والوں کے پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ معاف کردیتا ہے۵۴۴
— ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خیرات کرے اور صداقت کا احسان جتلا کر اور دکھ دے کر اس کو ضائع نہ کرے ۲۰۴
— ایمان اور کفر کے درمیان راہ نکالنے والے پکے کافر ہیں۴۱۴
— اہل ایمان سے کفر کا رویہ اختیار کرنے والے ہی اصل میں خسارے میں ہیں۱۰۷
— دل میں خدا کا خوف رکھتے ہوئے کفار سے دوستی رکھنے کی اجازت تاکہ ان کے ظلم سے بچا جاسکے۲۴۴
— منکرین کو معجزوں سے ایمان حاصل نہیں ہوتا۵۷۱
— کیسے لوگ ایمان سے محروم رہتے ؟ ہیں۵۷۲
— ایمان نہ لانے والوں پر ان کی ناپاکی مسلط ہونا ۵۸۰
— قانون الٰہی سے روگردانی منافی ایمان ہے۴۷۲
— دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی منافی ایمان ہے۴۸۳
— کون سے اعمال ایمان کے نہ ہونے کی شہادت دیتے ہیں؟۴۸۴
— اہل ایمان کو مشرکین وکفار کی تکلیف دہ طعن وتشنیع کے ذریعے سے آزمایا جاتا ہے، نامساعد حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلہ کی بات ہے۳۰۹

ب

(۶۵) باطل
— کائنات باطل کے فروغ کے لیے نہیں بنائی گئی ہے ۵۵۱
— باطل کی کشمکش میں حق پرستوں کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزرنا ہوگا، یہی اللہ تعالیٰ کا دستور ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۵۳۵
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’آزمائش‘‘)
— دعوتِ حق والوں کو زندہ ضمیر اور عقل وفکر استعمال کرنے والے قرار دیا گیا ہے اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے۵۳۶-۵۳۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’دعوتِ حق‘‘)

(۶۶) بخل
— اللہ تعالیٰ فیاض ہے، اپنی مخلوق پر ہر وقت فیاضی اور عطا وبخشش سے متوجہ رہتا ہے اور ایسی ہی صفت والوں کو پسند کرتا ہے۲۰۷
— فیاضی اور زر پرست کرداروں کا تقابل۲۱۰-۲۱۷
— سودخواروں کے کردار کا بیان۲۸۷-۲۸۸
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے میں کنجوسی کا طرز عمل نہایت شرمناک ہے۲۰۷-۳۰۶

(۶۷) بائبل
— بائبل کی حقیقت۲۳۲
— قرآن مجید اور بائبل کے بیانات میں صریح اختلافات ۷۷-۸۵-۸۶

— کلام اللہ میں انسانی آمیزش ۴۲۴
— بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابتدائی تفکر پر کوئی روشنی نہ ڈالنا ۵۶۰
— ابراہیم علیہ السلام سے نمرود کے مباحثے کے بارے میں بائبل خاموش ہے ۱۹۸
— حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ۱۱۴
— سموئیل نبی اور طالوت کی بادشاہت کے بارے میں بائبل کا بیان ۱۸۵ تا ۱۸۷
— تابوتِ سکینہ کے بارے میں بائبل کا بیان ۱۸۹
— ''پہاڑی'' کا وعظ ۲۵۳
— اس میں دعوت عیسوی کے آثار ۲۵۵
— اس میں سوختنی قربانی کا ذکر ۳۰۷-۳۰۸
— بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں کا تذکرہ بائبل میں ۵۴۱
— ''باپ'' کے لفظ کا استعمال بطور استعارہ ۴۲۹

(۶۸) بدر غزوہ (جنگ)

— تحریک اسلامی کی تاریخ میں جنگ بدر کا مقام ۲۲۹
— واقعہ بدر میں دعوت کا سبق ۲۳۶-۲۳۷
— واقعہ بدرِ ثانیہ ۳۰۴
— باطل کے بڑے مجرمین سزا کے حق دار تھے، جنگ بدر کے بعد ۲ قیدیوں کا قتل اور ۱۷ قیدیوں کا عفو عام سے استثنا ۱۵۱-۱۵۲
— اہل ایمان اللہ کی راہ میں حق کے لیے لڑ رہے تھے اور قریش کفر کے لیے لڑ رہے تھے، دونوں کے انجام میں اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں ۲۳۶
— قریش تعداد میں دوگنے ہونے کے باوجود مغلوب ہو گئے، اللہ تعالیٰ اپنی فتح ونصرت سے جس کو چاہتا ہے مغلوب کرتا ہے ۲۳۷

(۶۹) برکت

— قرآن مجید ایک برکت والی کتاب ہے ۶۰۲

(۷۰) بسم اللہ

— ہر کام شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھنے کا فائدہ ۴۳

(۷۱) بنی اسرائیل

— لفظ ''بنی اسرائیل'' کی وجہ تسمیہ ۷۰-۱۰۸-۱۰۹
— دنیا کی قوموں پر ان کی فضیلت کے معنی ۷۴-۱۰۸
— ان پر ابر کا سایہ اور من وسلویٰ کا نزول ۷۷
— ان کے لیے چٹان سے چشمے نکالے گئے ۷۹
— وہ عہد جو بنی اسرائیل سے لیے گئے ۸۳-۹۰-۹۱-۹۵-۳۰۹-۳۱۰-۴۵۱-۴۸۹
— بنی اسرائیل کی عہد شکنیاں ۸۳-۹۰-۹۵-۳۰۹-۴۱۶-۴۵۴-۴۸۹
— ان کے نعمت سے نوازے جانے کا مطلب ۱۰۹
— بنی اسرائیل کو تابوتِ سکینہ کی واپسی کی بشارت ۱۸۸-۱۸۹
— ان کے صالحین کا رویہ ۲۸۰-۲۸۱
— بنی اسرائیل کے لیے ان میں سے بارہ نصیحتوں کا تقرر ۴۵۱
— ان سے اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، ایمان بالرسل، انفاق فی سبیل اللہ اور اقامت دین میں نصرت کا مطالبہ ۷۰-۷۲-۸۰-۸۳-۸۶-۴۵۸
— ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات ۴۵۸
— ان کو ارض مقدس میں داخلے کا حکم کیونکہ ارض مقدس ان کے نام لکھ دی گئی ۴۵۸-۴۵۹
— حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ان کا دور عروج ۴۵۸-۴۵۹
— یوشع بن نون کے عہد میں بنی اسرائیل کا فلسطین کو فتح کرنا ۴۶۱
— سمندر پھاڑ کر ان کے لیے راستہ بنایا گیا ۷۵
— ایک وقت میں بنی اسرائیل کو دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت دی گئی اور علم حق سے نوازا گیا ۷۰-۷۴
— بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر بہت بڑا احسان کیا گیا جو ان کے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۶۴ تا ۶۶-۷۵

— بنی اسرائیل کو بچالیا گیا اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا گیا ۷۵
— بنی اسرائیل کی عبرت کے لیے ان کی تاریخ سے چند اہم واقعات کا ذکر ۷۴ تا ۸۰-۸۳-۸۶
— بنی اسرائیل کا خدا کو دیکھنے کا مطالبہ جس پر انھیں زبردست صاعقے نے آلیا اور وہ بے جان ہو گرے اللہ نے انھیں دوبارہ زندہ اٹھا دیا کہ شاید وہ شکر گزار ہوں ۷۷
— بنی اسرائیل کو ایک بستی میں امن، حلال رزق اور گناہوں سے درگزر کرنے کے وعدے پر داخل کیا گیا لیکن ظالموں نے اللہ کی بات بدل ڈالی اور عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۷۸
— بنی اسرائیل کی من وسلویٰ کی یکسانی سے تنگ آ جانا اور طرح طرح کی پیداواروں اور کھانوں کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا ۷۹-۸۰
— بنی اسرائیل کو زمین میں فساد پھیلانے کی ممانعت لیکن وہ نہ مانے اور ان کا انجام بد ۷۷ تا ۸۱
— بنی اسرائیل میں سے نبوت ۸۰ تا ۸۲
— بنی اسرائیل انبیا کی قاتل قوم ۸۰ تا ۸۲- ۳۰۸- ۴۱۸- ۴۸۹
— بنی اسرائیل پر آیات اللہ کے کفر، قتل انبیائے کرام اور حدودِ شرع توڑنے کی پاداش میں ذلت وخواری اور بدحالی مسلط کر دی گئی ۸۰-۸۲
— بنی اسرائیل پر پہاڑ طور کے اٹھائے جانے کا واقعہ ۸۳-۴۱۵-۴۱۶
— بنی اسرائیل کو ان کی بداعمالیوں پر بندر بنائے جانے کا واقعہ ۸۴-۸۶-۸۸
— جب تورات کے احکام انھیں سنائے گئے تو کہنے لگے اس کے احکام بھاری اور مشکل ہیں ۸۳
— بنی اسرائیل کے لیے سبت کا قانون، اس کی خلاف ورزی اور نتیجتاً عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۸۳-۸۴
— بنی اسرائیل کا انجام بد ہر زمانے کی نسلوں کے لیے عبرت اور متقین کے لیے نصیحت بنا دیا گیا ۸۴
— بنی اسرائیل کا گائے کو ذبح کرنے کا مذاق اڑانا اور لیت ولعل کرنا لیکن بالآخر مجبوراً ذبح کرنے پر مجبور ہوئے ۸۴-۸۵
— بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی کی مثال کہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر بھی ان کے دل پتھر کے پتھر ہی رہے ۸۶
— ایک طرف بنی اسرائیل اللہ کی طرف سے آنے والے انبیائے کرام پر نازل ہونے والی کتاب اور رسالت پر ایمان لانے کے دعوے دار ہیں اور دوسری طرف انبیائے کرام کو قتل کرتے ہیں ۹۴-۴۸۹
— بنی اسرائیل کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسی کتاب اور نبوت پر ایمان لائیں گے جو صرف بنی اسرائیل پر اتری ہوگی ۹۴
— بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر قیام کے دوران میں بچھڑے کو معبود بنا لینا ۷۵-۹۵-۴۱۵
— تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بار بار ذلت کی مار پڑی، وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے پناہ مل گئی وہ اور بات ہے ۲۸۰
— بنی اسرائیل اگر مسلمانوں سے لڑیں گے تو مار ہی کھائیں گے اور ایسے بے بس ہوں گے کہ انھیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی ۲۸۰
— بنی اسرائیل میں گاؤ پرستی کہاں سے آئی ۷۶
— چالیس سال تک بنی اسرائیل کی صحرا نوردی ۴۶۰-۴۶۱
— بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد سے پھر گئے اسی لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے انھیں چھوڑا، وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہو کر رہیں گے اور آخرت میں بھی شدید عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے ۸۶ تا ۸۸
— بنی اسرائیل کے ایک مقتول کا دوبارہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتا بتانا ۸۵-۸۶
— بنی اسرائیل کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ تمھاری کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے ۸۶
— بنی اسرائیل سے ملک عظیم اور دنیا کی امامت اور

راہ نمائی کا منصب لے کر اولادِ ابراہیم میں سے بنی اسماعیل کو دے گیا، اس پر بنی اسرائیل حسد کے مارے جل بھن رہے ہیں ۳۶۰-۳۶۱
— قیادت کی نااہلی، بددیانتی اور کم ظرفی بنی اسرائیل کو لے ڈوبی ۳۶۲-۳۶۳
— حضرت موسیٰ قیامِ طور کے دوران میں بنی اسرائیل کے لیے تختیوں پر تحریر شدہ احکامِ خداوندی لائے ۴۵-۴۱۶
— بنی اسرائیل اپنی پے در پے نافرمانیوں، عہد شکنیوں، قتلِ انبیائے کرام اور باپ دادا کے نظریات سے چمٹے رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے سزاوار ٹھیرے ۴۱۶
— بنی اسرائیل پر دنیا میں ایک عذاب مسلسل کا سلسلہ طاری ہے اور وہ بحیثیت قوم اپنی بدکاریوں پر سزا پاتے ہیں ۷۹-۴۲۳-۴۲۴
— بنی اسرائیل فاسق ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کی حالت پر ترس کھایا جائے ۴۶۱
— بنی اسرائیل اور یہود کے رویے میں حضرت آدم کے قاتل و مقتول بیٹے کے واقعہ کے ساتھ مماثلت ۴۶۳
— بنی اسرائیل میں سے اکثر زمین پر زیادتیاں اور فساد پھیلاتے ہیں ۴۶۴
— بنی اسرائیل اہل ایمان کے مقابلے میں کفار و مشرکین کی حمایت کرتے ہیں ۴۹۶
— بنی اسرائیل کے بگاڑ کے اسباب ۷۴-۷۵-۱۵۸-۱۸۷
— بنی اسرائیل کو قرآن کی دعوت اور ان کے رویوں پر تنقید ۷۰
— بنی اسرائیل کے مذہبی اور اخلاقی جرائم ۷۷-۹۲-۳۰۸
— وہ بستی جس میں داخلے پر انھیں سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا ۷۸-۴۱۷-۴۵۴
— بابل کی اسیری کے زمانے میں ان کی حالت زار ۹۸
— بنی اسرائیل کو آخرت کے سخت محاسبے کی یاددہانی ۱۰۸
— دنیا کی قوموں کے لیے ان کا نمونۂ عبرت ہونا ۱۶۱-۱۸۷
— واقعۂ خروج ۱۸۴
— اس کا سموئیل نبی کے سامنے بادشاہ کے تقرر کا مطالبہ ۱۸۵ تا ۱۸۷
— واقعۂ نہر میں ان کی بے صبری کی مثال ۱۹۰
— تورات کی تاریخ ۲۳۱-۲۳۲
— حضرت عیسیٰ کا بنی اسرائیل کے لیے مبعوث ہونا اور ان کی دعوت ۲۵۲-۲۵۴
— دعوتِ عیسوی کے خلاف ان کی کافرانہ روش اور خفیہ چالیں ۲۵۶-۲۵۷
— ان کے بعض ماکولات کی خاص حرمت ۲۷۳
— ان کے مغضوب ہونے کا فیصلہ ۲۸۰
— اہل ایمان کو ان کی برائیوں سے بچنے کی تاکید ۳۶۲
— دعوت جہاد پر ان کی بزدلی اور سزا ۴۵۹-۴۶۰
— بنی اسرائیل کے قتل کی حرمت کا فرمان ۴۶۴
— بنی اسرائیل پر حضرت داود اور حضرت عیسیٰ کی زبان سے کیوں لعنت کی گئی؟ ۴۹۷
— اہل ایمان کے مقابلے میں کفار سے ان کا تعلق رفاقت ۴۹۶
— ان کے طرزِ عمل سے ان کے محروم ایمان ہونے کی شہادت ۴۹۶
— بنی اسرائیل کی اکثریت کا بگاڑ ۴۹۷
— بنی اسرائیل کی پے در پے گمراہیوں پر اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرتا رہا کہ شاید وہ شکرگزار بندے بن جائیں ۷۵-۷۶
— بنی اسرائیل کا تورات کے احکام کو مشکل اور بھاری قرار دے کر حکم عدولی کرنا ۸۳
— بنی اسرائیل کے نام ”ارض مقدس“ لکھا جانا ۴۵۸-۴۵۹

(۷۲) بین الاقوامی قانون

— اسلام قوموں کے درمیان وعدے، عہد اور

معاہدے کا احترام کرتا ہے۳۸۰ تا ۳۸۲
— اگر کوئی غیر مسلم ریاست اہل ایمان سے دستور کے خلاف سلوک کرتی ہے تو اہل ایمان ہرگز ویسی ہی زیادتی نہ کریں ۴۳۹-۴۴۰
— معاہد اقوام اور محرب اقوام کے افراد کے غیر دانستہ قتل پر الگ الگ کفارہ اور خون بہا مقرر کیا گیا ۳۸۲-۳۸۳

پ

(۷۳) پرہیزگار
(دیکھو ''تقویٰ''، ''متقی'')

(۷۴) پاک
— جسم کا پاک ہونا ایک نعمت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری واجب ہے۴۴۹

(۷۵) تحریک اسلامی
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کردہ تحریک اسلامی کی راہ نمائی کے لیے قرآن نازل کیا گیا۲۱ تا ۲۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ تحریک اسلامی کے مختلف ادوار۲۱ تا ۲۶
— ابتلا اور آزمائش کے دور میں اسلام پھیلتا ہے اور قرآن کا اس دور میں ایک مخصوص طرز بیان تھا ۲۲-۲۳
— دعوت اسلامی کے ہر مرحلے پر قرآن نے ایک نئے انداز سے ہدایات وفرامین دیے۲۱ تا ۲۵
— نظریاتی اور عملی لحاظ سے دعوتِ اسلامی کی تکمیل کے بعد ہم مسلمان اس بات کے مکلّف اور ذمہ دار ہیں کہ دعوتِ حق جاری رکھیں ۲۷
— قرآن ایک دعوتی اور تحریکی کتاب ہے، اس کے مکمل فہم کے لیے ضروری ہے کہ انسان وہی کام کرے جس کے لیے قرآن آیا تھا ۳۳-۳۴
— دعوتِ حق کو شروع ہی سے بین الاقوامی کیوں نہیں بنایا گیا۳۶-۳۷

ت

(۷۶) تابوت سکینہ
— اس کی حقیقت اور بنی اسرائیل کو اس کی واپسی کی بشارت۱۸۹-۱۸۸

(۷۷) تاریخ
— قومیں جنھیں زمین پر بڑا اقتدار حاصل تھا لیکن اپنے اعمال بد کی وجہ سے نیست و نابود ہوئیں اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو اٹھایا ۵۲۴-۵۲۵
— قرآن کا تاریخ انسانی سے استدلال ۴۱۸-۴۱۹-۵۸۳
— زمین میں چل پھر کر معذب قوموں کا انجام دیکھنے کی فہمائش۵۲۶
— یہود قتل انبیا جیسے بھیانک تاریخی پس منظر پر فخر کرتے تھے۴۱۸-۴۱۹

(۷۸) تحویل قبلہ
— بیت المقدس سے خانہ کعبہ کو نماز کے لیے قبلہ بنانے کا حکم۱۲۴
— بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ۱۱۸-۱۱۹
— رسول اللہ بھی خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیے جانے کے خواہش مند تھے۱۲۱
— تحویل کعبہ کے حکم پر یہودیوں اور عیسائیوں کے اعتراضات۱۲۲
— تحویل کعبہ، اللہ کی طرف سے امرحق ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۱۲۳
— تحویل کعبہ کا حکم دراصل امت محمد کی سرفرازی اور امامت وپیشوائی کی علامت ہے ۱۲۵

(۷۹) تزکیہ
— اس کا وسیع مفہوم۱۱۲

— اخفا سے نیکی کرنے کے نفس انسانی پر اثرات ۲۰۹

— شہادت کو چھپانے سے دل گناہ آلود ہوتا ہے ۲۲۲

(۸۰) تذکر

— اس کا مفہوم ۵۵۹

(۸۱) تسبیح

— اس کے معانی اور مفہوم ۶۳

(۸۲) تفرقہ و اختلاف

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''فرقہ بندی'')

— کسی قسم کا بھی تفرقہ قرآن میں ممنوع ہے ۳۷-۲۷۶

— اجتہادی اختلافات اس کی تعریف میں نہیں آتے ۳۷

— تفرقہ و اختلاف کی اصل وجہ ۱۶۲-۱۹۲-۲۳۹

— اس سے بچنے کا واحد طریقہ ۲۷۶

— تفرقہ و اختلاف سے بچنے کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت ۲۷۸

— نوع انسانی کا متخاصم گروہوں میں تقسیم ہونا ۶۰۴

(۸۳) تفہیم القرآن

— اس کی خصوصیات ۵-۱۱

— اس کی تاریخ ۱۲

— کن لوگوں کے لیے تحریر کی گئی ۵-۶

— تفہیم القرآن سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے مطالعہ کا طریقہ ۱۱-۱۲

— تفہیم کا مقدمہ لکھنے کا مقصد ۱۳

— تفہیم کے لکھنے میں بنیادی مقصد کیا ہے ۶

— ترجمے کے بجائے ترجمانی کا طریقہ اختیار کرنے کے وجوہ ۶ تا ۱۱

— ترجمانی کے طریقے کی تشریح ۱۰-۱۱

— ترجمانی میں کیا اصول کارفرما رکھے گئے ہیں؟ ۱۰-۱۱

— تحریر اور تقریر کی زبان میں فرق ہے، قرآن کی تقریری زبان کو تحریری زبان میں لایا گیا ہے ۸-۹

— لفظی ترجمہ کے مضرات ۷ تا ۱۱

— قرآن کی ایک مخصوص اصطلاحی زبان ہے، پابندیِ لفظ کے ساتھ کیے گئے تراجم میں اس کا لحاظ کرنا ممکن نہیں ہے ۱۰

— قرآن حکیم کے مختلف زبانوں میں معیاری تراجم ۶

— تفہیم القرآن باقی تفسیروں سے مختلف کیوں ہے ۵

— تفہیم القرآن کے تفسیری حواشی لکھنے میں کیا اصول کارفرما ہے ۱۱

— تفہیم القرآن میں ہر سورت کے آغاز سے پہلے اس کا زمانۂ نزول، تحریک اسلام کی زمینی پوزیشن اور ضروریات کے ساتھ سورت کے مضامین کا ایک خلاصہ دیا گیا ہے ۱۱

(۸۴) تقدیر

— کیا انسان خود مختار ہے؟ ۱۸-۶۴-۶۵

— اذنِ الٰہی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا ۹۹

— انسان کو اختلاف کی آزادی اللہ تعالیٰ نے دی ہے ۱۹۲

— ''آیت الکرسی'' میں نظام تقدیر کے متعلق نمایاں اشاروں کی اہمیت ۱۹۵

— تمام تغیرات کے پیچھے خدا کا دست قدرت ہے ۲۴۳

— گردش احوال کے اندر مشیت الٰہی کی مصلحتیں ۲۹۰

— بھلائی اور مصیبت سب کچھ مشیت الٰہی کے تحت ہے ۳۷۵

— اللہ تعالیٰ کا ''فتنے میں ڈالنا'' کا مطلب ۴۷۱

— دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردہ ڈالنا کا مفہوم ۵۳۰-۵۳۱

— اللہ تعالیٰ کا ہدایت دینے اور گمراہی میں اضافہ کرنے کا مطلب ۵۳-۵۹-۴۱۰-۵۳۸

— ہدایت و ضلالت کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہونے کا مطلب ۱۶۳-۵۳۸-۵۶۱

— اگر اللہ تعالیٰ کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا ۵۲۸

— اگر اللہ تعالیٰ بھلائی دینا چاہے تو کوئی مانع نہیں ہو سکتا ۵۲۸

— قانونِ فطرت کے تحت ہونے والے تمام حوادث کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے ۵۳۱
— اللہ تعالیٰ کے قوانین کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ۵۳۵
— فیصلے کا سارا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۵۴۵
— خشک وتر سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے ۵۴۶
— ہر بات کے لیے ایک وقت ظہور مقرر ہے ۵۴۶
— کشمکش حق و باطل کا اٹل قانون ۵۳۵
— جانوروں اور پرندوں کے لیے تقدیر کے نوشتے ۵۳۷
— کائنات کا نظام اللہ کے ٹھیرائے ہوئے اندازوں پر چل رہا ہے ۵۶۶
— ہر انسان کے لیے مستقر اور مستودع مقرر ہے ۵۶۶
— اللہ تعالیٰ کی طرف انسانی اعمال کی نسبت کی وجہ ۵۷۱
— اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً ہدایت پر پیدا کر دیا جائے ۵۷۰
— اللہ تعالیٰ کا دلوں اور نگاہوں کو پھیرنا ۵۷۱
— اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا میں فرق ۵۷۳-۵۷۴
— اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بالجبر گمراہی سے روکے اور کوئی بات زبردستی منوائے ۵۸۷-۵۸۸
— جنوں اور انسانوں کو خیر و شر میں انتخاب کی مکمل آزادی ۵۷۴
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبول حق کے لیے ”ضیق صدر“ اور ”شرح صدر“ کی کیفیت ۵۷۹
— مجرمین ومشرکین کا اپنے عزائم میں اللہ کی مشیت کی آڑ لینا اور اللہ کا جواب ۵۹۴-۵۹۵
— انسان جس راہ پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اسی کی توفیق دے دیتا ہے جو اس نے خود اپنے لیے پسند کی ہے ۳۹۷-۴۱۰
— باطل پرستی سے دلوں پر ٹھپا لگ جاتا ہے اور توفیق ہدایت سلب ہو جاتی ہے ۴۱۶
— اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دے یا ذلت دے ۲۴۳
— اللہ تعالیٰ جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۲۲۳
— کامیابی اور ناکامی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ۳۷۵
— بھلائی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور مصیبت انسان کے اپنے ہی کسب وعمل کی بدولت آتی ہے ۳۷۵
— جو آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو فطری حقائق سے اندھا بنے گا وہ خود ہی اپنا نقصان کرے گا ۵۶۸
— اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے ۱۱۸
— اللہ تعالیٰ کو مکمل اختیار ہے کہ اپنی بادشاہی جس کو چاہے عطا کرے ۱۸۸
— اللہ تعالیٰ ہرگز ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے پر ظلم کرتا ہے ۲۸۱-۲۸۲
— اپنی گمراہیوں کے لیے تقدیر کو موردِ الزام ٹھیرانا نہایت قابل مذمت ہے ۵۹۴-۵۹۵
— تقدیر کے معاملے میں انسان کی پسند اور ناپسند کبھی حقیقت پسندانہ نہیں ہو سکتی ۱۶۴
— انسان پر اس کی اپنی حرکتوں اور کرتوتوں کی وجہ سے مصیبت اور آلام آتے ہیں ۳۶۷
— اللہ تعالیٰ کس قسم کے لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھتا ہے؟ ۵۲-۵۳-۵۶-۲۰۰-۳۰۵
— فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۲۳۷-۲۸۶-۳۹۲
— اللہ تعالیٰ کا نظام رزق رسانی ۴۲۸
— خوفِ موت کا ازالہ ۲۹۱-۳۷۴
— موت کا وقت اور جگہ مقرر اور اٹل ہے ۲۹۶-۲۹۷
— خدا تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اس کی تقدیر سے نہیں بچا جا سکتا ۲۹۷
— اللہ تعالیٰ جس کی مدد پر ہو اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا ۲۹۸
— اہل کفر کو ڈھیل دینے کی غایت وحکمت ۳۰۵
— اللہ تعالیٰ چاہے تو زمین سے ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم کو لے آئے ۴۰۴
— انبیائے کرام کی آمد پر نزول مصائب اور اس کی

حکمت ۵۴۰
— شیاطین جن وانس کو انبیائے کرام کا دشمن بنا دیا گیا ۵۷۲
— اکابر مجرمین کا اپنے جال میں خود ہی پھنس جانا ۵۷۹
— ایمان نہ لانے والوں پر ان کی ناپاکی کا مسلط ہو جانا ۵۸۰
— اللہ تعالیٰ پر افترا کرنے والے ظالم ہدایت سے بے نصیب رہتے ہیں ۵۹۱
— قسمت کا حال پانسوں کے ذریعے سے معلوم کرنے کی کوشش حرام ہے، اس حکم میں لاٹری وغیرہ بھی آ جاتے ہیں ۴۴۱-۴۴۲
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے ۴۵۴
— جس کسی کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد اللہ تعالیٰ کرے تو اس کی ہدایت کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا ۴۷۰-۴۷۱
— یہودیوں کی سازشوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو محفوظ کیا جانا ۴۵۰
— اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے اندر سزا کے طور پر بغض و عداوت ڈال دی ہے ۴۵۵
— یہودیوں کے جرائم کی وجہ سے ان کو مبتلائے مصیبت کرنے کا فیصلہ ۴۷۹-۴۸۰
— یہودیوں کے طغیان وکفر کے وبال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ان میں بغض وعداوت ڈالنا ۴۸۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخالفین سے بچانے والا اللہ تعالیٰ خود تھا ۵۱۳
— آدمی کے لیے اس کا عمل خوش نما بنا دیا جاتا ہے ۵۷۱-۵۷۸-۵۸۶
— ہر آدمی پر نگرانی کرنے والے فرشتے مقرر ہیں ۵۴۷

(۸۵) تقلید
— نظریۂ تقلید کا قرآنی جواب ۱۱۸
— دنیا میں پیشواؤں اور راہ نماؤں کی پیروی کرنے والے پشیمان ہوں گے جب ان سے وہ مکمل لاتعلقی کا اظہار کریں گے ۱۳۲
— تقلید گمراہی وضلالت کی سیڑھی ہے ۱۳۳
— باپ دادا کی اندھی تقلید نہایت اہم سبب ضلالت ہے ۵۰۹
— مذہبی پیشواؤں، سرداروں اور باپ دادا کی اندھی تقلید اور ان کی بنائی ہوئی جاہلی رسوم اور حلال و حرام کی بے مقصد قیود کی تردید اور مذمت ۵۸۸-۵۸۹

(۸۶) تقدیس
— اس کے معنی ۶۳

(۸۷) تقویٰ
— اس کا مفہوم ۵۷
— تقویٰ کا لزوم ۱۰۰
— بر ۴۴۰
— تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ ۸۳-۱۴۷
— تقویٰ کے اخروی نتائج ۲۳۸-۳۱۳
— اللہ تعالیٰ کا محبوب بننے کے لیے تقویٰ کی اہمیت ۲۶۶
— اللہ تعالیٰ متقیوں کی عبادات قبول کرتا ہے ۴۶۱
— تقویٰ سفر حج کے لیے بہترین زاد راہ ہے ۱۵۵
— روزے انسان میں تقویٰ پیدا کرتے ہیں ۱۴۱
— آخرت کی بھلائی کا مدار تقویٰ پر ہے نہ کہ فراوانیٔ رزق پر ۱۶۲
— اہل تقویٰ کی خاص صفت صبر ہے ۲۳۸
— فلاح کے لیے تقویٰ لازم ہے ۲۸۸
— چوٹیں کھا کر بھی خدا اور رسول کی پکار پر لبیک کہنا ۳۰۳
— اہل ایمان کو صبر سے کام لینے، باطل کے مقابلے میں پامردی دکھانے اور حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہنا چاہیے، یہی فلاح کا راستہ ہے ۳۱۴
— قوانین اسلامی کی کامیابی کے لیے تقویٰ کی اہمیت ۳۱۹
— اللہ تعالیٰ کے قوانین کو توڑنے سے بچنا ۴۴۶
— عدل وانصاف تقویٰ کے قریب ترین ہے ۴۴۹

— اہل کتاب کو بھی اسی طرح تقویٰ کی ہدایت کی گئی تھی ۴۰۴
— ازدواجی زندگی میں تقویٰ کی اہمیت ۴۰۳-۴۰۴
— نیکی کے کام میں تعاون کرو اور گمراہی میں تعاون نہ کرو ۴۴۰
— دنیا ایک کھیل تماشے کے علاوہ کچھ نہیں، متقین نے عقل سے کام لیا ہے اور وہ آخرت ہی کو بہترین مقام جانتے ہیں ۵۳۳-۵۳۴

(۸۸) تقیہ (ایمان کو چھپانا)

— کس حالت میں اور کس حد تک کیا جا سکتا ہے ۲۴۴

(۸۹) تلمود

— اس میں حضرت یعقوبؑ کی وصیت کا مضمون قرآن حکیم سے بالکل متشابہ ہے ۱۱۴
— حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان مباحثے کا بیان ۱۹۸ تا ۲۰۰
— جستجوئے حقیقت میں حضرت ابراہیم کا سفر ۵۶۰

(۹۰) توبہ

— توبہ کے معنی اور حقیقت ۶۷-۳۳۳
— نظام اخلاق میں توبہ کی اہمیت ۶۸
— توبہ کے ساتھ اصلاح کی اہمیت ۱۲۸- ۲۷۱- ۳۳۱-۴۱۱-۴۶۸-۵۴۴
— سچی توبہ کے آداب ۲۸۹-۵۴۴
— توبہ کے حدود کیا ہیں، کن کی توبہ قبول ہوتی ہے اور کن کی نہیں؟ ۲۷۱-۳۳۲-۳۳۳
— توبہ کی قابل قبول صورت ۳۳۲-۳۹۵-۵۴۴
— توبہ کے لیے کفارے کی اہمیت ۳۸۳
— بغاوت کے مجرمین کے لیے توبہ کی گنجائش ۴۶۵-۴۶۶
— عدالتی سزا کے باوجود اخروی سزا سے بچنے کے لیے توبہ کی اہمیت ۴۶۸
— اسلام سے قبل کیے گئے گناہوں کی معافی ۵۴۴
— حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ ہی سے کلمات توبہ سیکھ کر توبہ کی جو مقبول ہوئی ۶۷
— قرآن اس نظریے کی پرزور تردید کرتا ہے کہ گناہ اور معصیت کے لازمی نتائج ہیں اور توبہ اور معافی کی کوئی صورت نہیں ۶۸
— مجرم اگر اپنے سابقہ جرم پر صدق دل سے توبہ کرلے اور آیندہ کے لیے اصلاح کرلے تو قابل معافی ہے ۳۳۱
— اپنے کیے پر نادم ہونا اور غلطی سے رجوع کرنا ۳۶۸
— جرم کی سزا میں جرمانہ اور توبہ یا کفارہ میں فرق روا رکھا گیا ہے اسلام عبادت، کار خیر، ادائے حقوق اور شرمساری و ندامت سے جرم کو دھوتا ہے جب کہ جرمانہ کی دفعہ ناگواری اور تلخی کو جنم دیتی ہے ۳۸۳-۳۸۴
— کس قسم کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں؟ ۶۸-۵۴۴
— اگر کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جائے تو یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ رحیم اور درگزر کرنے والا ہے ۳۹۵
— توبہ اس وقت تک مقبول ہے جب تک سزا ہاتھ پکڑ نہ لے ۴۶۵-۴۶۶
— اگر گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً اللہ کو یاد کرو اور گناہوں کی معافی چاہو ۲۸۹

(۹۱) توحید ۶۱-۹۱

— صرف اللہ کے لیے حمد ۴۳
— صرف اللہ ہی کے لیے عبادت ۴۴
— صرف اللہ ہی سے استمداد ۴۵
— توحید کے دلائل ۵۷- ۶۰- ۱۳۰- ۱۳۱- ۵۳۷- ۵۳۹-۵۴۱-۵۴۷-۵۶۶
— آیت الکرسی کا معرفت الٰہی کی کلید ہونا ۱۹۳- ۱۹۵
— تنہا ایک ہی معبود (اللہ) ۲۳۱-۵۶۸-۵۶۹
— ہادی وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو ۲۳۳
— اپنی توحید پر اللہ تعالیٰ خود شہادت دیتا ہے ۲۳۹
— توحید پر فرشتوں اور اہل علم کی شہادت ۲۳۹
— توحید پر آثار کائنات کی شہادت ۱۳۰-۱۳۱-۳۱۰-

۳۱۱
— پوری کائنات کو سنبھالنے والا اور اس کا انتظام کرنے والا تنہا اللہ تعالیٰ ہے ۱۹۳-۲۳۱
— پورے تکوینی اختیارات کا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہونا ۲۴۳
— پوری سیاسی حاکمیت اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے ۲۹۶
— لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۴۲۸
— اللہ تعالیٰ ایک ہی خدا ہے ۴۲۹-۴۳۱-۴۹۰
— اللہ تعالیٰ حکم دینے میں حاکم مطلق ہے ۴۳۸
— حلت وحرمت کے جملہ اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں ۴۳۸-۴۹۸
— ہر طرف سے منہ موڑ کر خدا کی طرف یکسو ہو جانا ۵۵۸
— پوری سلطنت زمین و آسمان کا مالک تنہا اللہ ہے ۴۶۹-۵۲۶
— تورات وانجیل میں توحید ہی کی تعلیم تھی ۴۸۸
— مشرکین عرب بھی وحدت الٰہ کے قائل تھے ۵۲۳
— معاملات کا اللہ کے قانون کے تحت چکانا اس کا تقاضا ہے ۵۷۴-۴۷۵
— اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا ۴۱۲
— ایک ہی خدا آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی ۵۲۴
— محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان توحید ۵۲۷-۶۰۵
— قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اہل کتاب توحید کی صداقت خوب جانتے ہیں ۵۲۹
— توحید کا لازمی تقاضا شرک سے بے زاری ہے ۵۲۹
— فیصلے کا سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے ۵۴۵-۵۴۷
— سارا نظام کائنات توحید کی اساس پر قائم ہے ۵۵۱
— ساری زمام کار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ۵۶۵
— اللہ تعالیٰ ہی بہترین حَکَم ہے ۵۷۵
— اس کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے ۵۷۵
— اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں پوری زندگی دے ڈالنا عین تقاضائے توحید ہے ۵۷۸
— دعوت ابراہیمی اور اس کی زد ۵۵۶
— حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مسلک توحید تھا ۶۰۵
— نمرود کے سامنے حضرت ابراہیم کے دلائل توحید ۱۹۸-۱۹۹
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں، انسانوں کے اقرار و انکار سے اس کی خدائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۳۷۸
— اللہ چاہے تو غلط کار اقوام کو دوسری قوم سے بدل ڈالے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا واحد مالک اور کارساز ہے ۴۰۴
— کائنات میں ہر طرف توحید کی نشانیاں بکھری پڑی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی توفیق دیتا ہے ۵۳۷-۵۳۸
— زمین کے جانوروں اور پرندوں پر غور کرو! کس طرح رب واحد نے ان کی رزق رسانی کا بندوبست کر رکھا ہے ۵۳۶-۵۳۷
— مظاہر کائنات ثابت کرتے ہیں کہ جب خالق و منتظم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو پھر شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہے ۵۲۷-۵۳۷تا۵۳۹-۵۴۷-۵۴۸-۵۵۶-۵۶۵-۵۶۷
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور خدا کیونکر ہو سکتا ہے جو تمام کائنات کا خالق اور رب ہے اور اس کی اطاعت پر تمام نظام چل رہا ہے ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ سے براہ راست دعا واستغاثہ کرنا ۱۴۴
— نظریہ توحید پر وفد نجران کو دعوتِ مباہلہ ۲۶۱
— اہل کتاب کو دعوتِ توحید ۲۶۲
— نہ حضرت عیسیٰ کو اور نہ مقرب ترین فرشتوں ہی کو کوئی عار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— حضرت عیسیٰ کی دعوتِ توحید ۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— توحید کے داعیین بے خوفی اور اطمینان کے حق دار ہیں جب کہ مشرکین بے اطمینانی اور خوف کے سزاوار ہیں ۵۵۹

— انبیائے کرام ربانی بننے کی دعوت دیتے ہیں وہ اپنی اور فرشتوں کی بندگی کا پرچار نہیں کرتے ۲۶۸
— توحید کا انکار حبط اعمال پر منتج ہوتا ہے ۲۸۲
— اللہ تعالیٰ پاک اور ناپاک کو چھانٹ کر الگ کر دیتا ہے ۳۰۵
— ہر طرف سے منہ موڑ کر خدا کی طرف یکسو ہو جانا ۵۵۸
— صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کرنا کافی ہے ۳۷۶

(۹۲) تورات

— حضرت عیسیٰ کی کتاب انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی تھی ۴۷۴-۴۷۵
— قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ان کا محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— تورات میں کس کس طرح کی تحریفات ہوئیں ۲۳۱-۲۳۲
— قرآن کس تورات کی تصدیق کرتا ہے ۲۳۲
— اس میں یہودی علما کے تصرفات و تحریفات ۲۷۳
— اس کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ۳۱۰-۵۶۳
— تورات میں زنا کی سزا رجم تھی ۴۷۲
— تورات ہدایت کا سرچشمہ تھی ۴۷۳-۶۰۲
— اس کی حفاظت کی ذمہ داری ۴۷۳
— انبیائے کرام اس کے قانون کے تحت فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
— قانون قصاص تورات میں موجود تھا ۴۷۴
— یہودی تورات کو واضح مطالب کے بجائے انھیں اصل معانی سے پھیرتے تاکہ ان سے من مانے احکام نکال سکیں ۴۷۰
— تورات ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئی اور علما و فقہا اور انبیائے کرام اس کے احکام کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتے تھے ۴۷۳
— تورات میں بھی انجیل کی طرح یہی حکم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو ۴۷۵
— یہودی تورات کو پارہ پارہ کر کے رکھتے تھے اور بہت کچھ چھپا جاتے تھے حالانکہ تورات تمام انسانوں کے لیے ہدایت اور روشنی تھی ۵۶۲-۵۶۳
— تورات کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ وہ علم دیتا ہے جس کا پہلے کوئی ذریعہ نہ تھا ۵۶۳
— یہ نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنے والوں پر تکمیل نعمت ہے، سراسر ہدایت و رحمت اور ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے ۶۰۲

(۹۳) توکل

— بھروسا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے ۳۷۶
— اہل ایمان اللہ ہی پر بھروسا کرتے ہیں ۴۶۰
— اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا حکم اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل اور بھروسا کرنا چاہیے ۴۵۰

(۹۴) تیمّم

— اس کا حکم کب آیا؟ ۳۱۶
— اس کا طریقہ اور احکام ۳۵۵-۳۵۶-۴۴۸-۴۴۹
— اس کی حکمت ۳۵۶

ث

(۹۵) ثواب

— کون سے کام ثواب کے مستحق ہیں؟ ۱۰۰
— ثوابِ دنیا اور ثواب آخرت ۲۹۲-۲۹۳-۴۰۵
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قانونِ مکافات'' اور ''جزا و سزا'')

ج

(۹۶) جادو

— جادو، ٹونے اور عملیات کی حقیقت اور ان کی مذمت و تردید ۹۶ تا ۹۸

(۹۷) جاہلیت

— اس کا اصطلاحی مفہوم ۴۷۹

— عرب جاہلیت ۱۳۸
— موجودہ جاہلیت ۱۳۹
— جاہلی عرب کی رسوم ۱۵۷-۱۵۸
— زمانہ جاہلیت میں حج کے لیے زادِ راہ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا ۱۵۵

(۹۸) جبت

— اس کے اصطلاحی معانی ۳۵۹

(۹۹) حضرت جبریل علیہ السلام

— قرآن مجید لانے والے ۹۶
— ان سے یہودیوں کی عداوت ۹۶
— جو فرشتوں، رسولوں، جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے اللہ ان کافروں کا دشمن ہے ۹۷

(۱۰۰) جزا و سزا

— اللہ تعالیٰ ہی روز جزا و سزا کا مالک ہے ۴۴
— ہر انسان اپنے ہی اعمال کا بدلہ پائے گا ۱۱۷-۳۹۵-۵۴۳
— تمام دنیوی معاملات بالآخر اللہ کے حضور پیش ہوں گے ۱۶۱
— کسی فرد سے دوسرے کے اعمال کے بارے میں استفسار نہ ہوگا ۱۱۷
— قانون جزا و سزا ۲۲۳-۲۲۴
— آخرت میں ہر شخص اپنے اچھے اور برے اعمال کو حاضر پائے گا ۱۰۳-۲۴۵
— جزا و سزا دنیا میں بھی نافذ العمل ہے (قانون مکافات) ۵۲۹-۴۶۵
— کوئی بھی گروہ اللہ کا مقرب نہیں ہے، ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ ملے گا، کسی قسم کی رعایت نہ ہوگی ۲۶۶-۲۶۷
— شکر گزار بندوں کو اللہ تعالیٰ جزا دے گا ۲۹۱
— روز جزا و سزا میں کوئی شک نہیں ہے ۳۱۱-۳۱۲
— اللہ تعالیٰ کا معیار جزا و سزا عورت و مرد، آقا و غلام اور کالے گورے سب کے لیے ایک ہی ہے ۳۱۲-۳۱۳
— اللہ تعالیٰ نیکی کو بڑھوتی اور پھر اپنی طرف سے مزید اجر عطا کرتا ہے ۳۵۳
— اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا، دیگر گناہ جس کے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے ۳۵۸-۳۵۹
— اپنے کیے پر نادم اور غلطی سے رجوع کرنا ۳۶۸
— انسان اچھے اور برے عمل کے لیے آزاد ہے لیکن جیسا عمل کرے گا ویسی ہی جزا و سزا پائے گا ۳۷۸
— روز جزا و سزا میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا ۱۰۸
— انجام کار کسی کی خواہشات اور آرزوؤں پر منحصر نہیں ہے ۳۹۹
— جزا و سزا کے معاملے میں ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا ۳۵۳-۳۷۴
— جو بھلائی کرے یا برائی، وہ اس کا پھل پائے گا ۳۹۹-۴۰۰
— ضمنی برائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے ۴۵۱
— جیسا عمل کرے گا ویسا اجر پائے گا ۳۷۸
— توبہ و استغفار تب تک قبول ہے جب تک کہ سزا کا وقت نہ آ جائے ۱۳۱-۱۳۲-۴۶۵-۴۶۶
— قانون مکافات کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں بھی بڑی سزا ہے ۲۵۹-۴۶۵
— معاشرے کے غلط کار لوگوں کے اعمال کی ذمہ داری پرہیزگاروں پر نہیں ہے البتہ نصیحت ان کا فرض ہے ۵۴۹
— تمام لوگوں کا درجہ ان کے اعمال کے لحاظ سے ہے ۵۸۲
— نیکی کا اجر دس گنا اور بدی کا برابر ہے ۶۰۴-۶۰۵
— نافرمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ فراوانی کے ساتھ رزق دیتا ہے لیکن آخرکار وہ بدترین ٹھکانے اور عذاب جہنم کے حق دار ہیں ۱۱۱
— اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے ہرگز غافل نہیں ہے ۱۰۳-۱۱۸-۳۵۳

— اللہ تعالیٰ نہایت شفیق و رحیم ہے وہ انسانوں کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا ۱۲۰-۱۲۱
— کوئی فرد یا گروہ اللہ تعالیٰ کا مقرب نہیں ہے، ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا، کوئی رعایت نہیں ہوگی ۲۶۶-۲۶۷
— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر چلنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ کر دیتا ہے اور دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے اور اپنی راہ پر چلنے والوں کو ثواب عطا کرتا ہے ۳۰۳-۳۰۴
— اللہ تعالیٰ انسانوں کے ہر نیک عمل کی قدر کرنے والی ہستی ہے ۱۲۷-۱۲۸
— انسان جب اپنے غلط اور گمراہ کن رویے کی اصلاح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ رحم کرنے والی ہستی ہے ۱۲۸
— جو قوم اللہ تعالیٰ کی نعمت ہدایت پانے کے بعد اس کو کھو دیتی ہے وہ قوم اللہ تعالیٰ سے سخت سزا پاتی ہے ۱۶۱
— جو مال اللہ کی راہ میں خرچ ہوگا اس کا پورا پورا حساب اور اجر ملے گا ۲۰۹
— اللہ تعالیٰ کے احکام ہدایت کی اطاعت سے انکار کرنا اپنے لیے دائرہ تنگ کرنے کے مترادف ہے ۲۴۰
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا ہے ۲۴۵
— اللہ انسان پر ظلم نہیں کرتا، وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے ۲۸۱-۳۰۷-۳۵۳
— جزا و سزا میں کامیابی ایسے ہی نہیں مل جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ صابرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کو الگ چھانٹ لیتا ہے ۲۹۰
— اللہ تعالیٰ اچھے اور برے ہر طرح کے اعمال پر نظر رکھنے والا ہے ۳۷۸
— انسان کو آخر کار اس حق تعالیٰ کے پاس جانا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۳۷۹
— جہاد میں حصہ لینے کا درجہ اور معاوضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا انعام ہے ۳۸۵-۳۸۶
— اگر کوئی انسان معصیت اور گناہ میں مبتلا ہو جائے اور توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ رحیم ہے ۳۹۵
— انسانوں سے اپنی حرکات چھپائی جاسکتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں ۳۹۴-۳۹۵-۴۰۱-۴۰۲
— انسان اگر اپنا طرزِ عمل درست رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تو اللہ تعالیٰ چشم پوشی کرنے اور رحم کرنے والا ہے ۴۰۳-۴۰۴
— اللہ تعالیٰ محاسبہ کرنے میں چشم پوشی اور اعمال کی قدر کرنے میں نہایت فیاض ہے ۴۱۲-۴۱۳
— اہل ایمان کے حساب کتاب میں اللہ تعالیٰ نرمی اور درگزر سے کام لے گا ۴۱۴
— ایک وقت سب کو گھیر کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کیا جائے گا ۴۳۰
— اللہ تعالیٰ کی سزا اور پکڑ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی ۴۴۰-۴۴۶
— باپ دادا کے اعمال کسی بھی انسان کو (آخرت میں) فائدہ اور نقصان نہیں پہنچا سکتے ۱۱۸
— جو جہنم کے حق دار ہیں وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے، نہ کوئی دوسری مہلت دی جائے گی اور نہ ان کی سزا کم ہوگی ۱۲۹-۱۳۰
— آخرت کی زندگی میں دنیا میں واپس بھجوا کر ایک اور موقع دینے کی درخواست رد کر دی جائے گی ۱۳۲
— دنیا میں پیشواؤں اور راہ نماؤں کی اندھی پیروی کرنے والے شرمندہ ہوں گے، کیونکہ وہ ان سے لاتعلقی کا اظہار کریں گے ۱۳۲
— آخرت میں دنیوی اسباب و وسائل جزا و سزا میں کوئی مدد نہ کرسکیں گے ۱۳۲
— گناہ گار کی معافی کی کیا صورت ہوگی؟ ۱۲۸-۱۳۵
— کسی فعل کو قانوناً جرم اور حرام قرار دینا ۲۱۳
— کفر کی حالت میں جان دینے والا اپنے آپ کو سزا سے نہیں بچا سکتا ۲۷۲
— کج روی اختیار کرنے اور غلط طرزِ عمل سے باز نہ آنے والے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ۲۷۹

— حق تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل کفار کے لیے خوب بارِ گناہ سمیٹنے کا اختیار ہے، خوب ذلیل کرنے والا عذاب ان کا مقدر ہے ۳۰۴-۳۰۵
— اللہ تعالیٰ کے قوانین پر غیر عامل اور ایمان کے منکروں کا تمام کارنامہ زندگی ضائع ہو گیا اور آخرت میں دیوالیہ ہو گئے ۴۴۷
— ایمان اور اس کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کی خطاؤں سے اللہ تعالیٰ درگزر کرتا ہے ۴۵۰
— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی نہایت سخت ہے، لیکن ساتھ میں نہایت رحم کرنے والا اور درگزر کرنے والا بھی ہے ۵۰۶
— رسول کا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینا ہے، آگے اللہ تعالیٰ انسان کے چھپے اور ظاہر تمام حالات کو جانتا ہے ۵۰۶-۵۲۴
— جزا و سزا کے دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم کیا اور یہی اصل کامیابی ہے ۵۲۸
— ایمان لا کر توبہ کرنے والوں اور آیندہ نیک چلن اختیار کرنے والوں کے تمام پچھلے گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے ۵۴۴
— سب انسان ربِ حقیقی کے حضور پیش ہوں گے جس کے پاس تمام اختیارات ہیں ۵۴۷
— ہجرت کرنے والے اور ہجرت پر مجبور کیے جانے والے، اللہ کی راہ کے غازی و شہید ان سب کے لیے اللہ کے پاس گناہوں کی معافی اور بہترین جزا ہے ۳۱۲-۳۱۳
— دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کی چلت پھرت کسی کو دھوکے میں نہ ڈالے، چند روزہ لطف دنیا کے بعد ان کے لیے بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳
— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷
— جس شخص نے اپنا گناہ کسی بے گناہ کے سر ڈال دیا اس نے بہت بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا ۳۹۵-۳۹۶
— ضلالت و گمراہی کے پیرو کار جزا و سزا کے دن کوئی سفارشی اور حامی و مددگار نہ پائیں گے ۴۶۷-۵۵۰
— فرقہ بندی کرنے والوں کا اسلام اور طریقہ ابراہیم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہی انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں ۶۰۵-۶۰۶
— عیسائیوں اور یہودیوں پر ایک ایسا وقت ضرور آئے گا جب انھیں ان کی دنیوی کارکردگی سے مکمل آگاہی دی جائے گی ۴۵۵
— اہل کتاب کے نزدیک ان کے لیے روز آخرت صرف نیک انجام ہے ۳۱۳-۳۱۴
— دین میں فرقہ پیدا کرنے والوں سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۶۰۵-۶۰۶
— یہودی یا عیسائی ہونا باعث نجات نہیں بلکہ صرف حضرت ابراہیم کا طریقہ ہی باعث نجات ہے ۱۱۴
— یہ خیال باطل ہے کہ صرف یہودی اور عیسائیوں کا مقدر جنت ہے اور وہ چند روزہ دوزخی زندگی کے بعد جنت میں جائیں گے، صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا ہی اس کا حق دار ہے ۱۰۳-۲۴۲

(۱۰۱) جلاوطنی

— حضرت الیاس علیہ السلام کی مظلومانہ جلاوطنی ۸۱

(۱۰۲) جن

— ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھیرایا گیا ۵۶۷
— انسانوں کی طرح جنوں کو بھی خیر و شر میں انتخاب کی آزادی دی گئی ۵۷۴
— آخرت میں شیاطین جن سے خطاب ۵۸۰

(۱۰۳) جنت

— جنت سلامتی کا گھر ہے ۵۸۰
— جنت کے باسی کون ہوں گے؟ ۵۸-۵۹-۶۶-۹۰-۱۶۳-۲۳۸-۲۸۸-۲۸۹-۳۱۳-۳۶۲-۳۹۹-۴۰۰-۴۵۲-۴۹۸
— جنت کی نعمتوں کی تفصیل ۵۸-۵۹
— جنت میں رشتۂ ازدواج ۵۹

— آدمؑ اوران کی بیوی کو اولین جنت میں رکھا گیا ۶۵
— جنت کی راہ کڑی آزمائشوں سے ہو کر گزرتی ہے ۲۹۰
— جنت کا حصول اطاعت خدا اور رسول پر منحصر ہے ۳۳۰
— اس خیال کی تردید کہ عیسائی اور یہودی جنت میں ہی جائیں گے، ایسا حق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیک عمل کرنے والوں کو حاصل ہے ۱۰۳
— رضائے الٰہی اہل جنت کا سب سے بڑا انعام ہو گا ۲۳۸
— جنت کی طرف سبقت کرو ۲۸۸
— جنت کی ہمیشگی ۵۹
— جنت کے باسیوں میں سے چار اوپر کے مدارج کا ذکر ۳۷۰
— مشرکین کے لیے جنت حرام ہے ۴۸۹

(۱۰۴) جوا (قمار)

— اس کے متعلق قرآن مجید کا اولین حکم ۱۶۷
— اس کی قطعی حرمت ۵۰۱
— اس کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳
— جوا کے ذریعے سے تقسیم اور فال گیری کی ممانعت ۴۴۲
— قمار آمیز کھیلوں اور معاملات کی حرمت ۴۴۲

(۱۰۵) جہاد فی سبیل اللہ، جنگ

— جہاد کا حکم ۱۴۹-۱۵۰-۱۶۴-۲۸۳-۲۸۴
— اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے مردہ نہیں، حقیقت میں زندہ ہیں ۱۲۶
— جہاد کا جواز کیا ہے؟ ۱۴۹ تا ۱۵۱
— مجاہدین کی دعا ۱۹۰-۱۹۱
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والوں کا نیک انجام ۲۹۸-۳۰۲
— جہاد کی تیاری میں اولین حکم صبر، نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے سے اصلاح کا ہے ۳۷۳-۳۷۴
— اسلام میں جہاد کا مقصد بے بس مردوں، عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو ظلم سے نجات دلانا ہے ۳۷۲
— میدانِ جنگ میں صف بستہ، کھڑے، بیٹھے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو ۳۹۲-۳۹۳
— مسلمان اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اس راہ میں کسی کی ملامت اور طعنہ زنی کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲
— مجاہدین کی صفات عالیہ ۳۷۲
— ظلم و زیادتی کے ساتھ جتھا بندی کرنا اور پھر فدیہ کے لیے لین دین کرنا صریحاً حرام ہے ۹۱
— جنگ کا جواز کتنا ہی مضبوط ہو، اللہ سے ڈرتے ہوئے افراط و تفریط اور ظلم و زیادتی سے مکمل پرہیز کیا جائے ۱۵۲
— مجاہدین کے رفیق، اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں، یہی کامیابی اور غلبہ کی ضمانت ہے ۴۸۲
— کن گمراہیوں کے خلاف جہاد واجب ہے اور کن گمراہیوں کی اصلاح تبلیغ اور نصیحت سے کی جائے گی ۱۵۱
— جب نظام باطل کی جگہ نظام حق قائم ہو جائے تو عفو و درگزر کی عمومی پالیسی کے باوجود باطل کے مجرمین سزا پانے کے حق دار ہیں ۱۵۱-۱۵۲
— جہاد کا مطلب قتل و غارت نہیں ہے ۱۵۲
— بارہا ایسے ہوا کہ ایک چھوٹا گروہ صبر کی طاقت کی بنا پر ہر بڑے گروہ پر غالب آ گیا ۱۹۰
— جہاد سب سے بڑی طاقت ایمان اور اس عقیدے سے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے، سے حاصل کرتا ہے ۱۹۰
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدد کے لیے موجود ہے ۲۸۶
— فرشتوں کے ذریعے سے میدانِ جنگ میں اہل ایمان کی مدد کی گئی ہے ۲۸۶
— اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے سے صابرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کو الگ چھانٹ لیتا ہے ۲۹۰
— آزمائش، جہاد اور دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا

۲۹۳

— دعوتِ حق کے مخالفین کو اللہ تعالیٰ فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس فتنے کا قلع قمع ہی جہاد کا اولین جواز ہے ۱۵۰

— اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں پر آزمائشیں ہر دور میں آئیں لیکن وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، ایسے صابروں کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ۲۹۲-۲۹۳

— اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کا اٹل وعدہ ہے ۲۹۴

— اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ رکھتا ہے اور دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے ۳۰۳-۳۰۴

— اہل ایمان کو فہمائش کہ باطل کے مقابلے میں پامردی دکھائیں، صبر سے کام لیں، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہیں اور اللہ سے ڈرتے رہیں ۳۱۴

— منافقین بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن میدان عمل میں صفر ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳-۳۷۴

— جہاد کے لیے ہر دم تیار رہو، اور پھر موقع کی مناسبت سے الگ الگ یا مجتمع ہو کر نکلو ۳۷۱-۳۷۲

— مجاہد وہ ہیں جو آخرت کے بدلے دنیا فروخت کر دیتے ہیں، وہ شہید ہوں یا غازی قرار پائیں دونوں صورتوں میں ان کے لیے اجر عظیم ہے ۳۷۲

— ایمان لانے والے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ۳۷۳

— مجاہدین کے خلاف شیطان کی چالیں بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً نہایت کمزور ہیں ۳۷۳

— اس رویے کی مذمت کہ جنگ میں کامیابی ملتی ہے تو اس کو اللہ کی طرف سے قرار دیتے ہیں اور خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے شکست ہوتی ہے تو اس کو رسولؐ اللہ کے سر تھوپ دیتے ہیں ۳۷۵-۳۷۶

— جنگ کے دوران میں افواہیں پھیلانے کی ممانعت، کوئی خبر بھی ملے تو ذمہ دارانِ معاشرہ کے گوش گزار کر کے خاموش ہونے کی تلقین ۳۷۶-۳۷۷

— مال غنیمت کی محبت کو حدود کے اندر رکھنے کا حکم ۳۸۴-۳۸۵

— جنگ میں قتل دشمن کے حدود، اگر کوئی خود کو مسلم ظاہر کرے تو اس کے قتل کی بہر حال ممانعت ہے ۳۸۴-۳۸۵

— اہل ایمان کو خوش خبری کہ تمھارے مقابل کفار ہر حال میں رسوا ہوں گے اور یہ اللہ کا نور اپنی پھونکوں سے ہرگز بجھا نہیں پائیں گے ۳۹۲-۳۹۳

— اہل ایمان حق کے لیے اتنی تکلیف کیوں نہ اٹھائیں جتنی کفار باطل کے لیے اٹھا رہے ہیں ۳۹۳

— کفار کی ساری سعی بے کار ہے جب کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حق دار ہیں ۳۹۳

— اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر کافروں کے غلبے کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے ۴۰۹

— جنگ احد کے دوسرے مرحلے میں کامیابی کے باوجود قریش کا لشکر بے وجہ پسپا ہو کر واپس ہو گیا ۲۸۴-۲۹۴-۲۹۵

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قتال فی سبیل اللہ'')

(۱۰۶) جہنم

— دوزخی کون ہیں؟ ۸۹-۹۰

— جہنم کے قیام کی ہمیشگی ۶۹-۹۰-۴۲۶

— جہنم کی آگ سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہوگی ۱۳۲

— جہنم کی آگ جب کھال جلا دے گی تو نئی کھال دے دی جائے گی تا کہ عذاب جاری رہ سکے ۳۶۱

— جہنم کا عذاب تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ہوگا ۴۱۴

— جہنم مشرکین کا ٹھکانہ ہے ۴۸۹

چ

(۱۰۷) چاند

— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے

ہے ۱۴۷-۱۴۸

(۱۰۸) حبط اعمال

— ارتداد کا لازمی نتیجہ ۱۶۶
— ریاکارانہ انفاق کا نتیجہ ۲۰۶
— انبیاو مصلحین کے قتل کا نتیجہ ۲۴۱
— کفر کا لازمی نتیجہ ۲۸۱
— حبط اعمال کا سبب کیا ہے؟ ۲۸۲
— ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کا نتیجہ ۴۴۷
— منافقت کا نتیجہ ۴۸۱
— شرک کا نتیجہ ۵۶۱

(۱۰۹) حبل اللہ

— اس کا مفہوم ۲۷۶

(۱۱۰) حج

— حج اور عمرہ کے احکام ۱۵۳-۱۵۴-۱۵۷
— حج اور عمرہ کا فرق ۱۴۷
— نقشہ مقاماتِ حج ۱۵۶
— حج کے سفر میں تقویٰ بہترین زادِراہ ہے ۱۵۵-۱۵۶
— حج اسلامی اخلاقیات کی عملی تربیت ۱۵۵
— ذکر الٰہی کا حکم ۱۵۷
— حج لوگوں پر اللہ کا حق یعنی حقوق اللہ میں سے ہے ۲۷۵
— فرضیت حج کے لیے شرط استطاعت ۲۷۵
— حج اور عمرے کی نیت کو پورا کیا جائے ۱۵۳
— حاجی قربانی سے پہلے بال نہ ترشوائے ۱۵۳
— حج کو جاتے ہوئے ''گھر جانے'' اور ''امن نصیب ہوجانے'' کا مفہوم ۱۵۴
— قربانی میسر نہ ہونے کی صورت میں حاجی روزے رکھے ۱۵۴
— حالت احرام کی پابندیاں ۱۵۵-۴۳۷-۴۳۸
— مشعر حرام (مزدلفہ) کے آداب ۱۵۶
— مناسک حج میں قریش کی ترمیمات ۱۵۷
— مکہ سے عرفات اور عرفات سے مزدلفہ آنا جانا ۱۵۷
— ایام تشریق میں منیٰ سے مکہ کی طرف واپسی میں تقدیم وتاخیر کی رخصت ۱۵۸
— زائرین حج کو کعبہ سے نہ روکا جائے ۴۳۹

(۱۱۱) حدود اللہ

— ان کا لحاظ و احترام کرنے والوں اور ان پر عامل افراد کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے ۱۵۲
— ان کے بارے میں نہایت درجہ احتیاط کی ضرورت ہے ۱۴۷
— ان کی پابندی وہی کر سکتے ہیں جن کو ان کے توڑنے کے انجام بد کا شعور ہو ۱۷۵-۱۷۶
— ''حد سے تجاوز'' نہ کرنے کا مفہوم ۴۹۹

(۱۱۲) حدیبیہ

— وہ حالات جن میں سورۂ مائدہ کا نزول ہوا ۴۳۴
— صلح حدیبیہ کے دوررس مفید اثرات ۴۳۶

(۱۱۳) حدیث

— قرآن کی تشریح حدیث کے ذریعے سے ۱۳۴-۳۰۲

(۱۱۴) حروف مقطعات

— ان کی حقیقت کیا ہے؟ ۴۹

(۱۱۵) حزب اللہ

— کیسے لوگوں پر مشتمل ہے اور آخر کار یہی گروہ غالب آنے والا ہے ۴۸۲

(۱۱۶) حکمت

— شیطان کے ہتھکنڈوں سے بچنے کا طریقہ ۲۰۷
— اللہ کی ایک نعمت ۱۷۷-۲۰۷-۳۶۱
— تمام انبیا کو دی جاتی ہے ۲۶۸
— حضرت داود علیہ السلام کو عطا کی گئی ۱۹۱
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی ۲۵۲-۵۱۳
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی ۳۹۶
— رسول اللہ اس کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے ہیں

۱۱۲-۱۲۵-۳۰۰

(۱۱۷) حکمت تبلیغ

- اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سوال پر آخر جھگڑا کیسا؟ ۱۱۷
- اہل کتاب کو قرآن کی دعوتِ اسلام ۲۴۰
- تبلیغ میں مباہلے کا مقام ۲۶۱
- عقیدۂ توحید پر بلانے کا طریقہ ۲۶۱
- اہل کتاب کو دعوتِ توحید ۲۶۲
- تبلیغ میں ''قول بلیغ'' کی اہمیت ۳۶۸
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بادشاہوں کو خطوط کے ذریعے سے دعوتِ اسلام دینا ۴۳۶
- اشرار سے علیحدگی ۵۴۹
- مناظروں سے اجتناب ۵۴۹
- طالبین حق پر توجہ ۵۴۹
- تبلیغ کوئی پیشہ ورانہ کام نہیں ہے ۵۶۲
- مبلغ کی دنیوی مفاد سے مکمل بے نیازی ۵۶۲
- داعی و مبلغ کا منصب اور اس کی ذمہ داریوں کی حدود ۵۷۰
- بحث و مباحثہ میں غیر ضروری جوشیلے پن سے بچنے کا حکم ۵۷۱

(۱۱۸) حق

- زمین و آسمان (کائنات) کو حق کے ساتھ پیدا کرنے کا مطلب ۵۵۱
- اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا اور کوئی بات منسوب نہ کرو ۴۲۷
- دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں؟ ۵۳۶
- انسان کی زندگی میں حق و باطل کی کشمکش ۴۶۶-۵۳۵
- تلاش حق کی جستجو میں کامیابی اور حق پا لینا بلند ترین مرتبہ پالینے کے مترادف ہے ۵۶۰
- ضمیر اور عقل و استدلال استعمال کرنے والوں کو زندہ، اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے ۵۳۶-۵۳۷
- حق کو رد کر کے انسان اپنی ہی تباہی کا سامان کرتا ہے ۵۳۲
- حق سے فرار اور حق سے نفرت کی ناپاکی کفار پر مسلط کر دی جاتی ہے اور انھیں صاف اور سیدھی راہِ ہدایت نظر نہیں آتی ۵۷۹-۵۸۰

(۱۱۹) حقوق اللہ

- اسلام کا مطلوبہ معیارِ ایمان، اصل میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
- اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہے ۹۰
- ظلم کی راہ اختیار کر کے انسان حقوق النفس اور حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی خلاف ورزی کا بھی مرتکب ہوتا ہے ۶۶-۶۷
- حقوق اللہ کس حد تک ادا کیے جاتے ہیں ۹۰-۹۱
- حقوق اللہ میں مداخلت کرنے کے معنی ۱۳۱
- حج حقوق اللہ میں سے ہے ۲۷۵
- حقوق اللہ، انسان پر فطرتاً عائد ہوتے ہیں ۶۰۰
- حقوق اللہ کی ادائیگی سے گریز کفر ہے ۲۷۵

(۱۲۰) حقوق العباد

- حقوق العباد کے بارے میں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ غالب اقتدار اور حکمت و دانائی رکھنے والا حق تعالیٰ بھی موجود ہے ۱۷۴
- ایمان کا مطلوبہ معیار حقوق اللہ اور حقوق العباد کا بہترین امتزاج ہے ۱۳۶-۱۳۷
- انسان ظلم کی راہ اختیار کرتا ہے تو حقوق العباد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے ۶۶
- حقوق العباد کا احترام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صاحب تقویٰ ہوں ۱۸۳
- والدین ۹۰-۱۶۴-۳۵۱-۵۹۸
- ذی القربیٰ (رشتہ دار) ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱
- حقوق النفس ۶۶-۶۷
- یتامیٰ ۹۰- ۱۳۷- ۱۶۴- ۱۶۷- ۱۹۸- ۳۱۹-

۳۲۰-۳۵۱-۴۰۱-۵۹۹-۶۰۰
— مساکین ۹۰-۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱
— مسافر ۱۳۷-۱۶۴-۳۵۱
— اہل حاجت ۱۳۷
— ہمسایہ ۳۵۱
— لونڈی غلام ۳۵۱
— احترام ملکیت ۱۴۸
— مالی امداد حاصل کرنے کا حق ۱۶۴

(۱۲۱) حلال وحرام

— کیا کیا حرام ہے؟ ۱۳۴-۱۳۵-۴۴۰
— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنا عین تقاضائے ایمان ہے ۱۳۴
— حلال وحرام کی قیود کا جواز کیا ہے؟ ۱۳۵
— حلال وحرام کی حدود میں زیادتی کیا ہے؟ ۴۹۹
— حلال وطیب اور پاک چیزیں کھانے کا حکم ۱۳۳-۱۳۴
— حرام ماکولات کے بارے میں رخصت کی تین شرائط ۱۳۵
— حلت وحرمت کے مکمل اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں ۴۳۸-۴۹۸
— زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم ۴۴۰-۴۴۱
— کھانے پینے کی چیزوں میں وجوہِ حرمت طبی نہیں بلکہ اخلاقی واعتقادی ہیں ۴۱۱-۴۴۲
— قرآن کا نظریۂ حلت وحرمت ۴۴۴
— صرف اللہ تعالیٰ مختار ہے، حلال چیزوں کو حرام کرنے کی ممانعت ۴۹۸-۴۹۹
— پاک اور ناپاک یکساں نہیں ہیں ۵۰۶
— لوگوں کی خود ساختہ حلت وحرمت ہیچ ہے ۵۷۶
— لوگوں کی خود ساختہ مذہبی پابندیاں افتراء علی اللہ کی تعریف میں داخل ہیں ۵۸۷-۵۸۸
— اہل عرب کے ہاں حلت وحرمت کے مشرکانہ وتوہم پرستانہ تصورات ۵۸۸
— شرائع الٰہی میں بنیادی حرمت، مردار، خون، سور کے گوشت اور غیر اللہ کے ذبیحوں کی ہے ۵۹۲-۵۹۳
— حلت وحرمت کے بارے میں فقہائے اسلام کے اختلافات ۵۹۲-۵۹۳
— شریعت محمدی اور یہودی فقہ میں احکام حلت وحرمت کا فرق کیوں ہے؟ ۵۹۳
— یہودیوں پر لعنت و پھٹکار کے طور پر خدائی تحریم کی ایک صورت ۵۹۵
— یہودیوں پر ان کی مستقل نافرمانیوں کی وجہ سے سزا کے طور پر کئی حلال چیزیں حرام کر دی گئیں ۴۲۲-۴۲۳-۵۹۳-۵۹۴
— بنی اسرائیل کے لیے بعض ماکولات کی خاص حرمت ۲۷۳
— اہل کتاب کی خواتین مسلمانوں کے لیے نکاح کے لیے حلال ہیں ۴۴۶-۴۴۷
— اہل کتاب کے ذبیحے کی حلت ۴۴۶
— کھانے پینے میں حلال وحرام کی پابندیاں اولین تقاضائے ایمان ہے کیونکہ انھی میں لوگوں نے قیاس وگمان کے ذریعے سے احکام خداوندی کی سب سے زیادہ خلاف ورزی کی گئی ۵۷۶
— حلال وحرام کے احکام حالت اضطرار کے علاوہ سختی سے لاگو ہیں ۵۷۶-۴۴۴
— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والے بھٹک گئے ہیں اور ہرگز راہِ راست پر نہیں ہیں ۵۸۹
— حلال وحرام میں اللہ تعالیٰ کی قیود واجازت کے بجائے خود ساختہ قیود واجازت اختیار کرنا شیطان کی پیروی کرنا ہے ۵۹۰-۵۹۱
— سب سے بڑا ظالم شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف حلال وحرام سے متعلق جھوٹی باتیں منسوب کرے اور علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے ۵۹۱
— اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے حلال وطیب رزق کو حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور تقاضائے ایمان کے بھی خلاف ہے ۴۹۹
— چرند چوپایوں کی حلت ۴۳۷

— حادثے سے مرجانے والے جانور مردار ہونے کی وجہ سے حرام ہیں ۴۴۰
— ذبح کی اہمیت ۴۴۰-۴۴۱
— اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کی حرمت ۴۴۰-۵۷۶-۵۷۷
— شکار کے قاعدے ۴۴۵
— ’’حلال‘‘ کے ساتھ ’’پاک‘‘ کی قید کا مقصد ۴۴۵
— سمندری شکار کی حلت ۵۰۵
— شراب کی قطعی حرمت کا حکم ۵۰۱-۵۰۲
— ذبح کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی اہمیت ۵۷۶-۵۷۷

(۱۲۲) حمد
— اس کے معنی ۴۳
— اللہ تعالیٰ ہی اس کا مستحق کیوں ہے ۴۳

(۱۲۳) حواری
— اس لفظ کے صحیح معنی ۲۵۶
— حواریوں کا دین اسلام ہی تھا ۲۵۶
— حضرت عیسیٰ پر حواریوں کا ایمان لانا ۵۱۳
— حواریانِ عیسیٰ کا آسمانی خوان کی خواہش کرنا ۵۱۴

(۱۲۴) حضرت حوا علیہا السلام
— آپ کی پیدائش کے بارے میں بائبل کا بیان ۳۱۹

(۱۲۵) حیات بعد الموت
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزے کے طور پر اس کا مظاہرہ ۲۰۰
— حضرت ابراہیم کی درخواست پر چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ۲۰۱
— خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے لیے بشارت ۲۹۸
— شہدا فی سبیل اللہ کے لیے بہترین زندگی کی بشارت ۳۰۲
— خدا کی پیشی پر سب لوگوں کو گھیر کر لایا جائے گا ۵۲۷
— قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ضرور جمع کرے گا ۵۲۷
— حیات بعد الموت کی مثال رات کو سو کر صبح جاگنے کی سی ہے ۵۴۶
— تمام انسانوں کو از سر نو زندہ کیا جائے گا ۵۸۳

(۱۲۶) حیض
— اس حالت میں عورت سے تعلق کے کیا حدود ہیں ۱۶۹-۱۷۰
(مزید دیکھو ’طہارت و پاکیزگی‘)

(۱۲۷) ختم نبوت
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے ہر نبی سے بعد میں آنے والے ہر نبی کے لیے عہد لیا گیا کہ ان کی دعوت اور تعلیم کو مانا جائے گا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد نہیں لیا گیا، جو ختم نبوت کا ثبوت ہے ۲۶۸-۲۶۹

(۱۲۸) خسران
— کس قسم کے لوگ خسران پاتے ہیں؟ ۶۰-۱۰۷-۵۳۳-۵۸۸
— ایمان لا کر کفر کا رویہ اختیار کرنے والے اصل میں خسارے میں ہیں ۱۰۷
— دعوتِ حق کے حاملین کو مخالفین کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیے، نہیں تو وہ انھیں نامراد اور خسارے میں مبتلا کر کے چھوڑیں گے ۲۹۳-۲۹۴

(۱۲۹) خطوط نبویؐ
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط بنام ایران، مصر اور روم ۴۳۶

(۱۳۰) خلافت
— خلافت کے معنی ۶۲
— انسانی خلافت سے متعلق تین حقائق ۶۰۶
— قرآن اس نظریے کی واضح تردید کرتا ہے کہ گناہ کے لازمی نتائج ہیں ۶۸

(۱۳۱) خلع

— اصطلاحی مفہوم اوراس کا طریقہ ۱۷۵
— خلع کی صورت میں عدت کی مدت کیا ہے؟ ۱۷۶

(۱۳۲) خمر

(دیکھو ''شراب'')

(۱۳۳) خون بہا

— خون بہا کے قرآنی احکام کا بیان ۱۳۷ تا ۱۳۹ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''قتل انسانی'' اور ''قانون اسلامی'')

(۱۳۴) خیانت

— امانت میں خیانت کرنے والا اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر کیا جائے گا ۲۹۹
— جو شخص خیانت کا مرتکب ہوتا ہے وہ دراصل اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے ۳۹۴

(۱۳۵) خیر امت

— خیر امت کے اوصاف اور ذمہ داریاں ۲۷۹
— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی گروہ اور امت کی اجارہ داری نہیں ہے ۱۰۱
— انسان بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— منصب امامت پر مامور کرنے کے بعد امت مسلمہ کے لیے ضروری ہدایات ۱۲۵
— احکام کتاب اللہ کو دنیوی فائدے کے لیے چھپانے والے جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۳۵۳

د

(۱۳۶) دانش مند

— اہل ایمان ہی سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں جو عین دانش مندی کا تقاضا ہے ۲۳۵

(۱۳۷) داود علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا ۵۵۹-۵۶۰
— آپ صالحین میں سے تھے، انھیں تمام دنیا پر فضیلت عطا کی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— قتل جالوت کا واقعہ ۱۹۱

(۱۳۸) دعا

— دعا کی حقیقت، اس کے آداب اور درست طریقہ ۴۲-۴۳
— قرآنی دعائیں ۴۵- ۱۹۰- ۲۲۴- ۲۲۵- ۲۳۵- ۲۳۸-۲۴۳-۲۹۳-۳۱۱-۳۱۲
— حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی دعا ۱۱۲
— حق تعالیٰ تک اپنی دعا پہنچانے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے ۱۴۴
— حضرت مریم کی والدہ کی دعا ۲۴۷
— حضرت زکریاؑ کی بڑھاپے میں نیک اولاد کے لیے دعا ۲۴۸
— اللہ تعالیٰ سے طلب فضل کی دعا کا حکم ۳۴۷
— خوانِ آسمانی کے لیے حضرت عیسیٰؑ کی دعا ۵۱۴
— اللہ تعالیٰ کے وعدۂ آخرت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے دعا یہ کرنی چاہیے کہ اس برحق وعدہ کے مصداق بن جائیں ۳۱۱-۳۱۲
— سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے جو قرآن سے فائدے کے طالب ہر انسان کو سکھلائی گئی ہے ۴۲
— اللہ تعالیٰ ہی صرف عبادت کے لائق ہے اور صرف اسی سے مانگنا درست ہے ۴۴-۴۵
— جو لوگ اللہ کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی سنتا ہے ۱۴۴
— آزمائش اور تکلیف میں مبتلا افراد کے لیے دعا ۲۲۵-۲۲۶
— اہل ایمان کی خصوصیات کے حصول کی دعا ۲۳۸-۲۳۹

— کچھ مانگنے سے پہلے اپنی خطاؤں اور غلطیوں کی معافی طلب کرنی چاہیے تو پھر دعا بھی مقبول ہوتی ہے ۲۹۳
— صراطِ مستقیم پانے اور اس پر قائم رہنے کی دعا ۴۵

(۱۳۹) دعوتِ حق، دعوتِ اسلامی

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں انسانوں کے خیالات، اخلاق، عبادات، معاشرت، تمدن اور سیاست سب کی اصلاح شامل ہے ۱۱۲
— باطل کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی حمایت ہی کافی ہے، جو سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے ۱۱۶
— دعوتِ حق ایک عظیم الشان لیکن پرخطر خدمت ہے ۱۲۵-۱۲۶
— دعوتِ حق کا مقصود ۶۰۵ تا ۶۰۷
— دین کا راستہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے، کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا ۱۶۳
— دعوتِ حق کے مجاہدین کی قرآنی دعا ۱۹۰-۱۹۱
— مومن کی حامی و مددگار ذاتِ خداوندی ہے، جو انھیں ظلمات سے نور کی طرف لاتا ہے، جب کہ کفار کا مددگار طاغوت ہے جو انھیں روشنی سے تاریکی میں لے جاتا ہے ۱۹۷ تا ۲۰۲
— اہل ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کہ وہ اپنا وقت، قوتیں اور کمائیاں اللہ کی راہ میں خرچ کریں ۲۰۲
— دعوتِ حق میں مصروف معاشرتی اور معاشی طور پر کمزور افراد انفاق فی سبیل اللہ کے اولین اور بڑے حق دار ہیں ۲۰۹-۲۱۰
— داعیانِ حق کا کام صرف دعوتِ حق پہنچا دینا ہے، آگے اللہ مالک ہے، وہ بندوں کے معاملات خود دیکھ رہا ہے ۲۴۰-۲۴۱
— دعوتِ حق کے نافرمانوں کا پھلنا پھولنا اور اطاعت گزاروں کی آزمائش، اس فرق پر قرآنی تبصرہ ۲۴۳
— دعوتِ حق کے پیروکاروں کی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ ذات غفور و رحیم ہے ۲۴۵
— اہل ایمان میں ہر وقت ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے ۲۷۷
— داعیانِ حق اگر صبر، شکر اور اللہ سے ڈر کر زندگی گزاریں تو مخالفین کی کوئی تدبیر اور حربہ ان کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے گا ۲۸۳-۳۱۴
— اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے نتھار کر اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور اسی ذریعے سے کفار کی سرکوبی کرتا ہے ۲۹۰
— دعوتِ حق میں ثابت قدمی کی دعا ۲۹۳
— اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا کرو، وہی بھروسے کے لیے کافی ہے، وہ مخالفین کے تمام ہتھکنڈے ناکام کر دے گا ۳۷۶
— دعوتِ حق کا داعی صرف اپنی ذات کا جواب دہ ہوتا ہے، وہ اکیلا ہی ڈٹ جاتا ہے، کیونکہ سخت سزا دینے والا زبردست اس کے ساتھ ہے ۳۷۷
— دعوتِ حق کی پیروی انسان کے اپنے لیے بہتر ہے ۴۲۷-۴۲۸
— خالق کائنات کے وجود کا انکار کرنے سے مالک علیم و حکیم رب تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا ۴۲۷-۴۲۸
— دعوتِ حق تمام انسانوں کے لیے دلیل و برہان، نورِ مبین اور دعوتِ عام ہے ۴۳۰-۴۳۱
— بالعموم انسان اور بالخصوص اہل ایمان سے لیا گیا عہد و پیمان ۴۴۹
— صراطِ مستقیم اور دنیا بھر کے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کا منصب ایک عہد کے مطابق ہے، اس عہد کے لوازمات جو اہل ایمان پر فرض ہیں ۴۴۹
— اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارنے اور اللہ ہی پر توکل اور بھروسا کرنے کی ہدایت، جو اہل ایمان کے ساتھ ہے ۴۵۰-۴۵۱
— اللہ سے ڈرنے، اس کے حضور باریابی کا ذریعہ تلاش کرنے اور اللہ کی راہ میں شیطان، اپنے نفس اور باطل نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کا حکم ۴۶۶-۴۶۷
— اہل ایمان کو راہِ حق کے خلاف کفار کی سرگرمیوں پر

رنجیدہ نہ ہونے کا حکم، یہی حکم رسول اللہ کو بھی دیا گیا ۴۶۹

— مسلم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں اور اس راہ میں کسی ملامت اور شرمندگی کی پروا نہیں کرتے ۴۸۱-۴۸۲

— امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حدود کا تعین ۵۱۰

— دوسروں کے عقائد و اعمال کی خرابیاں دیکھنے کے بجائے اپنی اصلاح کی فکر کرو ۵۱۰

— حق و باطل کی کشمکش میں حق پرستوں کو آزمائش کی بھٹی سے گزرنا پڑا اللہ تعالیٰ کے اس طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ۲۹۳-۳۰۵-۳۰۸-۳۰۹-۵۳۵

— دعوتِ حق کے لیے صبر اور نماز دو بنیادی ضروریات ہیں ۱۲۶

— جنگ بدر کے مشاہدات و نتائج میں اہل دانش اور عقل مندوں کے لیے سبق ہے ۲۳۷

— متقین اور خوفِ آخرت رکھنے والے افراد ہی اسلام کی دعوت کے اصل مخاطب ہیں اور وہی اس سے فیض یاب ہوتے ہیں ۵۴۳

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فہمائش کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طالب کو اپنے سے الگ نہ کرو کہ وہ معاشی و معاشرتی طور پر کمزور ہے ۵۴۳-۵۴۴

— ایمان لاکر نیک عمل کرنا ہی اصل معیارِ عزت و شرف ہے، دنیوی دولت و مقام کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۵۴۴

— اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی صحیح اور درست راہ نمائی ہے ۵۵۱

— غیر مسلموں کے معبودوں تک کو برا نہ کہو، مبادا وہ جہالت میں اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱

— رسولؐ اللہ کو داعی، مبلغ اور مظہرِ حق بنایا گیا، وہ کوتوال اور حوالہ دار نہیں ۵۷۰

— اللہ تعالیٰ کی خوشنودی صرف اور صرف حق اور اس کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے ۵۷۳ تا ۵۷۵

— دعوتِ حق کے علم بردار اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نور و ہدایت کے تحت زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸

— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا سرپرست ہے کیونکہ انھوں نے صالح طرزِ عمل اختیار کیا ہے ۵۸۰

— دعوتِ حق کے لیے انبیائے کرام کی جدوجہد ۱۶۳

— مال کو اگر دین کی سربلندی کے لیے خرچ نہ کرو گے اور اپنی ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے تو یہ دنیا و آخرت میں ضلالت و گمراہی اور خسران کا باعث بن جائے گا ۱۶۴

— دعوتِ حق کے مخالفین ظالم ہیں، ان کی زبان کبھی بند نہ ہوگی، لہٰذا اہل ایمان کو ان سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہوگا ۳۱

— تعلیمات و ہدایات خداوندی چھپانے والے لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸-۲۶۰-۲۶۱

— دعوتِ حق کے مخالفین کو اللہ تعالیٰ فتنے میں مبتلا کر دیتا ہے، اس فتنے کا قلع قمع ہی جہادِ اسلامی کا اولین جواز ہے ۱۵۰

— جب نظامِ باطل کی جگہ نظامِ حق کامیاب ہو جائے تو عفو و درگزر کی عمومی پالیسی کے باوجود باطل کے بڑے بڑے داعیان سخت سزا کے مستحق ہیں ۱۵۱-۱۵۲

— اپنی لچھے دار گفتگو کے ذریعے سے اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیرانے والے بدترین دشمن حق ہیں ۱۵۸-۱۵۹

— دعوتِ حق کے مخالفین کے مغلوب ہونے اور بدترین انجام پانے کی پیشین گوئی ۲۳۶

— دعوتِ حق کے مخالفین کو وعید کہ دردناک عذاب ان کا مقدر ہے، ان کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں مقبول نہ ہوں گے ۲۴۱

— دعوتِ حق کے مخالفین سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا اور انھیں کبھی معاف نہ کرے گا ۲۵۹

— اس رویے کی مذمت کہ حق آشکار ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے کتمان حق کرنا ۲۶۰-۲۶۱

— حاملینِ دعوتِ حق کو مخالفین کی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے، وہ نامراد اور خسران میں مبتلا ہیں ۲۹۳-۲۹۴

— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات پھیلانے اور انھیں پوشیدہ نہ رکھنے کا عہد لیا گیا لیکن انھوں نے انھیں پس پشت ڈالا اور تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا ۳۰۹-۳۱۰

— دعوتِ حق کے داعیان مخالفوں کے رویے سے بری الذمہ ہیں ۳۷۵-۳۷۶

— دعوتِ حق کے ساتھ یہودیوں کا ظالمانہ رویہ ۴۲۲-۴۲۳

— جو لوگ دعوتِ حق کا خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت آگے نکل گئے ہیں ۴۲۶

— دعوتِ حق کے خلاف کفر و بغاوت اختیار کرنے والے اور ظلم و ستم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا ۴۲۶

— اللہ تعالیٰ دعوتِ حق کی طرف اٹھنے والے ہاتھ توڑ دیتا ہے ۴۵۰

— اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر سے بچانے والا ہے، وہ کفار کو حق کے مقابلے میں کبھی کامیابی نہ دے گا ۴۸۷

— بنی اسرائیل پر اس لیے لعنت کی گئی کہ انھوں نے برے اعمال سے ایک دوسرے کو روکنا چھوڑ دیا ۴۹۶-۴۹۷

— انبیائے کرام کی دعوت جھٹلانے والوں پر وہی حقیقت مسلط کر دی گئی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۵۲۶

— دعوتِ حق کو ''قصۂ پارینہ'' قرار دینا ہر زمانے میں اہل ضلالت کا وتیرہ رہا ہے ۵۳۱

— جو لوگ دعوتِ حق قبول کرنے سے انکاری ہیں اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں، وہ لاشعوری طور پر اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں ۵۳۲

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کے انکار پر نہایت رنجیدہ ہوتے تھے، انھیں بتایا گیا کہ یہ تمھارا نہیں تمھارے بھیجنے والے کا انکار کر رہے ہیں، مغضوب قوموں کی تاریخ ان کے انجام پر گواہ ہے ۵۳۴

— انبیائے کرام ہمیشہ سے جھٹلائے جاتے رہے لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی ۵۳۴-۵۳۵

— داعیانِ حق کی اس خواہش کا جواب کہ اللہ تعالیٰ کی نشانی اور مدد جلدی آ جائے ۵۳۵-۵۳۶

— زندہ ضمیر اور عقل و فکر استعمال کرنے والے زندہ اور تعصب و جمود والے مردہ قرار دیے گئے ہیں ۵۳۶-۵۳۷

— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ دعوتِ حق کے مخالف رہے ہیں، ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳

— دعوتِ حق کے مخالفین کفار کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں ۵۷۸-۵۷۹

— بڑے بڑے گمراہ مجرمین اس کام پر لگا دیے گئے ہیں کہ مکر و فریب کا جال پھیلائیں، انھیں شعور نہیں، وہ خود اپنے مکر و فریب میں گرفتار ہوں گے ۵۷۹-۵۸۰

— دعوتِ حق کے داعیان ہدایت کے ذریعے سے زندگی پا چکے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رشد و ہدایت کی روشنی اور نور کے ذریعے سے دنیوی زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸

(۱۴۰) دنیا

— دنیا میں کون کامیاب رہا اور کون ناکام؟ ۴۴۷

— ڈارون کے نظریۂ حیاتِ انسانی کی طرح انسان نے ہدایت ارتقائی عمل سے حاصل نہیں کی بلکہ انسانی تاریخ کا آغاز ہدایت پر ہوا ۱۶۲-۱۶۳

— دنیا کے تمام معاملات تو آخر کار اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے ہیں ۱۶۱

— دنیا و آخرت کا موازنہ ۲۳۷-۲۳۸

— دنیا میں عقل مند وہ ہے جس نے دنیا میں ہر دم آخرت کی ہیشگی کی زندگی کی تیاری کر لی ۲۰۸
— دنیا میں نشیب و فراز اللہ تعالیٰ کی مشیت و رضا سے انسانوں کے درمیان گردش کرتے ہیں ۲۹۰
— نیک و صالح لوگوں کے لیے دنیا میں بھی اجر ہے اور آخرت میں تو ہے ہی ۲۹۳
— دنیا کا سرمایہ نہایت قلیل اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے بہتر ہے ۳۷۴
— دنیوی معاشرے میں کسی کی اونچی حیثیت کی تمنا نہ کرو، اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی دعا کرتے رہو، اس سے تمدن اور معاشرے میں سکون رہے گا ۳۴۷-۳۴۸
— دنیا میں اس شخص سے بہتر کس کا طرز عمل ہو سکتا ہے جو ایمان لا کر نیک عمل کرتا رہا اور ابراہیمؑ کے طریقے پر چلتا رہا ۴۰۰
— دنیوی آزمائش میں کامیابی اور پورا اترنے کے لیے نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کرنی چاہیے ۴۷۷-۴۷۸
— ہر انسان کے لیے دنیا میں قیام کی مدت مقرر ہے ۵۲۳
— دنیا کی زندگی میں امتحان اور آزمائش کی کیا نوعیت ہے ۵۲۶
— دنیا کا مال و دولت اور عزت و اقتدار سب کچھ یہاں ہی رہ جانے والا ہے ۵۶۵
— ''دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا ہے'' اس حقیقت کا بیان ۵۳۳-۵۳۴
— دنیا کی زندگی میں انسان کو حق و باطل کے انتخاب کی آزادی ہے اور یہ ہی آزمائش ہے کہ کس چیز کا انتخاب کرتا ہے ۵۷۰
— دنیا پرستوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ کہ جسے دنیا میں جتنا دیا گیا اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے ۱۱۱-۱۶۱
— دنیا و آخرت میں ذلت، خواری اور شدید ترین عذاب کن کے لیے ہے ۹۱
— صرف دنیا کا طالب آخرت میں حصہ دار نہیں، لیکن آخرت کا طلب گار دونوں جگہ پاتا ہے ۱۵۷-۱۵۸-۲۹۲
— دنیا کی زندگی کفار کے لیے نہایت دل پسند اور محبوب بنا دی گئی ہے ۱۶۱
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والے کو دنیا و آخرت میں ثواب ملتا ہے ۲۹۳
— دنیا کی زندگی کو کن معنوں میں ظاہر فریب چیز قرار دیا گیا ہے؟ ۳۰۸-۳۰۹
— دنیا میں نافرمانوں کی چلت پھرت کسی کو دھوکے میں نہ ڈالے، یہ محض چند روزہ لطف ہے آخر کار ان کے لیے بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳
— دنیا میں جو چاہے کرتا رہے لیکن آخر کار اسے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ۳۷۹-۳۸۰
— محض دنیا ہی کو زندگی جاننے والے اپنے انکارِ حقیقت پر عذاب کے مستحق ہوں گے اور افشائے حقیقت پر اقرار کریں گے ۵۳۳
— دنیا کے فریب زدہ افراد کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم ۵۴۹-۵۵۰

(۱۴۱) دوزخ

— اس سے بچانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے ۵۸۱
— کس قسم کے لوگ دوزخ میں جائیں گے؟ ۵۸-۵۹-۶۹-۸۹-۹۰-۱۰۶-۱۴۸-۱۵۹-۱۹۷-۲۱۳-۲۳۶-۲۹۴-۲۹۹-۳۴۶-۳۶۱-۳۹۷-۴۵۰-۴۸۹-۴۹۸
— اس میں ہمیشہ قیام ۶۸-۳۳۰-۵۸۰
— اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے ۵۸
— اس کی سزا بڑی ذلت بھری ہے ۳۱۱
— بدترین جائے قرار ہے ۳۱۳-۳۹۷
— عذاب دوزخ کی تفصیل ۳۶۱
— اس سے خلاصی کی کوئی صورت نہ ہوگی ۳۹۹-۴۶۷
— مشرکین کے بت بھی دوزخ میں جائیں گے ۵۸
— اس کا عذاب مجرمین کی اپنی کمائی کا حاصل ہوگا ۳۰۷

— یتیموں کا مال کھانے والوں کا انجام ۳۲۵
— منافق اور کافر اس میں جمع کیے جائیں گے ۴۰۹
— منافقین اس کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے ۴۱۱
— کفر و ظلم کرنے والوں کو قطعی طور پر ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جانا ہے ۴۲۶

(۱۴۲) دیت

(دیکھو ''قانونِ اسلام'')

(۱۴۳) دین

— اللہ تعالیٰ کا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اور انسان کی اولین پیدائش سے یہی ہے ۶۰۴ - ۶۰۵ -
— نوعِ انسانی کا اصل دین ایک ہی تھا ۱۶۲ - ۲۲۸ - ۶۰۴
— پورا دین اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو؟ ۱۵۱
— دین کی اساس کن باتوں پر ہے؟ ۲۲۲-۵۶۳
— دین کی اولین بنیاد اللہ تعالیٰ کے مالک کائنات ہونے کا شعور ہے ۲۲۲
— دین بمعنی روز جزا ۴۴
— اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ۲۳۹
— دین اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت کے مسلک کا نام ہے ۲۶۹
— دین فقہی جزئیات کا نام نہیں، بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے اصول کا نام ہے ۴۲۷
— اللہ تعالیٰ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مفہوم ۴۱۲
— دین میں غلو کرنے کی ممانعت ۴۲۷ - ۴۲۸
— دین اسلام سے کفار کی مایوسی کا مطلب ۴۴۳
— تکمیلِ دینِ اسلام کا اعلان ۴۴۳ - ۴۴۴
— ایک ہی دین کے تحت شریعتوں کا جزوی اختلاف ۴۷۷
— حدودِ دین کے اندر رہتے ہوئے مثبت اختلافات کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹
— دین میں موشگافیوں کا نتیجہ کفر ہوتا ہے ۵۰۸
— دین پر مخالفین کی طرف سے ''اساطیر الاوّلین'' کی پھبتی اور اس کا جواب ۵۳۱
— حق ہر زمانے میں ایک ہی تھا ۵۳۱
— دین کو کھیل تماشا بنانے والے ۵۵۰
— دین میں ''اللہ کی سند'' کی اہمیت ۵۵۹
— ایک دین سے کئی مذہب کیسے بنے؟ ۶۰۴
— دین کا راستہ ہمیشہ آزمائش کا راستہ رہا ہے ۱۶۳
— ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑنے کا حکم جنھوں نے دین کو کھیل بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی نے فریب میں بتلا کر رکھا ہے ۵۴۹-۵۵۰

(۱۴۴) ذکر

— اللہ تعالیٰ کی عبادت و ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بھی یاد رکھتا ہے ۱۲۵
— اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، اس کے حضور باریابی کا ذریعہ تلاش کرنے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شیطان، اپنے نفس، باطل افراد اور باطل نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کا حکم ۴۶۶ - ۴۶۷
— اللہ تعالیٰ کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے ۱۸۳
— حج کے ساتھ ذکر الٰہی کی اہمیت ۱۵۷
— اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کے دو گروہ: (۱) محض دنیا کے طلب گار (۲) دنیا اور آخرت دونوں کو چاہنے والے ۱۵۷

ر

(۱۴۵) رب

— اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے ۴۳-۴۴
— رب کا اصطلاحی مفہوم (مالک، مربی، فرمانروا اور حاکم) ۴۳-۴۴

(۱۴۶) ربانی

— ربانی، احبار، علما اور مشائخ کا کام ہے کہ لوگوں کو گناہ اور گمراہی سے روکیں اور حرام نہ کھانے کی

تلقین کریں ۴۸۴

(۱۴۷) ربا (سود)

— (تفصیلات کے لیے دیکھو ’’سود‘‘)

(۱۴۸) رحم

— رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہیں اور قرآن مجید میں ان کا استعمال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ۴۳-۶۸-۷۶-۱۱۲-۱۲۱-۱۲۸-۱۳۰-۱۳۵-۱۵۰-۱۵۷-۱۶۷-۱۷۲-۲۴۵-۲۷۱-۲۸۷-۳۳۱-۳۳۹-۳۴۳-۳۶۸-۳۸۶-۳۸۷-۳۹۴-۳۹۵-۴۰۴-۴۱۴-۴۴۴-۴۶۶-۴۶۸-۴۹۰-۵۰۶-۵۴۴-۵۹۴-۶۰۷

— اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر اتنی رحمت ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا ۴۴

— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے چنتا ہے ۱۰۱

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے لیکن اس کے ساتھ بہت درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا بھی ہے ۵۰۶

— اللہ تعالیٰ نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے ۵۴۴

— اللہ تعالیٰ کا دامن رحمت نہایت وسیع ہے ۵۹۴

(۱۴۹) رزق

— اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسا کر انسانوں کے لیے ہر طرح کا رزق بہم پہنچایا ۵۷

— رزق دنیا مومن و کافر سب کو دیا جاتا ہے ۱۱۲

— رزق دنیا کی فراوانی حق امامت کی بنیاد نہیں ہے ۱۱۲

— دنیا کا رزق تقویٰ کے لحاظ سے نہیں دیا جاتا ۱۶۲

— دنیا کے رزق کی کثرت وقلت پر آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار نہیں ہے ۱۶۲

— رزق رسانی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے ۲۴۳-۲۴۸

— صرف حلال وطیب رزق استعمال کرنے کا حکم ۴۹۹

— زرعی اور حیوانی رزق (املاک) کے متعلق تین اہم ہدایات ۵۹۰

— رزق رسانی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے ۵۹۸

(۱۵۰) رسول

— اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو تمام انسانوں میں سے چن کر انتخاب کرتا ہے ۱۱۳-۲۴۶

— انبیائے کرام کی رسالت کا دائرۂ کار ۱۲۵

— رسول کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے ۵۶۰

— یہودی رسولؐ اللہ کی رسالت سے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵

— رسول انسانوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، جن میں خیالات و افکار، اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت اور سیاست سمیت ہر چیز کی اصلاح شامل ہے ۱۱۲-۱۱۶

— رسول کی پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست جانتا ہے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے ۲۴۵

(۱۵۱) رشوت

— رشوت کی ممانعت ۱۴۸

— اللہ کی آیات مالی فائدے کے لیے بیچ ڈالنا یہودیوں کی عادت تھی ۷۲

(۱۵۲) رضا

— اللہ تعالیٰ کی رضا اہل جنت کے لیے سب سے بڑا انعام ہوگا ۲۳۸

— اللہ تعالیٰ کی رضا پر چلنے والا کس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار فرد کی طرح ہوسکتا ہے ۲۹۹

(۱۵۳) رضاعت

— طلاق اور خلع کی صورت میں بچوں کی رضاعت کا معاملہ ۱۷۸

— بالمعاوضہ رضاعت ۱۷۹

— یتیم بچوں کی رضاعت ان کے اولیا کی ذمہ داری ہے ١٧٩
— حرمت بربنائے رضاعت ٢٣٧-٢٣٨

(١٥٤) رمضان المبارک
— اس مہینے میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی ١٤٢
— اس مہینے میں روزے رکھنے کا حکم ١٤٢-١٤٣
— روزے کے احکام کی تشریح ١٤٥-١٤٦-
— روزے انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرتے ہیں ١٤١
— روزے کے بارے میں اولین احکام ١٤١
— روزے کے اوقات ١٤٥-١٤٦
— ماہ رمضان میں رات کے وقت ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت ١٤٥-١٤٦
— روزے کا اصل مقصد ١٤١
— روزے کے احکام میں تدریج ١٤١-١٤٢
— حالت سفر کے لیے روزے کے احکام ١٤٢
— نزول قرآن حکیم پر اظہار تشکر کا ذریعہ ١٤٣
— سحری اور افطاری کے اوقات کی حد بندی ١٤٥
— منطقۂ شمالی وجنوبی میں اس کا نظام اوقات ١٤٦
— حالت اعتکاف میں بیویوں سے شب باشی کی ممانعت ١٤٦-١٤٧
— سحری اور افطاری میں بے جا شدتِ احتیاط ١٤٦
— روزہ بطور فدیہ (بسلسلہ حج) ١٥٤
— روزہ بطور کفارہ ٣٨٣-٥٠٠-٥٠٤

(١٥٥) روح القدس
— اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی گئی ١٩٢
— ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' کا مطلب ٤٢٨
— اس کے بارے میں عیسائیوں کے غلط تصورات ٤٢٨

(١٥٦) روزہ
(دیکھو ''رمضان'')

(١٥٧) رہبانیت
— مذہبی لوگوں کا ایک غلط رجحان ٤٩٨

(١٥٨) رہن
— رہن بالقبض کا معاملہ ٢٢١
— شئے مرہونہ سے مالی فائدہ اٹھانا سود ہے ٢٢٢

(١٥٩) ریا
— ریا خدا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی علامت ہے ٢٠٣-٣٥٣

ز

(١٦٠) زبور
— اس میں تحریف ہوگئی ہے ٤٢٤

(١٦١) زکریا علیہ السلام
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ٥٥٩-٥٦٠
— انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے ٥٥٩-٥٦٠
— ان کا مظلومانہ قتل ٨١

(١٦٢) زکوٰۃ
— زکوٰۃ ہر زمانے میں شریعت اسلام کا حصہ رہی ٧٢-٧٣-٩٠
— رسول اللہؐ کی امت کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ١٠٣

(١٦٣) زمین
— اللہ تعالیٰ ہی نے زمین کو فرش بنایا ٥٧
— ایک کتاب جس میں اللہ تعالیٰ نے خشک وتر کی تمام معلومات درج کر رکھی ہیں ٥٤٦
— اللہ تعالیٰ کے زمین وآسمان کے برحق پیدا کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ ٥٥١-٥٥٢
— تاروں کو اللہ تعالیٰ ہی نے صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ٥٦٦
— رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھیرا ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے ٥٢٧

— زمین پر چلنے پھرنے والے تمام جانور اور اڑنے والے پرندے، ان کی تقدیر کے نوشتے مقرر ہیں، انسان کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سمٹے جاتے ہیں ۵۳۷-۵۳۸
— زمین اور سمندر میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اسے زمین کے تاریک پردوں میں ایک ایک دانے کا علم ہے، اسی طرح درخت سے گرنے والے ہر پتے کا علم ہے ۵۴۶
— زمین میں فساد کرنے والے بالآخر خسران میں رہیں گے ۶۰
— زمین پر بسنے والے انسان اکثر حق کی راہ پر نہیں ہوتے کیونکہ وہ محض قیاس اور گمان کی پیروی کرتے ہیں ۵۷۵-۵۷۶

(۱۶۴) زنا
— زنا کے مختلف مدارج معصیت ۳۴۷
— اس جرم کی ابتدائی سزا ۳۳۱-۳۳۲
— زنا کے جرم کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی شہادت ۳۳۱
— منکوحہ لونڈی کے ساتھ زنا کی سزا ۳۴۲

(۱۶۵) سائل
— مانگنے والا ۲۰۹

(۱۶۶) سبت
— بنی اسرائیل کے لیے اس کے احکام ۸۳
— سبت کے احکام کی اسرائیلیوں کی طرف سے خلاف ورزیاں اور نتیجتاً عذاب الٰہی کا سزاوار ٹھیرنا ۸۳-۸۴

(۱۶۷) سجدہ
— اللہ کے حکم پر آدم (انسان) کو فرشتوں کا سجدہ ۶۴

(۱۶۸) سحر
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جادو'')

(۱۶۹) سرقہ
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''چوری'')

(۱۷۰) سکراتِ موت
— سکراتِ موت کے عالم میں ظالموں کی حالت ۵۶۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''موت'')

(۱۷۱) سواء السبیل
— اس قرآنی اصطلاح کی مکمل توضیح ۴۵۲ تا ۴۵۴
— یہود کا سواء السبیل سے بھٹک جانا ۴۸۴
— اہل کتاب کا سواء السبیل سے بھٹک جانا ۴۹۱
— اعتدال کی راہ چھوڑنے والے اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں ۴۹۹

(۱۷۲) سلیمان علیہ السلام
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا ۵۵۹-۵۶۰
— ان کے بعد بنی اسرائیل کا انتشار ۸۱
— ان پر جادوگری کا جھوٹا الزام ۹۷
— حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف طلسمات اور عملیات منسوب کرنے کی تردید ۹۷-۹۸

(۱۷۳) سلویٰ
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''من وسلویٰ'')

(۱۷۴) سنت
— نظام دین میں اس کی اہمیت ۳۶-۳۷
— سنت نبوی قیامت تک کے لیے سند ہے ۳۶۹

(۱۷۵) سود
— لفظ ''ربا'' کی تحقیق ۲۱۰
— اس کی حرمت ۲۱۱-۲۱۷
— اس کا خلاف عقل و انصاف ہونا ۲۱۱-۲۱۲
— تجارت اور سود کا فرق ۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳
— سود خوار کا حشر ۲۱۱

— سود کے روحانی، معاشی اور اخلاقی نقصانات ۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۸۸
— سود کا شرعی حکم ۲۱۳
— صدقہ اور سود کا تقابل ۲۱۴
— پچھلے سودی معاملات کی تنسیخ ۲۱۷
— رہن میں سود کی صورت ۲۲۲
— سود کے دوررس مفاسد ۲۸۷
— تورات میں اس کی ممانعت ۴۲۲
— سودخوار کو اللہ تعالیٰ بدعمل اور ناشکرا قرار دیتا ہے اور انھیں سخت ناپسند کرتا ہے ۲۱۶
— سودخواری اور انفاق فی سبیل اللہ سے پیدا ہونے والی خصوصیات کا موازنہ ۲۸۷-۲۸۸
— یہودیوں کے جرائم میں سودخواری اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا شامل ہے ۴۲۲-۴۲۳

ش

(۱۷۶) شراب

— شراب کے بارے میں پہلا حکم ۱۶۷
— اس کے فوائد سے اس کے نقصانات زیادہ ہیں ۱۶۷
— تدریجی امتناع کے تحت دوسرا حکم ۳۵۴
— شراب کی حرمت کا تیسرا اور قطعی حکم ۵۰۱
— شراب نوشی کی سزا ۵۰۲
— شراب نوشی شیطانی کام ہے ۵۰۱-۵۰۳
— اس کے متعلق رسولؐ اللہ کے تفصیلی احکام ۵۰۱-۵۰۲
— شراب انسان کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکتی ہے ۵۰۳
— شراب اور جوئے سے معاشرے میں عداوت اور بغض پھیلتا ہے ۵۰۳

(۱۷۷) شرک

— اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ ۱۸
— شرک کے خلاف قرآن حکیم کے دلائل ۵۷
— شرک کے خلاف عقلی دلائل ۱۳۰-۱۳۱
— شرک اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے ۵۲۹-۵۳۰
— شرک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں (آیات) کو جھٹلانے کے مترادف ہے ۵۲۹-۵۳۰
— شرک ظلم ہے ۵۵۹
— صفاتِ الٰہی اور حقوق اللہ میں دوسروں کو شریک کرنا شرک ہے ۱۳۱
— ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لینا ۱۳۵-۴۴۰
— نظریۂ شرک ایک جھوٹ اور حقیقت کے خلاف اعلان جنگ ہے ۱۹۳-۱۹۴-۳۵۸-۳۵۹
— مشرک معاشرے کا نظام فکر ۱۹۸-۱۹۹
— شرک کا جوہر ۲۵۵
— شرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے ۳۵۹-۳۵۸-۳۹۷
— مشرکانہ عقائد کے تحت جانوروں کے کان چیر کران کو دیوتاؤں کے نام پر پُن کرنا ۳۹۸
— مشرکانہ فال گیری ۴۴۲-۵۰۱
— آستانوں کے چڑھاوے ۴۴۱-۵۰۱
— مشرکین کے لیے جنت حرام ہے ۴۸۹
— اللہ تعالیٰ نے کوئی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مقرر نہیں کیے ۵۰۸
— شرک کس معنی میں ظلم ہے؟ ۵۳۰-۵۵۹-۵۸۴
— مصیبت کے وقت مشرکین کا ''شرکا'' کو چھوڑ کر خدائے واحد کے سامنے گڑگڑانا ۵۳۹-۵۴۰-۵۴۷-۵۴۸
— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰
— نظریہ شرک کے خلاف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد ۵۵۲-۵۵۳
— جو شرک میں ملوث ہو اس کا کیا کرایا ضائع ہو جاتا ہے ۵۶۱
— دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا مدمقابل ٹھیرانا ۵۷
— مشرکین کا انجام بد ۵۸
— شرک اجتماعی قوت کو کمزور کرتا ہے ۲۹۴
— آخرت میں مشرکین سے باز پرس ۵۳۰

— جنوں کو بھی خدا تعالیٰ کا شریک ٹھیرایا گیا ٥٦٧
— اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنے کا شرک ٥٦٨
— شرک کی بنیاد اوہام پر ہے ٥٦٨
— شیطان کی اطاعت بھی شرک ہے ٥٧٧
— اعتقادی شرک اور عملی شرک ٥٧٨
— اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں شرکا کا حصہ لگانا ٥٨٤-٥٨٥
— اللہ تعالیٰ کے حقوق میں شرک ٥٨٤-٥٨٥
— مشرکانہ خیالات کی بنا پر قتل اولاد ٥٨٥
— غیر الٰہی قانون کو تسلیم کرنا بھی شرک ہے ٥٨٦
— مشرکین کے لیے مشرکانہ اعمال کا خوش نما بن جانا ٥٨٦
— شرک کی چار صورتیں ہیں: (١) ذات میں شرک، (٢) صفات میں شرک، (٣) اختیارات میں شرک، اور (٤) حقوق اللہ میں شرک ٥٩٧-٥٩٨
— کائنات کے نظام میں شرک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ٦٠٦
— مشرکین اس حقیقت پر جلتے ہیں کہ اللہ کا فضل و رحمت (نبوت) رسولؐ اللہ ہی کو کیوں مل گیا ١٠١
— حضرت ابراہیمؑ ہرگز مشرک نہ تھے ١١٤-١١٥
— اللہ تعالیٰ ہی وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ١٩٤
— شرک کی کوئی سند نہیں ہے، مشرکین ظالم ہیں اور ان کے لیے نہایت برا ٹھکانہ ہے ٢٩٤
— اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی شرک ہے ٥٥٨ تا ٥٦٠
— اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں ہو سکتا، انسانوں کا اس حقیقت پر اقرار یا انکار اللہ تعالیٰ کی خدائی پر کوئی فرق نہیں ڈال سکتا ٣٨٧
— مشرکین گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں ٣٩٧
— شرک اصل میں باغی شیطان کی عبادت اور پیروی ہے جس نے انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے ٣٩٧ تا ٣٩٩
— شرک کی معافی نہیں ہے حضرت عیسیٰ اور مقرب ترین فرشتے کو اس میں عار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ٣٩٧-٤٣٠
— جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر اللہ کی سرپرستی اور مدد پر بھروسا رکھتے ہیں وہ ان میں سے کسی کو مددگار نہ پائیں گے ٤٣٠
— حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ قرار دینے والے کفر کر رہے ہیں ٤٨٩
— حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم دونوں بشر تھے اور الوہیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا ٤٩١
— اللہ تعالیٰ کے سوا انسان جس کسی کی عبادت و بندگی کرتا ہے وہ نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتے ٤٨٩
— حضرت عیسیٰ میدان حشر میں عیسائیوں کے موجودہ مشرکانہ نظریات کی تردید کریں گے ٥١٥-٥١٦
— اللہ تعالیٰ اپنی خدائی میں کسی کا محتاج نہیں ہے، مشرکین کے معبود محتاج ہیں ٥٢٧
— مصیبت میں آیندہ شکر گزار رہنے کے وعدے پر انسان اپنی جان بچاتا ہے لیکن پھر شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے ٥٤٦-٥٤٧
— شرک کی کوئی سند نہیں لیکن مشرکین اللہ سے نہیں ڈرتے پھر جعلی معبودوں سے کیوں ڈرا جائے جن کی حیثیت کی کوئی سند نہیں ہے ٥٥٩
— انبیائے کرام پر تلاش حق میں شرک کا الزام اور قرآن کی تردید ٥٦١
— انسان کے بناوٹی معبود کسی کام نہ آئیں گے اور ان کا زعم پارہ پارہ ہو جائے گا ٥٦٥
— شرک انسان کے لیے اس کا دین مشتبہ اور مشکوک بنا دیتا ہے ٥٨٦
— شرک اللہ تعالیٰ پر افترا پردازی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی سزا دے گا ٥٨٧-٥٨٨
— شرک، انکار آخرت اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا اہم ترین اسباب ضلالت ہیں ٥٩٧
— تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف

اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں ہے ۶۰۵

(۱۷۸) شریعت

— شریعت کی تفصیلات میں فرق کیوں ہے؟ ۴۷۷-۴۷۸
— وہ بنیادی پابندیاں جو جملہ شرائعِ الٰہیہ میں عائد کی گئی ہیں ۵۹۷تا۵۹۹
— شریعت ان ناروا پابندیوں سے آزاد کرواتی ہے جو انسان نے اپنے اوپر عائد کرلی ہیں ۱۵۵
— اسلامی شریعت کا مطالبہ پورا کا پورا دائرۂ احکام میں آجاتا ہے ۱۶۰
— شریعت جن معاملات میں خاموش ہو ان معاملات میں زیادہ سوال وجواب کرنا منع ہے ۵۰۷-۵۰۸

(۱۷۹) شعائر اللہ

— لفظ ''شعائر'' کی تشریح ۴۳۸-۴۳۹
— صفا ومروہ شعائر اللہ میں سے ہیں ۱۲۷
— شعائر اللہ کی توہین کا مطلب ۴۳۸
— شعائر اللہ کے احترام کی وجہ ۴۳۹
— احرام بھی شعائر اللہ میں سے ہیں ۴۳۹
— اہل ایمان دوسرے مذاہب کے شعائر کی عزت و تکریم کے پابند ہیں بشرطیکہ ان میں مشرکانہ آلودگی نہ ہو ۴۳۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''حج'')

(۱۸۰) شکار

— حالت احرام میں شکار کی حرمت ۴۴۵-۵۰۴-۵۰۵
— حالت احرام میں شکار کے قاعدے ۴۴۵-۴۴۶
— شکاری جانوروں سے مراد کیا ہے؟ ۴۴۵
— حالت احرام میں شکار کرنے کا کفارہ ۵۰۴
— سمندری شکار کی حلت ۵۰۵

(۱۸۱) شکر

— شکر کے رویے کی تشریح ۱۴۳-۴۱۲
— اللہ تعالیٰ کے شاکر ہونے کا مطلب ۴۱۲
— کفران کی ضد شکر کا رویہ ہے ۱۲۹
— شکر اور ایمان کا تعلق ۴۱۲
— جو انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے ۱۲۵
— شکرگزار بندوں کی جزا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے ۲۹۱-۲۹۲
— اللہ تعالیٰ کے بنائے قوانین انسان کے لیے نعمت ہیں جس کے لیے انسان کو شکرگزار ہونا چاہیے ۴۴۸-۴۴۹

(۱۸۲) شفاعت

— مجرمین کے لیے اس کا غیر مفید ہونا ۱۰۸
— اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں کہ کسی کے بارے میں سفارش کرسکے ۱۹۴
— قیامت کے روز مجرمین کی طرف سے کوئی سفارش نہ کرسکے گا ۳۹۵
— آخرت میں خدا تعالیٰ کی بندگی سے گریز کرنے والوں کا کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا ۴۳۰
— اپنی امت کے لیے حضرت عیسیٰؑ عاجزانہ اور لطیف شفاعت کریں گے ۵۱۷
— آخرت میں کوئی ایسا ذی اقتدار نہ ہوگا کہ کسی کی حمایت اور سفارش کرسکے ۵۴۳
— آخرت میں حمایت، سفارش اور فدیہ کا بے کار ہونا ۵۵۰
— آخرت میں متوقع سفارشیوں کا کھو جانا ۵۶۵
— حساب کے لیے ہر ایک کی حاضری تن تنہا ہوگی ۵۶۵

(۱۸۳) شہادت

بمعنی جانی قربانی

— راہِ خدا میں جان دینے کے معنی ۱۲۶
— اس قربانی کا گراں قدر بدلہ ۲۹۸
— شہدا کے لیے آخری انعامات ومدارج ۳۰۲

— اس قربانی کی غیر معمولی لذت ۳۰۳
— جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو، وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں، ہاں تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے ۱۲۶

بمعنی شہادت حق

— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اس کو چھپالے ۱۱۷
— شہادتِ حق علی الناس میں امت کا جانشینِ رسول ہونا ۱۱۹
— شہادت حق علی الناس کے وسیع تقاضے ۱۱۹-۱۲۰
— اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ مخلصین کو آزما کر چھانٹتا ہے ۲۹۰

بمعنی گواہی

— گواہی دینے والا (شاہد) ۲۵۷
— شہادت کی ذمہ داری ۱۱۷
— شہادت کا قانون ۲۲۰-۵۱۱
— قانون شہادت میں عورت کی گواہی ۲۲۰
— قانون شہادت میں غیر مسلم کی گواہی ۲۲۰
— شہادت کے معتبر ہونے کے لیے اخلاق و سیرت کا لحاظ ۲۲۰-۵۱۰
— شہادت سے انکار ممنوع ہے ۲۲۰
— کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے ۲۲۱
— شہادت کو چھپانا گناہ ہے ۲۲۲
— معاملات میں شہادت کی اہمیت ۳۲۴
— زنا کی سزا جاری کرنے کے لیے چار گواہوں کی شہادت ۳۳۱
— للہ فی اللہ انصاف کے ساتھ گواہی دینے کا مطالبہ ۴۰۵-۴۰۶
— قرآن حکیم کے لیے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ۴۲۶
— وصیت کے نصاب شہادت ۵۱۰
— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے ۱۱۷
— رسول اللہؐ پر صحابہ کرامؓ گواہ، صحابہ کرامؓ بعد میں آنے والوں پر گواہ اور ہر گزرنے والی نسل آنے والی نسل پر گواہ ہے ۱۱۹
— تمام انبیائے کرام سے گواہی اور شہادت لی جائے گی کہ ان کی دعوت حق پر کیا جواب ان کی قوم کی طرف سے ملا ۵۱۲

(۱۸۴) شہدا

— اللہ کی راہ میں جانیں دینے والوں کی تعریف و توصیف ۳۷۰

(۱۸۵) شیطان

— شیطان لعنت زدہ ہے ۳۹۸
— لفظ شیطان کے معانی ۵۴-۶۵
— سرکش انسانوں کے لیے لفظ شیطان کا استعمال ۵۴
— ''الشیطان'' سے کیا مراد ہے؟ ۶۵
— شیطان جن کون ہیں؟ ۶۶
— اس کو معبود بنانے کا مفہوم ۳۹۷
— شیاطین کی اطاعت شرک ہے ۵۷۷
— شیطان کا راستہ ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے جو انسان کو بدی اور فحش کی طرف لے جاتا ہے ۱۳۳
— شیطان کی چالیں بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً نہایت کمزور ہوتی ہیں ۳۷۳
— شیطان نے ہی حضرت آدم کو جنت سے نکلوایا ۶۶-۶۷
— انسان کا ازلی دشمن ہے ۶۷-۱۳۳-۱۶۰-۵۹۰
— برائی اور بے حیائی کا داعی ہے ۱۳۳
— شیطان ہی جادو کے موجد ہیں ۹۷
— شیطان کی پیروی نہ کرو ۱۶۰
— وہ انفاق فی سبیل اللہ سے روکنے کے لیے افلاس کا خوف دلاتا ہے ۲۰۷
— شیطان کا چھو کر باؤلا کر دینا ۲۱۱

— شیطان بزدلی اور گھبراہٹ پھیلاتا ہے ۲۹۷
— اہل ایمان کے دلوں میں دشمنوں کی طاقت وقوت کا رعب ڈالتا ہے ۳۰۴
— شیطان کی رفاقت نہایت بری رفاقت ہے ۳۵۲
— شیطان کی چالیں نہایت کمزور ہوتی ہیں ۳۷۳
— انسان کے بارے میں اس کا چیلنج ۳۹۸
— اس کا سبز باغ دکھانا جب کہ اس کے تمام وعدے فریب ہیں ۳۹۹
— شراب، جوا، آستانے اور پانسے گندے شیطانی کام ہیں ۵۰۱-۵۰۲
— شیطان مسلمانوں میں بغض وعداوت ڈالنا چاہتا ہے ۵۰۳
— شیطان کا گمراہی کو خوش نما بنانا ۵۴۰
— وہ انسان کو بھلاوے میں ڈالتا ہے ۵۴۹
— شیاطینِ جن وانس کی دعوتِ انبیا سے دشمنی ۵۷۲
— شیطان کا خوش آیند باتیں القا کرنا اور اس کا مفہوم ۵۷۳
— شیطان کے اپنے ساتھیوں پر شکوک وشبہات اور اعتراضات القا کرنا ۵۷۷
— شیاطین جن سے آخرت میں جواب طلبی اور ان کے لیے دوزخ کی دائمی سزا ۵۸۰
— شیطان کے مکر وفریب سے انسان کا محفوظ رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت وتوفیق کے سبب ہے ورنہ انسان تو گمراہی میں مبتلا ہو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۳۷۷
— حلال وحرام سے متعلق اللہ تعالیٰ کی قیود کے بجائے خود ساختہ قیود اختیار کرنا شیطان کی پیروی کے مترادف ہے ۵۹۰-۵۹۱

ص

(۱۸۶) صالحین
— حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہوگا ۳۷۰

(۱۸۷) صبر
— لفظ صبر کے معنی ۷۳-۱۳۷-۲۳۸-۲۹۳
— صبر کی اہمیت ۷۲-۷۳
— ''صابروا'' کے دو معنی ۳۱۴
— اہل صبر کے لیے اللہ کی نصرت ۱۲۶-۱۹۰-۲۸۶
— باطل کا مقابلہ کرنے میں صبر کی اہمیت ۲۹۳
— آزمائش کے مراحل کے لیے اس کی ضرورت ۳۰۹
— اہل حق کے لیے صبر شرط کامیابی ہے ۷۳-۱۲۶-۱۹۰-۲۸۳-۲۹۰-۵۳۵
— دعوت حق کے لیے صبر اور نماز دو بنیادی ضروریات ہیں ۱۲۶
— اہل ایمان کو صبر سے کام لینے، باطل کے مقابلے پر پامردی دکھانے اور حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہنے اور اللہ سے ڈرنے کا حکم تاکہ فلاح پائیں ۳۱۴

(۱۸۸) صِبْغَةَ اللّٰهِ
— اللہ تعالیٰ کا رنگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے سے چڑھتا ہے ۱۱۶

(۱۸۹) صحابہ کرامؓ
— رسولؐ اللہ اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں سے یہ جان چکے تھے کہ حق کیا ہے لیکن جانتے بوجھتے انکار کرتے تھے ۲۶۳-۲۶۴-۲۷۱
— صحابہ کرامؓ پر رسولؐ اللہ، صحابہ کرام بعد میں آنے والوں پر گواہ، اور ہر گزرنے والی نسل بعد میں آنے والی نسل پر گواہ ہے ۱۱۹

(۱۹۰) صدقہ
(دیکھو ''انفاق فی سبیل اللہ'')

(۱۹۱) صراطِ مستقیم
— اس کا مفہوم ۴۵-۴۵۲ تا ۴۵۴
— اس کے نشانات خوب واضح کر دیے گئے ہیں ۵۸۰
— وہ آیاتِ الٰہی کے ذریعے سے واضح ہوتی ہے ۲۷۷

— صراطِ مستقیم پانے اور اس پر قائم رہنے کی دعا ۴۵
— صراط مستقیم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے ذریعے سے بھیجا ہے ۱۰۷
— احکام خداوندی اور احکام رسول اللہؐ پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم کی دولت سے سرفراز فرماتا ہے ۳۶۹-۳۷۰
— صراطِ مستقیم اور ہدایت ایک نعمت ہے، اگر ایک قوم اس کا انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت کسی اور کو سونپ دیتا ہے ۵۶۲
— اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے کہ انسان اپنے فطری عہد کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلے ۴۴۹-۶۰۱
— جو اسلام قبول کر لیں اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جائیں انھیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور انھیں صراطِ مستقیم دکھائے گا ۴۳۱
— اللہ تعالیٰ انسان کو اندھیرے (ضلالت) سے نکال کر روشنی (ہدایت اور نور) کی طرف لے جاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۴۵۶

(۱۹۲) صفا

— اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ۱۲۷

(۱۹۳) صفاتِ الٰہی

— ربوبیت و رزاقی ۴۳- ۱۶۲- ۲۴۳- ۲۴۶- ۲۴۸- ۲۴۹- ۲۶۵- ۴۸۵- ۵۱۵- ۵۲۸- ۵۵۱-۶۰۵
— حیات ۱۹۳-۲۳۱
— رحمت ۴۳- ۶۷- ۱۱۲- ۱۴۰- ۱۵۰- ۱۵۷- ۱۷۲- ۲۴۵- ۲۶۵- ۲۷۱- ۲۸۷- ۲۹۸- ۳۳۱- ۳۳۹- ۳۴۳- ۳۴۶- ۳۶۸- ۳۸۷- ۳۹۴- ۳۹۵- ۴۰۴- ۴۴۴- ۴۶۶- ۴۶۹- ۴۹۰- ۵۰۶- ۵۲۷- ۵۴۴- ۵۹۲- ۶۰۶
— حساب لینا، جزا و سزا دینا اور انتقام لینا ۴۳- ۱۳۲- ۱۵۵- ۱۶۱- ۲۲۳- ۲۳۳- ۲۳۶- ۲۴۰- ۲۸۷- ۴۴۰- ۴۴۶- ۴۵۵- ۴۵۷- ۴۶۹-۵۰۵-۵۰۶-۵۴۷-۵۸۲-۶۰۶
— خلق، ایجاد، صورت گری ۱۰۵- ۲۳۳- ۲۵۲- ۳۱۹- ۴۵۷- ۵۲۳- ۵۲۷- ۵۵۱- ۵۵۸- ۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۸۹
— علم و خبر ۶۱- ۶۴- ۸۸- ۱۱۶- ۱۱۸- ۱۲۲- ۱۲۴- ۱۲۸- ۱۴۰- ۱۶۴- ۱۶۸- ۱۷۲- ۱۷۷- ۱۷۸- ۱۸۰- ۱۸۵- ۱۸۸- ۱۹۴- ۲۰۳- ۲۰۷- ۲۰۸- ۲۲۱- ۲۲۲- ۲۳۳- ۲۴۴- ۲۴۶- ۲۶۳- ۲۶۵- ۲۷۳- ۲۷۵- ۲۸۵- ۲۹۵- ۲۹۷- ۳۰۶- ۳۲۸- ۳۲۹- ۳۳۲- ۳۴۱- ۳۴۳- ۳۴۷- ۳۵۰- ۳۵۴- ۳۶۸- ۳۷۰- ۳۸۳- ۳۸۵- ۳۹۳- ۴۰۲- ۴۰۳- ۴۰۶- ۴۱۲- ۴۱۳- ۴۲۷- ۴۳۲- ۴۴۹- ۴۸۲- ۴۹۱- ۵۰۵- ۵۰۶- ۵۱۶- ۵۲۴- ۵۲۷- ۵۲۸- ۵۴۴- ۵۴۶- ۵۵۲- ۵۵۸- ۵۶۰- ۵۶۶- ۵۶۸- ۵۷۵- ۵۷۶- ۵۷۷- ۵۸۱-۵۸۸
— توبہ قبول کرنا ۶۷-۷۶-۱۱۲
— نرمی کرنا اور معاف کرنا ۱۴۰- ۱۵۰- ۱۵۷- ۱۷۱- ۱۷۲- ۱۸۱- ۲۰۴- ۲۲۳- ۲۷۱- ۲۸۷- ۲۸۹- ۲۹۷- ۳۳۰- ۳۳۱- ۳۳۲- ۳۳۹- ۳۴۳- ۳۴۴- ۳۵۵- ۳۵۸- ۳۶۸- ۳۸۷- ۳۹۴- ۳۹۵- ۳۹۷- ۴۰۴- ۴۱۳- ۴۴۴- ۴۵۷- ۴۶۶- ۴۶۸- ۴۶۹- ۴۹۰- ۵۰۶-۵۰۷-۵۴۴-۵۹۲-۶۰۶
— قوت، قدرت، اختیار، احاطہ، غلبہ ۵۶- ۶۸- ۹۹- ۱۰۱- ۱۰۳- ۱۲۳- ۱۳۲- ۱۶۰- ۱۶۸- ۱۷۴- ۱۸۳- ۱۸۵- ۱۸۸- ۱۹۲- ۲۰۱- ۲۰۲- ۲۲۳- ۲۳۳- ۲۴۳- ۲۴۴- ۲۴۹- ۲۶۱- ۲۶۵- ۲۸۴- ۲۸۶- ۲۸۷- ۳۰۱- ۳۱۰- ۳۴۶- ۳۶۱- ۳۹۵- ۴۰۴- ۴۱۳-

۴۲۰-۴۲۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۸-۴۶۹-۵۱۷-۵۲۸-۵۳۷-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۵۲-۵۵۸-۵۶۶-۵۶۸-۵۸۳

— حاکمیت، اقتدار، پادشاہی ۱۰۲-۱۰۵-۱۱۲-۱۹۴-۱۹۵-۳۱۰-۳۵۸-۴۳۸-۴۷۹-۵۱۷-۵۵۲

— کارساز، ولی و مددگار، وکیل ۱۰۲-۳۵۷-۳۷۶-۴۰۴-۴۲۹-۵۶۸

— حکمت ۶۴-۱۱۲-۱۶۰-۱۶۸-۱۷۴-۱۸۳-۲۰۲-۲۳۳-۲۳۹-۲۶۱-۲۸۷-۳۲۸-۳۳۲-۳۴۱-۳۴۳-۳۶۱-۳۸۳-۳۹۳-۴۰۴-۴۲۰-۴۲۶-۴۲۷-۴۶۸-۵۱۷-۵۲۸-۵۵۲-۵۶۰-۵۸۱-۵۸۸

— نگراں، بصیر ۱۰۳-۱۷۹-۱۸۲-۲۰۵-۲۳۸-۲۴۱-۲۹۸-۳۰۰-۳۱۹-۳۲۸-۳۶۲-۳۷۸-۴۰۵-۴۸۹-۵۱۶

— واسع ۱۰۵-۱۸۸-۲۰۳-۲۰۷-۲۶۵-۴۰۴-۴۸۲

— سمیع ۱۱۶-۱۴۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۸۵-۲۴۶-۲۴۸-۳۸۵-۳۶۲-۴۰۵-۴۱۳-۴۹۱-۵۲۷-۵۷۵

— مالک ۱۱۸-۱۹۴-۲۲۲-۲۴۳-۲۷۹-۲۸۷-۳۰۶-۳۱۰-۴۰۴-۴۲۷-۴۲۹-۴۵۷-۴۵۸-۴۶۹-۵۲۶

— شاکر و قدردان ۱۲۸-۴۱۲

— ہادی و مضل ۱۶۳-۲۰۵-۲۰۹-۳۸۰

— فریادرس ۱۴۴

— فیصلہ کرنے والا، حساب لینے والا ۱۵۸-۳۷۸-۴۰۹

— مدبر، قیوم، منتظم، فعال ۱۹۳-۲۳۱-۲۴۳-۲۵۷-۴۷۹-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷

— عیوب، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ۱۹۴-۴۲۹-۵۶۸

— بے نیاز ۲۰۴-۲۰۷-۲۷۵-۴۰۴

— بزرگی، برتری، علو، کبریائی ۱۹۵-۳۵۰-۵۶۸

— تمام خوبیوں کا جامع، لائق ستائش ۴۳-۲۰۷-۴۰۴-۵۲۳-۵۴۱

— اس کے وعدوں کا اٹل ہونا ۲۳۶-۳۹۹

— مارنے اور جلانے والا ۲۹۷-۵۲۴-۵۳۷-۵۶۵-۵۸۰-۵۸۲

— انصاف کرنے والا، ظلم سے پاک ۳۰۷-۵۷۴

— لامکانیت، معیت ۳۹۵

(۱۹۵) ضلالت

— اسبابِ ضلالت

(۱) ہر طرف پھیلی ہوئی حق کی نشانیوں کے باوجود معجزوں کا مطالبہ ۱۰۵-۱۰۶

(۲) بے علم ہونا گمراہی کی اولین سیڑھی ہے ۱۳۳

(۳) باپ دادا کی اندھی پیروی کرنا ۱۳۳

(۴) شرک میں مبتلا ہونا ۱۳۱- ۳۵۸ تا ۳۶۰-۳۹۷-۵۹۷

(۵) محض اپنے خود ساختہ وقار کی خاطر گناہ پر جمے رہنا ۱۵۹

(۶) انکارِ آخرت ہی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے ۵۷۳-۵۷۴-۵۹۷

(۷) محض قیاس اور گمان کی پیروی کرنا ۵۷۵-۵۷۶

(۸) علم کے بجائے محض قیاس اور گمان کی پیروی کرنا ۵۹۵

(۹) اللہ کی آیات کو جھٹلانا ۵۹۷

— اہل ضلالت اللہ کے معتوب ہیں ۴۵

— اللہ تعالیٰ گمراہی میں فاسقین ہی کو مبتلا کرتا ہے ۶۰

— اسلام نے جرم کو ظلم قرار دیا ہے ۴۶۸

— انسان کسی کے ساتھ ظلم کرتا ہے تو اس کے گناہ بھی سمیٹتا ہے ۴۶۲

— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کو فتنے میں ڈالنے کا مفہوم کیا ہے؟ ۴۷۱

— قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے لازمی نتائج ہیں ۵۲
— بنی اسرائیل پر حق عین واضح تھا لیکن اپنے نفس کے حسد کی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ راہِ راست کو مشکوک کر دیں ۱۰۳
— شیطان کا راستہ ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے اور انسان کو بدی اور فحش کی طرف لے جاتا ہے ۱۳۳
— ہدایت کے بدلے ضلالت کمانے والے دراصل مغفرت کے بجائے عذاب الٰہی مول لے رہے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— ضلالت کی طرف دوسروں کو مائل کرنے والے دراصل خود اپنے آپ کو گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۲۶۳- ۵۷۹- ۵۸۰
— بڑے اور چھوٹے گناہوں میں کیا فرق ہے؟ ۳۴۶-۳۴۷
— کون لوگ پکے گمراہ ہیں؟ ۲۷۱-۲۷۲
— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ان کے حساب کتاب سے ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷-۴۵۱
— اللہ تعالیٰ انسان کو گناہوں کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹-۵۵۰
— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام مال کھاتے ہیں ۴۸۴
— ضلالت و گمراہی اختیار کرنے والے خود اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرتے ہیں ۵۲۹
— دعوت حق کو ’’پرانی باتیں‘‘ اور ’’قصۂ پارینہ‘‘ قرار دینا ہر زمانے میں اہل ضلالت کا طریقہ رہا ہے ۵۳۱
— شیطان انسان کو درست رویہ اختیار نہیں کرنے دیتا اور اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو بالکل درست ہے ۵۴۰
— اللہ تعالیٰ اگر راہ نمائی نہ کرے تو انسان گمراہ ہو کر رہے گا ۵۵۶
— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ ہی حق کے مخالف رہے ہیں اور ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲- ۵۷۳
— ضلالت مردہ اور موت کی حالت ہے اور زندگی سے مراد حقیقت شناسی کی حالت ہے ۵۷۸-۵۷۹
— اہل کتاب پر ان کی باطل پرستی کے باعث اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑی ہے اور وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸
— ضلالت و گمراہی کے ساتھ انسان اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے ۳۶۸-۳۹۴-۳۹۵
— شیطان کے مکر و فریب سے انسان کا محفوظ رہنا بھی صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت کے سبب ہے ورنہ انسان گمراہی کی طرف میلان رکھتا ہے ۳۷۷
— ہدایت و ضلالت کا مکمل انحصار انسان کی اپنی سعی و طلب اور چاہت پر ہے ۴۱۰-۴۱۱
— ضلالت و گمراہی میں پھنسے ہوئے انسان کو نہ کوئی سفارشی اور حامی و مددگار ملے گا اور نہ وہ فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے ۵۵۰
— جو قرآن کی بصیرت سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا پاسبان نہیں ہے ۵۶۸-۵۶۹
— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی گمراہی اور شرک میں مبتلا نہ ہوتا ۵۷۰
— اللہ تعالیٰ گمراہوں کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیتا ہے ۵۷۱
— کھلی اور چھپی ہر گمراہی اور گناہ سے بچو کیونکہ ہر انسان اپنی ہر کارکردگی کا بدلہ پا کر رہے گا ۵۷۷
— اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت و رشد بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو ضلالت میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا دل تنگ کرتا ہے اور اسلام کا تصور ہی اسے پریشان کر دیتا ہے ۵۷۹-۵۸۰
— اہل ضلالت روز قیامت اقرار کریں گے کہ انھیں دنیا میں راہِ ہدایت دکھائی گئی تھی لیکن ہم نے بات

نہیں مانی ۵۸۱

— اہلِ ضلالت کا استدلال کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہی ہے کہ ہم گمراہ رہیں، اس کا جواب ۵۹۵

— اللہ تعالیٰ جس انسان کو گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۸۰

— اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی سزا اور پکڑ بہت سخت ہے ۴۴۰

— اگر کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ۳۹۵

— اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت شامل نہ ہو تو انسان گمراہی سے بچ نہیں سکتا ۳۹۶

— جس شخص نے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈال دیا اس نے صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا ۳۹۵-۳۹۶

— راہِ راست واضح ہو جانے کے بعد بھی جو باطل کی راہ پر چلے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلائے گا جو خود اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے ۳۹۷

— باطل پرستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دلوں پر ٹھپا لگا دیتا ہے جس کی وجہ سے توفیقِ ہدایت سلب ہو جاتی ہے ۴۱۶

— نیکی کے کام میں تعاون اور گمراہی کے کام میں تعاون نہ کرو ۴۴۰

— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴

— ہدایت کی موجودگی اور وضاحت کے بعد ضلالت و گمراہی کا ہرگز کوئی جواز نہیں رہ جاتا ۴۷۶

(۱۹۵) طاغوت

— لفظ طاغوت کے معنی ۳۵۹-۳۶۷

— اس کی مختلف اقسام ۱۹۷

— بندگی کے رویے سے انحراف کا تیسرا مرتبہ ۱۹۶

— اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے لیے طاغوت سے انکار ضروری ہے ۱۹۷-۳۶۷

— معاملات میں طاغوت کی طرف رجوع کرنا منافی ایمان ہے ۳۶۶

— طاغوت کی راہ میں لڑنا کفر ہے ۳۷۳

— مومن کا حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے جو اس کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے جبکہ کفار کا مددگار طاغوت ہے جو انھیں روشنیوں سے تاریکی کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۷-۲۰۲

— ایمان اور طاغوت کی کشمکش کی حقیقت پر حضرت ابراہیم اور انسانی تاریخ سے تین مثالیں ۱۹۷-۲۰۲

— طاغوت اور شیطان کی چالیں اگرچہ بظاہر بڑی بڑی ہوتی ہیں لیکن اصل میں نہایت کمزور ہیں ۳۷۳

— یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب وارد ہوا کیونکہ انہوں نے طاغوت کی بندگی اختیار کی ۴۸۴

(۱۹۶) طالوت

— طالوت کا لشکر اور بادشاہت کے لیے اس کا تقرر قرار پایا ۱۸۷تا۱۸۹

(۱۹۷) طلاق

— اسلام کا قانونِ نکاح ۱۷۵-۱۷۸

— مطلقہ عورتوں کے لیے عدت کا حکم ۱۷۲-۱۷۳

— رجعت ۱۷۳-۱۷۴

— طلاق کا درست طریقہ ۱۷۴

— طلاق سہ گانہ پر قطعی انقطاع اور علیحدگی ۱۷۶

— سازشی حلالے کی حیثیت ۱۷۶

— علیحدگی کی صورت میں شریفانہ رویے کی تلقین ۱۷۴

— طلاق کو ہرگز ضرر رسانی کا ذریعہ نہ بنایا جائے ۱۷۶

— علیحدگی کی صورت میں بچوں کی رضاعت کا معاملہ ۱۷۸

— ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دینے کی صورت ۱۸۱

— مطلقہ عورت جب عدت گزار لے تو اپنی مرضی سے دوبارہ نکاح کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے ۱۷۷

— طلاق اور مکمل جدائی سے بہتر ہے کہ زوجین باہمی مصالحت کر لیں ۴۰۲

— اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ

تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دامن نہایت کشادہ ہے۴۰۴
— طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے۳۳۴

(۱۹۸) طور
— بنی اسرائیل پر طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا گیا ۸۳
— بنی اسرائیل کو ''فرمان'' دینے کا واقعہ ۴۱۶

(۱۹۹) طہارت و پاکیزگی
— حیض کی ماہیت ۱۶۹
— حالت حیض میں مقاربت کی ممانعت ۱۶۹
— حالت حیض کے متعلق مشرکین اور یہود کا طریقہ ۳۴۵
— غسل جنابت ۳۵-۴۴۸
— تیمم ۳۱۶-۳۵۵-۳۵۶-۴۴۸

(۲۰۰) ظلم، ظالم، ظالمین
— قرآنی اصطلاح میں ظلم سے کیا مراد ہے؟ ۶۶
— اللہ تعالیٰ کی مساجد میں عبادت سے روکنا اور ان کو ویران کرنا ظلم ہے۱۰۴
— خدا کے دیے ہوئے علم کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی کرنا ظلم ہے۱۲۲
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو ناپسند کرتا ہے ۲۵۹
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا ۲۷۱-۴۸۰-۵۹۱
— مظلوم کے لیے بدکلامی کی رخصت ۴۱۳
— جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظالم ہیں ۴۷۴
— اللہ تعالیٰ پر بہتان لگانے اور آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے والے سب سے بڑھ کر ظالم ہیں ۵۲۹
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ہے ۵۳۰
— آیاتِ الٰہی پر نکتہ چینی کرنے والے ظالم ہیں ۵۴۹
— شرک ظلم ہے ۵۵۹
— ظالمین کا ٹھکانا جہنم ہے ۲۹۴-۴۸۹
— اللہ پر بہتان باندھ کر نبوت کا دعویٰ کرنا ظلم ہے ۵۶۴
— ظالموں کی حالت سکراتِ موت کے عالم میں ۵۶۴
— افترا علی اللہ انتہائی ظلم ہے ۵۹۱
— ظالم تین بنیادی حقوق تلف کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں ۶۶-۶۷
— بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا ۹۷
— اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا ۲۰۰
— یہودی کتمان حق کر کے ظلم کے مرتکب ہوئے ۲۷۱
— ظالم وہ لوگ ہیں جو اپنی گھڑی ہوئی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں ۲۷۳
— انسان کو قتل کرنے والے ظالم ہیں ۴۶۲
— ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے ۵۸۳
— سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے جو حلال و حرام اور قوانین سے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرے اور علم کے بغیر لوگوں کی غلط راہ نمائی کرے ۵۹۱

(۲۰۱) عبادت
— صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے اور صرف اسی سے مانگنا درست ہے ۴۴-۴۵
— عبادت بمعنی پرستش، اطاعت اور بندگی ۴۴-۴۵
— عبادت کا وسیع ترین مفہوم ۵۷
— صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ۴۴-۵۷-۱۱۷-۲۶۲-۳۵۱-۴۹۱-۵۶۸
— عبادت بمعنی اطاعت قانون ۱۳۴
— کسی کی بے چون و چرا اطاعت اس کی عبادت ہے ۳۹۸
— یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے عہد لیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے ۱۱۳

— مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف اللہ کی بندگی و عبادت کی طرف تھی ۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— عبادت کا مستحق صرف وہی ہے جو نفع ونقصان کا مکمل اختیار رکھتا ہو ۴۹۱
— اہل کتاب کو قرآن حکیم کی دعوت کہ صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت کرو ۲۶۲
— تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے کی تلقین کیونکہ یہی دنیا و آخرت کی فلاح کا باعث ہو سکتی ہے ۵۷ تا ۶۱
— اللہ تعالیٰ کی عبادت و ذکر سے اللہ تعالیٰ بھی بندے کو یاد کرتا ہے ۱۲۵
— عبادت کی مقدار نہیں بلکہ اس میں تقویٰ کی مقدار اہم ہے ۱۵۸-۱۵۹
— تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں ہے ۶۰۵
— روزہ محض عبادت ہی نہیں بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے ۱۴۳
— عبادت کے تعین اوقات کے لیے اسلام نے ایک باقاعدہ نظام وضع کیا ہے اور اس معاملے میں بے جا تشدد پسند نہیں کیا ۱۴۵-۱۴۶
— صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کی جانی چاہیے کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ مقرر ہوا ہے ۶۱ تا ۶۹
— اللہ تعالیٰ کی خدائی نہایت وسیع ہے اور وہی عبادت کا واحد حق دار ہے ۱۰۵
— انسانوں کی عبادت سے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے ۵۸۲-۵۸۳
— جو لوگ مسجدوں میں لوگوں کو عبادت سے روکتے ہیں اور مسجدوں کی ویرانی چاہتے ہیں ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے ۱۰۴
— طاغوت کی عبادت موجب لعنت ہے ۴۸۴
— غیر اللہ کی عبادت قطعاً ممنوع ہے ۹۰-۵۴۵
— اللہ تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑنا موجب عذاب ہے ۴۳۰
— فرائض کی کھلم کھلا اور علانیہ انجام دہی کو پسند کیا گیا ہے ۲۰۸

(۲۰۵) عدت

— بصورتِ وفاتِ شوہر ۱۷۹-۱۸۰
— بصورتِ طلاق ۱۷۲-۱۷۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''طلاق'')
— عدت کے احکام ۱۷۳-۱۷۴
— عدت گزارنے کے بعد عورت معروف طریقے سے عقد ثانی اور زندگی گزارنے کے لیے مکمل آزاد ہے ۱۸۰

(۲۰۳) عدالت

— قانون کے نفاذ میں لوگوں سے نہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو رشوت و خوف کے ذریعے سے فروخت نہیں کرنا چاہیے ۴۷۶
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے کا حکم ۴۷۶-۴۷۷

(۲۰۴) عدل

— اہل ایمان کو عدل و انصاف کی ہدایت ۳۶۳
— عدل و انصاف تقویٰ کے قریب تر ہے ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والا اور انصاف کی گواہی دینے والا ہی مسلم ہے ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۴۷۲
— قرآن حکیم حق کے ساتھ نازل کیا گیا تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے ۳۹۲ تا ۳۹۴
— قاضی کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت ہی درست فیصلے کی طرف لے جا سکتے ہیں ۳۹۶
— عدل کے مطابق رسولؐ اللہ کے ایک فیصلے کی مثال جب اللہ تعالیٰ کی مداخلت پر رسولؐ اللہ نے جتھا

بندی اور عصبیت سے ہٹ کر فیصلہ فرمایا ۳۹۳-۳۹۶
— انصاف کی گواہی دینے کا حکم، عدل میں گروہی دشمنی کو الگ رکھ کر فیصلہ کرنے کا حکم جو خدا ترسی کے قریب ہے ۴۴۹
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم اور حق سے منہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے کی سخت ممانعت ۴۷۶-۴۷۷
— اہل یہود کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور حرام کا مال کھانے والے ہیں ۴۷۱
— ایسے منافقانہ رویے کی مذمت کہ اپنی مرضی کا فیصلہ متوقع ہو تب ہی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے ۳۶۷
— جو شخص حاکم اور منصف کو دھوکا دیتا ہے وہ دراصل خود کو دھوکا دیتا ہے ۳۹۶-۳۹۷

(۲۰۵) عذابِ الٰہی

— کس قسم کے لوگوں کے لیے ہے؟ ۵۲-۷۹-۹۱-۹۴-۱۰۱-۱۰۵-۱۳۰-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۹-۱۵۵-۱۶۱-۲۳۳-۲۳۶-۲۴۱-۲۵۹-۲۶۶-۲۷۸-۳۰۷-۳۳۳-۳۵۲-۴۲۳-۴۹۰-۵۴۱-۵۵۰-۵۷۹
— کسی فدیہ اور رشوت سے ٹل نہیں سکتا ۲۷۲-۵۵۰
— اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے کا مطلب دنیا و آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب ہے ۸۰-۸۱-۵۴۱
— اگر لوگ ایمان اور شکر کی روش پر چلیں تو اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ عذاب مسلط کرنے والا نہیں ہے ۴۱۲-۴۱۳
— قائم رہنے والا ہمیشگی کا عذاب ۴۶۷
— عذاب الٰہی ایسی چیز ہے جس سے ڈرنا چاہیے ۵۲۸
— دنیا میں عذاب مسلط ہونے سے پہلے مجرمین پر خوشحالی کا دور دورہ ۵۴۰
— عذاب آخرت کی تفصیلات ۵۵۰-۴۱۴
— مجرموں سے عذاب الٰہی کو پھیرا نہیں جا سکتا ۹۴
— جس نے بھی حق کو جھٹلایا وہ خدا کے عذاب کا مزا چکھ کر رہے گا ۵۹۵
— دنیوی سزا آخرت کے عذاب سے نہیں بچا سکتی ۴۶۵
— عذاب دنیا کی مختلف صورتیں ۵۴۸
— عذاب دنیا خبردار کرنے کے بعد نازل کیا جاتا ہے ۵۸۲
— دنیا اور آخرت میں ذلت و خواری اور شدید ترین عذاب کن کے لیے ہے؟ ۹۱
— قانونِ مکافات کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں بھی ذلت والا عذاب ہے ۴۶۵
— دنیا میں اقوام پر عذاب الٰہی ان کے گناہوں کی پاداش میں ہی آتا ہے ۵۲۵
— زمین میں چل پھر کر مغضوب قوموں کے انجام بد دیکھنے کی فہمائش ۵۲۶
— دنیا میں افراد، معاشروں اور اقوام کے اختلافات اور باہمی جنگ و جدل بھی عذاب الٰہی کی صورتیں ہیں ۵۴۸
— نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور نافرمانوں کو مزید عذاب الٰہی کی وعید دی گئی ہے ۸۷
— عذاب الٰہی کی مختلف صورتیں اور بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا بندر بنایا جانا ۸۴
— عذاب آ جانے کے بعد مہلت اور رجوع کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے ۱۳۱-۱۳۲
— ساری طاقتیں اور اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جو سزا دینے میں بہت سخت ہے ۱۳۲
— اہل ایمان کو چھوڑنے اور کافروں کو رفیق و دوست بنانے والے اللہ تعالیٰ کو سخت عذاب نازل کرنے کے لیے صریح حجت اور جواز فراہم کر رہے ہیں ۴۱۱
— اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کی پکڑ اور سزا بہت سخت ہے

۴۴۰

— اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں مبتلائے مصیبت کرتا ہے ۴۷۹

— اللہ تعالیٰ کائنات کی سلطنت کا مالک ہے، جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے ۴۶۹

— اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان اس کی مخلوق ہیں اور برابر ہیں، جس کو چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے ۴۵۷

— اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت درگزر کرنے والی ہستی بھی ہے ۵۰۶

— اللہ تعالیٰ جب پکڑتا ہے تو انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے اور یہی انجام ظالموں کا مقدر ہے ۵۴۰-۵۴۱

— اللہ تعالیٰ چاہے تو منکرین حق کو عذاب میں تباہ کر کے رکھ دے اور ان کی جگہ دوسری نسل اٹھائے جس طرح ہمیں بھی کسی نسل سے اٹھایا گیا ہے ۵۸۳

— اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام ایک روشن دلیل پر ہوتے ہیں لیکن مخالفین ان دلائل کو جھٹلاتے ہیں عذاب لانا نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و فیصلہ ہے کہ کتنی ڈھیل دی جائے، اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۶-۵۴۵

(۲۰۶) عرب

— اہل عرب کی بعثت نبویؐ کے وقت کیا حالت تھی؟ ۱۳۸-۸۸

— ظہور اسلام کے وقت عرب کی معاشرتی حالت ۲۷۷

— عرب کے توہمات ۳۹۸

— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے تھا لیکن عرب جاہلیت میں اس کو عجیب و غریب معانی پہنائے جاتے تھے ۱۴۸-۱۴۷

— جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا ۱۵۵

— جاہلیت کے قانون طلاق کی اصلاح ۱۷۵-۱۷۴

— جاہلی عرب میں بے مقصد مختلف جانوروں کو بے وجہ اور بے دلیل تقدس کا درجہ دیا جاتا تھا ۵۰۹-۵۰۸

— اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ کھیتوں اور جانوروں میں اللہ کے ساتھ ساتھ خودساختہ معبودوں کا حصہ مقرر کرنے کی مذمت ۵۸۵-۵۸۴

— اہل عرب کی جاہلی روایات کی تردید اور مذمت ۵۹۱-۵۹۰-۵۸۸-۵۸۷

— عرب معاشرے میں قتل اولاد کی صورتیں، یہ ہولناک کام مشرکین کے معبودوں نے ان کے لیے آسان کر دیا حالانکہ یہ ان کے لیے سراسر ہلاکت ہی ہلاکت تھا ۵۸۵ تا ۵۸۸

— کیا قرآن حکیم صرف عربوں کے لیے ہی آیا تھا؟ ۳۵ تا ۳۷

— یہودیوں کو عربوں پر علمی برتری حاصل تھی ۲۷

— عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور راہ نما مانتے تھے ۵۵۳

— قرآن ایک خیر و برکت والی کتاب ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اہل عرب کو متنبہ کرتی ہے ۵۶۳

— اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب اس بات پر جلتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل (نبوت) صرف رسول اللہؐ ہی کو کیوں نصیب ہوئی ۱۰۱

(۲۰۷) عرفات

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۲۰۸) عزت

— قرآن کا معیار عزت و شرف ۵۶۰-۵۴۴

— ایمان لانا اور نیک عمل کرنا اصل معیار عزت و شرف ہے، دنیوی دولت ہرگز نہیں ہے ۵۴۴

— تلاش حق میں کامیابی ہی اصل عزت ہے ۵۶۰

— جھوٹی عزت کی طلب میں غیر مسلموں سے تعلقات رکھنے والے یاد رکھیں کہ عزت ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ۴۰۸

(۲۰۹) عکرمہ (بن ابی جہل)

- قبول اسلام کا واقعہ ۵۳۹-۵۴۰

(۲۱۰) عقل وفکر اور علم

- ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴
- عقل مند اور دانش مند اہل ایمان کی دعا ۲۳۵
- عقل استعمال نہ کرنے والوں کی مذمت ۴۸۳
- عقل وخرد سے قرآن حکیم کی اپیل ۱۳۰ تا ۱۳۳-۵۰۷-۵۴۲
- عقل کا استعمال نہ کیا جائے تو انسان گمراہ ہو جاتا ہے ۵۰۹
- متقین نے عقل سے کام لیا اور سمجھ لیا کہ دنیا ایک کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور آخرت ہی اصل مقام ومقصود ہے ۵۳۳-۵۳۴
- زندہ ضمیر اور عقل وفکر استعمال کرنے والوں کو زندہ اور تعصب و جمود والوں کو مردہ قرار دیا گیا ہے ۵۳۶-۵۳۷
- عقل وفکر والوں کے لیے کائنات میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۵۳۷-۵۳۸
- اللہ تعالیٰ نے درست سمت عین واضح کر دی ہے اور آگے عقل وفکر سے کام لینے کا حکم دیا ہے ۵۹۹
- اللہ تعالیٰ تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور علم کا سرچشمہ ہے ۶۱-۵۴۶
- انسان کے علم کے حدود کیا ہیں؟ ۶۳
- اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنا کر محض اختیارات ہی نہیں بلکہ علم بھی دیا ہے ۶۳-۶۴
- کائنات کی تمام حقیقتیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور ہم سے مخفی ہیں ۶۴
- انسان اور فرشتوں کے علم کا تقابل ۶۴
- علم سے بے بہرہ لوگ بے بنیاد امیدوں، آرزوؤں اور وہم وگمان کے سہارے چل رہے ہیں ۸۸
- یہودی اہل علم رسولؐ اللہ کی حقانیت جانتے بوجھتے صرف اپنی دکان داری ختم ہونے کے خوف سے حق کو چھپاتے تھے ۸۸-۸۹
- علم کے ہوتے ہوئے جو خواہشات کی پیروی کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی مددگار اور دوست نہیں ملے گا ۱۰۷
- علم رکھتے ہوئے باطل اختیار کرنے والے ظالم ہیں ۱۲۲
- علم کے بغیر کوئی راستہ اختیار کرنا عین گمراہی کا راستہ ہے ۱۳۳
- علم وہی انسان کے بس میں ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت انسان کو دینا چاہے ۱۹۴
- اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق ومدبر ہے، اس حقیقت پر فرشتوں اور اہل علم ودانش کی شہادت بھی ہے ۲۳۹
- حقیقت جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کا علم ہی کافی ہے ۳۷۰
- علم میں راسخ افراد ایمان لاتے ہیں ۴۲۳-۴۲۴
- اسلام کی ضد جاہلیت اور بے علمی ہے ۴۷۹
- علمی طریقے پر آثار قیامت کا مشاہدہ کرنے کا حکم ۵۲۷-۵۳۷-۵۵۶-۵۶۴ تا ۵۶۷
- قرآن حکیم کے اصل مخاطب علم کے حامل اور سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں ۵۶۶
- اللہ تعالیٰ اپنی آیات بار بار مختلف طریقے سے بیان کرتا ہے تاکہ صاحب علم حضرات پر حقیقت روشن ہو جائے ۵۶۹
- علم کے بجائے محض گمان اور قیاس کی پیروی انسان کو گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے ۵۹۵

(۲۱۱) علمائے کرام

- علمائے کرام کے درمیان جائز اور حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلاف کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹

— علمائے یہود کی اس خوش فہمی کی مذمت کہ ان کے لیے چند روزہ عذاب آخرت ہے پھر جنت ان کا مقدر ہے ۸۹
— علمائے یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۱۲۸
— جو لوگ احکام کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کی خاطر انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن گئے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— علمائے کرام، ربانی، احبار اور مشائخ کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو گناہ و گمراہی سے روکیں اور حرام نہ کھانے کی تلقین کریں ۴۸۴

(۲۱۲) عمران

— اِمْرَاَتُ عِمْرٰنَ کے دو مفہوم ۲۴۷

(۲۱۳) عمرہ

— عمرے اور حج کے احکام ۱۵۳-۱۵۴
— حج اور عمرے کا فرق ۱۲۷
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''حج'')

(۲۱۴) عمل صالح

— ایمان اور عمل صالح کا لزوم اور ان پر عامل لوگوں کا انعام ۵۸-۵۹-۸۲
— نجات کسی مومن، یہودی، صابی، عیسائی کی اجارہ داری نہیں بلکہ اصل نجات کا راستہ ایمان کے ساتھ عمل صالح میں ہے ۸۲

(۲۱۵) عورت

— معاشرت میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ ۷۰-۱۷۱-۱۷۳-۱۷۷-۱۸۰-۱۸۳-۳۲۵-۳۲۶-۳۳۳-۳۴۸-۳۴۹
— عورتوں کے حقوق ۱۶۹-۱۷۳-۱۸۰
— عورتوں کے اخلاقی فرائض ۱۷۳
— قانونِ شہادت میں ان کی گواہی ۲۲۰
— عورتوں کے معاشی حقوق ۳۲۴
— بہترین بیوی کی صفات ۳۴۹
— عورت سے شوہر کی اطاعت کا مطالبہ کہاں تک ہے؟ ۳۴۹
— عورت کا حصہ آدھا کیوں؟ ۳۲۵-۳۲۶
— عورتوں پر مرد کو ایک درجہ حاصل ہے ۱۷۳
— عورت کا حصہ شوہر کے ترکے میں ۳۲۸
— عورت اپنی عدت کی مدت گزارنے کے بعد معروف طریقے سے اپنی آیندہ زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے ۱۸۰-۳۳۳-۳۳۴
— اللہ تعالیٰ کا بے لاگ معیار جزا و سزا عورت و مرد، غلام و آقا اور کالے اور گورے سب کے لیے ایک ہے ۳۱۲-۳۱۳-۳۹۹-۴۰۰
— جرم کی سزا مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی ہے، جنس کی بنا پر کوئی رعایت نہیں ہے ۳۳۱-۳۳۲

(۲۱۶) عہد

— اللہ تعالیٰ سے کیا گیا عہد توڑنے کی سزا ۲۶۶-۲۶۷-۴۵۴
— عہد جو انبیائے کرام سے لیا گیا ۹۰-۹۵-۳۰۹-۳۱۰-۴۵۱
— عہد جو بنی اسرائیل سے لیا گیا ۴۱۶
— مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے عہد پر کاربند رہنے کی تاکید ۴۴۹
— سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا عہد ۴۴۹
— عیسائیوں سے بھی عہد لیا گیا اور انھوں نے بھی عہد شکنی کی ۴۵۵
— اللہ تعالیٰ کے عہد کے تین مفہوم ۶۰۰
— فطری عہد کی توضیح ۶۰۰
— فطری عہد کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلے ۶۰۱
— اسلام خفیہ عہد کا قائل نہیں ہے، جو کچھ طے ہو ظاہر اور صاف ہو ۱۸۰
— عہد سے پھرنے والے فاسق ہیں ۲۶۹
— اسلام وعدے، عہد اور معاہدے کا اس قدر احترام

کرتا ہے کہ اگر کوئی واجب القتل منافق کسی معاہد قوم میں پناہ لے لے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا ۳۸۰ تا ۳۸۲

(۲۱۷) عیسیٰ علیہ السلام

— عقیدۂ الوہیت ۲۵۷-۲۵۸
— انھیں راہ راست دکھائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے، اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰
— آپ کو ”اللہ کا فرمان“ کیوں کہا گیا؟ ۲۴۹
— معجزانہ پیدائش کی وجہ سے آپ الٰہ نہیں قرار پا سکتے ۲۵۰-۲۵۱-۴۱۷-۴۵۷
— حضرت آدم علیہ السلام سے آپ کی وجہ تشبیہ ۲۵۹
— آپ کے کلمۃ اللہ ہونے اور حضرت مریم پر بھیجے جانے کا مفہوم ۴۲۶-۴۲۷
— ”رُوْحٌ مِّنْہُ“ یا ”روح من جانب اللہ“ کا مطلب ۴۲۸
— آپ اور آپ کی والدہ اللہ تعالیٰ کی بے اختیار رعیت ہیں ۴۵۷
— آپ اور آپ کی والدہ کی بشریت ۴۹۰
— حضرت عیسیٰ سے نت نئے معجزات کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۵۱۴
— آپ کے خاص معجزات ۲۵۲-۲۵۳
— آپ کا اٹھایا جانا ۲۵۸
— آپ کے قتل ہونے اور صلیب دیے جانے کی تردید ۴۱۸
— واقعہ صلیب سے پہلے آپ کا اٹھایا جانا ۴۱۸-۴۱۹
— واقعہ رفع کی غیر معمولی نوعیت ۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کی صلیب کے واقعے پر یہودیوں اور عیسائیوں میں پائے جانے والے خیالات غلط ہیں اور محض گمان کی پیروی ہیں ۴۱۹-۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا جا سکا بلکہ زبردست طاقت اور حکمت والے نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا ۴۱۸ تا ۴۲۰
— حضرت عیسیٰ کے ظہور ثانی پر تمام اہل کتاب بھی ان پر ایمان لے آئیں گے ۴۲۰-۴۲۲
— عیسائیوں کے عقیدہ برائے تثلیث کی تردید ۴۲۸-۴۳۰
— حضرت عیسیٰ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتے تھے لیکن لوگوں نے انھیں رب قرار دے دیا ۴۸۹
— حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ یا خود اللہ قرار دینے والے سراسر کفر کر رہے ہیں ۴۸۹
— آپ کے خلاف بنی اسرائیل کی زیادتیاں ۸۱-۴۱۷
— آپ کے فضائل ۹۲
— آپ کی مدد کے لیے روح القدس ۱۹۲
— آپ تورات اور انجیل کی تعلیم دینے آئے تھے ۲۵۲
— آپ تورات کے مصدق تھے ۲۵۳-۴۷۴
— آپ وہی دین لائے جو حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیائے کرام کا دین تھا ۲۵۳
— آپ کی اصل دعوت یہی تھی کہ اللہ کے حکم پر ان کی اطاعت کی جائے ۲۵۴-۴۸۹-۵۱۶
— بائبل میں آپ کی دعوت کے آثار ۲۵۵-۲۵۶
— توفی کا مفہوم ۲۵۷-۴۲۱
— اللہ کی طرف سے آپ کو منکرین پر فوقیت دینے کا وعدہ ۲۵۸
— بنی اسرائیل کے کفر پر آپ کا مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ کی عام پکار بلند کرنا ۲۵۶
— آپ کی دعوت وہی تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ۲۶۰
— آپ کی موت سے قبل تمام اہل کتاب کا آپ پر ایمان لانے کا مفہوم ۴۲۱
— آپ کے بارے میں اہل کتاب کا غلو ۴۲۷
— انجیل میں آپ کے اقوال توحید پر مشتمل ہیں ۴۲۸
— آپ کا مقام عبدیت ہے ۴۳۰
— عیسائیوں کا آپ کو خدا قرار دینا ۴۵۶
— آپ کی حیثیت خدا کا رسول ہونے سے زیادہ کچھ نہ

تھی ۴۹۰

— شیطان کے ذریعے سے آپ کی آزمائش ۴۹۱

— عیسائیوں کے ایک خیالی عیسیٰ (مسیح) تصنیف کرنے کی داستان ۴۹۱ تا ۴۹۵

— آپ کے سارے معجزات اللہ تعالیٰ کے اذن سے ظاہر ہوئے ۵۱۲-۵۱۳

— حضرت عیسیٰ کی میدان حشر میں شہادت ۵۱۲-۵۱۳

— آپ پر حواریوں کا ایمان لانا ۵۱۳

— آسمانی خوان کے لیے آپ کی دعا ۵۱۴

— آپ پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی جرح ۵۱۵

— آخرت میں آپ کا اپنی صفائی پیش کرنا ۵۱۶

— اپنی امت کے لیے حضرت عیسیٰ کی عاجزانہ لطیف شفاعت ۵۱۷

— حضرت عیسیٰ کو اس حقیقت کے اظہار میں کوئی عار نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰

(۲۱۸) عیسائی

— اس لفظ کے مفہوم کی تشریح ۴۸۰

— حضرت عیسیٰ کے اوّلین پیرو عیسائی نہیں بلکہ مسلم تھے ۲۵۶-۵۱۷

— عیسائیوں کے سامنے قرآن کی تین تصریحات ۲۶۰

— ان سے عہد لیا گیا اور انھوں نے عہد شکنی کی ۴۵۵

— لفظ ''نصاریٰ'' کی تشریح ۴۵۵

— انھیں زعم تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور چہیتے ہیں ۴۵۷

— ان کو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ۴۷۵

— ان کا عقیدۂ تثلیث کفر ہے اور قرآن حکیم الوہیت کے نظریے کی مکمل تردید کرتا ہے ۴۹۰-۴۹۱

— ان کا ایک خیالی مسیح تخلیق کر لینا ۴۹۱ تا ۴۹۵-۵۱۷-۵۱۸

— اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے سلیم الفطرت عنصر کا رویہ ۴۹۷-۴۹۸

— حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انھیں توحید کی دعوت دی تھی نہ کہ تثلیث کی ۵۱۶

— اہل کتاب یہودی ہوں یا عیسائی یا مشرکینِ مکہ، سب اس بات سے جلتے ہیں کہ اللہ کا فضل (نبوت) رسولؐ اللہ ہی کو کیوں نصیب ہو گیا ۱۰۱

— یہودی اور عیسائیوں کے اس زعم کی تردید کہ صرف وہی جنت میں جائیں گے، یہ تو اطاعت خداوندی کرنے والوں کا حق ہے ۱۰۳

— عیسائیوں کی اس خام خیالی کی تردید کہ چند روز دوزخ میں گزارنے کے بعد وہ جنت میں بھیج دیے جائیں گے ۲۴۲

— یہودی اور عیسائیوں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینا ۱۰۴

— عیسائی یا یہودی ہونا باعث نجات نہیں بلکہ حضرت ابراہیم کا طریقہ باعث فلاح و نجات ہے ۱۱۴

— عیسائیوں کی رسمِ غسلِ ہدایت ۱۱۶

— عیسائی رب کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہیں حالانکہ وہی سب کا رب ہے اور سب ہی اس کا اقرار کرتے ہیں ۱۱۷

— حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور اولادِ یعقوب کے بہت بعد میں یہودیت اور عیسائیت نے جنم لیا ۱۱۷

— تحویل کعبہ کے حکم پر یہودی اور عیسائی اعتراضات بے جا ہیں کیونکہ عیسائی حضرات کعبہ کی فضیلت کو جانتے ہیں لیکن جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہیں ۱۲۲-۱۲۳

— عیسائیوں کے جھوٹے دعووں اور ان کی غلط فہمیوں کی تردید ۱۳۵-۱۳۶

— عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ کے متعلق الوہیت کا عقیدہ پیدا ہونے کے وجوہ اور اس سلسلے کی غلط فہمیوں کا ازالہ ۲۵۷-۲۵۸

— عیسائی وفد نجران حقیقت کو پا چکا تھا لیکن ہٹ دھرم بن گئے، انھیں اللہ کی طرف سے مباہلہ کی دعوت جس سے وہ بھاگ گئے ۲۶۰-۲۶۱

— عیسائیوں پر باطل پرستی کی وجہ سے لعنت پڑی ہے،

اس لیے کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸
— عیسائی اہل کتاب پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے اس کا کوئی مددگار نہیں ہے ۳۶۰
— اہل کتاب یہودی اور عیسائی اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے ۳۶۰
— عیسائی، یہودی اور اہل کتاب اس قدر تنگ دل اور تنگ نظر ہیں کہ حق کا اعتراف کرنے سے چوکتے ہیں، اگر کہیں کائنات کی حکومت ان کی ہوتی تو کسی کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دیتے ۳۶۰
— یہودی اور عیسائی حضرت عیسیٰ کے معاملے میں حد سے گزر گئے یہودی انکار و مخالفت میں اور عیسائی عقیدت و محبت میں اس کو اللہ تعالیٰ نے دین میں غلو قرار دیا ہے ۴۲۷
— حضرت عیسیٰ کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''کلمہ'' بھیجنے کا درست مفہوم ۴۲۷
— حضرت عیسیٰ کے ''روح من جانب اللہ'' ہونے کا درست مفہوم کیا ہے؟ ۴۲۸
— عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی تردید ۴۲۸ تا ۴۳۰
— عیسائیوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنا عہد توڑ ڈالا اور تعلیمات خداوندی کا سبق فراموش کر دیا ۴۵۵
— عیسائیوں اور یہودیوں کی بدعہدی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض کا بیج بو دیا ۴۵۵
— حضرت عیسیٰ کی حقیقت کے بارے میں عیسائیوں نے ٹھوکر کھائی اور غلو کیا ۴۵۶
— عیسائی اور یہودی اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہونے کے دعوے دار ہیں جو بالکل غلط ہے، اگر ایسا ہے تو وہ اپنے گناہوں پر سزا کیوں پاتے رہتے ہیں؟ ۴۵۷
— عیسائی جب بھی جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ فساد پھیلانے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا ۴۸۶
— عیسائیوں کو تنبیہ کہ تم نے عیسیٰ اور مریم کو خدا بنا ڈالا ہے، اگر اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کر دے تو کیا امر مانع ہے ۵۴۷
— عیسائی یا یہودی جو بھی ایمان لا کر نیک عمل کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ اور خدا قرار دینے والے صریحاً کفر کر رہے ہیں ۴۸۹
— حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ دونوں بشر تھے ۴۹۰
— عیسائی عداوتِ اسلام میں کم تر ہیں، ان میں ایمان اور اسلام اخذ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے ۴۹۷-۴۹۸

(۲۱۹) عیسائیت

— قرآن حکیم عیسائیوں کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے منسوب کرتا ہے ۵۱۸
— عیسائیت حضرت مسیح کے بعد پیدا ہوئی ۱۱۵
— اس کے باطل ہونے پر قرآن کا ایک لطیف استدلال ۱۱۵ تا ۱۱۷
— اس کی بنیادی گمراہی ۲۴۶
— عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کی وجہ سے عیسائیوں کا بنیادی مغالطہ ۲۵۰
— حضرت عیسیٰ کے متعلق عقیدۂ الوہیت پیدا ہونے کے اسباب ۲۵۷
— عیسائیت حضرت ابراہیم کے بہت بعد پیدا ہوئی ۲۶۲
— واقعہ صلیب کے بارے میں عیسائیوں کے اختلافات ۴۱۹
— عقیدۂ تثلیث ۴۲۸-۴۹۰
— کفارے کا عقیدہ اور اس کی تردید ۴۲۹
— مسیحی کلیسا کے عقیدے پر ''ریونڈ جارج ولیم ناکس'' کی بحث ۴۹۴
— مسیحی فلسفے پر ''ریونڈ چارلس اینڈرسن اسکاٹ'' کا تبصرہ ۴۹۱ تا ۴۹۴
— الوہیت مسیح کے عقیدے کا نشو و ارتقا ۴۹۴-۴۹۵
— الوہیت مریم کا عقیدہ، حضرت مریم کو عیسائیوں کا

''ام اللہ'' قرار دینا ۵۱۵

(۲۲۰) عورت

— عورتوں اور مردوں کے حقوق معروف طریقے پر بالکل ایک جیسے ہیں ۱۷۳-۱۷۴
— عورتوں پر مرد قوام ہیں ۱۷۳-۳۴۹
— قانون شہادت میں مرد اور عورت کی گواہیوں میں فرق ۲۱۹-۲۲۰
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جان (حضرت آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا (حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ) بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے ۳۱۹
— مردوں نے جو کمایا وہ ان کا ہے، عورتوں نے جو کمایا اس کے مطابق ہی ان کا حصہ ہے ۳۴۷
— عورتوں اور مردوں کو تلقین کہ تم میں کسی کو زیادہ دیا گیا ہے اس کی تمنا نہ کرو، اس طرح حسد، رشک، عداوت، مزاحمت اور کشاکش سے بچے رہو گے ۳۴۷-۳۴۸
— صالح عورت کس طرح کی ہوتی ہے؟ ۳۴۹
— معاشرے میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ ۱۷۰-۱۷۱-۱۷۳-۱۷۷-۱۸۰-۱۸۲-۳۲۵-۳۲۶-۳۳۳-۳۴۸-۳۴۹
— عورتوں کے حقوق ۱۶۹-۱۷۳-۱۸۰
— عورتوں کے اخلاقی فرائض ۱۷۳
— عورتوں کے معاشی حقوق ۳۲۴
— بہترین بیوی کی صفات ۳۴۹
— بیوی (عورت) کی طرف سے شوہر کی اطاعت کے حدود ۳۴۹
— وراثت میں عورتوں کا حصہ آدھا کیوں ہے؟ ۳۲۵-۳۲۶
— عورت (النساء) نام سے قرآن مجید کی چوتھی سورت ۳۱۶ تا ۴۳۲
— عورت ہو یا مرد، بشرطیکہ ہو مومن، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک عمل کا مکمل بدلہ دیا جائے گا اور ہرگز حق تلفی نہ ہو گی ۴۰۰
— سزا کے نفاذ میں عورت اور مرد بالکل برابر ہیں ۴۶۷
— اوّلین انسان (حضرت آدمؑ) کی جنت میں ساتھی (حضرت حواؑ) تھیں ۶۵
— شیطان نے آدم و حوا دونوں کو بہکایا، صرف حضرت حواؑ قصوروار نہ تھیں ۶۵-۶۶
— عمران کی عورت یعنی حضرت مریم کی والدہ کا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنا ۲۴۶
— ''لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا'' لیکن رب اعلیٰ نے لڑکی کو بخوشی بطور نذر قبول کیا اور اسے ایک اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا ۲۴۷-۲۴۸
— حضرت مریم جیسی نیک اور صالح لڑکی کی سرپرستی کرتے ہوئے حضرت زکریا کی بڑھاپے میں نیک اولاد کی دعا ۲۴۸-۲۴۹
— حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا، پاکیزگی عطا کی اور تمام جہان کی عورتوں پر فوقیت دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ۲۵۰
— حضرت مریم کو بن باپ کے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو خوش خبری، جنھیں دنیا و آخرت میں معزز اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شمار کیا گیا ۲۵۱-۲۵۲
— حضرت مریم کی بے گناہی اور اخلاقی برتری کی گواہی ۴۱۷-۴۲۷-۴۲۸
— جنت میں نیک عورتوں کے زوج صرف نیک مرد ہوں گے ۵۸-۲۳۸
— عورت اور مرد (زوجین) کا تعلق بالکل غیر منفک، لباس اور باہمی لطف کا ہے ۱۴۴-۱۴۵
— بیوی (عورت) اگر پسند نہ بھی ہو تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں تمھارے لیے بھلائی رکھی ہو ۳۳۴
— محفوظ عورتیں جو اہل ایمان میں سے ہوں یا اہل کتاب میں سے؛ قید نکاح میں اہل ایمان کے لیے حلال ہیں ۴۴۶-۴۴۷
— مومن عورت کا مشرک مرد اور مومن مرد کا مشرک عورت سے نکاح منع ہے ۱۶۸-۱۶۹

— تعدد ازدواج کو محدود کیا گیا اور عدل کی شرط سے مشروط کیا گیا ہے ۳۲۰-۳۲۱-۴۰۳-۴۰۴

— نکاح ایک پختہ عہد ہے، اس کے اختتام پر عورت کو دیے گئے مال و دولت واپس لینے کی ممانعت ہے؟ ۱۷۴-۱۷۵-۳۳۵

— کن عورتوں سے نکاح کی ممانعت ہے؟ ۳۳۵ تا ۳۳۹

— جس عورت کا شوہر عدل نہیں کرتا وہ عورت حکومت اسلامی کی عدالتوں سے اپنے لیے دادرسی کر سکتی ہے ۳۲۱

— عورتوں کے حق مہر خوش دلی سے ادا کرنے کا حکم، عورت کو حق مہر کا کچھ حصہ معاف کر دینے کا اختیار ہے ۳۲۲-۳۴۱

— عورتوں کے حق مہر میں کتر بیونت کرنا سراسر حرام ہے ۳۳۳ تا ۳۳۵

— عورت کو اگر شوہر سے بے رخی اور بدسلوکی کا خطرہ ہو تو میاں بیوی کچھ حقوق کی کمی بیشی پر آپس میں صلح اور فیصلہ کر لیں ۴۰۲-۴۰۳

— اگر زوجین (عورت اور مرد) کا نباہ نہ ہو سکے تو ان کے پاس فیصلے کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے ۱۷۱-۱۷۲

— مطلقہ عورت کی عدت ۱۷۲-۱۷۳

— طلاق کو دور جاہلیت میں عورت کو ایذا دینے کا سب سے بڑا ہتھیار بنا دیا گیا تھا، اسلام نے اس کی اصلاح کی ۱۷۴-۱۷۵

— عورت کو حاصل طلاق کا حق (خلع) ۱۷۵-۱۷۶

— طلاق شدہ عورت کے سابقہ شوہر پر حقوق ۱۷۶-۱۷۷

— طلاق شدہ عورت کو عقد ثانی کا حق حاصل ہے ۱۷۷-۱۷۸

— ازدواجی رشتہ قائم ہونے سے پہلے طلاق پانے والی عورت کے حقوق ۱۸۱-۱۸۲

— شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ عورت کا زبردستی وارث بننے کی ممانعت ۳۳۳

— ازدواجی تعلقات بگڑنے پر عورت اور مرد کے ایک ایک رشتہ دار کو حکم (ثالث) مقرر کرو ۳۵۰

— زوجین اگر حکم اور صلح کی تمام کوششوں کے باوجود الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا ۴۰۴

— بیوہ ہونے والی عورت کی مدت عدت ۱۷۹-۱۸۰

— مرنے والوں کو حکم کہ اپنی بیوی کے لیے وصیت کر جائیں ۱۸۳

— بدکار عورت کی سزا کا اولین حکم، توبہ اور اصلاح پر معافی کا حکم ۳۳۱-۳۳۲

— سرکش عورت (بیوی) سے نمٹنے کا طریقہ ۳۴۹-۳۵۰

— یتیم ہونے والے کمزور بچے اور بچیوں کے حقوق کا خیال رکھنے کا حکم ۴۴۰ تا ۴۰۲

— ایام حیض میں عورت سے متعلقہ احکام ۱۶۹-۱۷۰

— عورت اپنے جرم پر خود ہی سزاوار ہوگی، کوئی اس کی جگہ سزا نہیں بھگتے گا ۱۳۸

— عورتوں کا بھی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں حق وراثت مردوں کی طرح ہے، خواہ جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، زرعی ہو یا صنعتی ۳۲۴

— عورت کا وراثت میں مرد سے آدھا حصہ ہے کیونکہ خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریاں ہیں اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا گیا ہے ۳۲۵-۳۲۶

— اگر میت کی وارث صرف لڑکیاں ہوں تو وراثت میں ان کا حصہ کس طرح متعین ہوگا؟ ۳۲۶

— ماں کا حصہ وراثت ۳۲۶-۳۲۷

— بیوہ ہونے والی عورت کا اپنے شوہر کے ترکے میں حصہ وراثت ۳۲۸

— اللہ تعالیٰ کا بے لاگ قانون جزا و سزا عورت و مرد کے لیے بالکل ایک ہے، جنس کی بنا پر کوئی رعایت ہرگز نہیں ہے ۳۱۲-۳۱۳-۳۳۱-۳۳۲-۳۹۹-۴۰۰

— مرنے والی عورت کے شوہر کا حصہ وراثت ۳۲۸

— مرنے والی عورت جو بے اولاد بھی ہو اور ماں باپ

بھی نہ ہوں اس کی وراثت کی تقسیم کا طریقہ ۳۲۹
— بہنوں اور بھائیوں کا باہمی وراثت کا قانون ۴۳۱-۴۳۲
— عورتوں، بچوں اور بے بس مردوں کی خاطر لڑنے کا حکم جنھیں کمزور پا کر دبا دیا گیا ہے اور وہ حامی و مددگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کرتے ہیں ۳۷۲
— عورتیں، بچے اور کمزور مرد حضرات ہجرت کی عدم پابندی پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور درگزری کے طالب ہیں ۳۸۷
— اہل فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۷۵
— بنی اسرائیل کی اخلاقی گراوٹ کی انتہا کہ وہ تعویذ اور عمل کے ذریعے سے منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے جدا کرواتے تھے ۹۹
— ماؤں (عورت) کے پیٹ میں استقرار حمل سے لے کر حمل کے تمام مراحل میں ضروریات کا مکمل اہتمام ۲۳۳
— لوگوں کے مرغوبات نفس، عورت اور سونا چاندی کے ڈھیر ہیں لیکن یہ سب کچھ دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان ہے ۲۳۷-۲۳۸
— عورت اپنی عدت کی مدت گزارنے کے بعد معروف طریقے سے اپنی آیندہ زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہے ۱۸۰-۳۳۳-۳۳۴

غ

(۲۲۱) غرور
— جو شخص اپنی معاشی اور معاشرتی بڑائی پر مغرور ہو، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو سخت ناپسند کرتا ہے ۳۵۲
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اخلاقی تعلیمات‘‘)

(۲۲۲) غلامی
— لونڈیوں سے تمتع کی اجازت اور اعتراضات کے جوابات ۳۲۱-۳۲۲-۳۳۹-۳۴۰
— منکوحہ لونڈی کے لیے زنا کی سزا ۳۴۲

(۲۲۳) غیب
— اس کے معنی ۵۰
— ایمان بالغیب کا مطلب ۵۰
— اہل ایمان کی لازمی صفت ہے کہ وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں ۵۰-۵۱
— اللہ تعالیٰ حقائق غیب میں سے جتنا کچھ چاہتا ہے اپنے رسولوں کو بتاتا ہے ۳۰۶
— امورِ غیب کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول پر اعتماد کرو ۳۰۶
— پردۂ غیب الٹنے پر مہلت اصلاح کا خاتمہ ۵۲۵
— آخرت میں حقیقت بالکل بے نقاب ہو گی ۵۳۲
— رسول اللہ کے عالم الغیب ہونے کی تردید ۵۴۲
— غیب کی کنجیاں صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں ۵۴۶
— مومن و منافق کی تمیز کے لیے غیب سے دلوں کا حال نہیں کھولا جاتا بلکہ آزمائش کے ذریعے سے کھوٹے اور کھرے کو الگ الگ کر دیا جاتا ہے ۳۰۵-۳۰۶

ف

(۲۲۴) فاتحہ
— معانی ۴۲
— قرآن مجید کی پہلی مکمل سورت جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی ۴۲
— سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے جو ہر اس شخص کو سکھلائی گئی ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ۴۲
— سورۂ فاتحہ اور باقی قرآن کا کیا تعلق ہے؟ ۴۲

(۲۲۵) فاسق
— فسق کے معانی ۶۰-۹۷-۱۹۶
— فاسقین کی صفات ۶۰
— اللہ تعالیٰ کی آیات سے فاسق ہی انکار کرتے ہیں ۹۷

— فسق بندگی کے رویے سے انحراف کا پہلا مرتبہ ہے ۱۹۶
— خدا سے عہد کر کے پھر جانا فسق ہے ۲۶۹
— فسق کی چند صورتیں ۴۴۳
— جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں ۴۷۵
— اللہ تعالیٰ فاسقین کو ہدایت نہیں دیتا ۵۱۲
— جس ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا فسق ہے ۵۷۷
— بنی اسرائیل فاسق ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کی حالت پر رحم کھایا جائے ۴۶۱
— اہل کتاب کا ان کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں فاسقوں سے بھی بدتر انجام ہو گا ۴۸۳

(۲۲۶) فتنہ

— لفظ فتنہ کے معانی ۱۵۰
— فتنہ قتل سے زیادہ سنگین ہے ۱۵۰
— لفظ فتنہ کا استعمال غلبہ باطن کے معنی میں ۱۵۱
— فتنہ خون ریزی سے بدتر ہے ۱۶۵
— فتنہ طرازوں کی متشابہات سے غیر معمولی دلچسپی ۲۳۵
— اللہ تعالیٰ کے ''فتنہ میں ڈالنے'' کا مفہوم ۴۷۱
— مخالفین کے فتنے میں ڈالنے کی کوشش سے ہوشیار رہنے کی تاکید ۶۴۷
— اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا گویا خود کو فتنے میں ڈالنے کے مترادف ہے ۴۷۹

(۲۲۷) فرشتے

— فرشتے کے معانی ۶۲
— کائنات کے نظام میں فرشتوں کی حیثیت ۶۲-۶۴-۶۵-۹۸
— فرشتوں کے علم کی حقیقت ۶۴
— فرشتے فرائض کی انجام دہی میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتے ۵۴۷
— فرشتے اللہ کی سلطنت کے کارپرداز ہیں اور اپنے مناصب کی انجام دہی کے لیے انسانی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں ۹۸
— انھیں اس بات میں کوئی عار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— انسان کی خلافت پر فرشتوں کے اعتراض کی حقیقت ۶۲
— کیا فرشتے خود خلافت الٰہیہ کے امیدوار تھے؟ ۶۲-۶۳
— آدمؑ کے آگے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ۶۴
— فرشتوں کا انسان کو سجدہ کس بات کی علامت تھا؟ ۶۴ تا ۶۶
— فرشتے پیدائشی راست رو ہیں ۵۹۶
— ان کی مخالفت کفر ہے ۹۷
— توحید پر فرشتوں کی شہادت کی اہمیت ۲۳۹
— جو فرشتوں کا دشمن ہے اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے ۹۷
— قرآن مجید کے حق تعالیٰ کی طرف سے مبنی بر علم ہونے پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ہے ۴۲۶
— فرشتوں کا حضرت زکریا کو نماز میں خوشخبری سنانا ۲۴۹
— فرشتوں کا حضرت مریم کو بشارت دینا ۲۵۰-۲۵۱
— فرشتوں کے ذریعے سے میدانِ جنگ میں اہل ایمان کی مدد کی گئی ۲۸۶
— کفر کا رویہ اختیار کرنے والوں اور کفر کی حالت میں جان دینے والوں پر اللہ اور فرشتے لعنت بھیجتے ہیں ۱۲۹
— فرشتوں کا روح قبض کرنے کے لیے آنا ۳۸۶-۵۴۷
— فرشتوں کے علی الاعلان آنے کی دو صورتیں ۵۲۶
— ہر انسان پر نگرانی کرنے والے فرشتے مقرر ہیں ۵۴۷
— فرشتے ظالموں کی جان کس طرح نکالتے ہیں؟ ۵۶۴-۵۶۵

— ہاروت اور ماروت نامی فرشتوں کے حوالے سے جادوگری کی تعلیم کی مذمت ۹۸

(۲۲۸) فرعون

— بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم ۷۵
— فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی ۷۵

(۲۲۹) فرقان

— حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا ۷۶
— قرآن کی صفت ۱۴۲
— فرقان بمعنی کسوٹی ۲۳۳

(۲۳۰) فرقہ بندی

(مزید دیکھو ’’تفرقہ واختلاف‘‘)
— فرقہ بندی کو شرک کہا گیا ہے ۶۰۵
— قرآن حکیم جس فرقہ بندی کی مذمت کرتا ہے ۳۸
— حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلاف کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹
— دین اسلام اصل اور بنیادی نکتہ ہے جو اہل ایمان کو جوڑتا ہے، اس سے پہلے اہل ایمان نااتفاقی کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے ۲۷۶-۲۷۷
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام اختلافات کی حقیقت کھول دے گا جو انسان نے پیدا کر رکھے ہیں ۶۰۶
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام مذہبی اختلافات کا فیصلہ کر دے گا ۱۰۴-۲۵۹
— حضرت ابراہیم کا طریقہ ہی درست تھا، یہ فرقہ بندیاں سب بعد کی پیداوار ہیں ۲۷۴-۲۷۵
— فرقہ بندی کرنے والوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ بن گئے، اس چلن کا اسلام اور طریقہ ابراہیم سے کوئی تعلق نہیں ہے ۶۰۴-۶۰۵
— مذہبی موشگافیاں ایک نہایت پرانا حربہ ہے جو یہود مدینہ استعمال کرتے تھے اور دین اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرتے تھے ۱۱۰ تا ۱۰۷
— غیر مسلموں کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت کہ کہیں وہ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱
— مسجد میں عبادت سے روکنا اور ان کی ویرانی کے درپے ہونا ۱۰۴

(۲۳۱) فساد

— حقیقت آشکارا ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی کی بنا پر کتمان حق کرنا مفسدین کی صفت ہے ۲۶۰
— اللہ تعالیٰ کو مفسدین ناپسند ہیں ۴۸۶
— منافقین فساد پھیلانے کے مجرم ہیں ۵۳
— زمین میں فساد پھیلانے والے خسارے میں رہیں گے ۶۰
— فساد برپا کرنے سے کیا مراد ہے؟ ۶۰
— فساد پھیلانے والا ایک انسانی کردار ۱۵۹
— زمین کو فساد سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تدابیر ۱۹۱
— بندگی کے رویے میں فساد کے تین مراتب ۱۹۶
— فساد، اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے کے معنی میں ۴۶۵

(۲۳۲) فلاح

— فلاح پانے والے لوگ کون ہیں؟ ۴۵-۵۱-۳۱۴
— فلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہے ۲۷۸
— فلاح کے لیے تقویٰ لازم ہے ۲۸۸
— فلاح پانے کے لیے ایمان کے ساتھ تقویٰ اور جہاد کی اہمیت ۴۶۶
— فلاح پانے کے لیے گندے شیطانی کاموں سے بچنا ضروری ہے ۵۰۱
— ظالموں کے لیے فلاح نہیں ہے ۵۳۰-۵۸۳
— احکام خداوندی کی پیروی ہی فلاح کا راستہ ہے ۱۲۵
— اللہ تعالیٰ اپنی بات نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ ہدایت وفلاح کا راستہ صاف نظر آجائے ۲۷۷
— احکام خداوندی اور احکام رسولؐ اللہ پر عمل کرنے والے ہی کو فلاح کا راستہ اور اجر اور صراطِ مستقیم کی دولت سے سرفرازی نصیب ہوتی ہے ۳۶۹-۳۷۰

(۲۳۳) فواحش
— اس کے معانی کی تشریح ۵۹۹
(۲۳۴) قاضی
— منصف اور قاضی کو حکم کہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں اور حق سے منہ موڑ کر ہرگز لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں ۴۷۶-۴۷۷
(۲۳۵) قانتات
— مسلمان عورت کی تعریف ۳۴۹
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''عورت'')
(۲۳۶) اصولِ قانونِ اسلام
— جرم میں ارادے کا شامل ہونا بہت ضروری ہے ۵۴۴
— ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی ذمہ دار ہے، یہ ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی ۲۲۴
— جملہ معاملات میں قرآن ہی قانونی مرجع ہے ۴۷۶-۴۷۸-۴۷۹
— جرم میں ارادے کا شامل ہونا ضروری ہے ۵۴۴
— اسلامی قانون کے نفاذ سے قبل کے معاملات کا حکم ۳۳۵
— جرم کی سزا پانے کے بعد بھی توبہ اور اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے ۴۶۸-۴۶۹
— فیصلے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶
— توبہ اور معافی تب تک ہی ہے جب تک سزا کا ہاتھ جکڑ نہ لے ۴۶۵-۴۶۶
— قانون کے نفاذ میں لوگوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے، کسی رشوت وخوف کی طرف مائل نہیں ہونا چاہیے ۴۷۶
— احکام کے جواز کی حدود سے دور رہنا ہی بہترین رویہ ہے تاکہ حدود پار کرنے کا خطرہ نہ رہے ۱۴۷
— اس کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر، ظالم اور فاسق ہیں ۴۷۴-۴۷۵
— اللہ تعالیٰ اپنے احکام میں نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی ہرگز نہیں کرنا چاہتا ۱۴۳
— قانونی اور اخلاقی حیثیات کا فرق ۲۱۳
— کسی بھی شخص سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی جگہ خود کو متصور کرو اور سوچو کہ تم کیا سلوک چاہتے ہو، وہی سلوک اور معاملہ روا رکھو ۳۲۵
— قانون اسلام کا لحاظ اور احترام کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے ۱۵۲
— قانون اسلام کی پیروی میں انسان کی اپنی بھلائی ہے ۳۶۶
ازدواجی تعلقات، قانونِ نکاح
— نکاح ۶۸-۱۸۰-۳۲۰-۳۳۵ تا ۳۳۹-۳۴۱-۴۴۶
— محرمات اور لونڈیاں ۳۳۸-۳۴۱
— ایلا ۱۷۱-۱۷۲
— طلاق ۱۷۲ تا ۱۷۵
— مہر ۱۸۱-۳۲۲-۳۳۳-۳۳۵-۳۴۱-۴۴۷
— عدت ۱۷۳-۱۷۶-۱۷۹
— رجعت ۱۷۴-۱۷۷
— خلع ۱۷۵-۱۷۶-۱۷۸
— عورت کا نفقہ ۳۴۹
— مشرکین سے نکاح کی ممانعت ۱۶۸-۱۶۹
— عورت کو تنگ کر کے حق مہر مارنے کی کوشش کی ممانعت ۳۳۳
— عورت کے ساتھ بھلے طریقے سے ازدواجی زندگی گزارنے کا حکم، ان کی ناگوار اور ناپسندیدہ باتوں سے درگزر کرو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور پہلو سے ان میں تمھارے لیے بھلائی رکھ چھوڑی ہو ۳۳۴
— عورت مرنے والے کی میراث نہیں بلکہ عدت گزارنے کے بعد آزاد ہے ۳۳۳-۳۳۴
— سوتیلی ماؤں سے نکاح کی ممانعت ۳۳۵

— نکاح ایک پختہ عہد ہے، اس کی حفاظت اور تحریم کا حکم ہے، اس کو توڑنے کے لیے بہانہ سازی کی ممانعت کی گئی ہے ۳۳۴-۳۳۵
— محرمات کی تفصیل جن سے نکاح نہیں ہو سکتا ۳۳۶ تا ۳۳۹
— سگے اور حقیقی رشتوں کے ساتھ رضاعی رشتوں کا حکم ایک جیسا ہے ۳۳۷
— اسلامی قانون سگے رشتوں کو منہ بولے رشتوں سے الگ رکھتا ہے اور منہ بولی اولاد کو سگی اور حقیقی اولاد کا مقام نہیں دیتا ۳۳۹
— ایسے افراد جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں انھیں مالک کی اجازت سے اس کی لونڈی سے نکاح کر لینے کا حکم، لیکن اگر وہ صبر سے کام لیں تو ان کے حق میں یقیناً بہتر ہے ۳۴۲-۳۴۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’ازدواجی زندگی‘‘)

بغاوت

— نظامِ اسلامی سے بغاوت کی سزا ۴۶۵
— خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے کا مفہوم ۴۶۵
— باغیوں کے لیے توبہ کی گنجائش ۴۶۵-۴۶۶
— فساد فی الارض پھیلانے والوں کے قتل کرنے کا حکم ۴۶۴

بین الاقوامی قانون

— بین الاقوامی معاہدات کا ضابطہ ۳۸۱
— اسلام عہد، وعدے اور معاہدے کا اس قدر پابند ہے کہ اگر کوئی واجب القتل آدمی کسی ایسی قوم میں پناہ لے لے جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو تو اس کی جان بخش دی جائے ۳۸۰ تا ۳۸۲

قانونِ جنگ

— جنگ کا حکم ۱۴۹-۳۸۶
— جنگ کا مقصد ۱۵۰-۲۹۰-۳۷۲
— جنگ کے حدود ۱۳۷-۱۵۱-۳۸۰-۳۸۴-۳۸۵
— قصر فی الصلوٰۃ کی اجازت ۳۸۸ تا ۳۹۰
— صلوٰۃ خوف ۳۹۰ تا ۳۹۲

چوری

— چوری کی سزا قطع ید ہے اور اس کی تفصیلات ۴۶۷-۴۶۸
— چوری کی سزا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات ۴۶۸

دستوری مسائل

— ایسے حکمران جو امانت دار ہوں اور ایمان داری سے فیصلہ کریں ۳۶۲-۳۶۳
— اسلامی حکومت کی دستوری بنیادیں ۳۶۳ تا ۳۶۵
— اللہ تعالیٰ حکمرانوں کو حکمت اور جن جن چیزوں میں چاہتا ہے علم دیتا ہے ۱۵۹
— اہل کتاب کا اللہ کی حکومت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۳۶۰
— ایسے حکمرانوں کی مذمت جن کو اگر اقتدار مل جائے تو اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ ان سے کچھ نہیں ہوتا ۱۵۹

قانونِ تعزیرات

— زنا کی ابتدائی سزا ۳۳۱-۳۳۲
— زنا کے لیے نصاب شہادت ۳۳۱
— محرمات سے زنا کا ارتکاب فوجداری جرم بھی ہے اور بے حیائی، ناپسندیدہ اور نہایت برا چلن ہے ۳۳۶
— منکوحہ لونڈیوں کے لیے زنا کی سزا ۳۴۲-۳۴۳
— رجم کی طرف ایک لطیف اشارہ ۳۴۳
— خاندانی عورت اور لونڈی کی سزا میں فرق مراتب ۳۴۲-۳۴۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’زنا‘‘)

سود

— سود فوجداری جرم ہے ۲۱۸
(مزید دیکھو ’’سود‘‘)

قانون شہادت

— شہادت کا قانون ۲۲۰-۲۲۱
— زنا کے لیے نصابِ شہادت ۲۳۱
— وصیت کے لیے نصاب شہادت ۲۲۰-۵۱۰
— گواہوں کا صاحب عدل ہونا ۵۱۰-۲۲۰
— شہادت کا ضابطہ ۵۱۱
— اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم قابل اعتماد افراد ہی گواہ ہو سکتے ہیں ۲۲۰
— وہ شخص سب سے بڑا ظالم ہے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ طرف سے گواہی ہو اور وہ اس کو چھپائے ۱۱۷-۱۱۸
— گواہی کے لیے بلائے جانے پر انکار نہیں کرنا چاہیے ۲۲۰
— عدل کا علم بردار رہنے کا حکم، خواہ اس کی زد ہماری ذات پر، والدین پر، یا رشتہ داروں پر پڑتی ہو ۴۰۵-۴۰۶
— گواہی سچی ہونی چاہیے، خواہ فریق معاملہ امیر ہو یا غریب ۴۰۵-۴۰۶
— گواہ اگر لگی لپٹی بات کر جائے اور سچ کو چھپا جائے تو یہ جان رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر فعل سے باخبر ہے ۴۰۶
— شہادت کے گواہوں کو پرکھنے کا طریقہ کہ جب ان سے خدا کی قسم لی جاتی ہے، یہی عمل طرفین کے گواہوں سے ہونا چاہیے ۵۱۰ تا ۵۱۲
— شہادت قائم کرنے میں آسانی اور شکوک وشبہات سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے چاہییں:
(۱) مدت معاہدہ کا تعین ضروری ہے، جو معاہدے کی بنیادی شرط ہے ۲۱۹-۲۲۰
(۲) معاہدہ چھوٹا ہو یا بڑا، معاہدے کی دستاویز لکھنے میں ہرگز تساہل نہیں کرنا چاہیے ۲۲۰
— وصیت پر شہادت اور گواہی کا التزام کرو ۵۱۰-۵۱۱

عدالت وقضا

— عدالتی فیصلے کا دارومدار ظاہری شہادتوں پر ہوگا ۱۴۸
— عدالت کی طرف سے پنچایت کے تقرر کا قانون ۳۵۱
— قضا کا اسلامی طریقہ ۳۹۴
— اسلامی عدالت کو یہودِ مدینہ کے مقدمات سننے یا نہ سننے کا اختیار دیا گیا ۴۷۱
— منصف اور قاضی کو حکم کہ صرف حق و انصاف کا فیصلہ کریں اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہرگز نہ کریں ۴۷۶-۴۷۷

قتل انسان اور قتل اولاد

— ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کا قتل جائز نہیں ہے ۳۸۲
— قتل عمد اور قتل خطا کے الگ الگ احکام اور ان کے لیے الگ الگ ادائیگی کفارہ کا طریقہ بتایا گیا ہے ۳۸۲-۳۸۳
— قتل انسانی کی دو جائز وجوہ: (۱) قتل بدل اور (۲) فساد فی الارض کرنے والا ۴۶۴
— ایک انسان کی جان بچانے والے نے گویا پوری انسانیت کی جان بچالی اور ایک انسان کو قتل کرنے والے نے گویا پوری انسانیت کو قتل کر دیا ۴۶۴
— جو لوگ ایمان لائے ان کے لیے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ۱۳۷
— قتل تک کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے ۱۳۸-۱۳۹
— جس نے دارالاسلام میں مسلمان بھائی کا قتل عمد کر ڈالا اس کی سزا ہمیشگی کی جہنم، اللہ تعالیٰ کی لعنت، غضب اور سخت عذاب ہے ۳۸۴
— قاتل مقتول کے گناہوں کو بھی سمیٹ لیتا ہے اور سراسر نقصان میں رہنے والا ہے ۴۶۲
— قتل انسانی میں اصل رکاوٹ اللہ رب العالمین کا خوف اور ڈر ہے ۴۶۲
— انسان جان و جسم کو اللہ تعالیٰ نے محترم ٹھیرایا ہے، اس کو ختم کرنے کی قرآن وحدیث میں صرف پانچ صورتیں بیان کی گئی ہیں ۵۹۹-۶۰۰
— اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے ہرگز قتل نہ کرو ۵۹۸

— معاشرے میں قتلِ اولاد کی مختلف صورتیں، مشرکین کے معبودوں نے یہ ہولناک کام ان کے لیے آسان کر دیا حالانکہ ان کے لیے اس میں سراسر ہلاکت ہے ۵۸۵-۵۸۸
— قتل انسانی کے لیے قصاص کا قانون ۱۳۸-۱۳۹
— دیت (خون بہا) کا قاعدہ ۱۳۸
— مومن کی جان کی حرمت ۳۸۲
— مومن کو سہواً قتل کرنے کا کفارہ اور خون بہا کی مقدار ۳۸۲-۳۸۳
— تورات کا قانون قصاص ۴۷۴
(مزید دیکھو ”قصاص“)

قرض و رہن

— اس کے احکام ۲۱۹ تا ۲۲۲
— تقسیم وراثت سے پہلے ادائے قرض کا حکم ۳۲۷ تا ۳۲۹
— دیوالیہ کا قانون ۲۱۸
(مزید دیکھو ”قانونِ شہادت“)

وراثت

— پانچ بنیادی احکام وراثت ۳۲۴
— قانون وراثت کی دینی اہمیت ۳۳۰
— شرعی ورثا کے حصوں میں وصیت کے ذریعے سے کمی بیشی نہیں کی جاسکتی ۱۴۰
— حق وراثت بر بنائے قرابت ۳۲۴
— وراثت پورے ترکے میں جاری ہوگی ۳۲۴
— وراثت میں مرد کے ساتھ عورت بھی حق دار ہے ۳۲۴
— اولاد کے حصص ۳۲۵
— والدین کے حصص ۳۲۶
— مرد کا حصہ عورت سے دوگنا کیوں ہے؟ ۳۲۵-۳۲۶
— تقسیم میراث اور وصیت و قرض ۳۲۷ تا ۳۲۹
— بیوی کے ترکے میں شوہر کا حصہ ۳۲۸
— شوہر کے ترکے میں بیوی کا حصہ ۳۲۸
— مروجہ ”وفات ٹیکس“ قانون اسلامی کی روشنی میں ۳۳۱
— منہ بولے رشتوں کو قانونِ وراثت تسلیم نہیں کرتا ۳۲۸
— کلالہ کی تعریف ۴۳۱
— کلالہ کا حصہ میراث مختلف صورتوں میں ۳۲۹-۴۳۱-۴۳۲
— حضرت عمر فاروقؓ کا کلالہ کے بارے میں تردد ۴۳۱
— تقسیم میراث کے وقت اگر غریب و مسکین رشتہ دار آجائیں تو انھیں ضرور کچھ دینا چاہیے ۳۲۵
— صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بہر حال میّت کے والدین میں سے ہر ایک $\frac{1}{6}$ حصے کا حق دار ہوگا ۳۲۶-۳۲۷
— اگر صرف ماں باپ وارث ہوں تو ماں کو $\frac{1}{3}$ اور باپ کو $\frac{2}{3}$ حصہ ملے گا ۳۲۷
— بہن بھائیوں کا حصہ بھی میراث میں مقرر کیا گیا ہے ۳۲۶-۳۲۷
— وصیت کرنا کیوں ضروری ہے؟ ۳۲۷
— قرض وصیت پر بہر حال مقدم ہے ۳۲۷
— وصیت کرنے والا اگر زیادتی کرتا ہے تو اس کی اصلاح کا طریقہ موجود ہے ۳۲۸-۳۲۹
— بے اولاد شخص کے ذکر میں ضرر آمیز وصیت کا خاص ذکر کیوں کیا گیا ہے اور وصیت کی ضرر رسانی کیا ہے؟ ۳۲۹-۳۳۰
— قانونِ وراثت کی خلاف ورزی کرنے والے جان رکھیں کہ یہ حصے علم رکھنے والی نرم خو ہستی نے بنائے ہیں جو انسان کے لیے سہولت پیدا کرنا چاہتا ہے ۳۳۰
— اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنے والا ہمیشگی کے ذلت و عذاب کا حق دار ہوگا ۳۳۰-۳۳۱

وصیت

— منہ بولا رشتہ دار، دوست اور عہد و پیمان انسان کو حق

وراثت نہیں دلا سکتے، ہاں ان کے حق میں کل تر کے کے ⅓ تک وصیت کی جا سکتی ہے ۳۴۷-۳۴۸
— وصیت پر گواہی اور شہادت کا التزام کرنا چاہیے ۵۱۰-۵۱۱
— قانون وراثت سے پہلے وصیت کا حکم دیا گیا تھا ۱۳۹
— قانون وراثت کے نزول کے بعد وصیت کے حدود متعین ہو گئے ۱۴۰-۳۲۷
— تقسیم میراث اور وصیت ۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹

(۲۳۷) قانونِ مکافاتِ عمل

— نافرمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ رزق دنیا فراوانی سے دیتا ہے، لیکن آخر کار عذاب جہنم جیسا بدترین ٹھکانا بھی ان کا مقدر ہے ۱۱۱
— قانونِ مکافاتِ عمل دنیا میں بھی روبعمل ہے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچانے والا کوئی مددگار نہیں مل سکتا ۲۵۹
— نیک لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ اجر و ثواب ہے ۲۹۳
— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر چلنے والوں کو ہر ضرر سے محفوظ رکھتا ہے اور ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیتا ہے، اور اپنی راہ پر چلنے والوں کو اجر وثواب بھی عطا کرتا ہے ۳۰۳-۳۰۴
— قانونِ مکافاتِ عمل کی زد میں آنے والوں کے لیے دنیا میں تو رسوائی ہے ہی، ان کے لیے آخرت میں بھی بڑی سزا ہے ۴۶۵

(۲۳۸) قبلہ

— کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی طرف ہے ۱۱۹
— تحویل قبلہ اور انقلاب امامت ۱۱۹
— تحویل قبلہ میں آزمائش ۱۲۰
— تحویل قبلہ کا اصل حکم ۱۲۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحویل قبلہ کا آرزومند ہونا ۱۲۱
— تحویل قبلہ کی تعمیل دوران نماز میں کس طرح کی گئی؟ ۱۲۱-۱۲۲
— قبلہ بننے کے لیے کعبہ کی اولیت ۲۷۴
— مشرق و مغرب سب اللہ تعالیٰ کے ہیں، جس طرف بھی رخ کرو گے اللہ تعالیٰ کا رخ اسی طرف ہے ۱۰۵
— بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب رسالت کی وجہ سے قبلہ تھا لیکن جب امامت بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تو دونوں گروہوں کے امام حضرت ابراہیم کے تعمیر کردہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰

(۲۳۹) قتل، قتل اولاد، قتل انسانی

— دیکھو ''قانون اسلام، قتل، قتل اولاد اور قتل انسانی''

(۲۴۰) قتال فی سبیل اللہ

— اس کا اوّلین حکم ۱۴۹
— اس کے مقاصد ۱۵۰-۱۵۱-۲۹۰-۳۷۲
— اس کے حدود ۱۵۱-۱۵۲-۳۸۰-۳۸۴-۳۸۵
— یہ لازمۂ ایمان ہے ۳۷۳
— بڑی بڑی باتیں بنانے والے نکمے ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳
— حکم جہاد پر منافقین کا ذہنی ردِعمل ۳۷۴
— حکم قتال میں مخفی خیر ۱۶۴
— قتال کے مقابلے میں جہاد کا وسیع مفہوم ۱۶۶-۴۶۶
— بنی اسرائیل کا اس سے جی چرانا اور اس کے نتائج ۱۸۴-۴۵۹
— اللہ کی راہ میں لڑنے اور کفر کے لیے لڑنے میں فرق ۲۳۶
— اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے کا اجر ۳۷۲-۳۸۵
— قتال فی سبیل اللہ میں صبر و استقامت کی اہمیت ۲۹۳
— خون کا بدلہ خون، وہی کیا جائے جو اس نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا ۱۳۷
— مقابلے کے لیے تیار رہنے کا حکم ۳۷۱
— یہ ان لوگوں کا کام ہے جو آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو فروخت کر دیں ۳۷۲
— نفیر عام اور فرض کفایہ کا فرق ۳۸۶
— قصر فی الصلوٰۃ کی اجازت ۳۳۸ تا ۳۹۰

— صلوٰۃ خوف ۳۹۰ تا ۳۹۲

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''جنگ جہاد فی سبیل اللہ'')

(۲۴۱) قرآن مجید

— ایمان بالقرآن ۵۰-۵۱

— قرآن کے لفظی ترجمے کے نقائص ۷ تا ۱۱

— قرآن کا اسلوب بیان ۷-۸-۹-۱۴-۲۰-۲۳-۱۱۴-۲۳۴-۲۸۴-۳۳۲

— قرآن انسان کی عقل وفکر سے اپیل کرتا ہے ۱۳۰-۱۳۹-۲۰۶-۳۱۰-۳۱۱-۵۰۷-۵۴۲-۵۶۶

— اس میں بظاہر بے ربطی محسوس ہونے کی وجہ ۹-۱۴-۱۵

— قرآن کو سمجھنے کے لیے تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے کی اہمیت ۹

— سورتوں کا نزول کن حالات میں ہوتا ہے؟ ۹-۱۲۰

— قرآن کی مخصوص اصطلاحی زبان ہے، لفظی تراجم میں اس کا لحاظ رکھنا ہرگز ممکن نہیں ہے ۱۰

— قرآن کا عام کتابوں سے فرق اور امتیاز ۱۳-۱۴-۲۰-۲۵

— اس کو سمجھنے میں عام لوگوں کو کس قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں اور ان کی وجوہ ۱۴-۱۵-۱۶

— اس کی آیات میں مصنوعی ربط بنانے کی غلطی ۱۴

— اس کی آیات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے دیکھنے کا نقصان ۱۴

— قرآن کو سمجھنے کے لیے کن چیزوں کا جان لینا ضروری ہے؟ ۱۶-۲۰

— قرآن حکیم کی تاثیر میں پاکیزہ تعلیمات اور عالی قدر مضامین کے علاوہ قرآنی ادب کا بڑا حصہ ہے ۷

— قرآن میں ہر قسم کے مسائل، دلائل، امتیازات و شواہد یکے بعد دیگرے بیان کیے گئے ہیں، بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں ہے ۱۳ تا ۱۶

— قرآن کا مابعد الطبیعی پس منظر ۱۶

— اس کا موضوع اور مرکزی مضمون اور مدعا ۱۹-۲۰

— اس کے نظم، ربط کلام اور کیفیت نزول کی تشریح ۲۰-۵۲۰

— دعوتِ اسلامی مختلف مراحل میں نازل شدہ سورتوں کی الگ الگ خصوصیات ہیں ۲۰

— قرآن کے اسلوب بیان کی خصوصیات ۲۱-۲۴ تا ۲۶-۵۶۴

— قرآن کے مضامین میں وقتی اور مقامی رنگ اس قدر نمایاں کیوں ہے اور یہ چیزیں اس کے دائمی اور عالمگیر ہدایت ہونے پر قادح نہیں ہیں ۲۱-۳۵ تا ۳۷

— مکی سورتوں کا پس منظر اور ان کی خصوصیات ۲۱ تا ۲۴-۵۲۱

— مدنی سورتوں کا پس منظر اور ان کی خصوصیات ۲۴-۲۵-۵۲۱

— مکی سورتوں کی تقسیم بلحاظ زمانہ ۵۲۱-۵۲۲

— قرآن مجید میں مضامین کی تکرار کیوں ہے؟ ۲۶

— قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف کیوں ہے؟ ۲۶ تا ۲۸

— موجودہ ترتیب کس کی دی ہوئی ہے اور کب دی گئی؟ ۲۶ تا ۲۸

— قرآن میں مختلف الاوقات نازل ہونے والی آیات کی ترتیب کا اصول اور آیات اور سورتوں کی ترتیب اور ناموں کی حکمت ۴۳۱-۴۳۴

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کی کتابت ۲۸

— اس کو حفظ کرنے کا طریقہ ابتدا سے رائج ہو گیا تھا ۲۸

— قرآن مجید میں تحریف کیوں ناممکن ہے؟ ۲۸

— قرآن حکیم کے ''سات حروف'' پر نازل ہونے کا مطلب ۲۹

— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کن کن لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا بصورت تحریر موجود تھے ۲۹-۳۰

— قرآن کے تحریری مجموعے کی ضرورت کا احساس کب اور کیونکر ہوا اور پہلا مستند نسخہ کس طرح تیار کیا

گیا؟ ۲۹-۳۰
— اس کے مطالعے کا درست طریقہ تحقیقی مطالعہ ہے ۳۱ تا ۳۴
— اس کی روح کو پالینا اس کے منشا کے مطابق کام کیے بغیر ممکن نہیں ہے ۳۳
— ’’سلوک قرآنی‘‘ ۳۴
— اس کے عالمگیر اور ابدی ہدایت ہونے کے دلائل ۳۵
— قرآن مجید کے مفصل ہدایت نامہ ہونے کا مطلب ۳۶
— سنت کے ساتھ اس کا تعلق ۳۶-۳۷
— قرآن مجید تفرقہ و اختلاف سے منع کرتا ہے ۳۷-۳۸
— قرآن میں مکی اور مدنی ادوار کا فرق نہایت واضح ہے ۴۷
— قرآن کے مطابق جائز اور ناجائز اختلاف کے حدود ۳۷
— سب سے پہلی مکمل سورت ۴۲
— نزول وحی کی ابتدا کن آیات سے ہوئی؟ ۴۲
— سورتوں کے نام اور ان کی خصوصیات ۴۶-۴۹-۲۳۰
— قرآن مجید کے نزول کی ابتدا ۱۴۲
— اس کی آیات کی دو بڑی قسمیں: محکمات اور متشابہات ۲۳۴-۲۳۵
— قرآن میں تفسیری اختلافات ۳۸
— قرآن کی ہر سورت ایک تقریر ہے جو دعوت اسلامی کے ہر ہر مرحلے پر حالات اور تقاضوں کے مطابق نازل ہوئی ۹-۱۰
— خیر و برکت والی کتاب ہے ۵۶۳-۶۰۲
— قرآن مجید میں تصریف کلام کا اسلوب ۵۶۹
— قرآن مجید کے بیان میں تفصیل کا ہونا ۵۷۵
— قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے ۸-۹
— قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس حقیقت پر چار باتوں کی شہادت ہے ۵۶۳-۵۶۴
— قرآن کا تاریخ انسانی سے استدلال ۱۰۶-۱۶۲-۲۸۹-۴۲۳-۴۲۴
— قرآن کے مخاطب تمام انسان ہیں ۵۰-۳۱۹-۵۶۲
— قرآن تمام انسانوں کی راہ نمائی کے لیے آیا ہے ۱۲۸-۲۳۱
— قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کو الگ الگ کرنے والی ہیں ۱۴۲
— قرآن ہمارے لیے ایک نصیحت ہے ۱۴۳
— قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ۵۷-۵۸-۲۳۵
— قرآن کو کلام الٰہی ماننے یا نہ ماننے کے اخروی نتائج ۵۸
— قرآن مجید پر مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۵۹-۱۰۱-۱۴۵-۵۶۹
— کس قسم کے لوگ قرآن سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں اور کون گمراہی اخذ کرتے ہیں؟ ۵۰-۵۹-۲۳۴-۲۳۵
— نوعِ انسانی کو قرآن مجید کی کیا دعوت ہے؟ ۵۷-۶۲
— قرآن کی دعوت وہی ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی تھی ۷۰-۲۳۲-۴۸۷-۴۸۸
— تمام پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۷۲-۹۳-۹۴-۹۶-۲۳۱-۳۵۸-۴۷۶-۵۶۳
— پچھلی کتابوں (تورات اور انجیل) کی تصدیق قرآن کن معنوں میں کرتا ہے؟ ۲۳۱-۲۳۲
— تنسیخ الآیہ سے مراد پچھلی کتابوں کے احکام ہیں، قرآن مجید کی کسی آیت کی تنسیخ نہیں کی گئی ۱۰۱-۱۰۲
— قرآن مجید ہی حق ہے کہ یہ اس خداوند ہستی کی طرف سے نازل شدہ ہے جو علیم و دانا ہے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت حق کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی ۲۳۳
— قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت کہ اس میں کوئی اختلاف اور تضاد بیانی نہیں ہے ۳۷۶-۳۷۷

— قرآن مجید حق کے ساتھ نازل کیا گیا، تاکہ اس کے احکام کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کیا جائے ۳۹۲ تا ۳۹۴
— قرآن حکیم کی حقانیت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا علم ہے ۴۲۶
— قرآن مجید کے منزل من اللہ (جو علیم ہے) ہونے پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی ہے ۴۲۶
— قرآن اور دیگر کتب کے بیان میں فرق اور اختلاف ۸۵-۸۶-۴۵۱-۵۶۰
— قرآن کا بتایا ہوا صراطِ مستقیم اور سواء السبیل ۴۵۲ تا ۴۵۴
— اسلام ایک نور ہے جو حق تعالیٰ نے کتاب (قرآن) اور نبوت (رسولؐ اللہ) کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کے راستے کی طرف راہ نمائی کے لیے پسند کیا ہے ۴۵۶
— تورات ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کی گئی اور انبیائے کرام اور علما و قضاۃ اس کے احکام کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
— قرآن اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی کو چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کرتا ہے اور کبھی چشم پوشی بھی کر جاتا ہے ۴۵۵-۴۵۶
— قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور محافظ و نگہبان ہے ۴۷۶-۴۷۷
— قرآن حکیم نے اکثر اہل کتاب کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دیا ۴۸۸
— قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذریعے سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بن کر رہے گا وہ خود نقصان اٹھائے گا، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا پاسبان نہیں ہے ۵۶۸-۵۶۹
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریلؑ کے ذریعے سے آیا تھا ۹۶
— قرآن مجید کی صفات ۹۶-۹۷-۱۴۲
— اس کے نسخ کا مطلب ۱۰۱
— اس کی اصولی تعلیمات ۱۱۴
— قرآن مجید قانون بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی احساسات کو بھی ابھارتا ہے ۱۳۸-۴۰۵
— قرآن مجید حق لے کر آیا ہے ۲۳۱-۳۹۳-۴۷۶-۵۷۵
— قرآن مجید حق و باطل کی کسوٹی ہے ۲۳۳
— قرآن حکیم سے ہدایت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ ۲۳۵
— قرآن مجید اہل ایمان کے لیے معیار فیصلہ اور سرچشمہ قانون ہے ۳۶۶-۳۹۳-۳۹۴-۴۷۶
— قرآن مجید محض کتاب آئین نہیں بلکہ کتاب ہدایت بھی ہے ۳۶۶
— کتاب مبین ہے اور تضادات سے مکمل پاک ہے ۳۷۶-۴۲۰
— قرآن مجید کا نظریۂ حلت و حرمت ۴۴۴
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن دلیل ۴۳۱-۶۰۳
— اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لانے والی کتاب ۴۵۶
— قرآن مجید سلامتی کے طریقے بتاتا ہے ۴۵۶
— انبیائے کرام کے بارے میں قرآن مجید کی اہم تصریح ۴۲۵-۴۷۵
— آسمانی کتب پر اس کے ''مہیمن'' ہونے کا مطلب ۴۷۷
— قرآن مجید بیک وقت نصیحت اور تنبیہ کا ذریعہ ہے ۵۵۰
— قرآن کے اوّلین مخاطبین ۵۶۳
— قرآن کو ماننے کے لیے ایمان بالآخرۃ ضروری ہے ۵۶۴
— قرآن مجید اپنے مخاطبین کے لیے آزمائش بن گیا ہے ۵۶۹
— قرآن مجید کے ذریعے سے لوگوں پر اتمام حجت ۶۰۲
— قرآن کے مطالعے کے لیے انسان کا ہر قسم کے تصورات و نظریات سے بالکل خالی الذہن ہونا

ضروری ہے۳۱
— قرآن مجید کے مفصل ہدایت نامہ اور کتاب آئین ہونے سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ۳۷-۳۸
— قرآن مجید کے ساتھ بعثت نبویؐ کا اہم تعلق ۳۷-۳۸
— قرآن حکیم سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟ ۵۰-۵۱
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت جاری تحریک اسلامی کی راہ نمائی کے لیے نازل کیا گیا۲۱ تا ۲۶
— قرآن مجید کے نزول کے بعد ہدایت کی غیر موجودگی کا بہانہ بے کار ہو گیا۶۰۲-۶۰۳
— قرآن کے طرز بیان، ترتیب اور مضامین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وقت اور کیفیت نزول کو بھی سمجھ لیا جائے۲۰ تا ۲۸
— قرآن حکیم نے عالم گیر صداقتیں بیان کرتے ہوئے دلائل، شواہد اور مثالیں مقامی ماحول سے لی ہیں تاکہ اولین مخاطب مطمئن ہوں ۲۱
— مکہ کے ابتلا و آزمائش کے دور میں قرآن کا ایک مخصوص طرز بیان رہا۲۲-۲۳
— قرآن حکیم نے دعوتِ اسلامی کے ہر مرحلے کے لیے الگ طرز بیان کے ساتھ ہدایات و فرامین دیے ۲۱ تا ۲۵
— چند اہم بنیادی مضامین کی تکرار کے علاوہ چند وقتی بیانات تحریک اسلامی کے خاص ادوار ہی تک محدود ہیں ۲۶
— قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۲۰-۳۰
— شروع میں اس بات کی اجازت دی گئی کہ عرب اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق پڑھ لیا کریں لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے اس رعایت کو ختم کر دیا۳۰
— یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے ٹھیک وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۲۹ تا ۳۱
— قرآن ایک دعوت اور تحریک ہے، قرآن فہمی کی تمام تدبیروں کے باوجود قرآن کی روح سے آشنائی نہیں ہو سکتی جب تک انسان وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن نازل کیا گیا۳۳-۳۴
— کیا قرآن صرف عربوں کے لیے آیا تھا؟ ۳۵ تا ۳۷
— قرآن جزئیات کی نہیں بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے ۳۷
— قرآن سے فیض لینے کے امیدوار کے لیے سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے۴۲
— قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر شک کرنے والوں کو فہمائش کہ اس کی سورتوں کے مانند ایک سورت ہی بنا لاؤ ۵۷-۵۸
— قرآن مجید کے فرامین سے انکار کا نتیجہ ۲۳۳
— قرآن مجید مجرمین کی روش کو نمایاں کرتا ہے ۵۴۵
— قرآن کی تفسیر میں اختلافات کی نوعیت ۳۸-۳۹
— قرآن اکثر لوگوں کی سرکشی اور باطل پرستی میں اضافے کا باعث بن جاتا ہے ۴۸۵
— قرآن مجید میں حقیقت کی نشانیاں واضح کر دی گئی ہیں لیکن لوگ پھر بھی الٹے پھرے جاتے ہیں۴۹۰-۴۹۱
— تلاوت قرآن مجید سے انسان پر طاری ہونے والی کیفیت کا بیان ۴۹۷
— اللہ تعالیٰ کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن ان کی طرف اللہ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۵۲۸-۵۲۹
— قرآن کی دعوت کے اصل مخاطب وہ متقی ہیں جو خوف آخرت رکھتے ہوں اور وہی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۵۴۳
— کچھ لوگ مقصد و مدعا پر غور و فکر کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کی حکمت و نصیحت سے فیض اٹھاتے ہیں، جب کہ کچھ لوگوں پر مخالفانہ تعصب کا دورہ پڑتا ہے ۵۶۹
— قرآن حکیم رب اعلیٰ کی طرف سے ایک روشن

دلیل، ہدایت اور رحمت بن کر آیا، اس سے منہ موڑنے والا سب سے بڑا ظالم ہے اور وہ بدترین عذاب اور سزا پا کر رہے گا ۶۰۳

(۲۴۲) قرآن کی اخلاقی تعلیمات

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''اخلاق، اخلاقی تعلیمات'')

(۲۴۳) قرآن کی سیاسی تعلیمات

(مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی ریاست''، ''اسلام کی سیاسی تعلیمات'')

(۲۴۴) قرآن کی معاشرتی تعلیمات

(مکمل تفصیلات کے لیے دیکھو ''اسلامی معاشرہ'' اور ''اسلام کی معاشرتی تعلیمات'')

(۲۴۵) قرآنی اصطلاحات

— فاتحہ ۴۲
— رب ۴۴
— استعانت ۴۵
— عبادت بمعنی پرستش، اطاعت اور بندگی ۴۴-۴۵
— تقویٰ، متقی ۵۰
— اقامت صلوٰۃ ۵۰
— فسق ۶۰-۱۹۶
— ابلیس ۶۵
— ''کفر'' ایک قرآنی اصطلاح ہے لیکن قرآن میں اس کو کئی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۱۰-۵۶-۵۷-۶۵-۱۲۹-۱۳۰-۴۰۷-
— توبہ ۶۷
— واسع ۲۶۵
— ظلم ۶۶-۶۷
— اگر تمھیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دشواری ہو تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے ۷۳-۷۴
— انسان اگر بھلائی کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— ''معروف'' کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے ۱۳۹
— ''احسان'' قرآن کی اہم اصطلاح ہے ۱۹۳-۴۱۲
— حکمت ۲۰۷
— طاغوت ۱۹۶-۱۹۷
— کسب ۱۱۴
— دین ۱۹۶
— نور ۱۹۷
— ظلمات ۱۹۷
— نذر ۲۰۸
— ثواب ۲۹۲
— شکر ۲۹۲
— توبہ ۳۳۳
— جنت ۳۵۹
— صدیق ۳۷۰
— صالح ۳۷۰
— ایمان کا دورخی مفہوم کیا ہے؟ ۴۰۷
— عزت ۴۰۸
— شکر ۴۱۲
— شاکر (قدردان) ۴۱۲
— کلالہ (اختلاف) ۴۳۱
— انعام ۴۳۷
— شعار ۴۳۸
— نصب ۴۴۱
— نصاریٰ ۴۵۵
— اسلام کی ضد (الٹ) جاہلیت ہے ۴۷۹
— ظلمات اور نور قرآن کی اہم اصطلاحات ہیں ۵۲۳
— فواحش کھلی اور چھپی ہوئیں ۵۹۸-۵۹۹

(۲۴۶) قرآنی تمثیلات

— منافقین کے دو گروہوں کی تمثیل ۵۵-۵۶
— ہدایت سے بے نیاز لوگوں کے لیے جانوروں اور چرواہے کی مثال ۱۳۳

— انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بیج اور بالوں اور دانوں کی مثال ۲۰۳
— ریاکارانہ انفاق کی مثال ۲۰۴
— مخلصانہ انفاق کی مثال ۲۰۵
— حبط اعمال کی تمثیل ۲۰۶-۲۸۱
— اہل شرک کے لیے صحرا میں بھٹکنے کی مثال ۵۵۰
— چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثال پر مخالفین کا اعتراض اور اس کا جواب ۵۹-۶۰-۵۶۹
— ’’موت‘‘ سے مراد جہالت اور بے شعوری کی زندگی ہے ۵۸۷
— ’’زندگی‘‘ سے مراد نیکی و بدی کے شعور کی حالت ہے ۵۷۸
— ’’روشنی‘‘ اور ’’تاریکی‘‘ سے ’’علم‘‘ اور ’’جہالت‘‘ کا مفہوم مراد ہے ۵۷۸
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مثال ۵۵
— طالبانِ حق امثال القرآن کے ذریعے سے حق پا لیتے ہیں لیکن منکرین حق کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۵۹
— بنی اسرائیل کے دلوں کی سختی کی مثال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات دیکھ کر ان کے دل پتھر کے پتھر ہی رہے ۸۶
— بنی اسرائیل کے رویوں میں حضرت آدمؑ کے قاتل و مقتول بیٹوں کے ساتھ مماثلث ۴۶۳
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’امثال القرآن‘‘)

(۲۴۷) قرآنی قصے

— قصہ آدمؑ و ابلیس ۶۱ تا ۶۹-۲۴۶-۴۶۱-۴۶۲
— قصہ بنی اسرائیل ۷۰ تا ۱۱۰-۱۸۵ تا ۱۹۱-۲۵۲ تا ۲۵۸-۴۵۱-۴۶۱ تا ۴۶۴-۴۸۹ تا ۴۹۸
— حضرت سلیمان علیہ السلام ۹۷-۹۸-۵۶۰
— حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ۷۵ تا ۹۵-۲۷۰-۵۶۰
— حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۱۰ تا ۱۱۵-۱۹۷ تا ۲۰۰-۲۴۶-۲۶۲-۲۶۳-۲۷۰-۵۵۲ تا ۵۶۱
— حضرت نوح علیہ السلام ۲۴۶-۵۶۰
— حضرت مریم علیہا السلام ۲۴۶ تا ۲۵۲- ۴۱۷- ۴۷۴
— حضرت زکریا علیہ السلام ۲۴۹-۵۶۰
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۲۵۱ تا ۵۲۸--۲۷۰-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۸ تا ۴۳۰-۴۵۶-۴۷۴-۵۱۴ تا ۵۱۸-۵۶۰
— حضرت اسماعیل علیہ السلام ۱۱۲--۲۷۰-۵۶۱
— حضرت اسحاق علیہ السلام ۲۷۰-۵۶۰
— حضرت یعقوب علیہ السلام ۲۷۰-۵۶۰
— حضرت داود علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت ایوب علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت یوسف علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت ہارون علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت الیاس علیہ السلام ۵۶۰
— حضرت الیسع علیہ السلام ۵۶۱
— حضرت یونس علیہ السلام ۵۶۱
— حضرت لوط علیہ السلام ۵۶۱

(۲۴۸) قربانی

— اس کے اپنی جگہ پہنچنے کا مفہوم ۱۵۳
— حاجی حضرات قربانی سے پہلے بال نہ ترشوائیں ۱۵۳
— قربانی میسر نہ ہونے کی صورت میں حاجی روزے رکھے ۱۵۴
— وہ قربانی جسے آسمانی آگ کھا جائے ۳۰۷-۳۰۸
— قربانی کے جانور پر دست درازی نہ کی جائے ۴۳۸
— آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کی قربانی کا واقعہ ۴۶۱

(۲۴۹) قرض

— مقروض سے فیاضانہ معاملے کی تلقین ۲۱۹
— دیوالیہ کا قانون ۲۱۹
— قرض کے لین دین کے لیے دستاویز لکھنے کی اہمیت ۲۱۹
— مدت کا تعین ضروری ہے ۲۱۹
— روز مرہ کے لین دین میں دستاویز کی ضرورت نہیں ہے ۲۲۱

— دستاویز کے بجائے رہن ۲۲۱
— رہن میں سود کی صورت ۲۲۲
— متوفی کے ترکے میں سے قرض کی ادائیگی ۳۲۷-۳۲۸

(۲۵۰) قرعہ اندازی
— مشرکانہ فال گیری ۴۴۲
— قرعہ اندازی کی جائز صورت ۴۴۲-۴۴۳

(۲۵۱) قریش
— ان کے مذہبی اور اخلاقی جرائم ۱۰۴-۱۱۱-۱۵۷-۱۶۵
— مسلمانوں پر ان کی زیادتیاں ۱۰۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا یہ اعتراض کہ ادنیٰ اور کمزور افراد آپ کی دعوت قبول کر رہے ہیں ۵۴۳
— حضرت ابراہیم پر قریش کا بے جا فخر و ناز ۵۵۳
— قریش کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ گئی ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے بلکہ سخت سزا اور عذاب کے مستحق ہیں ۵۲
— جاہلیت کا عرب کیسا تھا؟ ۱۳۸
— مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور قریش کفر و طاغوت کی راہ میں لڑ رہے تھے، قریش کا انجام بد اہل عقل کے لیے نشانی ہے ۲۳۶
— قریش دو گنے ہونے کے باوجود مغلوب ہوئے، اللہ تعالیٰ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مغلوب کرتا ہے ۲۳۷
— قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو عمرے کی اجازت دینے سے انکار اور صلح حدیبیہ ۴۳۴
— قریش کا رسولؐ اللہ پر اعتراض کہ تم قرآن کہیں سے پڑھ اور سیکھ کر آئے ہو ۵۶۹

(۲۵۲) قسم
— قسم توڑنے پر احکام ۱۷۱
— مہمل اور بے معنی قسموں پر کوئی گرفت نہیں لیکن جان بوجھ کر کھائی گئی قسموں پر کفارہ لازم ہے ۴۹۹-۵۵۰
— زیادہ قسمیں کھانا منافقت کی علامت ہے ۳۶۷-۳۶۸
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''کفارات'')

(۲۵۳) قسمت
— قسمت کا حال پانسوں کے ذریعے سے معلوم کرنا حرام ہے، اس حکم میں لاٹری وغیرہ بھی شامل ہیں ۴۴۱-۴۴۲

(۲۵۴) قصاص
— اس کا حکم تورات میں یہودیوں پر بھی نازل کیا گیا ۴۷۴
— جو لوگ ایمان لائے ان کے لیے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے ۱۳۷
— اس کے معانی ۱۳۷
— اس کا جاہلی تصور ۱۳۸
— قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے ۱۳۹
(مزید دیکھو ''قانون اسلام'')

(۲۵۵) قصر
— نماز کے اختصار یعنی قصر کا حکم، زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ کے لیے الگ الگ احکام ۳۸۸ تا ۳۹۰
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''نماز'')

(۲۵۶) قومیت
— اسلام جاہلیت کے تعصبات کی بیخ کنی کرتا ہے ۱۲۰

(۲۵۷) قیاس آرائی
— علم کے بجائے محض گناہ اور قیاس آرائی پر چلنے میں گمراہی ہے ۵۹۵

(۲۵۸) قیامت
— اختلافات کے فیصلے کا دن ۱۰۴

— پورے پورے اجر پانے کا دن ۳۰۸
— سارے انسانوں کو جمع کیا جائے گا ۳۷۸-۵۲۷-۵۸۰
— قیامت کے روز مجرموں کی طرف سے کوئی وکالت نہ کر سکے گا ۳۹۵
— مسلمانوں اور منافقین کے درمیان قیامت ہی کو فیصلہ ہوگا ۴۰۹
— قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اہل کتاب پر گواہی دینا ۴۲۱
— اہل کفر کو قیامت کے دن کوئی فدیہ سزا سے بچا نہ سکے گا ۴۷-۱۰۸-۴۶۷
— قیامت ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے ۵۲۷
— قیامت بڑا خوفناک دن ہے ۵۲۸
— جس دن اللہ تعالیٰ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا ۵۵۱-۵۵۲
— صورِ قیامت پھونکنے کا مفہوم ۵۵۲
— نظامِ کائنات کا درہم برہم ہو کر از سرِ نو قائم ہونا ۵۵۲
— قیامت کا واقع ہونا قطعی ہے ۵۸۳
— وقتِ قیامت اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے ۵۲۳
— روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کا شیاطین جنوں سے خطاب ۵۸۰-۵۸۱
— روزِ قیامت معبودان اور مجرمین اپنی گمراہی کا اقرار کریں گے اور باہمی اشتراک کا بھی اعتراف کریں گے ۵۸۰-۵۸۱
— روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ہی کو اختیار ہوگا کہ جسے چاہے معاف کر دے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ علم اور حکمت پر مبنی ہوگا ۵۸۱

(۲۵۹) کفر، کافر

— کفر بمعنی نافرمانی ۶۵
— کفر کے اصطلاحی معانی ۱۰-۱۲۹-۱۳۰-۴۰۷
— کفر بمعنی انکارِ حق ۵۶-۵۷
— کافروں کا انجام بد ۵۸
— کفار کی فرشتوں سے دشمنی ۹۷
— کافروں کے حامی و مددگار طاغوت ہیں ۱۹۷
— منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک ہی جگہ جمع کیا جائے گا ۴۰۸-۴۰۹
— اللہ تعالیٰ کے نام پر قانون بنانے والے اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور کافر ہیں ۵۰۹
— دعوتِ حق کے مخالفین کافروں کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں ۵۷۸-۵۷۹
— کفر کیوں خلافِ عقل و فطرت ہے؟ ۶۱
— آیاتِ الٰہی سے کفر کرنے کا مطلب ۸۰
— کتابِ الٰہی کے ایک حصے کو ماننا اور ایک سے انکار کر دینا صریح کفر ہے ۹۱
— کفر اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں ۴۹
— کافرانہ عقائد و اعمال کی تفصیل ۹۷
— کافرانہ رویے کی مختلف صورتیں ۱۲۹-۴۰۷-۴۱۳-۴۱۴
— ''کفر'' کے لفظ کا استعمال بمقابلہ ''شکر'' ۱۲۹
— اہل کفر کے لیے دنیوی زندگی بڑی دلچسپ بنا دی جاتی ہے ۱۶۱
— کفر و ایمان میں سمجھوتا نہیں ہو سکتا ۱۶۶
— کفر بندگی سے انحراف کا دوسرا مرتبہ ہے ۱۹۶
— ریاکاری پر کفر کا اطلاق ۲۰۵
— کفر کے اخروی انجام سے مال و اولاد نہیں بچا سکتے ۲۳۶-۲۸۱
— رسول کی اطاعت سے انکار کفر ہے ۲۴۵
— کفر کی روش کا انجام ۲۵۹
— کوئی نبی کفر کا حکم نہیں دے سکتا ۲۶۸
— کفر در کفر کا رویہ ۲۷۱
— حالتِ کفر میں جان دینے والوں کا انجام ۲۷۲-۳۳۳
— حقوق اللہ کی ادائیگی سے گریز کفر ہے ۲۷۵
— اہل کفر کی جلت پھرت دین حق کے مقابلے میں کچھ نہیں ۳۰۴-۳۱۳
— اہل کفر کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۳۰۵

— اہل کفر کو ڈھیل دینے کی غرض و غایت ۳۰۵

— کافر و مسلم کا اصولی فرق ۳۶۵

— طاغوت کی راہ میں لڑنا کفار کا کام ہے ۳۷۳

— نظام کفر کے تحت اہل ایمان کے زندگی بسر کرنے کی دو صورتیں ۳۸۷

— اسلام کے لیے بے حمیتی موجب کفر ہے ۴۰۸

— نصاریٰ کا کفر ۴۵۶-۴۸۹

— کفار کو آخرت کے عذاب سے کوئی فدیہ نہیں بچا سکتا ۴۶۷

— ''یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ'' کا مطلب ۴۶۹

— جو اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں ۴۷۴

— دین میں موشگافیوں کا نتیجہ کفر ہوتا ہے ۵۰۸

— اہل کفر کی ہٹ دھرمی ۵۲۵

— اہل کفر کے لیے ان کی گمراہی کا خوش نما بن جانا ۵۷۸

— رسول کی اطاعت سے انکار کفر ہے ۲۴۵

— اس روش کا انجام ۲۵۹

— کفر کا رویہ اختیار کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے اور ان کی تمام حرکتوں سے باخبر ہے ۶۱

— کفر کا رویہ اختیار کرنے والے اور کفر کی حالت میں جان دینے والے سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی ان پر لعنت ہے ۱۲۹

— اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی کفر ہے ۱۹۶

— کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کا مددگار اور حامی طاغوت ہے جو انھیں روشنیوں سے تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے ۱۹۷

— کفر بعدِ ایمان یعنی ارتداد اور پھر کفر میں بڑھتے ہی جانا، اللہ تعالیٰ ایسوں کا گناہ ہرگز معاف نہیں کرے گا ۴۰۷-۴۰۸

— ایمان اور کفر کے درمیان کوئی راہ نہیں ہے، جو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پکے کافر ہیں ۴۱۴

— کسی نبی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا کفر ہے ۴۱۴

— حق سے فرار اور حق سے نفرت کی ناپاکی کفار پر مسلط کر دی گئی ہے اور انھیں راہ ہدایت نظر نہیں آتی ہے ۵۷۹-۵۸۰

(۲۶۰) کائنات

— اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو برحق پیدا کیا ہے، محض تفریحاً پیدا نہیں کیا گیا ۵۵۱-۵۵۲

— کائنات کی تخلیق اور انتظام صرف حق پر مبنی ہے، یہاں عدل، حکمت اور راستی ہر چیز کی بنیاد ہے ۵۵۱-۵۵۲

— اللہ تعالیٰ کائنات کے تمام حالات سے باخبر ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۵۰۵-۵۰۶

— علمی طریق پر آثار کائنات کا مشاہدہ کرنے کا حکم ۵۶۶

— کائنات کی تخلیق اور اس کی ساخت و انتظام پر غور و فکر کرنے کی فہمائش ۳۱۰

— کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور ہرگز عبث، بے مقصد اور فضول نہیں ہے بلکہ عین بامقصد ہے، لیکن اس حقیقت کو اہل عقل، ہوش مند اور عقل و فکر استعمال کرنے والے ہی پا سکتے ہیں ۳۱۰-۳۱۱

— انسان ہوش مند ہو، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتا ہو اور غور و فکر کا مادّہ رکھتا ہو تو وہ حقیقت کو پا لیتا ہے ۳۱۰-۳۱۱

— اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کو دلائل سے قائل کرنا چاہتا ہے ۵۵۳

— توحید کے دلائل میں مظاہر کائنات کے ذریعے سے ثابت کیا گیا ہے کہ جب خالق و منتظم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو تو عقیدۂ شرک کی کیا بنیاد ہوئی ۵۶۵ تا ۵۶۷

— کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہے ۳۵۸

— کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے ۴۵۷

— کائنات کی تمام موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور

اسی کی طرف سب کو پلٹ کر جانا ہے، جو کائنات کی سلطنت کا واحد مالک ہے، جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۴۶۹-۴۵۸
— کائنات کی ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس نے رحم و کرم کو اپنا شیوہ بنا رکھا ہے، اس لیے نافرمانیوں اور سرکشیوں پر انسان کو فوراً نہیں پکڑتا۵۲۶-۵۲۷
— اللہ تعالیٰ کی کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی آیات کو جھٹلانے والے بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۵۳۷
— کائنات میں ہر طرف توحید کی نشانیاں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کرے اور جس کو چاہے ہدایت نہ دے۵۳۷-۵۳۸
— رات اور دن، چاند اور سورج کا طلوع و غروب کا حساب مقرر ہے اور یہ سب خدائے عزیز و علیم کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۱۴۷-۱۴۸-۵۶۶
— اللہ تعالیٰ کائنات کی ساری حقیقتیں جانتا ہے جو ہم سے مخفی ہیں، جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۶۴
— اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب ہے۴۳
— کائنات کی فرمانروائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ۱۰۲
— مشرق و مغرب سب اللہ تعالیٰ کے ہیں، جس طرف رخ کرو گے اسی طرف حق تعالیٰ ہوگا۱۰۵-۱۱۸
— کائنات کا عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مطلق حکیم و علیم کے زیر فرمان ہے۱۳۰
— توحید خداوندی پر آثارِ قیامت سے دلائل۱۳۰-۱۳۱
— فرشتوں کی انتہائی معتبر شہادت کے علاوہ اہل علم و دانش کی مشترکہ شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و مدبر کائنات ہے۲۳۹

(۲۶۱) کبائر

— اس کی تین صورتیں: (۱) ظلم (۲) فسق و معصیت، اور (۳) فجور۳۴۶-۳۴۷
— کبائر سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۳۴۶

(۲۶۲) کتاب، کتب آسمانی

— سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۵۰-۵۱-۱۱۵
— کتابوں کو نازل کرنے کی غرض و غایت۱۶۲-۲۳۱
— جملہ کتب آسمانی کے لیے ”الکتاب“ لفظ کا استعمال ۴۷۶
— قرآن جملہ کتب آسمانی کا مصداق اور محافظ ہے ۲۳۲-۴۷۶
— قرآن مجید حق لے کر آیا ہے اور اپنے سے پہلی کتابوں تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۲۳۱-۲۳۲
— کتاب اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری اور اس پر گواہی کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کی روشنی ہی میں فیصلے کیے جائیں۴۷۳-۴۷۴
— لکھی لکھائی اور معجزانہ طریقے سے موصول ہونے والی کتاب کا مطالبہ اور اس کا جواب۵۲۵
— کتب الٰہی کا علم رکھنے والے اس حقیقت کو غیر مشتبہ طور پر جانتے مانتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور خدائی میں کسی کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۵۲۹
— کتاب مبین جس میں حق تعالیٰ نے خشک و تر کی تمام معلومات درج کر رکھی ہیں۵۴۶
— کتب الٰہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ علم دیا جس کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۵۶۳
— انسان کا ہر فعل خوف خداوندی کے تحت ہونا چاہیے، کتب الٰہیہ کی ہمیشہ سے یہی تعلیم رہی ہے۴۰۴
— قرآن مجید نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنے والوں پر تکمیل نعمت ہے، سراسر ہدایت و رحمت اور ہر ضروری چیز کی تفصیل ہے۶۰۲
— قرآن مجید کے ساتھ بعثت رسول کی اہمیت ۳۷-۳۸
— قرآن مجید پر ایمان کا تقاضا ہے کہ راست بازی

سے اس کی پیروی کی جائے اور اسے دستورِ زندگی بنایا جائے ۴۸۷
- قرآن مجید اور سابقہ کتب کی موجودہ حالت میں مختلف امور میں اختلافِ بیان ۵۶۰
- بنی اسرائیل کو کتاب عطا کرتے ہوئے کیا وعدہ لیا گیا تھا؟ ۸۳
- تورات وانجیل کی تاریخ ۲۳۱-۲۳۲
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام تورات کی اقامت کے لیے آئے تھے ۲۵۳
- یہودیوں کا کتاب الٰہی میں تحریف کرنا ۲۶۷
- اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات کو پھیلانے اور پوشیدہ نہ رکھنے کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن انھوں نے ان تعلیمات کو پس پشت ڈالا اور تھوڑی سی قیمت پر اللہ تعالیٰ کی آیات بیچ ڈالیں ۳۰۹-۳۱۰
- انجیل، زبور، قرآن آسمانی کتابیں ہیں ۳۵۸
- زبور حضرت داود پر نازل ہوئی ہے ۴۲۴
- بنی اسرائیل تعلیمات خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن ان کی احکام الٰہی میں کی گئی خیانتوں کا پول کھلتا ہے ۴۵۴
- تورات کو ہدایت اور روشنی بنا کر نازل کیا گیا تھا اور علما وفقہا اس کے احکام کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے تھے ۴۷۳
- حضرت عیسیٰ پر نازل کردہ انجیل تورات کی تصدیق کرنے والی تھی ۴۷۴-۴۷۵
- انجیل ہدایت، راہ نمائی اور نور و روشنی تھی اور خدا ترس لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ۴۷۵
- بنی اسرائیل کا تورات کے احکام کو مشکل اور بھاری قرار دے کر اس کی حکم عدولی کرنا ۸۳
- اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کو کیا کیا عطا کیا جاتا ہے؟ ۵۶۱

(۲۶۳) کسب

- اس کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۱۴
- قرآن اعمال کو کسب کہتا ہے ۱۱۴
- ہر شخص اپنے کسب کردہ اعمال کا خود ذمہ دار ہے ۶۰۵

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''جزا وسزا'')

(۲۶۴) کعبۃ اللہ

- بیت المقدس سے پہلے کی مرکزی عبادت گاہ ۱۲۴
- اس کی علامات کہ کعبہ ہی مقبول الٰہی ہے ۲۷۵
- عربوں میں اس کا احترام ۲۷۶
- اس کے اثرات عربوں کی اجتماعی زندگی پر ۵۰۵
- معاشی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز تھا ۵۰۵
- بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب امامت کی وجہ سے قبلہ تھا لیکن جب بنی اسرائیل سے امامت لے کر بنی اسماعیل کو دے دی گئی تو مکہ مکرمہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰
- بیت المقدس کے بجائے مکہ مکرمہ میں واقع خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ۱۱۸-۱۱۹
- شروع میں مکہ مکرمہ کی جگہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جانا مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش تھی ۱۲۰

(۲۶۵) کفارہ، کفارات

- قسم توڑنے کا کفارہ ۱۷۱-۵۰۰
- مومن کو سہواً قتل کرنے کا کفارہ ۳۸۲-۳۸۳
- کفارے اور جرمانے میں فرق ۳۸۳
- صدقہ بطور کفارہ ۴۷۴
- حالت احرام میں شکار کر ڈالنے کا کفارہ ۵۰۴
- کفارہ ادا کرنے کا طریقہ ۳۸۲-۳۸۳

(۲۶۶) کفران نعمت

- ''کفر'' بمقابلہ ''شکر'' ۱۲۹
- کنجوسی کفران نعمت ہے ۳۵۲
- کفران نعمت اور اس کی پاداش ۵۲۵
- کفران نعمت کا نتیجہ سلب نعمت ہوتا ہے ۵۶۲

(۲۶۷) کلالہ

- بے اولاد شخص کے ذکر میں ضرر آمیز وصیت کا خاص

ذکر کیوں کیا گیا ہے ۳۲۹-۳۳۰

(۲۶۸) کنجوس

— خود کنجوسی کرنے والا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینے والا اللہ تعالیٰ کے فضل کو چھپاتا ہے، یہ عین کفرانِ نعمت اور اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے ۳۵۲

(۲۶۹) گمان

— علم و یقین کے بجائے گمان اور قیاس آرائی پر چلنا عین گمراہی ہے ۵۹۵

(۲۷۰) گناہ، گمراہی

— جرم اور گناہ کے لیے ارادے کا ہونا ضروری ہے ۵۴۴
— گناہ کو کیا چیز اتنا برا بناتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناقابلِ معافی ہو جاتا ہے ۳۴۶
— گناہ معاف ہو جانے کی وضاحت و تشریح ۲۰۹
— بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے والوں کے چھوٹے گناہ ساقط کر دیے جائیں گے ۳۴۶-۳۴۷
— گمراہ فرد جس کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد حق تعالیٰ کرے تو ایسے لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں رسوائی ہے اور ان کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا ۳۹۶-۳۹۷
— ضلالت و گمراہی کے خریدار، جو چاہتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنے جیسا گمراہ بنا ڈالیں ۳۵۶
— علم کے مقابلے میں قیاس و لاعلمی پر چلنے میں سراسر گمراہی ہے ۵۹۵
— ضلالت و گمراہی میں پھنسا ہوا انسان نہ کوئی سفارش پائے گا نہ کوئی حامی و مددگار اور نہ فدیہ دے کر چھوٹ سکے گا ۵۵۰
— کھلی اور چھپی گمراہی سے بچو کیونکہ انسان اپنی کارکردگی کا بدلہ پا کر رہے گا ۵۷۷
— حالانکہ حق عین عیاں ہے لیکن اپنے نفس کے حسد کی وجہ سے جانتے بوجھتے راہِ راست کو مشکوک کرنے کے درپے ہیں ۱۰۳

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ’’ضلالت‘‘)

ل

(۲۷۱) لعنت

— کس قسم کے لوگ اس کے مستحق ہیں ۹۳-۱۲۸-۱۲۹-۲۷۱-۳۵۸-۳۶۰-۳۸۴-۳۹۸-۴۸۴
— باطل پرستی کی وجہ سے یہود پر لعنت ۳۵۸
— جس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو پھر اس کو لعنت سے بچانے والا کوئی مددگار نہیں مل سکتا ۳۶۰
— بنی اسرائیل کے کفر پر حضرت داود اور حضرت عیسیٰ کی لعنت ۴۹۶
— شیطان لعنت زدہ ہے ۳۹۸
— کفر کا رویہ اختیار کرنے اور کفر کی حالت میں جان دینے والوں پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے لعنت ہے ۱۲۹
— مفسد حقیقت آشکارا ہو جانے کے باوجود محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۲۶۰-۲۶۱
— یہود پر باطل پرستی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ۳۵۸

(۲۷۲) حضرت لوط علیہ السلام

— حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۲۷۳) لونڈی

— ان سے متعلق احکام ۳۲۱-۳۲۲
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’غلامی‘‘)

م

(۲۷۴) ماہِ حرام

(تفصیلات کے لیے دیکھو ’’اشہرِ حرم‘‘)

(۲۷۵) مباہلہ

— عیسائیوں کے وفد نجران کو دعوتِ مباہلہ اور ان کا اس سے گریز کرنا ۲۶۰-۲۶۱

(۲۷۶) متشابہات

— آیاتِ متشابہات کی تعریف ۲۳۴-۲۳۵
— متشابہات سے اہل فتنہ کی غیر معمولی دلچسپی ۲۳۵

(۲۷۷) متقی

— متقی کون ہیں؟ ۱۳۷
— متقین کی صفات ۵۰-۲۸۸-۲۸۹
— دوسروں کو نصیحت کرنا ان کا فرض ہے مگر دوسروں کے حساب کی ذمہ داری ان پر نہیں ۵۴۹
— دنیا کا سرمایہ نہایت قلیل ہے اور آخرت ایک خدا ترس متقی انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے ۳۷۴
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''تقویٰ'')

(۲۷۸) محکمات

— آیات محکمات کی تعریف ۲۳۴
— اہل ایمان دانش مند محکمات اور متشابہات سب پر ایمان لاتے ہیں لیکن ٹیڑھے دلوں والے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ۲۳۴-۲۳۵

(۲۷۹) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

— آپ کی امت کو امت وسط کیوں کہا گیا؟ ۱۱۸-۱۱۹
— آپ کس کام کے لیے تشریف لائے تھے ۱۹-۳۷-۱۰۶
— آپ کی دعوت کا آغاز کس طرح ہوا اور کن کن مراحل سے گزر کر تکمیل تک پہنچا؟ ۲۱-۵۲۲
— کس قسم کے لوگوں نے آپؐ کی دعوت قبول کی اور ان کی زندگی پر کیا کیا اثرات پڑے ۲۲
— آپؐ کی کامیابی کے وجوہ ۲۲
— آپ کی دعوت وہی تھی جو پچھلے انبیائے کرام کی تھی ۷۰-۲۲۸-۵۵۳
— آپ کی نبوت کے دلائل ۱۰۶-۲۶۳
— آپ کا ظہور حضرت ابراہیم کی دعا کی قبولیت تھی ۱۱۲
— آپ پر تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کی ذمہ داریاں ۱۲۵
— آپ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف ۲۲۳
— آپ کی ذمہ داریِ رسالت ۲۴۱-۳۷۵-۳۷۷-۴۸۷-۵۰۳-۵۰۶
— آپ کی پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت کا عین تقاضا ہے ۲۴۵
— آپ کی دعوت وہی تھی جو حضرت عیسیٰ کی تھی ۲۶۰
— آپؐ پر نبوت ختم ہونے کے متعلق ضمنی اشارہ ۲۶۹-۲۷۰
— غزوۂ احد کے موقع پر بددعا کرنے پر تنبیہ ۲۸۷
— سابق رسولوں کی طرح محض ایک رسول ہیں ۲۹۱
— جنگ احد کے موقع پر آپ کی موت کی خبر کا اڑنا ۲۹۱
— آپ کی طرف سے شجاعت واستقامت کا بے مثال مظاہرہ ۲۹۵
— قیادت کے بہترین اوصاف کی جامع ہستی ۲۹۸
— آپؐ سو فی صد اعتماد کے مستحق ہیں ۲۹۹
— آپؐ کی بعثت مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے ۳۰۰
— آپؐ کے کار رسالت کے بنیادی شعبے ۳۰۰
— آپؐ سے آپؐ کی امت پر آخرت میں شہادت طلبی ۳۵۳
— آپؐ کی سنت قیامت تک کے لیے سند ہے ۳۶۹
— آپؐ پر ایمان لانے کا تقاضا ۳۶۹
— خدا کی اطاعت آپؐ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ۳۷۵
— آپؐ کا منصب قضا ۳۹۴
— آپؐ پر وحی آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ۴۲۴-۴۲۶
— آپؐ اپنے رب کی طرف سے حق لے کر آئے ۴۲۷
— آپؐ ان باتوں کو کھولنے والے ہیں جن پر اہل کتاب نے پردہ ڈال رکھا تھا ۴۵۵
— آپؐ کی بعثت اہل کتاب کے لیے ذریعۂ اتمام حجت ہے ۴۵۸

— آپؐ کو تمام معاملات میں کتاب اللہ کے تحت فیصلہ کرنے کا حکم ۴۷۶
— آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ ۴۸۷
— سورۃ الانعام کے نزول کے وقت آپؐ کی کیفیت ۵۲۰
— مکہ میں آپؐ کی دعوت کے چار بڑے ادوار ۵۲۱-۵۲۲
— آپؐ کا اعلانِ توحید ۵۲۷ تا ۵۲۹
— آپؐ کو ذاتی حیثیت سے مخالفین صادق مانتے تھے ۵۳۵
— قرآن آپؐ کے لیے فوق الانسانی اختیارات ہونے کی تردید کرتا ہے ۵۴۲
— قرآن آپؐ کے عالم الغیب ہونے کی تردید کرتا ہے ۵۴۲
— آپؐ وحی الٰہی کی پیروی کرنے والے تھے ۵۴۲
— ایمان لانے والوں کے بارے میں آپؐ کو خاص ہدایات ۵۴۳
— عذاب لانا آپؐ کے اختیار میں نہ تھا اور نہ آپؐ کو لوگوں پر حوالہ دار بنایا گیا تھا ۵۴۵-۵۴۸-۵۶۹
— آپؐ کا ”کام“ وہی تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا ۵۵۲-۶۰۵
— آپؐ کسی اجر کے طالب نہ تھے ۵۶۲
— آپؐ کو سابق انبیائے کرام کے طریقے پر چلنے کی ہدایت ۵۶۲
— آپؐ کو بطور خود معجزات دکھانے کا اختیار نہ تھا ۵۷۱
— آپؐ کی مخالفت کس کس طرح کی گئی اور کن وجوہ سے کی گئی ۲۲
— قریش کا آپؐ کو زیارت کعبہ سے روکنے کا واقعہ ۴۳۴
— راہِ راست اور ہدایت بار بار کھونے والی انسانیت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے راہِ ہدایت کو از سرِ نو تازہ کیا گیا اور آپؐ آخری رسول ہیں ۹۱
— رسولؐ اللہ ہی مرتب قرآن ہیں، انھوں نے قرآن کو ترتیب نزولی سے کیوں مرتب نہیں کیا؟ ۲۶ تا ۲۸
— نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے رسولؐ اللہ نے دعوت اسلامی مکمل کر دی، اب اس کو آگے بڑھانے کے ذمہ دار ہم مسلمان ہیں ۲۷
— رسول اللہ کی نبوت کا قرآن مجید کے ساتھ ایک مکمل تعلق ہے جس کو الگ نہیں کیا جا سکتا ۳۷
— رسولؐ اللہ کی بعثت کے وقت مدینہ کے اہل کتاب کی اخلاقی اور دینی حالت کیا تھی ۴۶-۴۷
— رسولؐ اللہ کو فہمائش کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں، خواہ انھیں خبردار کیا جائے یا نہ کیا جائے ۵۲
— رسولؐ اللہ کی ذات پُر صفات ہی اس حقیقت پر سب سے بڑی نشانی ہے کہ تعلیمات محمدیؐ برحق ہیں ۱۰۶-۱۰۷
— رسولؐ اللہ بھی خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیے جانے کے خواہش مند تھے ۱۲۱
— رسول اللہ اپنے لوگوں ہی میں مبعوث ہوئے، وہ لوگوں کو اللہ کی آیات سناتے، ان کی زندگیاں سنوارتے، انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے اور وہ باتیں سکھلاتے جو وہ پہلے نہیں جانتے تھے ۱۲۵-۳۰۰
— رسولؐ اللہ کے تربیت یافتہ (صحابہ کرام) وہ گروہ ہے جس کو انسانیت کی اصلاح و ہدایت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ۲۷۹
— رسولؐ اللہ کی بات سننا اور اطاعت کرنا انسان کے لیے نہایت بہتر اور راست طریقہ ہے ۳۵۷-۳۵۸
— رسولؐ اللہ کے منصب رسالت پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— رسولؐ اللہ کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی چاہیے ۳۶۸
— رسولؐ اللہ تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے اور اس حقیقت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے ۳۷۵
— رسولؐ اللہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہے، ان پر کتاب

وحکمت نازل کی گئی اور انھیں وہ باتیں بتلائی گئیں جو انھیں معلوم نہ تھیں ۳۹۶

— رسولؐ اللہ کی نبوت تمام انسانوں کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل برہان اور نورِ مبین ہے اور صراطِ مستقیم کو بالکل واضح کر دینے والی ہے ۴۳۱

— رسولؐ اللہ اہل کتاب کی حق اور احکام الٰہی کو چھپانے والی حرکات کو بے نقاب کرتے ہیں ۴۵۵-۴۵۶

— اسلام ایک نور ہے جو حق نما کتاب قرآن اور نورِ نبوت رسول اللہ کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کا راستہ بتاتا، راہ راست کی طرف راہ نمائی کرتا اور ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنیوں کی طرف لے جاتا ہے ۴۵۶

— رسول اللہ کو کفار کی کفر کی راہ میں سرگرمیوں پر رنجیدہ نہ ہونے کا حکم ۴۶۹-۴۸۷

— رسول اللہ کو جو کچھ احکام اور ہدایات ملتی تھیں وہ بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیتے تھے اور یہی حقِ نبوت تھا ۴۸۷-۴۸۸

— رسول اللہ کے ذمے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا ہے، حکم عدولی کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں ۵۰۳-۵۰۶

— رسولؐ اللہ سے فرشتوں کے ظہور کا مطالبہ اور اس کا جواب ۵۲۵-۵۲۶

— رسول اللہ کی خواہش کہ کوئی ایسا معجزہ آ جائے جس سے کفار کے کفر کا زور ٹوٹ جائے، اس کا جواب ۵۳۵ تا ۵۳۷

— قرآن اور نبوتِ رسول اللہ کی صورت میں بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بن کر رہے گا وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا، کوئی کسی کی ہدایت وضلالت کا پاسبان نہیں ۵۶۸-۵۶۹

— مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہودی اور عیسائی سب اس بات سے جلتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت (نبوت) رسولؐ اللہ ہی کو کیوں نصیب ہو گئی ۱۰۱

— آپؐ کے مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۰۶-۱۶۵-۵۲۵-۵۳۱-۵۳۷-۵۶۲

— اہل کتاب رسولؐ اللہ کی نبوت پر ایمان لانے سے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵

— آپؐ کی مخالفت کا نتیجہ عذاب جہنم ہے ۳۹۶-۳۹۷

— لوگوں کے جھٹلانے سے آپؐ کو رنج ہوتا تھا ۵۳۴

— آپؐ کو جھٹلانے والے آپؐ کی ذات کو نہیں بلکہ آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے تھے ۵۳۴

— شرارت پسند لوگوں کا رسول اللہ اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا ۳۴۴-۳۴۵

— آپؐ پر الزام کہ آپؐ قرآن مجید کہیں سے پڑھ اور سیکھ کر آئے ہیں ۵۶۹

— مدینہ کے یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اتار کر لاؤ جو ہمارے سامنے نازل ہو ۴۱۵

(۲۸۰) مدینہ منورہ

— مدینہ میں وہ مرحلہ جب اسلام ایک مکمل نظام بن کر چھا گیا، کفر مغلوب اور مایوس ہو گیا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ۴۴۳

— اسلام ۶-۷ ہجری تک ایک ناقابل شکست ریاست کا روپ دھار چکا تھا اور اخلاق، معاشرت، معیشت غرض زندگی کے ہر شعبے کے قوانین دیے جا چکے تھے ۴۳۵

— مدنی دور کی سورتوں کی خصوصیات ۴۷

— مدنی دور کے آغاز میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت ۴۸-۸۷-۱۸۴-۲۳۰-۳۷۷-۴۸۰

— مدینہ کے معاشی توازن پر مہاجرین مکہ کی آمد کا کیا اثر پڑا ۲۲۹

— مدینہ منورہ میں رسولؐ اللہ کے کام کے تین شعبے ۳۱۷

— تمام مسلمانوں کو مدینہ میں ہجرت کر کے آنے کا حکم ۳۷۹

— یہودِ مدینہ کی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں

روش۹۳-۱۰۰-۱۰۷-۲۸۲
— یہود سے معاشرتی تعلق رکھنے کی ممانعت کیونکہ وہ مسلمانوں میں خرابی پیدا کرنے کے کسی موقع سے نہیں چوکتے ۲۸۲-۲۸۳
— قوانین اسلام کے خلاف مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کی ناپاک مہم جوئی ۳۴۴-۳۴۵
— یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب ہمارے سامنے نازل کراؤ ۴۱۵
— مدینہ کے یہودی تورات میں واضح احکام کے باوجود کئی دفعہ مقدمات رسولؐ اللہ کی عدالت میں لے آتے کہ شاید کوئی حسب منشا حکم مل جائے ۴۷۲-۴۷۳
— مدینہ کے یہودیوں کی مشرکین مکہ کی حمایت ورفاقت پر قرآن حکیم نے مذمت اور تنقید کی ہے ۴۹۶-۴۹۷
— بعثت رسولؐ اللہ کے وقت مدینہ کی اخلاقی اور دینی حالت ۴۶-۴۷
— ہجرت کے بعد تحریک اسلامی کو پیش آنے والے مختلف مراحل کی تفصیل ۴۶ تا ۴۸
— مدینہ منورہ میں منافقین کی مختلف اقسام ۴۸
— جنگ احد کی شکست کی وجہ سے مدینہ کی ریاست کو درپیش خطرناک حالات ۳۷۱
— منافقینِ مدینہ رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو منہ پر کہتے تھے کہ وہ مطیع وفرمانبردار ہیں لیکن رات کو اہل ایمان کے خلاف مل کر خفیہ مشورے کرتے تھے ۳۷۶
— رسولؐ اللہ کے ایک فیصلے کی مثال جس میں اللہ تعالیٰ کی مداخلت کی وجہ سے رسول اللہ نے جتھا بندی اور عصبیت سے بالکل ہٹ کر فیصلہ صادر فرمایا ۳۹۳-۳۹۴

(۲۸۱) مذاہب
— مختلف مذاہب کی اصل کے متعلق قرآنی نقطہ نظر ۱۶۲-۲۳۹
— مختلف مذاہب اسلام میں رد و بدل کر کے بنائے گئے ہیں ۲۴۰
— ایک دین سے الگ الگ مذاہب کیسے بن گئے؟ ۶۰۴
— مذاہب اختلافات سے پیدا ہوئے جبکہ جائز اور حدود دین کے اندر رہتے ہوئے اختلافات کی تحسین کی گئی ہے ۳۸-۳۹
— مذہب کے احکام میں مطالبات اور سوال جواب کرنا کفر کی روش ہے اور انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے ۱۰۲
— انسان نے اپنی زندگی کا آغاز درست سمت میں ہدایت کے تحت کیا، گمراہی بعد میں در آئی ۱۶۲-۱۶۳
— مختلف مذاہب اور انسانوں کے درمیان اختلافات ارادہ و اختیار کی آزادی کی وجہ سے ہیں اور عین حکمت خداوندی کے مطابق ہیں ۱۹۲-۱۹۳
— اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام مذہبی اختلافات کی حقیقت کھول دے گا ۱۰۴-۲۵۹-۶۰۶
— کتاب اللہ میں اختلاف پیدا کرنے والے اور ان جھگڑوں میں بہت آگے نکل جانے والے نہایت برے انجام کے خریدار بن بیٹھے ہیں ۱۳۵-۱۳۶
— فرقہ بندیاں کرنے والے کفران نعمت کا رویہ اختیار کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں ۲۷۸
— فرقہ بندیاں کرنے والوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ در گروہ ہو گئے ۶۰۴-۶۰۵
— بے علم انسان صرف شیطان کی راہ ہی پر چل سکتا ہے ۱۳۳
— جو لوگ احکام کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کے لیے انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۱۳۵
— دین کی روح خدائے واحد کی بندگی ہے، جوں جوں انسان اس سے دور ہوا مذاہب اور فرقہ بندیاں شروع ہوگئیں ۳۷۴
— اہل کتاب سے کتاب اللہ کی تعلیمات کو پھیلانے اور انھیں پوشیدہ نہ رکھنے کا وعدہ لیا گیا تھا لیکن انھوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالا اور اس کی

آیات بیچ ڈالیں ۳۰۹-۳۱۰
— تمام انبیا ایک دوسرے کے دین کی تصدیق و تائید کرتے ہیں تو شریعت کی تفصیلات میں ان کے درمیان فرق کیوں ہے ۴۷۷-۴۷۸
— غیر مسلموں کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو کہ کہیں وہ جہالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا نہ کہنے لگ جائیں ۵۷۰-۵۷۱

(۲۸۲) مرتد
— اسلام سے پھر کر کفر اختیار کرنے والے کو مرتد کہتے ہیں، اس کے دنیا و آخرت کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں ۱۶۶
— ایمان کے بعد کفر کرنا اور پھر کفر میں بڑھتے جانا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کبھی ہدایت نہ دے گا ۴۰۷-۴۰۸

(۲۸۳) مروہ
— اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے ۱۲۷

(۲۸۴) مریم علیہا السلام
— آپ کی پیدائش ۲۴۷
— عمران کی عورت یعنی حضرت مریم کی والدہ کا آنے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کی نذر کرنا ۲۴۶
— اللہ تعالیٰ نے یہ نذر قبول فرمائی ۲۴۶-۲۴۷
— حضرت زکریا کو حضرت مریم کی سرپرستی عطا ہوئی ۲۴۷-۲۴۸
— حضرت مریم کو برگزیدہ کیا گیا، پاکیزگی عطا کی اور تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا ۲۵۰
— حضرت مریم کی بے گناہی اور اخلاقی برتری کی گواہی ۴۱۷-۴۲۷-۴۲۸
— ہیکل کے داخلے کے بعد کے حالات ۲۵۰
— فرشتوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی آپ کو بشارت دینا ۲۵۱
— آپ پر بنی اسرائیل کی بہتان طرازی ۴۱۷
— آپ پر ”کلمہ“ بھیجنے کا مطلب ۴۲۷
— رُوْحٌ مِّنْهُ کا مطلب ۴۲۸
— آپ ایک راست باز خاتون تھیں ۴۹۰
— عیسائیوں میں الوہیت مریم کا عقیدہ ۵۱۵-۵۱۶

(۲۸۵) مزدلفہ
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ”حج“)

(۲۸۶) مساجد اللہ
— کون لوگ اس کی تولیت کے مستحق ہیں ۱۰۴

(۲۸۷) مسجد حرام
— اس اصطلاح کا مفہوم ۱۲۲
— اس کی حرمت اور حکم جہاد ۱۵۰
— قریش کا اس سے مسلمانوں کو روکنا ۱۶۵
— مسجد حرام سے زائرین کو روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے ۴۴۰

(۲۸۸) مسخ
— اصحاب السبت کا مسخ کیا جانا ۸۳
— یہود کا بندر اور سور بنایا جانا ۴۸۴

(۲۸۹) مسلم
— مسلم کون ہوتا ہے ۱۱۳-۲۶۲
— مسلم ہونے کے تقاضے ۲۵۶
— مرتے دم تک مسلم رہنے کا مطالبہ ۲۷۶
— اس کا رویہ خدا کے سامنے ۴۳۸
— ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی رضا میں محو ہو جانا ۶۰۵
— مسلم یک سو کا مفہوم و معنی ۲۶۳

(۲۹۰) مسیح، مسیحی اور مسیحیت
(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو عیسائی، عیسائیت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

(۲۹۱) مشرکین (مشرکین مکہ)
— ان کے جاہلانہ خیالات ۱۳۳
— ان کی جاہلانہ رسوم و رواج ۱۳۳

— ان کی جاہلانہ صحبتیں ۱۳۲
— اسلام سے پہلے ان کی حالت ۲۷۷
— یہ وحدتِ خالق کے قائل تھے ۵۲۳
— ان کے لیے ان کے دین کا مشتبہ ہو جانا ۵۸۷
— ان کے حلت و حرمت کے مشرکانہ تصورات ۵۸۸
— مشرک ظالم ہیں ۵۲۹-۵۳۰
— مشرکین میدان حشر میں بھی جھوٹ بولنے کی جسارت کریں گے ۵۳۰
— مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہودی اور عیسائی، وہ سب اس بات پر جلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل (نبوت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں نصیب ہو گیا ہے ۱۰۱
— مشرکین کے بناوٹی معبود روز قیامت ان سے گم ہو جائیں گے ۵۲۰
— مشرکین بے اطمینانی اور ہر دم خوف کے حق دار ہیں ۵۵۹
— مشرکین کے تکلیف دہ طعن اور جھوٹی نشر و اشاعت کے ذریعے سے اہل ایمان آزمائے جاتے ہیں، ان مشکل حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہنا نہایت حوصلے کی بات ہے ۳۰۹
— حضرت ابراہیم کی قوم بھی اللہ کی ہستی کی منکر نہیں تھی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی خدائی صفات اور خدائی حقوق میں شریک قرار دیتی تھی ۵۵۹
— مدینہ کے یہودیوں کی مشرکین مکہ کی حمایت پر قرآن کی مذمت اور تنقید ۴۹۶-۴۹۷
— یہودی مکہ کے مشرکین کو گمراہ کرتے تھے ۵۶۲-۵۶۳
— اسلام اور رسول اللہ کی عداوت میں یہودی اور مشرکین مکہ نہایت سخت ہیں ۴۹۷
(مزید دیکھو ’’اوہام جاہلیت‘‘)

(۲۹۲) مشیت الٰہی

— اللہ تعالیٰ کی رضا اور مشیت میں بہت فرق ہے ۵۷۲-۵۷۳
— اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت حق و باطل دونوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا صرف حق اور حق کے لیے کام کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے ۵۷۳ تا ۵۷۵
— اللہ تعالیٰ کی مشیت کو انسان اپنی گمراہی اور ضلالت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کر سکتا ۵۹۶
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ’’تقدیر‘‘)

(۲۹۳) مصیبت

— مصیبت میں انسان آیندہ شکر گزار رہنے کے وعدے پر اپنی جان بچاتا ہے لیکن آزمائش ٹلنے پر دوسروں کو شریک بنانے لگتا ہے ۵۴۷-۵۴۸

(۲۹۴) معاشی قانون و تعلیمات

— اموال کو نادان لوگوں کے تصرف میں دینا موجب فساد ہے ۳۲۲
— کمائی کے باطل طریقے اور لین دین کے جائز طریقے ۳۴۵
— جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا ۲۱۰
— جو کچھ تمھاری ضروریات سے زائد ہو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو ۱۷۶
— رب کی بخشش اور جنت کے حق دار وہ خدا ترس ہیں جو ہر حال میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، خواہ خوش حال ہوں یا بد حال ۲۸۸
— تجارت کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا اور سود کو حرام کیا، ان میں کیا فرق ہے؟ ۲۱۱ تا ۲۱۳
— زر پرست اور فیاض کرداروں کا تقابل ۲۱۰-۲۱۷
— قرض کی ادائیگی میں معذور و مجبور مقروض کے قرض خواہوں کو مہلت دینے، قرض کا ایک حصہ یا مکمل قرض معاف کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۲۱۸-۲۱۹
— قرض اور تجارتی معاملات کو تحریروں میں لا کر اس پر شہادتیں قلم بند کرو تا کہ معاملات صاف و شفاف رہیں ۲۱۹
— کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے پر مجبور نہ

کیا جائے، اس کا اخلاقی فریضہ یاد دلایا جا سکتا ہے ۲۲۱

— معاشی معاملات میں کھرے اہل کتاب کی توصیف ۲۶۵-۲۶۶

— معاشی حوالے سے یہودیوں کے نیکی کے تصورات کی تردید ۲۷۲

— انفاق فی سبیل اللہ کے خسران اور بے فائدہ ہونے کی مثال، یہ ظلم انھوں نے خود ہی اپنے اوپر کیا ۲۸۱-۲۸۲

— تمام چیزیں اللہ کی ملک ہیں، اس عارضی ملکیت میں انھیں راہِ خدا میں خرچ کرنے والا عقل مند اور بخل کرنے والا اپنے حق میں نہایت برا فیصلہ کر رہا ہے ۳۰۶

— اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر خرچ کرنے والوں کو اپنے ذمے قرضِ حسن قرار دیتا ہے، اس پر یہودیوں کے اعتراض کا جواب ۳۰۶-۳۰۷

— یتیموں کے مال کے متعلق احکام خداوندی ۳۱۹ تا ۳۲۱

— ہر فردِ معاشرہ کے معاشی حقوق ملکیت اور حقوق استعمال پر حکومت اور معاشرہ پابندی لگا سکتا ہے ۳۲۲-۳۲۳

— یتیموں کو ان کا مال سپرد کرتے ہوئے گواہ بنالو ۳۲۴

— ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانے کی ممانعت، لین دین ہمیشہ باہمی رضا مندی سے ہونا چاہیے ۳۴۵

— جس معاشرے میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقوں سے کھایا جاتا ہو ایسا معاشرہ خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے ۳۴۵-۳۴۶

— جو شخص اپنی معاشی اور معاشرتی بڑائی پر فخر کرے اللہ تعالیٰ کو ایسا شخص ہرگز پسند نہیں ہے ۳۵۲

— خود کنجوسی کرنے والا اور دوسروں کو کنجوسی کی تلقین کرنے والا اللہ کا فضل و رحمت چھپاتا ہے، یہ فعل اللہ کو سخت ناپسند ہے اور یہ فعل کھلم کھلا کفرانِ نعمت ہے ۳۵۲

— محض لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرنے والے اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں ۳۵۲-۳۵۳

— نفس انسان کو تنگ دلی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن انسان اگر احسان سے پیش آئے اور خدا ترسی سے کام لے تو اس کے لیے بہتر ہے ۴۰۲-۴۰۳

— ہر انسان کا دنیا میں قیام کے دوران میں رزق مقرر کر دیا گیا ہے، اب یہ اس پر منحصر ہے کہ حلال کر کے کھائے یا حرام کر کے کھائے ۴۱۰-۴۱۱

— یہودیوں کے جرائم میں دو بڑے معاشی جرائم تھے: (۱) وہ سود خواری کرتے تھے (۲) اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے تھے ۴۲۲-۴۲۳

— منافق گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں ۴۸۴

— قرآن کا معیار قدرت و منزلت کم اور زیادہ مقدار کی بنا پر نہیں ہے بلکہ معیار کی بنا پر ہے ۵۰۶-۵۰۷

— اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال کا بہترین حصہ دینا ہوگا ۱۳۷

— اپنے والدین، رشتہ داروں اور یتیموں پر خرچ کرو، جو تم خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے ۱۶۴

— اسلام کسی بھی شخص پر اس کی معاشی استطاعت سے زیادہ بار نہیں ڈالتا بلکہ معروف طریقے پر چلنے کا حکم دیتا ہے ۱۷۸-۱۷۹

— اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی کرنا شرمناک عمل ہے ۲۰۷

— اللہ تعالیٰ جو فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر وقت عطا اور بخشش کرتا ہے ایسی ہی صفات انسانوں میں بھی پسند کرتا ہے ۲۰۷

— معاشی تعلیمات اور انفاق کرنے والوں کے بیان کردہ اوصاف کیا ہیں ۲۰۹-۲۱۰

— انفاق میں علانیہ اور مخفی دونوں طرح کی ادائیگی ہی افضل ہے ۲۰۸

(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''اسلام کی معاشی تعلیمات'')

(۲۹۵) معجزات

— حیات بعد الموت کا معجزے کے طور پر عملی مظاہرہ ۲۰۰
— چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ۲۰۱
— حضرت زکریا علیہ السلام کی بانجھ بیوی کے ہاں اولاد کی پیدائش ۲۴۹
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص معجزات ۲۵۱-۲۵۲
— قبول شدہ قربانی کے گوشت کو معجزانہ طور پر آسمانی آگ کا کھا جانا ۳۰۷-۳۰۸
— رفع عیسیٰ کی غیر معمولی نوعیت ۴۲۰
— معجزات عیسیٰ کی تفصیل ۵۱۳
— سمندر پھاڑ کر بنی اسرائیل کو بچا لیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا گیا ۷۵
— حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر بنی اسرائیل کے لیے چشمے کا عصا کی چوٹ پر جاری ہو جانا ۷۹
— بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا بندر بنایا جانا ۸۴
— اللہ تعالیٰ کے حکم سے مقتول کا زندہ ہو کر قاتل کی خبر دینا ۸۵-۸۶
— معجزات اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتے ہیں ۵۱۳
— رسولؐ اللہ سے محسوس معجزہ دکھانے کا مطالبہ جب کہ آپ بطور خود معجزات دکھانے پر قادر نہ تھے ۵۳۵-۵۳۷
— مدنیت صالحہ کی تعمیر معجزات کے بل پر نہیں ہو سکتی ۵۳۶
— معجزات دکھانا تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ۵۷۱
— نادان لوگوں کا مطالبہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتا ۱۰۶-۱۵۵
— جن لوگوں کے دلوں پر پردے اور کانوں میں گرانی ڈال دی گئی ہے وہ کوئی بھی معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لائیں گے ۵۳۱
— بنی اسرائیل کی مصر سے جزیرہ نمائے سینا میں مہاجرت پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے مسلسل ابر آلود آسمان اور چالیس سال تک من و سلویٰ کی فراہمی ۷۷-۷۸

(۲۹۶) معروف

— اس کا شرعی اور قانونی مفہوم ۱۳۹
— امر بالمعروف کا فریضہ ۲۷۷
— اسلام معروف (رواج اور رائج طریقہ) کی افادیت کا مکمل اہتمام کرتا ہے ۱۸۰
— بنی اسرائیل پر معروف کی تلقین سے اجتناب کرنے پر انبیائے کرام حضرت داود اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے ۴۹۶

(۲۹۷) مغفرت

— کن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفرت نہیں ہے ۳۵۸-۳۹۷-۴۰۷
— شرک کی معافی نہیں ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ چاہے تو جس گناہ کو بھی چاہے معاف کر سکتا ہے ۳۹۷
— ہدایت کے بدلے ضلالت اور مغفرت کے بدلے عذاب پانے والے کون لوگ ہیں ۱۳۵-۱۳۶

(۲۹۸) مکہ مکرمہ (بیت اللہ)

— مکی دور کی نازل شدہ سورتوں کی خصوصیات ۴۶-۴۷
— مکی دور میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت ۴۷-۲۲۵
— مکہ میں مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے خطوط ۲۲۶
— سب سے پہلی مرکزی عبادت گاہ مکہ میں بنی ۲۷۴
— مکی زندگی میں دعوتِ نبوت کے چار بڑے دور ۵۲۱-۵۲۲
— مکہ میں رسول اللہ کا آخری سال ۵۲۰-۵۲۱
— دعوت اسلامی کے لیے مکہ کی مرکزیت ۵۶۳
— بیت المقدس بنی اسرائیل کے منصب امامت کی وجہ

سے قبلہ تھا لیکن جب ان سے امامت لے کر بنی اسماعیل کو دی گئی تو مکہ کو قبلہ قرار دیا گیا ۱۱۰
— مکہ کو امن و امان اور اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کا گہوارہ حضرت ابراہیم کی دعا کے نتیجے میں بنایا گیا ۱۱۱
— جاہلیت کے تاریک ترین دور میں بھی مکہ اور بیت اللہ کا احترام موجود تھا ۲۷۵
— مکہ کے مشرکین کے گمراہی میں استاد یہود مدینہ تھے ۵۶۲-۵۶۳

(۲۹۹) مناسک

— صفا و مروہ کی سعی مناسک میں سے ہے اور ہرگز زمانۂ شرک کی ایجاد نہیں ہے ۱۲۷

(۳۰۰) منافقین

— منافقین ۵۲ تا ۵۶-۴۰۹-۴۱۰
— منافقین گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور حرام کھاتے ہیں، یہی یہودیوں کا وتیرہ بھی تھا ۴۸۴
— مکہ میں کس قسم کے منافق پائے جاتے تھے ۴۸
— مدینہ منورہ میں منافقین کی مختلف اقسام ۴۸
— واقعہ نخلہ پر منافقین مدینہ کی فتنہ انگیزیاں ۱۶۵
— جنگ احد میں منافقین کی رخنہ اندازیاں ۲۳۰-۲۹۱-۲۹۴
— غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی فتنہ انگیزی ۲۸۴-۲۸۵
— مسلمانوں کے ایمان میں رخنہ اندازیاں ۲۹۳
— معرکہ احد کے بعد اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کے جاہلانہ گمان ۲۹۶
— ان کا نفسیاتی تجزیہ ۳۰۱-۳۰۲-۳۶۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۸۰
— اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے سے اہل ایمان سے منافقین کو الگ کر لیتا ہے ۳۰۵
— احد کے واقعے کے بعد مدینہ میں منافقین کی سرگرمیاں ۳۱۷
— ان سے کیا برتاؤ کیا گیا؟ ۳۱۸
— اسلام کی اصلاحات سے ان کی چڑ ۳۴۴-۳۴۵
— معاملات کے فیصلے کے لیے ان کا قرآن کو چھوڑ کر طاغوت کی طرف رجوع کرنا ۳۶۶-۳۶۷
— ان کا جہاد سے جی چرانا ۳۷۱-۳۷۲
— ان کی طرف سے حکم جہاد پر منفی ردعمل ۳۷۴
— ان کے خفیہ مشورے ۳۷۶
— ان کی انتشار انگیز حرکات ۳۷۶
— ان کے بارے میں دو رائیں رکھنے والے مسلمانوں کی گرفت ۳۷۹
— منافقین مسلمانوں کو بھی اپنے کفر کی چھوت لگانا چاہتے تھے ۳۸۰
— منافقین سے دوستی کی ممانعت ۳۸۰
— ان سے دورانِ جنگ میں معاملہ ۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲
— نبیؐ کے عدالتی فیصلے سے انحراف نفاق ہے ۳۹۷
— ان کا اہل ایمان کے بجائے کافروں کو رفیق بنانا ۴۰۸
— ان کو جہنم میں کافروں کے ساتھ جمع کیا جائے گا ۴۰۹
— ان کی دلچسپ منافقانہ پالیسی ۴۰۹-۴۱۰
— ان کی اللہ تعالیٰ سے فریب کاری ۴۰۹
— ان کی حالت تذبذب ۴۱۰
— منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے ۴۱۱
— دین حق کی مخالفت کرنے والے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل ۴۸۰
— ان کے لیے حبط اعمال کا فیصلہ ۴۸۱
— نفاق آخر کار کھل کر رہتا ہے ۴۸۱
— اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ایمان نہیں لائے ۵۲-۵۳
— منافقین سے جب کہا جاتا ہے کہ فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، درحقیقت وہ مفسد ہیں لیکن انھیں اس کا احساس نہیں ہے ۵۳
— منافقین کو تنبیہ کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور دردناک عذاب تمھارا مقدر ہے ۵۳

— منافقین اہل ایمان سے دھوکا کر رہے ہیں، انھیں شعور نہیں ہے اصل میں وہ خود دھوکے میں ہیں ۵۳
— منافقین کے دلوں میں بیماری ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اور بڑھا دیا ہے ۵۳
— منافقین قسمیں بہت کھاتے ہیں ۳۶۷-۳۶۸
— منافقین بھلائی اور اصلاح بین الناس کے بہت دعوے دار ہوتے ہیں ۳۶۸
— منافقین زبان سے جو کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا اور وہ دلوں کی باتوں کو چھپاتے ہیں ۳۰۱
— منافقین جہاد میں بڑی بڑی باتوں اور دعووں کے حامل ہوتے ہیں لیکن میدان میں صفر ثابت ہوتے ہیں ۳۷۳-۳۷۴
— منافقین اہل ایمان سے ملتے ہیں تو ایمان کے دعوے دار بنتے ہیں اور اپنے شیطان کے حلقے میں جاتے ہیں تو انھیں کہتے ہیں ہم مسلمانوں سے مذاق کر رہے تھے، ہم تمھارے ساتھ ہیں ۵۴
— منافقین سے جب کہا جاتا ہے کہ صدق دل سے ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں ۵۴
— اللہ تعالیٰ منافقین کی رسّی دراز کر رہا ہے اور وہ سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے جا رہے ہیں ۵۴
— منافقین کا نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے سلب کر لیا ہے اور انھیں کچھ نظر نہیں آ رہا ۵۵
— منافقین اندھے، بہرے اور گونگے ہیں اور ہدایت کی طرف کبھی نہیں پلٹیں گے ۵۵
— منافقین نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی لیکن یہ سودا ان کے لیے کبھی نفع بخش نہیں ہوگا ۵۵
— منافقین کے لیے قرآن کی تمثیل ۵۵-۵۶
— منافقین غلط فہمی میں ہیں کہ ہلاکت سے بچ جائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے ۵۶
— جب معاملات سنبھل جاتے ہیں تو منافقین مسلمانوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اگر آزمائش کی گھڑی آتی ہے تو ٹھٹک کر الگ کھڑے ہو جاتے ہیں ۵۶
— منافقین ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب ہوتے ہیں ۳۰۱
— منافقین کے ایمان پر اگر کوئی آزمائش آ جائے تو ثابت قدم نہیں رہ سکتے ۳۶۹
— منافقین جہاد میں کامیابی ہو تو اسے اللہ کی طرف سے قرار دیتے ہیں لیکن اگر غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے شکست ہو جائے تو اسے رسولؐ اللہ کے سر تھوپ دیتے ہیں ۳۷۵-۳۷۶
— ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں کو منافق قرار دیا گیا حالانکہ دارالسلام نے اپنے دروازے ان کے لیے کھلے رکھے تھے ۳۷۹-۳۸۰
— اسلام عہد، وعدے اور معاہدے کا اس قدر احترام کرتا ہے کہ اگر واجب القتل منافق بھی ایسی قوم میں پناہ لے لے جن سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو احترام معاہدہ میں اس کی جان بخش دی جائے گی ۳۸۰-۳۸۲
— ہر زمانے میں منافقین کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دو متحارب گروہوں کے ساتھ عہد و پیمان کر لیں گے، جو بھی غالب رہے گا اس کے ساتھ ہو جائیں گے ۴۰۹
— اگر منافقین اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور پچھلے طرز عمل سے تائب ہو جائیں تو ان کے لیے اہل ایمان جیسے درجات ہیں ۴۱۱-۴۱۲
— منافقین ایمان کے دعوے کرتے ہیں لیکن ہیں کفر کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال بہت اچھی طرح جانتا ہے ۴۸۴

(۳۰۱) منکر

— نہی عن المنکر کا فریضہ ۲۷۷
— نہی عن المنکر میں کوتاہی کرنے کا نتیجہ ۴۹۶

(۳۰۲) منکرین حدیث

— منکرین حدیث کے خلاف ایک دلیل ۳۷

(۳۰۳) من وسلویٰ

— بنی اسرائیل کو جزیرہ نمائے سینا میں مصر سے ہجرت

کے بعد دھوپ سے بچاؤ کے لیے مسلسل آبر آلود آسمان اور چالیس سالہ مہاجرت میں من وسلویٰ کی مسلسل فراہمی ۷۷-۷۸

(۳۰۴) موت

— کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر نہ مر سکتا ہے اور نہ زندہ ہی رہ سکتا ہے، اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر چھوڑا ہے ۲۹۱
— موت کی جگہ اور وقت مقرر ہے انسان خود چل کر مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پر آ جاتا ہے ۲۹۶-۲۹۷
— موت کا وقت آ جانے پر کوئی اسے ٹال نہیں سکتا ۳۰۲
— موت آ کر رہے گی خواہ کتنے ہی انتظامات اس سے بچنے کے لیے کر لیے جائیں ۳۷۴
— اگر ہم ایک نیک کام کا قصد کر لیں لیکن پورا کرنے سے پہلے موت آ لے تو ہمیں اس نیک کام کا اجر ملے گا، گویا ہم نے وہ نیک کام کر ڈالا ۳۸۷
— موت کو قرآن مصیبت قرار دیتا ہے ۵۱۰
— موت کا وقت مقرر ہے جان نکالنے والے فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بالکل کوتاہی نہیں کرتے ۵۴۷
— اللہ تعالیٰ ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے خارج کرے گا ۵۶۵-۵۶۶
— جہالت، گمراہی اور ضلالت کی حالت کو مردہ قرار دیا گیا ہے اور حقیقت شناسی کو زندگی قرار دیا گیا ہے ۵۷۸-۵۷۹

(۳۰۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام

— آپ کا زمانہ ۴۶
— گائے کو ذبح کرنے کا حکم، بنی اسرائیل کی بہانہ سازیاں اور بمشکل ہی اس حکم پر عمل کیا ۸۴-۸۵
— چالیس شبانہ روز کے لیے طور پر بلایا جانا ۷۵
— کتاب اور فرقان سے نوازا جانا ۷۶
— چٹان سے چشمے نکالنے کا معجزہ ۷۹
— آپ سے اللہ تعالیٰ کا براہِ راست کلام کرنا ۴۲۵
— بنی اسرائیل سے دشتِ فاران میں آپ کا خطاب ۴۵۹
— حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سامری کا ان کی قوم کو گمراہ کر دینا ۷۶
— حضرت موسیٰ کی اپنی قوم کی طرف واپسی، ان کے شرک پر رنج وغم کا اظہار اور اس گمراہی کے ذمہ داروں کے لیے قتل کی سزا تجویز کرنا ۷۶
— حضرت موسیٰ کو راہِ راست دکھلائی گئی، انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۰۶) مہر

— بے ہاتھ لگائے طلاق کی صورت میں نصف مہر دینا چاہیے ۱۸۱
— بیوی کا مہر معاف کرنے کا اختیار ۳۲۲
— بیوی کو تنگ کر کے مہر میں حق ماری کرنے کی ممانعت ۳۳۳-۳۳۴
— دے کر ہرگز مہر واپس نہ لیا جائے ۳۳۵
— مہر نکاح کے ارکان میں سے ہے ۳۴۱-۴۴۷

(۳۰۷) میثاق

(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''عہد'')

(۳۰۸) میدان حشر

— جس دن اللہ تعالیٰ حکم فرمائے گا اس دن حشر برپا ہو جائے گا ۵۵۱-۵۵۲
— میدانِ حشر میں تمام انبیائے کرام سے گواہی اور شہادت لی جائے گی کہ ان کی دعوتِ حق کا ان کو اپنی قوم کی طرف سے کیا جواب ملا ۵۱۲

ن

(۳۰۹) ناپ تول

— ناپ تول میں پورا انصاف کرنے کا حکم، بھول چوک اور نادانستہ کمی بیشی کی باز پرس نہ ہوگی ۶۰۰

(۳۱۰) نامۂ اعمال

— مجرمین کو تنبیہ کہ اللہ تعالیٰ تمھاری کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے ۸۶
— انسان اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے جو کچھ بھی کرتا ہے اسے آخرت میں پائے گا، انسان کا کوئی اچھا یا برا فعل اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا ۱۰۳
— اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے رویوں پر گہری نظر رکھتا ہے ۲۳۸
— انسانوں سے اپنی حرکات چھپائی جا سکتی ہیں لیکن حق تعالیٰ جو ہر دم انسان کے ساتھ ہے اس سے کیونکر چھپائی جا سکتی ہیں، وہ رب عزیز انسان کے تمام اعمال پر محیط ہے ۳۹۴-۳۹۵

(۳۱۱) نبوت

— نبوت کیا ہے؟ ۹۷
— اس کی تشریح ۱۸
— اس کی ضرورت کس لیے پیش آئی ۱۸
— تمام انبیا کا دین ایک تھا اور ان کی دعوت بھی ایک ہی تھی ۱۸
— تمام انبیائے کرام کی اطاعت باذن اللہ ۳۶۸
— انبیائے کرام کس کام کے لیے آتے ہیں ۱۸
— آغاز نبوت ۱۶۲
— انبیا کی بعثت کی غرض ۱۶۲
— اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ کر نبوت کا دعویٰ کرنے والے ۵۶۴
— اللہ تعالیٰ خود بہتر جانتا ہے کہ رسالت کے لیے کس کو منتخب کرے ۵۷۹
— انبیائے کرام کی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ الگ بندوبست کرتا ہے ۵۷
— خلیفۃ اللہ (انسان) کو زمین پر اتارتے وقت حق و باطل کی راہیں بالکل واضح کر دی گئیں لیکن انسان ان ہدایات کو بار بار ضائع کرتا رہا، چنانچہ انسانوں ہی میں سے صالح افراد کو نبوت سے سرفراز کر کے اللہ تعالیٰ بار بار اس راہِ ہدایت کی وضاحت کرتا رہا ہے ۱۷ تا ۱۹
— نبوت کا کتاب کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے جس کو الگ نہیں کیا جا سکتا ۳۷-۳۸
— حضرت آدم کو سزا کے طور پر زمین پر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ توبہ قبول کر کے نبوت سے سرفراز فرما کر زمین پر اتارا گیا ۶۸-۶۹
— بنی اسرائیل، انبیا کی قاتل قوم ۸۱
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اور مشرکین اس بات سے جلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل (نبوت) رسولؐ اللہ ہی کو کیوں مل گیا ۱۰۱
— اللہ تعالیٰ کی خیر و رحمت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اسے چنتا ہے ۱۰۱
— پیغمبروں میں تفریق نہ کرنے کا مطلب ۱۱۶
— اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیائے کرام کو ایک دوسرے سے بڑھ کر مرتبہ اور درجہ عطا کیا ہے ۱۹۲
— بشر پہ نزول وحی پر حیرانی ناقابل فہم ہے ۵۶۳
— رسول کا کام دعوت حق پہنچا دینا ہے، آگے اللہ تعالیٰ بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے ۲۴۰-۲۴۱
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کی خطاؤں سے اللہ تعالیٰ درگزر کرتا ہے ۲۴۵
— تمام انبیا کی دعوت کے ہمیشہ تین بنیادی نکات رہے ہیں ۲۵۴ تا ۲۵۶
— انبیائے کرام اور ان کی امتوں سے لیا گیا عہد کہ ہر آنے والے نبی کی تعلیمات پر لبیک کہیں گے لیکن اہل کتاب اس عہد کی پابندی نہیں کرتے ۲۶۸-۲۶۹
— انبیائے کرام کو کتاب، حکمت اور دانش سے نوازا جاتا ہے ۲۶۸
— تمام انبیائے کرام کے برحق جاننے اور ان کی تعلیمات پر ایمان لانا عین تقاضائے ایمان ہے، اس کے علاوہ کوئی طریقہ قابل قبول نہیں ہے ۲۷۰
— نبی ہمیشہ اپنی قوم ہی میں سے اٹھایا جاتا ہے ۳۰۰
— نبی کا کام (۱) آیاتِ کتاب اللہ پہنچانا (۲) انسانوں کی زندگی کو سنوارنا (۳) کتاب اور دانائی و حکمت

کی تعلیم دینا ۳۰۰
— رسولؐ اللہ کے منصب پر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے ۳۶۸
— رسول کی اطاعت محض زبانی نہیں بلکہ عملی بھی ہونی چاہیے ۳۶۸
— جس نے رسولؐ اللہ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور اگر منہ موڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے رسول کو بری الذمہ قرار دیا ۳۷۵-۳۷۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اور حقیقت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے ۳۷۵
— رسولؐ اللہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت فضل ہے، ان پر کتاب وحکمت نازل کی گئی اور انھیں وہ باتیں بتائی گئیں جو انھیں معلوم نہ تھیں ۳۹۶
— کسی نبی کو ماننا اور کسی کا انکار کھلا کفر ہے ۴۱۴
— مدینہ کے یہودیوں کا رسولؐ اللہ سے مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب ہمارے لیے آسمان سے نازل کراؤ ۴۱۵
— رسول کا منبع ہدایت وہی وحی ہے جو تمام انبیا کا ذریعہ ہدایت رہا ہے ۴۲۴ تا ۴۲۶
— تمام مبعوث شدہ انبیا کا ذکر قرآن میں نہیں ہے ۴۲۵
— تمام انبیائے کرام کو اس حقیقت کے ماننے میں کوئی عار نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں ۴۳۰
— اللہ تعالیٰ اپنے انبیا کی طرف اٹھنے والے ہاتھ توڑ دیتا ہے ۴۵۰
— رسولؐ اللہ کی نبوت نے قرآن حکیم کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں سلامتی کا راستہ بتایا، جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر ہدایت اور روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۴۵۶
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسے وقت میں ہوئی جب کہ بعثت انبیا کا سلسلہ ایک عرصے سے بند تھا، آپ نہایت واضح تعلیمات و ہدایت کے ساتھ بشیر ونذیر بن کر آئے ۴۵۸
— نبی جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام وہدایات اخذ کرتا ہے انھیں بے کم وکاست لوگوں تک پہنچا دینا ہی حق نبوت ہے ۴۸۷
— حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ دونوں بشر تھے اور ہماری ہی طرح کھانا کھاتے تھے اور الوہیت سے ان دونوں کا کوئی تعلق نہ تھا ۴۹۰
— رسولؐ اللہ کے ذمے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا ہے، حکم عدولی کے ذمہ دار وہ نہیں ہیں ۵۰۳-۵۰۶
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات کا مطالبہ ۵۱۴
— رسولؐ اللہ سے فرشتوں کی معیت کا مطالبہ اور اس کا جواب ۵۲۵-۵۲۶
— انبیائے کرام کی دعوت کو جھٹلانے والوں اور ان کا مذاق اڑانے والوں پر وہی حقیقت مسلط کر دی گئی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۵۲۶
— انبیائے کرام ہمیشہ ہی جھٹلائے جاتے رہے لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی ۵۳۴-۵۳۵
— انبیائے کرام نیک کردار لوگوں کے لیے خوش خبری اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے بن کر آتے ہیں نیک کرداروں کے لیے خوف ورنج کا کوئی مقام نہیں اور نافرمانی کرنے والے سزا بھگت کر رہیں گے ۵۴۱
— انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوتے ہیں اگر مخالفین حق اس دلیل کو جھٹلاتے ہیں تو عذاب لانا نبی کے اختیار میں نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت وفیصلہ ہے کہ کتنی ڈھیل دینی ہے کیونکہ امر حق اللہ تعالیٰ ہے جو بہترین فیصلہ دینے والا ہے ۵۴۵-۵۴۶
— نبوت کا منصب اللہ کی دین ہے کسی سعی اور کوشش سے اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا ۵۶۱
— انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا عطا کیا

جاتا ہے ۵۶۱
— انبیائے کرام انسانوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے ۵۶۲
— رسول اللہ کی نبوت اور قرآن مجید کی صورت میں بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں، جو قبول کرے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو رد کرے گا اپنا ہی نقصان کرے گا ۵۶۸-۵۶۹
— شیطان صفت انسان اور جن ہمیشہ انبیائے کرام کے مخالف رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں ۵۷۲-۵۷۳
— منکرین نبوت کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے کہ وہ مکر و فریب کا جال پھیلائیں، وہ خود اپنے ہی مکر و فریب کے جال میں گرفتار ہوں گے لیکن انھیں اس کا شعور نہیں ہے ۵۷۹-۵۸۰
— روز قیامت گمراہ افراد اس حقیقت کا اقرار کریں گے کہ انھیں انبیائے کرام نے خبردار کیا تھا لیکن ہم ہی نے بات نہ مانی ۵۸۱
— اللہ تعالیٰ اس قوم پر ہرگز عذاب نازل نہیں کرتا جس کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں یعنی اتمام حجت نہ ہو جائے ۵۸۲

(۳۱۲) نجران
— وفد نجران کی آمد پر نازل ہونے والی آیات ۲۴۵
— وہاں کی عیسائی جمہوریت کا نظام ۲۴۶
— وفد نجران کی ہٹ دھرمی ۲۶۰
— وفد نجران کا دعوتِ مباہلہ سے گریز ۲۶۱

(۳۱۳) نجوم
— نجوم کا علم سیکھنا اور حال احوال بتانا حرام ہے ۴۴۱-۴۴۲

(۳۱۴) نذر
— اس کی حقیقت ۲۰۸

(۳۱۵) نسی
— جاہلی عرب میں نسی کا قاعدہ اور اس میں بے جا تصرفات ۱۵۲

(۳۱۶) نصاریٰ
— نصاریٰ سے کیا مراد ہے؟ ۴۵۵
— قرآن عیسائیوں کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے منسوب کرتا ہے ۵۱۸
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''عیسائی، عیسائیت'')

(۳۱۷) نصرتِ الٰہی
— کب آتی ہے؟ ۱۶۴-۵۳۵
— وہ اہل صبر کے لیے ہے ۱۹۰-۲۸۶
— اس کے بل پر قلیل گروہ کثیر گروہ پر غالب آ جاتا ہے ۱۹۰-۲۳۷
— اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا حامی و مددگار ہے ۱۹۶-۲۸۶-۲۹۴
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے اس کا وعدہ ۲۹۴
— یہ جسے حاصل ہو اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا ۲۹۹
— جو اس سے محروم ہو وہ کہیں سے مدد نہیں پا سکتا ۲۹۹

(۳۱۸) نفاق
(مزید تفصیل کے لیے دیکھو ''منافقین'')

(۳۱۹) نفل عبادت
— اسلامی تعلیمات کے مطابق نفل عبادات کو اخفا سے انجام دینا افضل ہے ۲۰۸

(۳۲۰) نکاح
— مشرکین سے نکاح کی ممانعت اور اس کی مصلحت ۱۶۸
— عورت کی عدت گزرنے سے پہلے عقد نکاح کا فیصلہ نہ کیا جائے ۱۸۰
— تعدد ازدواج پر قیود ۳۲۰-۳۲۱

— محرمات ۳۳۵ تا ۳۳۹
— زن وشو کا تعلق صرف نکاح کی صورت میں جائز ہے ۳۴۱
— نکاح کے لیے مہر کی شرط ۳۴۱-۳۴۲-۴۴۷
— اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت ۴۴۶-۴۴۷
— اسلام کا قانون نکاح وطلاق ۱۶۸-۱۶۹
— قانونِ نکاح ۱۷۸
— مہر کے معاف کیے جانے کے احکام ۳۲۲
— کیا تعدد ازدواج کا حکم قرآن مجید نے خود ہی منسوخ کردیا ہے؟ ۴۰۳-۴۰۴
— اگر زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسیع قدرت سے انھیں ایک دوسرے سے بے نیاز کر دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دامن بہت کشادہ ہے ۴۰۴
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھو ''قانون اسلام، ازدواجی تعلقات'')

(۳۲۱) نماز

— ''اقامت صلوٰۃ'' ایک جامع اصطلاح، قرآن مجید اور نظام دین میں اس کی اہمیت ۵۰
— اس کے قائم کرنے کا مطلب ۵۱
— کن لوگوں کے لیے دشوار اور کن لوگوں کے لیے سہل ہے؟ ۴۷
— نماز میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم ۱۲۱-۱۲۴
— ریل یا کشتی میں استقبال قبلہ ۱۲۲
— ''صلوٰۃ وسطیٰ'' کی حقیقت ۱۸۲
— اسلامی نظام زندگی میں نماز کا مقام ۱۸۲
— ہر قسم کے حالات میں ادا کی جائے ۱۸۳
— ''صلوٰۃ خوف'' کا حکم کب آیا؟ ۳۱۶-۳۱۸-۳۹۰ تا ۳۹۲
— تیمم ۳۱۶-۳۵۵-۳۵۶
— قصر نماز ۳۱۸-۳۸۸ تا ۳۹۰
— نماز کے اختصار یعنی قصر کا حکم، زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ کے لیے الگ الگ احکام ہیں ۳۸۸ تا ۳۹۰
— حالت نشہ میں نماز کی ممانعت، نماز ایسی حالت میں پڑھو جب جان سکو کہ کیا پڑھ رہے ہو ۳۵۴
— حالت جنابت میں نماز کی ممانعت ۳۵۴-۳۵۵
— غسل جنابت کے احکام ۴۴۸
— اقامت صلوٰۃ اسلامی حکومت کی نمایاں علامت ہے ۳۶۴-۳۶۵
— جنگی حالات میں نماز میں تاخیر کی رخصت ۳۸۸
— نماز میں پابندیِ اوقات کی اہمیت ۳۹۳
— منافقین کی نماز کا نقشہ ۴۰۹
— دکھاوے کی نماز جو مارے باندھے پڑھی جائے ۴۰۹
— دورِ رسالت میں نماز کا اوّلین معیارِ کفر وایمان ہونا ۴۱۰
— وضو کی فرضیت اور اس کا طریقہ ۴۴۸
— شراب اور جوئے میں نماز سے غفلت پیدا کرنے کی خاصیت ۵۰۳
— نماز پنج وقتہ تو بعثت رسولؐ اللہ کے کئی سال بعد فرض قرار پائی لیکن اسلام میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جس میں نماز فرض نہ ہو ۲۹
— نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دین اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں ۴۳
— اقامت دین کے لیے نماز اور صبر کی اہمیت اور ان کا باہمی تعلق ۴۳-۴۷-۱۲۶
— نماز بے شک ایک سخت ترین اور مشکل کام ہے لیکن ان فرمانبرداروں کے لیے نہیں جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار رب کی طرف ہی پلٹنا ہے اور اس کے حضور پیش ہونا ہے ۴۷
— نماز میں خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ کا خیال رکھنے کا حکم ۱۸۲-۱۸۳
— نماز انسان کے اندر خوفِ خدا اور احکامِ خداوندی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے ۱۸۲
— نماز اور تمام مراسم عبودیت (عبادت) اور جینا مرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے جس کا کوئی

شریک نہیں ہے ۶۰۵

(۳۲۲) نمرود
— اس کے دعوائے خدائی کی حقیقت ۱۹۹
— اس کا حضرت ابراہیم سے مباحثہ ۱۹۷ تا ۱۹۹

(۳۲۳) نیند
— نیند کی حالت میں روزانہ انسان کی روح قبض کی جاتی ہے اور پھر اگلے روز کے لیے دوبارہ کاروبارِ عالم میں بھیج دیا جاتا ہے ۵۴۶

(۳۲۴) نوح علیہ السلام
— ان کو راہِ راست دکھائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۲۵) نیکی
— رسمی مظاہر کا نام نیکی نہیں ہے ۱۳۶، ۱۴۸
— نیکی کی حقیقت ۱۳۶-۱۳۷-۱۴۹
— ظاہرداری کا نام ہرگز نیکی نہیں ہے ۲۷۲
— انفاق فی سبیل اللہ نیکی کے دروازے کی کنجی ہے ۲۷۲
— نیکی کی طرف بلانے کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ۲۷۷
— ایمان کے ساتھ جو نیکی کی جائے وہ ضائع نہیں جا سکتی ۲۸۱
— نیکی کے اجر کو اللہ تعالیٰ دوگنا کر دیتا ہے ۳۵۳
— ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہو تو آدمی نیکی کرنے میں ریا اور دکھاوا نہیں کرتا ۳۵۳
— نیکی میں ہر ایک سے تعاون کرنا چاہیے ۴۴۰
— حملہ کی مدافعت نہ کرنا نیکی نہیں ہے ۴۶۲
— نیکی کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں دس گنا ملتا ہے ۶۰۴
— نیکی کی بنیاد ظاہری نمود و نمائش اور اپنے اوپر بے جا پابندیاں عائد کرنا نہیں بلکہ پرہیزگاری ہی بہترین زادِ راہ ہے ۱۵۶
— دنیوی آزمائش میں کامیابی اور پورا اترنے کے لیے نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی ہوگی ۴۷۷-۴۷۸

و

(۳۲۶) والدین
— والدین سے نیک سلوک کا حکم ۵۹۸
— خدا کے بعد بندوں پر سب سے مقدم حق اللہ تعالیٰ نے والدین کا مقرر کیا ہے ۵۹۸-۵۹۹

(۳۲۷) وحی
— اس کے معنی ۴۲۴
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں بلکہ تمام انبیائے کرام پر پہلے بھی وحی آتی رہی ہے ۴۲۴
— قرآن مجید کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی آنا ۵۲۸
— ''بشر'' پر نزولِ وحی سے انکار کے معنی ۵۶۳
— انبیا پر اس کے نزول کے چار دلائل ۵۶۴
— شیاطین کا اپنے ساتھیوں پر وحی کرنا ۵۷۷

(۳۲۸) وراثت
— پانچ بنیادی احکامِ قانونِ وراثت ۳۲۴
— اسلام کے قانون وراثت میں وصیت کرنا فرض ہے ۱۳۹
(مکمل تفصیل کے لیے دیکھو ''قانونِ اسلام، قانونِ وراثت'')

(۳۲۹) وسیلہ
— اس کا مفہوم ۴۶۶

(۳۳۰) وصیت
— وصیت کرنا فرض ہے ۱۳۹
— وصیت کے بارے میں اول حکم اور بعد میں دوسرا حکم

۱۳۹-۱۴۰
— وصیت کی اہمیت ۳۲۷
— وصیت کو بدلنے والے گناہ گار ہیں، اس میں وصیت کرنے والے کا کوئی قصور نہیں ۱۴۰
— وصیت کی اصلاح کرنے والا گناہ گار نہیں لیکن ایسی اصلاح جو نادانستہ یا قصداً نہ کی جائے ۱۴۰
— وصیت کرنے والا اگر زیادتی کرے تو اس کی اصلاح کا طریقہ موجود ہے ۳۲۸
— وصیت کی ضرر رسانی کیا ہے؟ ۳۲۹
— حضرت یعقوب کی اپنی اولاد کو نصیحت ۱۱۳
— قانون وراثت کی خلاف ورزی کرنے والا بچ نہیں سکتا، جو حصے مقرر کیے گئے ہیں وہ عین درست ہے، یہ قانون علم رکھنے والی ہستی نے بنائے ہیں جو نرم خو بھی ہے، لہٰذا انسان کے لیے سہولت پیدا کرتا ہے ۳۳۰
— منہ بولا رشتہ دار، دوستی اور عہد و پیمان کسی کو حقِ وراثت نہیں دیتے ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے ۳۴۷-۳۴۸
— وصیت پر گواہی اور شہادت کا التزام کرو ۵۱۰-۵۱۱
— اس شہادت کا نصاب کیا ہے؟ ۵۱۰-۵۱۱

(۳۳۱) وضو
— اس کے ارکان اور احکام ۴۴۸
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وضو کی عملی تکمیل ۴۴۸

(۳۳۲) وہم
— چاند کا گھٹنا بڑھنا صرف تاریخوں کے تعین کے لیے ہے، اس میں وہم کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۱۴۷-۱۴۸

ھ

(۳۳۳) ہاروت و ماروت
— فرشتوں اور ہاروت و ماروت پر لوگوں کو جادوگری سکھلانے کا الزام ۹۸

(۳۳۴) ہارون علیہ السلام
— ان کو راہِ راست دکھائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۳۵) ہجرت
— مدینہ کے ''دار الاسلام'' میں عام مسلمانوں کو ہجرت کرکے آ جانے کا حکم ۳۱۸
— ہجرت نہ کرنے والوں کے لیے حکم کہ انھیں پکڑ کر قتل کرو اور انھیں ہرگز دوست اور مددگار نہ بناؤ ۳۷۹-۳۸۰
— اس سے باز رہنے والوں پر نفاق کا اطلاق ۳۷۹
— ہجرت کرکے مدینہ نہ آنے والے منافقین کے لیے حکم ۳۸۰
— مدینہ کی ہجرت کے فوراً بعد تحریک اسلامی کو پیش آنے والے مختلف مراحل کی تفصیل ۴۶ تا ۴۸
— ہجرت کرنے والے، ہجرت پر مجبور کیے جانے والے، اللہ کی راہ میں لڑنے والے اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس گناہوں سے معافی اور بہترین جزا ہے ۳۱۲-۳۱۳
— دار الحرب اور دار الکفر میں بیٹھے رہنے والے اور دار السلام کی طرف ہجرت نہ کرنے والے افراد کے لیے بہت برا انجام مقدر ہے، لیکن کمزور مرد اور عورت اور بچے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ۳۸۷
— ہجرت کی نیت اور ہمت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی زمین میں بہت گنجائش پائے گا اور ہجرت کے سفر میں موت پانے والے کا درجہ ہجرت کرنے والے کی طرح محفوظ رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ۳۸۷
— دار الکفر کے مسلمانوں پر کن حالات میں ہجرت واجب ہوتی ہے ۳۷۸-۳۷۹
— جہاں قانون الٰہی کے مطابق جینا ممکن نہ ہو، وہاں سے ہجرت کرنے کا مطالبہ ۳۸۷
— "لا هجرة بعد الفتح" کا مفہوم سمجھنے میں ایک غلط

فہمی ۳۸۸

(۳۳۶) ہدایت
— اللہ تعالیٰ کس قسم کے لوگوں کو ہدایت سے محروم کرتا ہے؟ ۵۲- ۵۵- ۵۶- ۲۰۰- ۲۷۰- ۳۹۷- ۴۸۰-۵۱۲-۵۹۱
— انسان کے لیے راہِ راست معلوم ہونے کی صرف دو صورتیں ۶۹
— صرف اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی ہی ہدایت ہے ۱۰۷-۲۳۳
— انسان بھلائی اور ہدایت کی طرف رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا لیتا ہے، وہ رب جس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۱۲۳
— دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردے ڈالے جانے کا مفہوم ۵۳۱-۵۴۱
— اللہ تعالیٰ جبراً ہدایت نہیں دیتا ۵۳۵
— دعوتِ حق پر کیسے لوگ لبیک کہتے ہیں اور کون مردہ ضمیر افراد اس سے محروم رہ جاتے ہیں ۵۳۶-۵۳۷
— انسان کے قبول ہدایت میں شیطان کی رخنہ اندازیاں ۵۴۰
— اس کے حصول کے لیے اپنی ہی بینائی کام دے سکتی ہے ۵۶۸
— اس کے قبول یا رد کرنے میں انسان کا اپنا ہی نفع و نقصان ہے ۵۶۸
— اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی بھی شرک و گمراہی میں مبتلا نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہیں کہ لوگوں کو جبری ہدایت دی جائے ۵۷۰
— ہدایت کا انحصار معجزوں پر نہیں ہے ۵۷۲
— اللہ تعالیٰ تکوینی مداخلت کر کے کسی کو مومن نہیں بناتا ۵۷۳-۵۷۴-۵۹۶
— جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اس کے لیے کھول دیتا ہے ۵۷۹
— اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفۃ اللہ بنا کر زمین پر اتارا اور درست اور غلط راستے واضح کر دیے گئے ۱۷-۱۸
— انسان نے بار بار فطری ہدایت کو ضائع کیا اور اللہ تعالیٰ انسانوں ہی میں سے صالح افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر اصل ہدایت کو بار بار تازہ کرتا رہا ۱۸-۱۹
— ہدایت اور صراطِ مستقیم ایک نعمت ہے، اگر ایک قوم اس کا انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت کسی اور کو سونپ دیتا ہے ۵۶۱
— ہدایت الٰہی سے منہ موڑنے کا انجام ۶۱-۱۰۷
— ہدایت یافتہ ہونے کا معیار یہودیت اور عیسائیت کی من گھڑت مذہبی خصوصیات ہرگز نہیں ہیں ۱۱۵
— ہدایت کا مدار عالم گیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے ۱۱۵
— کون لوگ ہدایت یافتہ ہیں؟ ۱۲۷-۴۰۴
— ہدایت انبیائے کرام پر ایمان لانے سے ملتی ہے ۱۶۳
— ہدایت اللہ تعالیٰ کی دین میں ہے ۲۶۴- ۵۳۸- ۵۵۶
— راہِ راست پانے کی شرائط ۲۷۶
— گمراہ لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں ۳۵۶
— ہدایت سے محرومی برائیوں کی وجہ سے ہوتی ہے ۳۷۹
— جسے اللہ تعالیٰ ہدایت سے محروم کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا ۳۸۰-۴۱۰
— ہدایت و ضلالت کی توفیق کا قانون ۴۱۱- ۵۳۸- ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے دلوں پر ان کی باطل پرستی کی وجہ سے ٹھپا لگا دیا ۴۱۶
— کفر اور صدعن سبیل اللہ کا نتیجہ انتہائی گمراہی ہے ۴۲۶
— کفر و ظلم کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جہنم کے راستے کے سوا اور کسی طرف راہ نمائی نہیں کرتا ۴۲۶
— اللہ تعالیٰ راہِ راست کی طرف کیسے لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے؟ ۴۳۱
— اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالبوں کے لیے قرآن ذریعہ ہدایت ہے ۴۵۶
— ہدایت پر عامل افراد ہی سیدھے راستے پر ہیں اور

اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ ہیں ۴۵
— قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے ۵۰
— اللہ تعالیٰ کی طرف سے کون لوگ ہدایت پر ہیں؟ ۵۱
— اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا نورِ بصیرت ایک نعمت ہے ۴۵۹-۵۶
— ابتدائے آفرینش ہی میں انسانوں سے ہدایت کا راستہ واضح کر کے عہد لیا گیا تھا ۶۰
— جو لوگ ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ان کے لیے رنج و غم کا موقع نہیں ہے لیکن جو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے ۶۸
— انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستے کی پیروی کرے جو اس کے رب نے اس کے لیے تجویز کیا ہے ۶۹-۴۹
— ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے کوئی آزمائش سخت نہیں ہے ۱۲۰
— بے علم ہو کر انسان صرف شیطان کے راستے پر چل سکتا ہے ۱۳۳
— ہدایت سے انکار کرنے والے اور عقل سے کام نہ لینے والے بے عقل چوپایوں کی طرح ہیں ۱۳۳-۱۳۴
— جو لوگ احکامِ کتاب اللہ چھپاتے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدے کے لیے انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ جہنم کے خریدار بن رہے ہیں ۱۳۵
— ہدایت کے بدلے ضلالت کمانے والے دراصل مغفرت کے بدلے عذاب مول لے رہے ہیں ۱۳۶-۱۳۵
— اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت کرتا ہے اپنی مرضی سے کرتا ہے، کوئی کسی کی ہدایت و ضلالت کا ذمہ دار نہیں ہے ۲۰۹
— ہدایت کی موجودگی میں گمراہی اختیار کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے ۲۶۷
— ہدایت نصیب ہو جانا اللہ تعالیٰ کا احسان ہے ۳۵۸
— راہِ راست واضح ہو جانے کے بعد جو باطل کی راہ پر چلے گا اللہ تعالیٰ اسے اسی راہ پر چلائے گا جو اس نے خود اپنے لیے پسند کی ہے ۳۹۷
— ایمان سے ہٹ کر کفر اختیار کرنا اور کفر میں بڑھتے جانا ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہ کرے گا اور انھیں کبھی ہدایت نصیب نہ ہوگی ۴۰۸-۴۰۷
— منافقین کفر اور ہدایت کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے بھٹکا دیا ہے اور وہ ہدایت نہیں پا سکتے ۴۱۰
— انسان جب اپنے خالق سے فطری عہد توڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور اس کا دل کسی بھی ہدایت کے لیے سخت کر دیتا ہے ۴۵۴
— جس کو فتنۂ ایمان میں ڈالنے اور پاک نہ کرنے کا قصد اللہ تعالیٰ کرے ان کی ہدایت کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں سخت سزا ہے ۴۷۱-۴۷۰
— دعوت حق کے داعیان ہدایت کے ذریعے سے زندگی پا چکے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رشد و ہدایت کی روشنی کے ذریعے سے دنیوی زندگی گزارتے ہیں ۵۷۸
— ہدایت ملنا زندگی ملنے کے مترادف ہے ۵۷۸
— اللہ تعالیٰ نے تو راہ (ہدایت) بالکل واضح کر دی ہے، شاید کہ انسان نصیحت قبول کر لے ۶۰۱
— ہدایت کی موجودگی اور وضاحت کے بعد ضلالت اور گمراہی اختیار کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے ۲۷۶

(۳۳۷) ہلاکت

— اس لفظ کا معنی خیز استعمال ۵۸۶

ی

(۳۳۸) یتیم

— ان کے حقوق ۳۱۹ تا ۳۲۱
— یتیموں کے اموال میں ایمان داری ۳۱۹-۳۲۳-

۳۲۴-۳۲۵-۵۹۹-۶۰۰
— حقوقِ یتامیٰ اور تعدد ازدواج ۳۲۰
— بلوغ تک ان کے مال کی حفاظت ۳۲۲
— یتیم بچیوں اور بچوں کے بارے میں انصاف کی تلقین ۴۰۱
— یتیم کے مال کی حرمت کا حکم ۵۹۹-۶۰۰
— یتیم کے حقوق کے بارے میں قرآن حکیم کا خصوصی التزام ۴۰۱-۴۰۲
— یتیموں سے متعلق تدریجی احکام ۱۶۷-۱۶۸
— یتیم کا مال اس کے حوالے کرنے کی شرائط اور ان کی سرپرستی کے احکام ۳۲۳
— یتیم کا غریب ولی اپنا حق الخدمت معروف طریقے سے علانیہ وصول کرسکتا ہے ۳۲۴
— یتیموں کا مال ان کے حوالے کرتے وقت گواہ لے لو ۳۲۴
— یتیموں کے معاملے میں اپنے بچوں کو نظر میں رکھو کہ اگر تمھارا آخری وقت آ جائے تو اپنے بچوں کے متعلق تمھیں کیسے کیسے خدشات لاحق ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ان یتیموں کا خیال کرو جن کے تم ولی مقرر کیے گئے ہو ۳۲۵

(۳۳۹) حضرت یحییٰ علیہ السلام

— ان کا مظلومانہ قتل ۸۱
— کن اوصاف کے ساتھ پیدا کیے گئے ۲۴۹
— حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش ۲۵۰
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۰) حضرت یعقوب علیہ السلام

— آپ کی اپنی اولاد کو آخری وصیت ۱۱۳
— بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھے اور انھیں دنیا کی امامت کا فریضہ سونپا گیا ۱۰۹
— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۱) حضرت یوسف علیہ السلام

— انھیں راہِ راست دکھلائی گئی اور انھیں ان کی نیکی کا بہترین بدلہ دیا گیا کیونکہ وہ صالحین میں سے تھے اور انھیں تمام دنیا پر فضیلت دی گئی ۵۵۹-۵۶۰

(۳۴۲) حضرت یونس علیہ السلام

— انھیں اللہ تعالیٰ نے خدمت کے لیے چن لیا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کی ۵۶۱

(۳۴۳) یہود، یہودی، یہودیت

— نزول قرآن کے وقت ان کی مذہبی و اخلاقی حالت ۴۶-۲۶۵
— ان کے بگاڑ پر قرآن کی تنقید کیا سبق دیتی ہے؟ ۴۷
— قرآن میں ان پر کیا تنقید کی گئی ہے؟ ۷۰-۸۷
— ان کے اخلاقی و مذہبی جرائم ۷۲-۹۴ تا ۹۷-۹۹-۱۰۰-۲۶۴ تا ۲۶۶-۲۷۲-۳۰۷-۳۶۰-۴۱۵ تا ۴۱۸-۴۲۲-۴۶۴-۴۷۱-۴۷۳-۴۷۴
— مشرکین عرب میں ان کا مذہبی و اخلاقی اثر ۷۲
— اسلام کے خلاف ان کے ہتھکنڈے ۷۲-۸۸-۲۲۹-۲۳۰
— یہودیوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم اور ان کی غفلت ۷۳
— ان کی بت پرستی ۸۱
— ان کا زعم باطل کہ نجات صرف انھی کا اجارہ ہے ۸۲-۹۵
— کتاب الٰہی میں ان کی تحریفات ۸۷-۸۹
— اہل مدینہ پر ان کے اخلاقی اور مذہبی اثرات ۸۷-۹۳
— ان کے علما کی اخلاقی حالت ۸۷-۸۹-۲۶۶-۲۶۷-۲۷۵
— خدا کے ساتھ ان کی بدگمانیاں ۸۸
— ان کے عوام کی جہالت ۸۸
— ان کی بگاڑ کے اسباب ۸۹-۹۱-۱۰۲-۱۲۸

— آخرت کے متعلق ان کا غلط عقیدہ ۸۹-۲۶۶
— مدینہ کے یہودیوں کی اخلاقی حالت ۹۱-۹۳
— علمائے یہود پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقید ۲۵۴-۲۵۵
— یہود نے دعوت عیسوی کو رد کر دیا ۲۵۸
— اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے لیے جدا جدا اخلاقی رویہ ۲۶۶
— اخلاقی لحاظ سے یہودی نہایت بے اعتبار ہیں ۲۶۵-۲۶۶
— ان کا افترا علی اللہ ۲۶۶
— نیکی کے متعلق ان کا ظاہر پرستانہ تصور ۲۷۲
— ان کے علما کی فقہی نکتہ آفرینیاں ۲۷۳
— ان کی فتنہ انگیزیوں پر تنبیہ ۲۷۵
— مدینہ کے مسلمانوں سے تعلقات میں یہودیوں کا منافقانہ رویہ ۲۸۲
— اللہ کا مذاق اڑانے کی جسارت ۳۰۶
— بنی نضیر کی سازشی کارروائیاں ۳۱۸
— اسلام کی اصلاحات سے ان کی چڑ ۳۴۴-۳۴۵
— یہود کی تحریف کلمات کی تین صورتیں ۳۵۷
— جزئیات کی ناپ تول کے ساتھ ان کی شرک پسندی ۳۵۹
— مدینہ کے یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مضحکہ انگیز مطالبہ ۴۱۵
— یہودی ایک مسلّم فتنہ پرور قوم ہے ۴۲۲
— یہودیوں کی اسرائیل نامی ریاست کس طرح قائم ہوئی؟ ۲۸۰-۴۲۳
— ان کے لیے بعض طیبات کی حرمت بطور سزا ۴۲۱-۴۲۳-۵۹۳-۵۹۴
— ان کا اچھا عنصر ۴۲۳
— اس قوم کا نمونۂ عبرت ہونا ۴۲۳
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے خلاف ان کی قاتلانہ سازش ۴۵۰
— ان کا زعم کہ وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں ۴۵۷
— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش پر ان کو لطیف ملامت ۴۶۳
— یہودیو! میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں گا ۷۱
— یہودیوں کو عربوں پر علمی برتری حاصل تھی ۷۲
— یہودیوں کو تنبیہ کہ تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کا کہتے ہو لیکن اس راہ کو خود بھلا بیٹھے ہو ۷۳
— قتل انبیا میں ملوث ہونا ۱۸۰-۱۸۲
— اللہ کا کلام سنتے ہیں، جانتے ہیں کہ یہی صداقت ہے لیکن پھر بھی اس میں دانستہ تحریف کرتے ہیں ۸۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہود کے مقدمات سننے یا نہ سننے کا اختیار ۴۷۱ تا ۴۷۳
— یہودی علما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت جانتے ہوئے اپنی مذہبی دکان داری ختم ہونے کے خوف سے حق کو چھپاتے تھے ۸۸
— یہودی علما نے یہ بات گھڑ لی تھی کہ روز آخرت چند روزہ عذاب ہی انھیں ملے گا پھر جنت ان کا مقدر ہوگی ۸۹-۲۴۲
— انھوں نے آخرت بیچ کر دنیا خرید لی لیکن وہ دنیا و آخرت میں صریح نقصان میں رہیں گے ۹۱-۹۲-۱۰۳
— ان کے مغضوب ہونے کا اعلان ۲۸۰
— یہودیوں کا تحویل قبلہ پر اعتراض حالانکہ کعبۃ اللہ کی حیثیت کو وہ خوب جانتے بوجھتے ہیں ۱۲۲-۱۲۳-۲۷۴
— یہودی قرآن کی حقانیت کو جانتے بوجھتے اس کی تکذیب کرتے ہیں ۹۳-۹۴
— یہودیوں نے انبیا کی تعلیمات کو اپنی خواہشات نفس کے خلاف پایا تو سرکشی اختیار کی، کسی نبی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا ۹۲
— یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ۹۲
— یہودی غضب بالائے غضب کے مستحق قرار پائے ۹۴

— یہودی کہتے ہیں کہ ان کے دل محفوظ ہیں ۹۲
— ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ۴۷۱
— ان کا خدا کے قانون سے اعراض ۴۷۲
— ان کو حکم رجم کو چھپانا ۴۷۲
— ان کی مذہبی بد دیانتی کی پردہ دری ۴۷۳
— ان کو دعوت اصلاح ۴۷۴
— ان کے لیے مسخ کی سزا ۴۸۴
— اللہ تعالیٰ پر بخیلی کی پھبتی کستے تھے ۴۸۵
— نزول قرآن ان کے لیے طغیان و کفر میں اضافہ کا سبب بن گیا ۴۸۵
— ان کے طغیان و کفر کا وبال ۴۸۶
— ان کا مشرکین مکہ سے جوڑ توڑ ۴۹۶-۴۹۷
— ان کا رسولؐ اللہ کے بشر ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب ۵۶۲
— ان کا خود شارع بن بیٹھنا ۵۹۴
— ان کے مشیت الٰہی کے متعلق غلط تصورات ۵۹۶
— یہودیت حضرت ابراہیم کے بہت بعد تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی ۲۶۲
— یہودیت کے مذہبی نظام میں نسلی تعصب کی روح ۲۶۶
— یہودی رسولؐ اللہ کی رسالت کے اس لیے انکاری تھے کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے ۹۴-۹۵
— یہودی کھلم کھلا اعلان کرتے تھے کہ وہ اس کتاب اور نبوت پر ہی ایمان لائیں گے جو بنی اسرائیل پر اتری ہو ۹۴
— یہودیوں کا خام خیال کہ دارِ آخرت میں ان کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور موت کی تمنا کرتے لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے ۹۵-۹۶
— دعوت رسولؐ اللہ سے ان کی عداوت ۹۶-۱۰۱
— یہودی دراصل اس بات سے جلتے تھے کہ اللہ کا فضل (نبوت) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں نصیب ہوا ۱۰۱
— یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ دین کے بارے میں شکوک پیدا کریں جس کے لیے وہ بہت سوال جواب کرتے تھے ۱۰۳
— یہودی اور نصرانی ایک دوسرے کو دین سے خارج قرار دیتے ہیں ۱۰۴
— یہودی اور عیسائی ہونا نجات کا باعث نہیں بلکہ صرف ابراہیم کا طریقہ ہی باعث نجات ہوتا ہے ۱۱۴
— یہودیوں کے ہاں رسم غسل (اصطباغ) ۱۱۶
— یہودی رب کے بارے میں یوں ہی جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ سب کا رب ہے اور سب ہی اس کا اقرار کرتے ہیں ۱۱۷
— حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب علیہم السلام کے بہت بعد یہودیت اور عیسائیت نے جنم لیا ۱۱۷
— تعلیمات اور ہدایات خداوندی چھپانے پر یہودی اللہ تعالیٰ اور تمام انسانوں کی لعنت کے مستحق ہیں ۱۲۸
— یہودیوں کے جھوٹے دعوؤں اور غلط فہمیوں کی تردید ۱۳۵-۱۳۶
— یہودیوں کے اس خام خیال کی تردید کہ وہ اپنے مذاہب اور تعلیم کے علاوہ کسی کی بات نہیں جانیں مانیں گے ۲۶۴-۲۶۵
— یہودیوں کو پکے گمراہ کہا گیا ہے ۲۷۲
— مدینہ کے یہودیوں کی چال کہ اپنے آدمیوں کو صبح علی الاعلان مسلمان کراؤ اور شام کو مرتد کروالو، اس طرح اہل ایمان میں بد دلی پھیلے گی ۲۶۴-۲۶۵-۲۸۳
— ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت و پھٹکار ہے کیونکہ وہ کتمان حق کر کے ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں ۲۷۱-۲۷۶-۳۵۸
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) میں چند ایک باایمان بھی ہیں لیکن اکثریت نافرمانوں اور فاسقوں کی ہے ۲۷۹-۲۸۰
— اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اہل ایمان کا کچھ

نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ کچھ ستالیں گے ۲۸۰
— اگر مسلمانوں سے لڑیں گے تو مار ہی کھائیں گے ۲۸۰
— یہودیوں پر محتاجی اور مغلوبیت مسلط کر دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گھر چکے ہیں ۲۸۰
— یہودیوں پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑے گی، وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کے ذمے یا انسانوں کے ذمے سے پناہ مل گئی تو اور بات ہے ۲۸۰-۴۲۳-۴۲۴
— یہودیوں کے دلوں کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو دلوں میں رکھتے ہیں وہ اور بھی شدید ہے ۲۸۳
— یہودی اہل ایمان سے بغض ہی رکھیں گے چاہے اہل ایمان ان سے محبت رکھیں جو انھیں ہرگز نہیں رکھنی چاہیے ۲۸۳
— اہل ایمان پر خوشی کا لمحہ آتا ہے تو انھیں برا لگتا ہے اور کوئی مصیبت آجاتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں ۲۸۳
— یہودیوں کے تکلیف دہ طعن اور جھوٹی نشر و اشاعت سے اہل ایمان کو آزمایا جاتا ہے، ان حالات میں صبر اور خدا ترسی کی روش اختیار کرنی چاہیے ۳۰۹
— وہ یہودی بن گئے ہیں حالانکہ ان کی اصل یہ نہ تھی ۳۵۷
— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں یہودیوں کی حرکات ۳۵۷-۳۵۸
— یہود پر اللہ کی لعنت ہے اور جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے ان کا کوئی بھی مددگار نہیں ہو سکتا ۳۶۰
— یہودی اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی ۳۶۰
— یہودی، عیسائی اس قدر تنگ دل اور تنگ نظر ہیں کہ حق کا انکار کرنے سے بھی نہیں چوکتے، اگر کہیں حکومت کائنات ان کی ہوتی تو کسی کو ایک پھوڑی کوڑی بھی نہ دیتے ۳۶۰
— یہودیوں کا مطالبہ کہ ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے ہمارے سامنے نازل کراؤ ۴۱۵
— حق و ہدایت کو اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) کے لیے مشکوک بنا دیا گیا ہے ۴۱۸-۴۱۹
— حضرت عیسیٰ کی صلیب کے واقعے پر یہودیوں اور عیسائیوں میں پائے جانے والے خیالات غلط ہیں اور محض گمان کی پیروی کرتے ہیں ۴۱۹-۴۲۰
— یہودیوں کے جرائم (۱) حق کے ساتھ ظالمانہ رویہ (۲) اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا (۳) سود خواری کرنا (۴) لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانا ۴۲۲-۴۲۳
— عیسائی اور یہودی دونوں حضرت عیسیٰ کے معاملے میں حد سے گزر گئے، یہودی انکار و مخالفت میں اور عیسائی عقیدت و محبت میں، اس کو اللہ تعالیٰ دین میں غلو قرار دیتا ہے ۴۲۷
— یہودی اپنے فطری عہد سے پھر گئے، وہ احکام الٰہی کے الفاظ کو ہیر پھیر کر بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں ۴۵۴
— یہودی تعلیماتِ خداوندی کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں اور آئے دن ان کے احکام الٰہی میں کی گئی خیانتوں کا پول کھلتا رہتا ہے اور اس خیانت سے بہت کم اہل کتاب بچے ہوئے ہیں ۴۵۴
— اہل کتاب کی حرکات اور خیانت سے چشم پوشی کرنے کا حکم ۴۵۵
— یہودیوں اور عیسائیوں کی بدعہدی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض وعناد کا بیج بو دیا ہے ۴۵۵
— یہودیوں کو ایک وقت ان کی دنیوی کارکردگی کے متعلق آگاہی دے دی جائے گی ۴۵۵
— یہودی ہرگز اللہ تعالیٰ کے چہیتے نہیں ہیں اسی لیے اپنے گناہوں پر سزا پاتے ہیں ۴۵۷
— بنی اسرائیل کے رویے میں حضرت آدم کے قاتل و مقتول بیٹوں کے واقعے کے ساتھ مماثلت ۴۶۳
— یہودی تورات کے الفاظ کے معانی درست متعین ہونے کے باوجود انھیں اصل معانی سے پھیرتے ہیں تاکہ ان سے من مانے احکام نکال سکیں ۴۷۰
— یہودیوں کے قاضی اور منصف جھوٹ سننے والے اور

حرام مال کھانے والے ہیں ۴۷۱
— یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں ۴۸۰
— یہودیوں پر اللہ کی لعنت اور غضب ہے کیونکہ انھوں نے طاغوت کی زندگی اختیار کی ہے ۴۸۴
— یہودیوں کا انجام نہایت برا ہے اور وہ سواء السبیل سے بہت زیادہ بھٹک گئے ہیں ۴۸۴
— اہل کتاب کی حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے لیکن یہودی اور عیسائی جب کبھی جنگ کی آگ بڑھاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے ٹھنڈا کر دیتا ہے ۴۸۶
— یہودی اور عیسائی جو ایمان لا کر نیک عمل کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں ہے ۴۸۸
— ان میں سے اکثر فاسق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل گئے ہیں ۴۹۷
— اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں یہودی اور مشرکین مکہ بہت سخت تھے ۴۹۷
— یہودی مشرکینِ مکہ کو گمراہ کرتے تھے ۵۶۲-۵۶۳
— یہودیوں نے تورات کو پار پارہ کر کے رکھ دیا تھا، کچھ دکھاتے اور کچھ چھپاتے تھے حالانکہ تورات تمام انسانوں کے لیے ہدایت اور روشنی تھی ۵۶۲-۵۶۳

نقشہ جنگِ اُحُد

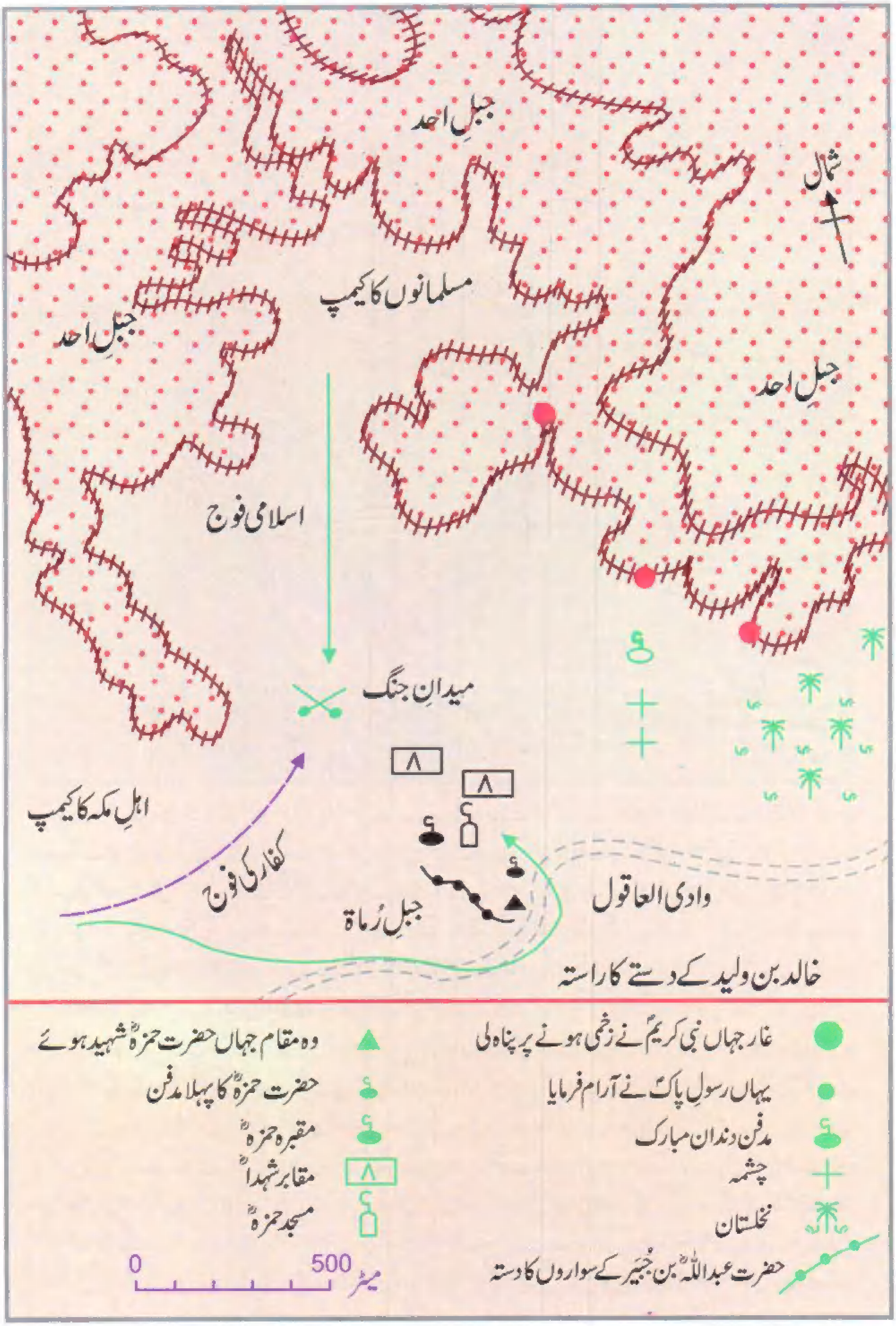
جبلِ احد
شمال
جبلِ احد
مسلمانوں کا کیمپ
جبلِ احد
اسلامی فوج
میدانِ جنگ
اہلِ مکہ کا کیمپ
کفار کی فوج
جبلِ رُماۃ
وادی العاقول
خالد بن ولید کے دستے کا راستہ
غار جہاں نبی کریمؐ نے زخمی ہونے پر پناہ لی
یہاں رسولِ پاکؐ نے آرام فرمایا
مدفن دندان مبارک
چشمہ
نخلستان
حضرت عبداللہؓ بن جُبیر کے سواروں کا دستہ
وہ مقام جہاں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے
حضرت حمزہؓ کا پہلا مدفن
مقبرہ حمزہؓ
مقابر شہداؓ
مسجد حمزہؓ
0
500
میٹر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت

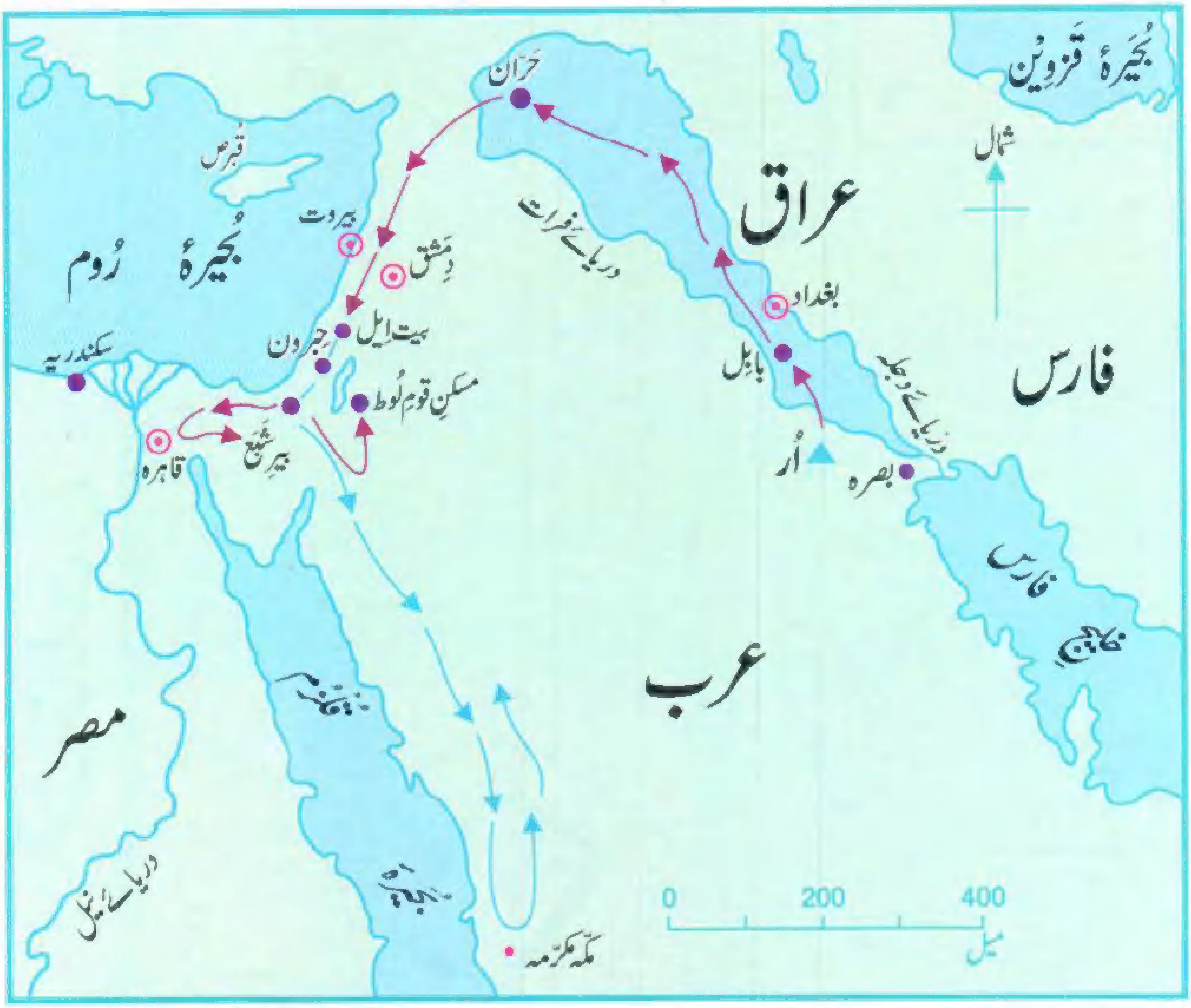
بُحیرۂ قزوین
حرّان
شمال
قبرص
عراق
دریائے فرات
بیروت
دِمشق
بُحیرۂ رُوم
بغداد
بیت اِیل
حِبرون
بابل
دریائے دجلہ
فارس
سکندریہ
مسکنِ قومِ لُوط
بیرِ شَبَع
اُر
بصرہ
قاہرہ
فارس
خلیج
عرب
بحیرۂ
احمر
مصر
دریائے نیل
0
200
400
میل
مکہ مکرمہ

تشریح: حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں اُر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ آگ کے الاؤ سے بچ نکلنے کے بعد آپ وطن چھوڑ کر پہلے حرّان (یا حاران) تشریف لے گئے۔ پھر وہاں سے فلسطین کی طرف منتقل ہوئے اور بیت اِیل، بیت جبرون اور بیرِ شَبَع میں اپنی دعوت کے مراکز قائم کیے۔ پھر بحرِ لوط کے مشرق میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو مامور کیا۔ وہاں سے آپ مصر تشریف لے گئے جو اُس زمانے میں عراق کے بعد تہذیب وتمدن کا دوسرا عظیم الشان گہوارہ تھا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصر میں بھی آپ کا تبلیغی مشن قائم ہوا یا نہیں۔ اس کے بعد آپ نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ میں بیت اللہ تعمیر کر کے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس کی خدمت سپرد کی۔ پھر فلسطین میں جبرون کو اپنا مستقل مرکز بنایا اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے بعد آپ کے دوسرے صاحب زادے حضرت اسحاق علیہ السلام اس مرکز میں آپ کے جانشین ہوئے اور ان سے یہ میراث حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہنچی۔

نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۰۸ (جلد اول)

نقشہ مقاماتِ حج

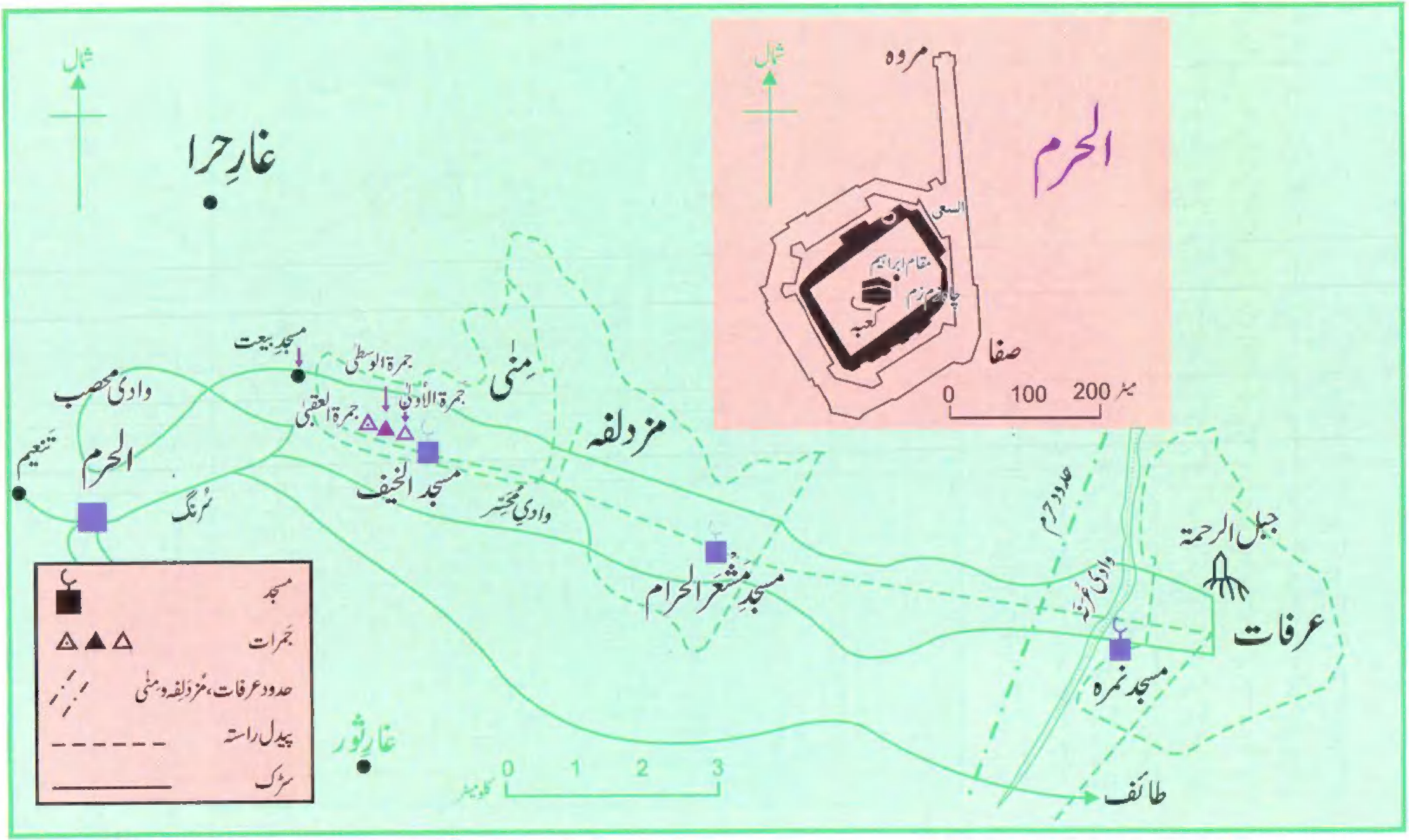
شمال
غارِ حرا
الحرم
شمال
مروہ
السعی
مقام ابراہیم
چاہِ زمزم
کعبہ
صفا
0 100 200 میٹر
مسجد بیعت
جمرة الوسطیٰ
جمرة الأولیٰ
جمرة العقبیٰ
وادی محصب
مِنیٰ
مزدلفہ
تنعیم
الحرم
سُرنگ
مسجد الخیف
وادیِ مُحسّر
حدودِ حرم
جبل الرحمة
مسجدِ مَشعَرالحرام
وادیِ عُرنہ
عرفات
مسجد نمرہ
مسجد
جَمرات
حدود عرفات، مُزدلفہ و مِنیٰ
پیدل راستہ
سڑک
غارِ ثور
0 1 2 3 کلومیٹر
طائف

(جلد اول) نقشہ متعلقہ صفحہ ۱۵۶

بنی اسرائیل کی صحرا نوردی

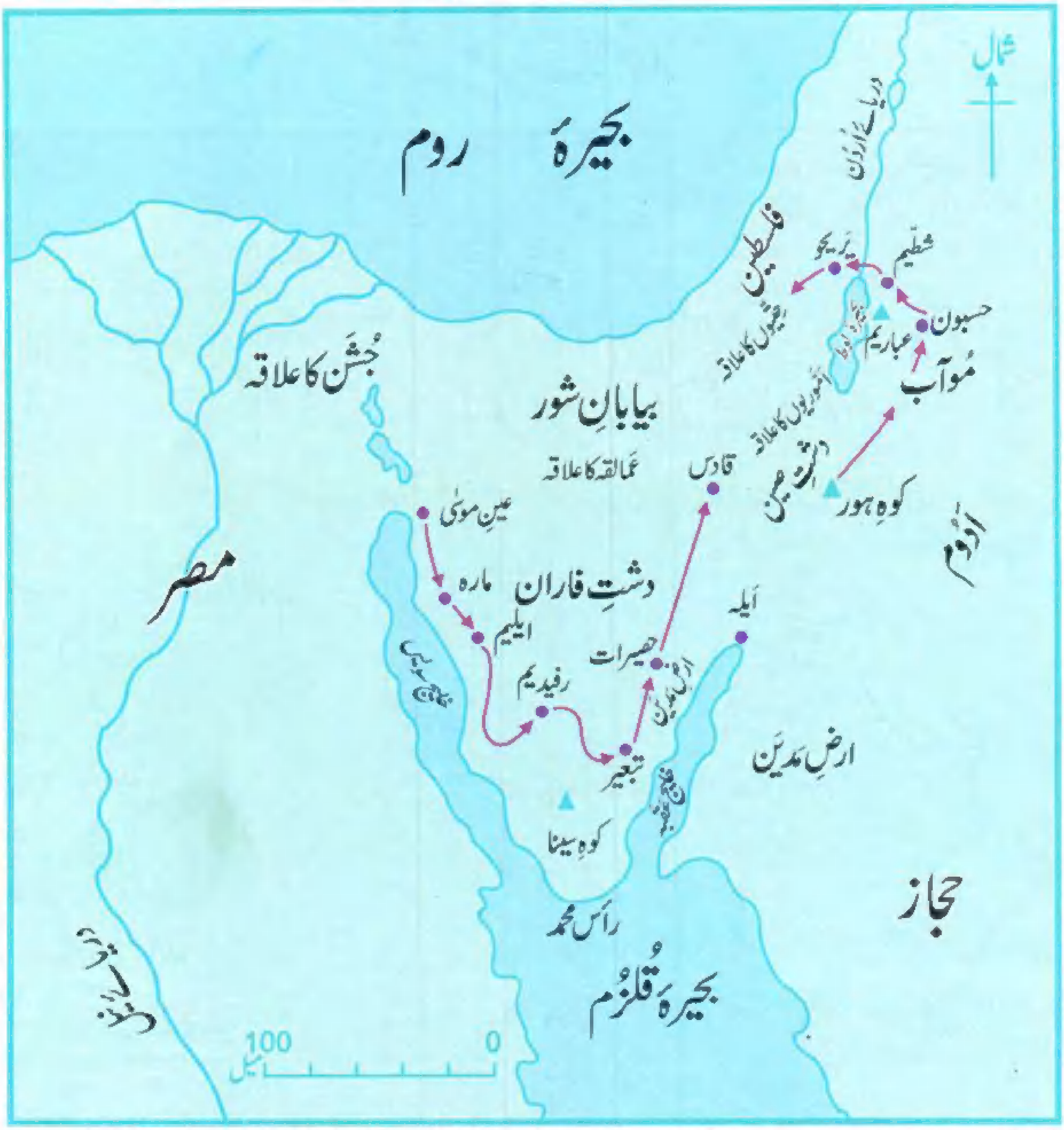
شمال
دریائے اُردن
بحیرۂ روم
فلسطین
یریحو
شطیم
حسبون
عباریم
بحیرۂ لوط
یہودیوں کا علاقہ
مُوآب
اَمُوریوں کا علاقہ
دشتِ صین
کوہِ ہور
اَدُوم
جُشَن کا علاقہ
بیابانِ شور
عَمالقہ کا علاقہ
قادس
عینِ موسیٰ
مصر
دشتِ فاران
مارہ
ایلیم
اَیلہ
حصیرات
رفیدیم
خلیج سویز
تبعیر
ارضِ مدین
خلیج عقبہ
کوہِ سینا
حجاز
راس محمد
بحیرۂ قُلزُم
دریائے نیل
100
0
میل

تشریح: حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ نمائے سینا میں مارہ، ایلیم اور رفیدیم کے راستے کوہِ سینا کی طرف آئے اور ایک سال سے کچھ زائد مدت تک اس مقام پر ٹھیرے رہے۔ یہیں تورات کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوئے۔ پھر آپ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو کہ وہ تمھاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے تبعیر اور حصیرات کے راستے دشتِ فاران میں تشریف لائے اور یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آ کر اپنی رپورٹ پیش کی۔ حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ نہایت حوصلہ شکن تھی۔ جسے سن کر بنی اسرائیل چیخ اٹھے اور انھوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے اور ان کی موجودہ نسل، یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی شکل نہ دیکھنے پائے گی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل دشتِ فاران، بیابانِ شور اور دشتِ صین کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عَمالقہ، اَمُوریوں، اَدُومیوں، مدیانیوں اور مُوآب کے لوگوں سے لڑتے بھڑتے رہے۔ جب چالیس سال گزرنے کے قریب آئے تو اَدُوم کی سرحد کے قریب کوہِ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیے ہوئے موآب کے علاقے میں داخل ہوئے اور اس پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے حسبون اور شطیم تک پہنچ گئے۔ یہاں کوہِ عباریم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشع علیہ السلام نے مشرق کی جانب سے دریائے اردن کو پار کر کے شہر یریحو (اریحا) کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک قلیل مدت ہی میں پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ اس نقشے میں اَیلہ (قدیم نام اَیلات اور موجودہ نام عَقَبہ) وہ مقام ہے جہاں غالباً اصحاب السبت کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس کا ذکر سورۂ بقرہ رکوع ۸، اور سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں آیا ہے۔